U16639 2-12-99

Title - Rooh Nazeer

Author - Sayyed Mohd. Rizvi Makhmoor Akbarabadi

Publisher - (Agra)

Date - 1922

Pages - 18 + 572.

Subjects - Nazeer Akbarabadi - Sawaneh-e-Tanqeed ; Tazkira Shoira - Nazeer Akbarabadi

روحِ نظیر

مؤلفہ

سید محمد محمود رضوی مخمور اکبرآبادی

۱۹۴۶ء

مطبوعہ آگرہ اخبار برقی پریس آگرہ

گیا پرشاد اینڈ سنز

بکسیلرز پبلشرز - آگرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۱) دیباچہ

(طبع اوّل)

نفسیات کے محض سرسری مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان وقتاً فوقتاً مختلف کیفیات کے زیر اثر رہا کرتا ہے۔ کوائف ذہنی کی ماہیت پر غائر نظر ڈالنا اور ان کی تکوین وانحطاط کی تشریح کرنا تنقید کا مبحث نہیں۔ تاہم اس تنوع کو مدنظر رکھتے ہوئے اس موقعے پر اتنا بتا دینا لازمی معلوم ہوتا ہے کہ صفاتی اعتبار سے کیفیات کی کم از کم دو قسمیں ضرور کی جا سکتی ہیں، یعنی ایک تو وہ جن کو ہم اعلیٰ کہتے ہیں اور دوسری وہ جن پر اسفل کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ یہ اصول جس طرح افراد عامہ کے لئے صحیح ہے اسی طرح شاعر پر بھی صادق آتا ہے۔ والٹر پیٹر کا قول ہے کہ شاعر اعلیٰ اور اسفل کیفیات کا ایک مجموعہ ہوا کرتا ہے۔ یہ تباین فی نفسہ ذاتی نہیں بلکہ اضافی ہے اور درحقیقت مدارج غور و انہماک پر مبنی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہیں کہ شاعر اپنے موضوع پر جیسی بسیط نظر ڈالتا اور اپنی تصنیف میں جس درجہ انہماک پیدا کرتا ہے

اسی حیثیت سے اُس کی کیفیات ذہنی کی بلندی اور پستی کے مدارج مرتب کئے جاتے ہیں۔ لیکن اِس فرق کے سمجھنے اور اس کی داد دینے کے لئے مزاج اور نفس کی حقیقی اور قرار واقعی تربیت کی ضرورت ہے۔ جو افراد انہماک و طمانیت نفس کی وساطت سے اس تربیت کے روبرو سرنیاز خم کر دیتے ہیں اُن میں ایک استعداد پیدا ہو جاتی ہے جس کے قیام کا اثر لازمی طور پر اُن میں یہ صلاحیت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ صناعت تقریر، حیات، اور عوائد میں ہمیشہ ان اجزاء کو جو وہبی، وجدانی اور مترنم ہوں، مصنوعی، کسبی اور جامد سے ممیز کر لیتے ہیں۔

اِن الفاظ سے غالباً انتخاب کی غرض و غایت پر کافی روشنی پڑتی ہے اور اتنا ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ اس تالیف کا مقصد صحیح کیا ہے اور مولف کس بات کو خصوصاً نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ مزید برآں انتخاب کے اور بھی متعدد فوائد ہیں جن کی صراحت اِس موقع پر کچھ ایسی ضروری نہیں۔ لیکن چند باتیں اتنی اہم ہیں جن پر کم از کم سرسری نظر ڈال لینا ناگزیر ہے۔ یقیناً کسی عقل سلیم کے مدعی کو دنیائے جدید کے باشندوں کے عموماً اور تعلیم یافتہ طبقے کے خصوصاً غیر معمولی انہماک اور کثرت مشاغل سے انکار نہیں ہو سکتا۔ قطع نظر اس سے، ملک کا موجودہ سیاسی تلاطم اور قومی خیالات کا حیرت انگیز انقلاب ایسے بیّن واقعات ہیں جو کسی نوع نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ پس ایک بڑی جماعت ایسے افراد کی ہے جنھیں اِن وجوہ سے مطالعے کے لئے بہت کم وقت میسر آتا ہے۔ اِس لئے اِن کو اپنا عزیز و بیش قیمت وقت، ایسے ادب پر جو مصنوعی، کسبی اور جامد ہو ضائع کرنا صرف ناپسند ہی نہیں بلکہ ایسا کرتے ہوئے وہ درد بھی محسوس کرتے ہیں۔ لہذا اس صنف کے لوگوں کے تفنن طبع اور ورزش ذہنی کے لئے صرف منتخب پھول اور چیدہ جواہر پیش کرنا لازمی ہے۔ ممکن ہے کوئی صاحب افادی مطالعے کے لئے انتخاب کی ضرورت تسلیم کرتے ہوئے یہ اصلاح پیش کریں کہ انتخاب ایسا کام ہے جو پڑھنے والے کو بطور خود کرنا چاہئے۔ یہ اعتراض اپنے مقام پر درست اور ہر حیثیت سے معقول ہے۔ بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جن کا مذاق ادب،

فطرتاً نہایت صحیح اور مکمل ہوتا ہے۔ یہ لوگ جبلتاً شعر کے حسین و ہمہ گیر عناصر کی جانب منجذب ہو سکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسی حساس طبیعتیں بہت کم ہیں اور ایسے لوگ جن میں تربیت اور مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ جیسے معلم ذرائع بھی شعری حس بہ مشکل پیدا کر سکتے ہیں، زیادہ ہیں۔

لیکن یہ دونوں طبقے میرے مخاطب صحیح نہیں۔ طبقۂ اول کی سریع الاحساسی کسی بیرونی تحریک یا خارجی مدد کی محتاج نہیں۔ وہاں ہر نظر شعر اور ہر حس نغمے کا حکم رکھتی ہے۔ طبقۂ ثانی کا جمود ازل سے ناقابل شکست ہے۔ ارباب ذوق کی کوشش ان میں رقت و ترنم کی لطیف کیفیات برانگیختہ نہیں کر سکتی۔

ہمارا مخاطب ایک دوسرا گروہ ہے جو اپنی نوعیت میں ان دونوں سے جدا ہے۔ یہ وہ اہل مطالعہ ہیں جن میں نوجوان مبتدیان ذوق خصوصاً بکثرت شامل ہیں۔ یہ عجلت پسند بعض اُن خشک و بدمزہ اجزاء سے تنگ آ کر جو تقریباً ہر سخنور کے کلام میں پائے جاتے ہیں شعری تفریح کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ بیٹھتے ہیں اور پھر کبھی اس غریب شاعر کی جانب توجہ مبذول کرنا گوارا نہیں کرتے۔ سب سے زیادہ مضر تو یہ ہے کہ بُری رائے قائم کر کے اس کی ترویج اپنا اخلاقی فرض قرار دے لیتے ہیں۔ اس طرح ان محاسن کا خون ہو جاتا ہے جن کی داد صرف بالغ نظری سے دی جا سکتی تھی اور جس کے فقدان کا غریب شاعر کسی طرح ذمہ دار نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔

اس جگہ یہ جتانا ضروری ہے کہ وہ بلند پایہ مقامات جن کو سہواً یا کسی مغالطے کے زیر اثر سرسری طور پر ٹال دیا جاتا ہے اپنی ندرت کے اعتبار سے پڑھنے والے کے معلومات میں معتد بہ اضافہ، خیالات میں عظیم الشان ارتفاع اور مطمح نظر میں ایک وسیع اور سودمند اصلاح تجویز کرنے کے بوجہ احسن اہل ہوتے ہیں۔

اب مؤلف کا کام ہے کہ وہ ان خشک اور بدمزہ اجزاء سے جن پر بعض اوقات مزخرفات کا اطلاق کیا جاتا ہے کلام کو پاک کر دے۔ بہت سے خصوصیات، بالخصوص کسل و انقباض کے لمحوں میں تفریح و شگفتگی پیدا کرنے کی بنا پر شعراء کی صحبت دنیا میں بہترین صحبت ہے۔ لیکن یہ لوگ ہر وقت اپنے بہترین انداز سے مزین نہیں رہتے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ مناسب موقع تلاش کر کے بہ عنوان جمیل ان کی انجمن میں بار حاصل کریں ساتھ

ہی ساتھ مؤلف کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ خود ایک مرتبہ تعارف کرادے۔ اس کے بعد پڑھنے والے کو اس کی حالت پر چھوڑ دے کہ وہ اپنے تعلقات خود جاری رکھے یا ختم کر دے۔ لیکن مؤلف کے مہیا کردہ مواد تفریح کے استعمال اور اس کے ذریعے جلب منفعت کی توقعات کے بارے میں اس مقام پر ارباب مطالعہ کو ایک اور خاص امر کی ہدایت کرنا ضروری ہے جو بیشتر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اسٹیل ایک بڑے مصور کا قول نقل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "جس طرح بعض صورتیں بعض مصوروں کے لئے قلم کے لئے مخصوص ہوتی ہیں اسی طرح بعض عنوان بعض شعرا کا حصہ ہوا کرتے ہیں"۔ یہ اصول من وعن انتخاب مطالعہ پر بھی عائد ہوتا ہے۔ کوئی شخص کسی شاعر کے کلام کا کما حقہ لطف نہیں اٹھا سکتا جب تک اس میں یہ اہلیت نہ ہو کہ وہ اس شاعر کی زندگی میں اس کا رفیق و ہمدم بن سکتا۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ کسی شاعر کے کلام سے لطف اندوز ہونا یا نہ ہونا مزاج اور افتاد طبیعت پر بہت کچھ منحصر ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ایک ہی شاعر یا ایک ہی تصویر کو پسند نہیں کرتا۔ مزاج ہماری دوستیوں کو سوسائٹی میں طے کرتا ہے اور مزاج ہی کے فیصلے پر ہمیں ادبی مشاغل کی بنا قائم کرنی چاہیئے۔

لیکن بایں ہمہ مزاج اور دماغ کی تربیت جیسا کہ ابتدا میں کہا جا چکا ہے قرین امکان ہے۔ اس شخص کو جو کسی شاعر کے کلام میں تاثیر اور دلکشی نہیں پاتا یہ مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے تئیں اس کی ہمجلیسی کے قابل بنائے۔ بسا اوقات عدم وقوف اور فقدان لذت نااہلی کے باعث نہیں ہوتا بلکہ ناتجربہ کاری کی وجہ سے ہوا کرتا ہے۔ پس اگر ابتدا میں کسی شاعر کے داخلی معانی ہماری دسترس سے باہر معلوم ہوں تو ہم کو مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب حیات کی کشمکش جو جملہ امور کی معلم ہے کسی سرور یا الم کے موقعے پر اُن سارے حقائق کو یکایک منکشف کر دیتی ہے جو ہماری کم نگاہی کے سبب ہم سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ شادمانی کے لمحوں میں اور غم کے مواقع پر بھی بالیقین شعرا کی صحبت ہمارے لئے بہترین نعمت اور بدرجہ اتم مسرت بخش ہے۔ شعر زندگی کے اُن دشوار گزار راستوں میں جن سے کوئی شخص بیشتر سے اتف

نہیں ہوتا ہمارے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے اگر ہم حسن پرستی، زندہ دلی اور محبت نوازی سے جو شعر کی جان ہے اپنی نظریں کشادہ، اپنا دماغ حاضر اور اپنی ہمدردیاں سرگرم رکھیں۔

یہ جملہ باتیں جواب تک بیان کی گئیں اصولاً ہر اعتبار سے نظیر پر صادق آتی ہیں۔ اس بنا پر اور اس کے علاوہ اور بہت سے وجوہ کی بنا پر نظیر کے کلام کا انتخاب اس حیثیت اور شان سے شائع کرنا نہایت ضروری تھا۔ باوجود ایسا نغز گو اور عدیم المثال شاعر ہونے کے ملک و ملت اب تک نظیر کی تمام و کمال روشناس نہیں۔ بلکہ موجودہ واقفیت اگر وہ کسی نوع واقفیت کہی جا سکتی ہے، جہل کی صورت میں نمایاں ہوتی تو زیادہ سود مند ثابت ہو سکتی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ قابل افسوس تو یہ امر ہے کہ ارباب ذوق اور اہل علم کو بھی اس بلند پایہ سخنور کے کلام پر اتنا عبور نہیں جتنا دوسرے اساتذہ کے کلام پر ہے بلکہ اُن کا تغافل اور عدم توجہی کسی طرح عوام الناس سے کم نہیں۔ اُردو زبان باوجود اپنی بے بضاعتی اور کم مایئگی کے شاعری کو اپنے مربیانہ فیضان سے ہمیشہ مالامال کرتی رہی ہے۔ اُردو بولنے والوں کو شعر و سخن سے ہر زمانے میں جو دلچسپی رہی ہے وہ شعرا کی کثرت سے صاف ظاہر ہے۔ اس صورت میں نظیر سے ناواقفیت اور بے پرواہی اور بھی تعجب انگیز ہے۔ مگر فی الحقیقت وہ ذوقِ عام صحیح مذاق شعر و ادب نہ تھا اور اس سے ہمارے استعجاب کا پورا جواب مل جاتا ہے۔

بہر حال اب مطالعہ کرنے والوں کو سہولت بہم کرنے اور دماغوں کو نظیر کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بہترین نظموں کا ایک مختصر مجموعہ پیش کیا جائے جو آئندہ ارباب تلاش کے نزدیک تحقیق و تنقید کا پیش خیمہ بن سکے۔ کسی شاعر کا مطالعہ کرتے وقت اس کا ضرور لحاظ رکھنا چاہیے کہ اس کے کلام کا کم از کم اتنا حصہ ضرور پڑھ لیا جائے جس سے زندگی اور آرٹ کے متعلق اس کے نقطۂ نظر کا کافی اندازہ ہو سکے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کلام کا وہ حصہ پیش نظر ہو جس میں شاعر نے پورا پورا زور تخیل صرف کیا ہے۔ میں نے اپنی لیاقت اور استعداد کے مطابق اسی نوعیت

کا کلام منتخب کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم متبعین کے لئے ابھی بڑی گنجائش باقی ہے۔ یقین ہے کہ یہ ترغیب بار ور ہوگی اور اس بنیاد پر نئی نئی عالی شان عمارتیں تعمیر کی جائیں گی۔

بحمداللہ اب ملک میں بیداری کے آثار نمودار ہیں اور استقلال کی روشنی دلوں پر مسلط ہو چکی ہے۔ اس لئے توی امید ہے کہ ملک خود اپنے پوشیدہ جواہر کو گمنامی کی تاریک کانوں سے کھود کھود کر نکالے گا اور ہر جوہر قابل کی اس کی حیثیت اور محاسن کے مطابق پوری پوری داد دی جائے گی۔

جدید تمدن سے روشناسی اور مغربی ادبیات کے ورود نے ہندوستانی مذاق میں ایک خاص تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ علاوہ بریں مغربی و مشرقی خیالات کے تواصل سے جو ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا ہے وہ بھی بالذات نہایت لطیف اور کیف آور ہے۔ بہرحال انگریزی ادبیات میں جس طرز کی نظمیں پائی جاتی ہیں وہ اُردو زبان میں میسر نہیں۔ ہر چند موجود شعراء اس جانب مائل ہیں تاہم اساتذہ کا کلام جو بہت سے وجوہ سے ادب القدما کی حیثیت سے ہمارے پیش نظر ہے اس طرز سے خالی ہے۔ یہاں اساتذہ کو سر نیاز خم کرنا پڑتا ہے لیکن اُردو زبان کا درفش سر دری کسی طرح سرنگوں نہیں ہوتا کیونکہ یہاں سے نظیر کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں نظیر کی شخصیت سب سے بلند نظر آتی ہے اور یہیں سے نظیر کی فوقیت کا ثبوت اور معترضین کا جواب دونوں بہم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مغرب پسند حضرات کا اعتراض رد کرنے کے لئے نظیر کا صرف وہ کلام پیش کرنا زیادہ قرین مصلحت ہے جو ان کے خیال میں قطعی مغربی انداز پر ہے اور جس کو مشرقی چاشنی کے سوا لے خالص اپنے رنگ میں ڈوبا ہوا پاتے ہیں۔

اس انتخاب کی ایک سیاسی غایت بھی ہے جو کسی عنوان مفاد سے خالی نہیں۔ نظیر کا کلام دیکھ کر اور اس کی ہمہ گیری سے شاعر کی بے تعصبی کا اندازہ کرتے ہوئے نہ صرف یہ معلوم ہوگا کہ قرون ماضیہ میں ہندوستان کی ایک قوم دوسری ہمسایہ قوموں کے جذبات کا یہاں تک پاس و لحاظ کرتی تھی کہ شعراء ارادۃً یا اضطراراً ان کا اظہار اپنا فرض منصبی قرار دے لیتے تھے بلکہ یہ بھی واضح ہوگا کہ اس سرزمین پاک کے بے جرم و خطا

مطعون باشندے اس قسم کے شریفانہ حیات سے بے بہرہ اور محروم نہیں جن پر ہندوستان کے مختلف مذہبوں اور قوموں کے باہمی اتحاد و مصالحت ہمدردی اور رواداری کی بنیاد رکھی جاسکے۔ یہ غیر فانی نکتہ نظیر کے کلام کا زندہ معجزہ ہے اور ملک کے بد اندیشوں کا جو ہمیشہ اختلاف کے حامی اور شکر رنجیوں کے معاون رہے ایک دندان شکن جواب ہے۔

((نظیر کا کلام ایک زخار سمندر ہے جس میں ہر قسم کے موتی بیحد و شمار دستیاب ہوتے ہیں)) اس لئے انتخاب کرنے والے کو بہت زیادہ گنجائش ہے۔ اسی فیض عام کی برکت سے اس تالیف میں بھی ہر مذاق کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ہندو، مسلم، شیعہ، سنی، سکھ ہر مذہب اور عقیدے کے پیرو کے لئے کافی دلچسپی کا التزام کیا گیا ہے (نظموں کی نوعیت اور مختلف مذاقوں کی رعایت کا ذکر لاحاصل معلوم ہوتا ہے۔ مطالعے سے ہر بات خود ظاہر ہو جائے گی)

نظموں کے ناموں کے متعلق بہت کچھ اختلاف ہے اور میں معترف ہوں کہ اس بارے میں تحقیق دشوار ہے۔ مختلف نسخوں میں مختلف عنوان دیئے ہوئے ہیں۔ میں نے نظیر کا تجویز کردہ عنوان معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا سراغ کچھ تو پرانے نسخوں سے لگایا ہے اور کچھ نفس مضمون سے اندازہ کیا ہے۔ پھر بھی پورے یقین کے ساتھ صحت کا دعوی نہیں کیا جاسکتا۔ اس انتخاب میں جو نظمیں شامل ہیں ان کی سات مختلف نسخوں سے صحت کی گئی ہے۔ لیکن شہباز کے ایڈیشن پر زیادہ انحصار کیا گیا ہے۔ مگر جہاں ہر نسخے میں اختلاف واقع ہوا ہے اور شہباز کے ایڈیشن سے بھی کافی تسلی نہیں ہوئی تو میں نے اکبر آباد کا باشندہ اور یہاں کی ہر قسم کی زبان سے واقف ہونے کی حیثیت سے اپنی رائے کو ترجیح دی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

اس تالیف میں عموماً اور دیباچہ نگاری میں خصوصاً انگریزی ادبیات سے بہت کچھ مدد لی گئی ہے۔ دیباچہ میں متعدد انگریزی انشا پردازوں اور حقیر مؤلف کے خیالات کا امتزاج ہے۔ بعض جگہ فقروں کا بجنسہ ترجمہ کر دیا گیا ہے جو واوین کے اندر بند ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر عبارت کا ربط قائم رکھنے اور دوسری انشائی ضروریات

کے باعث یہ مقامات علیٰحدہ بند رکھے جاسکے اور اس طرح مخلوط ہو گئے کہ قوسین کے اندر بھی بند نہیں۔ ممکن ہے عالی حوصلہ حضرات اِس پر انگشت نما ہوں لیکن اِس بارے میں صرف اس قدر گزارش کرنا غالباً عذر گناہ نہ سمجھا جائے گا کہ اُردو زبان خصوصاً نثر ابھی بہت کم مایہ ہے۔ دوسری زبانوں اور ادبیات سے خیالات کا اقتباس کر کے اپنی زبان میں شائع کرنا اور اُس کو سرمایہ دار بنانا کسی نوع مفاد اور دلچسپی سے خالی نہیں اور معیوب بھی نہیں تصور کیا جاسکتا۔

جون سنہ ۱۹۲۲ء
آگرہ

مخمور اکبرآبادی

دیباچہ (۲)

(طبع دوئم)

روح نظیر پہلی مرتبہ ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی تھی اور اب چوبیس (۲۴) برس کے بعد اس کا دوسرا نقش شائع ہو رہا ہے۔ صرف ایک ہزار جلدوں کا پہلا ایڈیشن ختم ہونے کے لیے، جس میں سے کم و بیش تین سو نسخے احباب اور اعزا کے حلقے میں مفت تقسیم ہوئے ہوں، یہ طویل مدت بڑی ہمت شکن ہے۔ لیکن اس احساس کی بنا پر کہ نظیر کے مطالعے کا ذوق روز افزوں ترقی کر رہا ہے اور اس اعتماد پر بھی کہ اس ذوق کے نشو ونما میں روح نظیر نے بھی قدرے قلیل حصہ لیا ہے، اس صحیفے کی دوسری اشاعت پیش کرنے کی جرأت کی گئی ہے۔ اس اشاعت کے متعلق ذیل کی باتوں پر توجہ دلانا ضروری ہے:-

(۱) پہلی اشاعت صرف چالیس نظموں پر مشتمل تھی۔ اس کی انتالیسویں نظم جو حافظ کی ایک غزل کی تضمین ہے، اس مرتبہ حذف کر کے گیارہ مزید نظمیں اضافہ کر دی گئی ہیں۔ اس طرح جدید اشاعت میں پچاس نظمیں شامل ہیں۔

۲- پہلی اشاعت میں غزلیں شامل نہ تھیں لیکن اس میں بہت سی غزلیں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ ان غزلوں کو تین حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے:

(۱) غزلیں

(۲) مسلسل غزلیں

(۳) موضوعی غزلیں

۳- غزلوں کے علاوہ چند تضمینیں اور مستزاد بھی شامل کیے گئے ہیں۔

۴- جو نظمیں بڑھائی گئی ہیں ان پر تبصرہ بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ پہلی کے سب پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح ہر نوع کی غزلوں، مستزادوں اور تضمینوں پر بھی تبصرہ کر دیا گیا ہے۔

۵- پہلی اشاعت میں نویں نمبر کی نظم کا نام "ترجیع بند" ہے۔ اس اشاعت میں اس کا نام بدل کر "چڑیوں کی تسبیح" رکھ دیا گیا ہے۔ ان میں سے کوئی نام نظیر کا رکھا ہوا نہیں ہے۔ برسات کی بہاریں، "کلجگ"، "مفلسی" اور "پہلی ہولی" کے بہت سے بند جو پہلی اشاعت میں شامل نہ تھے اس اشاعت میں بڑھا دیے گئے ہیں۔ لیکن شہباز کے نسخے کے مقابلے میں چند بند "برسات" میں، چار "مفلسی" میں اور کچھ "پہلی ہولی" میں اب بھی کم ہیں۔

۶- پہلی اشاعت کے وقت نظیر کے مختلف نسخوں سے مدد نہیں لی گئی تھی۔ جس وقت یہ ترجمہ کیا گیا تھا۔ اب قاری ... عباس ہاشمی صاحب ... بدایونی ... صاحب ریاست ٹونک کی دستخطی ... سے ایک قلمی نسخہ میسر آیا ہے۔ یہ نسخہ گوالیار کے ایک قدیم اور اصیل خاندان کے کتب خانے میں اب تک محفوظ تھا۔ چنانچہ اس اشاعت کی صحت میں اس نسخے سے مدد لی گئی ہے۔

۷- اس نسخے میں بہت سی غیر مطبوعہ غزلیں میسر آئی ہیں ... کے طور پر شامل کیا گیا تھا ... [illegible] ... دوسرے نسخے ... مقابلہ ... نظموں ... بھی اضافہ

کر دیا ہے۔ اس لئے اس نے جزواً کلیات کی شکل اختیار کر لی ہے۔ بہرحال اس سے غزلوں اور نظموں دونوں کی صحت میں بڑی مدد ملی ہے۔

۸۔ اس اشاعت میں صحت کا بڑا التزام کیا گیا ہے لیکن کہیں کہیں اب بھی اس نہیں ہوں۔ چنانچہ غزلوں کے بعض مصرعے جن کی صحت نہ ہو سکی درج نہیں کئے گئے۔ پہلی اشاعت کی کتابت کی غلطیوں اور دوسری خامیوں کی بھی اس اشاعت میں صحت کر دی گئی ہے لیکن اس اشاعت میں بھی بعض کتابت کی خامیاں باقی رہ گئی ہیں۔

۹۔ پری کے سراپے میں شہباز ایڈیشن اور قلمی نسخے میں بڑا فرق ہے۔ شہباز کے یہاں کل اٹھارہ اور قلمی میں بیس بند ہیں۔ قلمی کا بارہواں اور تیرہواں بند شہباز کے یہاں نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ بندوں کی ترتیب، بندوں میں مصرعوں کی ترتیب اور مصرعوں میں لفظوں کی ترتیب میں بھی فرق ہے۔ کہیں کہیں دونوں کے الفاظ مختلف ہیں۔ تیسرے بند کے پہلے مصرعے میں شہباز نے "خوب" درج کیا ہے اور قلمی میں "زور" استعمال ہوا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ پروفیسر شہباز جیسے اہل نظر اور نظیر شناس نے "خوب" کو "زور" پر کیسے ترجیح دیدی۔ "زور" نظیر کا محبوب لفظ ہے اور عہد کی زبان کا سچا نمونہ ہے۔ اسی طرح شہباز نے اپنے نویں اور دسویں بندوں کے پانچویں مصرعے میں دونوں جگہ "مونڈھوں" استعمال کیا ہے۔ نویں میں یہ لفظ بالکل برمحل ہے لیکن دسویں میں سیاق اس کی اجازت نہیں دیتا۔ یہاں "مونڈھوں" کی جگہ "کولھوں" ہونا چاہئے۔ نظیر ایک ہی لفظ کو دو جگہ لانا پسند نہیں کرتا۔ قلمی نسخے کا شہباز ایڈیشن سے ہر اختلاف نظیر کی زبان اور مزاج شعری سے پوری مطابقت کرتا ہے۔ یہ شہادت اس کی صحت اور مستند کی بڑی دلیل ہے۔ اس بنا پر ہر جگہ قلمی نسخے کے اندراج کو ترجیح دی گئی ہے لیکن میں اپنے فیصلے کو قول فیصل کے طور پر پیش نہیں کرتا۔ ادبی مسائل مزید ذاتی تحقیق و تفتیش کے ہمیشہ محتاج رہتے ہیں۔

"بھوبنجارا" نامی نظم میں شہباز کے نسخے میں صرف اٹھارہ بند ہیں اور قلمی میں چھبیس۔ اس کے علاوہ

بعض مصرعوں میں بھی اختلاف ہے۔ اسی طرح "جوانی اور بڑھاپے کی لڑائی" اور "مفلسی" نامی نظموں میں بھی دونوں نسخوں میں اختلاف ہے۔ میں نے بہر عنوان قلمی نسخے کا اتباع مناسب سمجھا ہے۔

۱۱۔ نظموں میں جہاں مکالمے کی صورت پیدا ہوئی ہے وہاں واوین کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ "کرشن جنم"، "جوگی نامہ" اور "جوگن نامہ" نظموں میں مکالمے کی کثرت ہے۔ ان میں خصوصیت سے اس نوع کا التزام کیا گیا ہے۔

۱۲۔ نظیر کے جو مصرعے کسی عنوان غلط معلوم ہوتے ہیں وہ حقیقت میں غلط نہیں۔ افسوس ہے کہ ہم تک اس صورت میں پہونچے ہیں۔ زبان کے تغیر، زمانے کے لازمی رد و بدل اور کاتبوں کی سہل انگاری نے بعض الفاظ اور محاوروں کو اس قدر مسخ کر دیا ہے کہ اصل تک پہونچنا آسان کام نہیں رہا۔ اس کا الزام نظیر کے سر تھوپنا بے انصافی ہے۔ اس لئے نظیر پسندوں کو صحت کی کوشش میں برابر مصروف رہنا ضروری ہے۔ نظیر کا صحیح لفظ بہم کرنے کے لئے نظیر کے عہد کی زبان ہر وقت پیش نظر ہونی چاہیے۔

۱۳۔ اس اشاعت میں فرہنگ اور حواشی کی ضخامت وہی ہے جو پہلی اشاعت میں تھی اور حواشی کی تاریخی صداقت کی ضمانت نہیں کی جاتی۔ جو نظمیں اور غزلیں اس میں اضافہ کی گئی ہیں ان کی فرہنگ اور حواشی مرتب نہ کئے جا سکے۔ "موت" نامی نظم مطبع کی غلطی سے شامل ہوگئی ہے۔ اسی وجہ سے اس پر تبصرہ بھی نہیں کیا گیا۔

۱۴۔ اس کتاب کا مسودہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء میں مطبع کو سپرد کر دیا گیا تھا مگر اب تک اس کے تکملے اور اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ دیکھئے کب تک اس قید سے آزاد ہو۔

(۲) مؤلف کا یہ پرانا خیال کہ آزاد سے نظیر کے باب میں سہو ہوا (صفحہ ۶) اب تک بالکل بدل چکا ہے۔

سہو کے امکان کی جگہ سہو عمد نے لی ہے۔ آب حیات میں جگہ نہ دے کر آزاد نے دانستہ نظیر کی اہانت کی کوشش کی ہے۔ وہ اگر دیانت سے نظیر کو شاعر نہیں مانتا تو اس کے ذوقِ شعر فہمی پر حرف آتا ہے نظر انداز کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ نظیر کو جدید رنگ کی شاعری کا پیش رو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اگر یہ وجہ بھی غلط ہے تو یہ الزام مسلم ہے کہ محض عامۃ الورود خیالات سے متاثر ہو کر آزاد نے اپنی ناقدانہ بصیرت کو پس پشت ڈال دیا اور نظیر کے متعلق غور و فکر، تحقیق و تفتیش کی سعی نہ کی۔

---

(۳)

انجمن ترقی اردو نے ۱۹۴۲ء میں 'مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کا مرتب کردہ' دیوان نظیر شائع کیا ہے۔ اس موقعے پر اس مجموعے کے متعلق حسب ذیل گزارش بے محل نہ ہوگی۔

۱۔ مرزا صاحب نے اپنے دیباچے میں تحریر فرمایا ہے کہ ان کے مرتب کردہ دیوان میں نظیر کا کل غزلیہ کلام شامل ہے۔ یہ خیال ذیل کے وجوہ سے غلط ہے:۔

(۱) ضیائے عباس ہاشمی ضیائی بدایونی والا نسخہ، جس سے میں نے اس اشاعت کے لئے انتخاب کیا ہے، بہت سی ایسی غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے جو اور کہیں میسر نہیں آتیں۔

(۲) مولوی عابد علی صاحب شاہ گنج آگرہ کے ذخیرے میں جو خود ان کا مرتب کردہ ہے، بہت سا غیر مطبوعہ کلام شامل ہے۔

(۳) منشی درگا پرشاد مہرہ ایڈوکیٹ ورئیس پنی گلی آگرے کے مرتب کردہ سرمائے میں بہت سا غیر مطبوعہ کلام شامل ہے۔

(۴) ان کے علاوہ اور بھی چند مقامات کا ذکر روایتاً سنا گیا ہے مگر ان کے متعلق حتم و یقین کے ساتھ کوئی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً یہ کہ:۔

(الف) پنڈت کیلاش ناتھ کنزرو مرحوم وکیل سرکار و رئیس اکبرآباد کے قبضے میں بہت سا غیر مطبوعہ کلام تھا جس کا بیشتر حصہ پورے دیوان حافظ کی تضمینوں پر مشتمل تھا۔ کلام میں حافظ کی تضمینوں کی موجودگی اس روایت کو قرین قیاس بناتی ہے۔ بہر حال مجھے اس کلام کا پتہ نہ لگ سکا۔ یہ روایت اگر صحیح ہے تو وہ کلام اس وقت بھی کسی نہ کسی کے قبضے میں موجود ہے۔

(ب) بابو رام گوپال ایڈووکیٹ سہارنپور کے قبضے میں کچھ کلام ہے۔ یہ اس کھتری خاندان کے چشم و چراغ ہیں جہاں میاں نظیر پڑھانے جایا کرتے تھے۔ ان کے پاس کلام کی موجودگی نہ صرف قرین قیاس ہے بلکہ یقینی ہے۔ خود انھوں نے اور ان کے بعض عزیزوں نے بھی اس کی تصدیق کی ہے مگر اب وہ کسی مصلحت سے بات ٹالتے ہیں۔ ایک مستند مخطوطہ بھی ان کے قبضے میں بتایا جاتا ہے۔ مگر اس ذخیرے تک میری رسائی نہ ہو سکی۔

(ج) بہ قول مولوی عابد علی صاحب بندرابن کے کسی حلوائی یا کنجڑے کے پاس بہت سا غیر مطبوعہ کلام موجود ہے۔

(د) مختلف لوگوں کو زبانی یاد ہے جو سینہ بہ سینہ چلا آ رہا ہے۔ ان حافظوں میں پیری کے فقیر، قلندر، خوانچے والے اور دیگر کام والے بھی ہیں۔

(ہ) آگرے میں سید ظہوری کے نزدیک کئی نسخے ہیں۔ ان میں سے حسن ... دو قدیم قلمی نسخے ہیں دو کا حوالہ پروفیسر شہباز نے دیا ہے۔ ان دونوں سے کچھ ... ان سے ... جو غیر مطبوعہ ہیں اور کچھ مطبوعہ ... دونوں میرے پاس موجود ہیں۔

(و) بہر حال جب تک ان سب ذرائع سے جمع کر کے سارا کلام ایک جگہ شائع نہ کیا جائے مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کا سا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

۲ - کتاب کی کتابت و طباعت ناقص ہے۔ حیرت ہے کہ انجمن نے جو کثیر سرمائے اور بیش از بیش ذرائع کی مالک ہے، اردو کے نظیرؔ جیسے رکن اعظم کے کلام کو، ایسی بد دلی سے شائع کرنا جائز رکھا۔

۳ - انتخاب میں کسی خاص اصول یا ترتیب کو مد نظر نہیں رکھا گیا اور دیباچے میں محض عامیانہ اور رد باتوں پر نظر ڈالی گئی ہے جن سے کوئی بصیرت پیدا نہیں ہوتی۔ نظیرؔ جیسے شاعر کا کلام اس سے بہت زیادہ گہرے، تحقیقی و تنقیدی مطالعے کا مستحق ہے۔

۴ - نظیرؔ کو محض روایتی نقطۂ نظر سے دیکھ کر بورژوا ذہنیت کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔

۵ - ۳۱ صفحے پر مرزا صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ نظیرؔ نے غالبؔ کے مضمون کو الٹ دیا ہے۔ یہ بیان فاش تاریخی غلطی ہے۔ نظیرؔ غالبؔ سے کم و بیش ساٹھ برس متقدم ہے۔ نظیرؔ نے سنہ ۱۸۳۰ء اور غالبؔ نے سنہ ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ تعجب ہے کہ مرزا صاحب نے مضمون لکھتے وقت، دونوں کے عہد حیات پر غور نہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ خود غالبؔ نے نظیرؔ کا مضمون الٹ کر باندھا ہے۔ غالبؔ کے کلام میں، اس نوع کے توارد کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں۔ تبصرے میں، اس موضوع پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

خاتمے میں ایک بات عرض کر دینی ضروری ہے۔ میں نے کئی سال کی متواتر محنت کے بعد نظیرؔ پر ایک دوسری کتاب مرتب کی ہے، جس کا نام نظیر نامہ ہے۔ یہ ضخیم کتاب نظیرؔ کے شاعرانہ نقطۂ نظر کا تنقیدی مطالعہ ہے۔ یہ کتاب سنہ ۱۹۴۳ء میں مکمل ہو چکی ہے۔ اگر کاغذ کا یہ قحط اور کتابت و طباعت کی یہ دشواریاں حائل نہ ہوتیں تو یہ کتاب بھی اب تک شائع ہو جاتی۔ میں برابر کوشش کر رہا ہوں کہ جلد سے جلد نظیر نامہ شائع کر سکوں۔

مخمور اکبر آبادی

نئی دہلی
مئی سنہ ۱۹۴۶ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۳) فہرست مضامین

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
۱- دیباچہ	۱-۸	۹- چڑیوں کی تسبیح	۲۳۵
۲- دیباچہ طبع دوم	۹-۱۵	۱۰- ننانامہ	۲۳۷
۳- فہرست مضامین	۱۶-۱۸	۱۱- طفلی	۲۴۲
۴- مقدمہ	۳-۴۰	۱۲- جوانی	۲۴۳
۵- تبصرہ	۴۲-۲۰۰	۱۳- بڑھاپا	۲۴۷
۶- کلام نظیر	۲۰۲	۱۴- فقیروں کی صدا	۲۵۶
۱- الٰہی نامہ	۲۰۳	۱۵- خوشامد	۲۵۹
۲- برسات کی بہاریں	۲۰۷	۱۶- کلجگ	۲۶۳
۳- بنجارہ نامہ	۲۱۸	۱۷- مفلسی	۲۶۶
۴- عاشق نامہ	۲۲۶	۱۸- معجزۂ حضرت علی علیہ السلام	۲۷۱
۵- آدمی نامہ	۲۲۳	۱۹- دوالی	۲۷۵
۶- ہنس نامہ	۲۲۶	۲۰- حضرت سلیم چشتی	۲۷۸
۷- روضۂ تاج گنج	۲۳۰	۲۱- ہولی کی بہار	۲۸۰
۸- تندرستی نامہ	۲۳۱	۲۲- نانک شاہ گرو	۲۸۱

۲۳- جنم کنھیا جی ۲۸۳
۲۴- بانسری ۲۸۹
۲۵- آگرے کی تیراکی ۲۹۱
۲۶- موسمِ زمستاں ۲۹۴
۲۷- اوس ۲۹۷
۲۸- کورا برتن ۲۹۸
۲۹- کوا اور ہرن کا بچہ ۳۰۱
۳۰- خواب کا طلسم ۳۰۳
۳۱- ریچھ کا بچہ ۳۰۶
۳۲- راکھی ۳۰۹
۳۳- سخاوت و عشرت ۳۱۰
۳۴- چاندنی رات ۳۱۳
۳۵- ہولی ۳۱۵
۳۶- جوگی نامہ ۳۱۷
۳۷- جوگن نامہ ۳۲۳
۳۸- موتی ۳۳۱
۳۹- موت ۳۳۳
۴۰- اکبرآباد ۳۳۵
۴۱- پدمنی کا سراپا ۳۳۶
۴۲- آئینہ ۳۳۰
۴۳- روٹی نامہ ۳۳۲
۴۴- آندھی ۳۳۵
۴۵- اژدہے کا بچہ ۳۴۰
۴۶- ککڑی ۳۴۹
۴۷- بھونچال ۳۵۲
۴۸- کوڑی نامہ ۳۵۷
۴۹- وجد و حال ۳۶۰
۵۰- جوانی اور بڑھاپے کی لڑائی ۳۶۲
۵۱- بلدیو جی کا میلہ ۳۶۶
۷- غزلیات ۳۷۵
۱- غزلیں ۳۷۵ ، ۴۹۰
۲- مسلسل غزلیں ۴۹۱ ، ۴۹۸
۳- موضوعی غزلیں ۵۰۱
۸- تضمینیں و مستزاد ۵۲۱
۹- زٹلیات ۵۳۱
۱۰- حواشی ۵۴۷
۱۱- عنوانات کا انڈکس (اشاریہ) ۵۶۱



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقدمہ (۳)

تمہید | شاعری کے محاسن کا تذکرہ کرتے ہوئے آرنلڈ ایک مقام پر رقم طراز ہے کہ شاعری "تنقید زندگی" ہے۔ اس دعوے کی حقیقت نمائی اور صداقت پر جو بیّن ہے اگر یقین کر لیا جائے تو شاعری کی ضرورت تسلیم کر لینا ہر قبیل سے لازم آتا ہے۔ اس لئے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس کا وجود مہذب قوموں کے لئے ناگزیر ضروریات حیات میں سے ہے اور اس کی ترقی قومی حیات و عوائد کی ترقی کے پہلو بہ پہلو رہتی ہے۔ جس طرح کوئی قوم فلسفی اور مقنن کی دماغی و ذہنی مساعی سے بے نیاز نہیں رہ سکتی اسی طرح شاعر کی روح پرور خدمات قومی ضروریات سے حذف نہیں کی جا سکتیں۔ اگر فلسفی اپنی عزیز عمر اور تمام تر قوتیں

مقصد حیات، اسباب فلاح اور وسائل نجات کی تلاش و جستجو کے لئے وقف کر دیتا اور مقنن بہبود و امن عامہ کو مد نظر رکھ کر کامل ترقی اور اعلیٰ معیار حیات تک پہونچنے کے ذرائع بہم کرنے کی کوششیں کرتا اور شاہراہ سعی و عمل پر بہ اسلوب احسن قدم زن ہونے کے لئے قواعد منضبط کرتا ہے، تو شاعر بھی اسی شغف و انہماک کے ساتھ قومی غیرت و حمیت کو زندہ اور حساس قومیت کو جو حیات قومی کے لئے غالباً سب سے زیادہ ضروری عنصر ہے بیدار رکھتا ہے۔ شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ وقت اور نظم ملک کے حیات کے مد و جزر سے باخبر رہے اور اخلاق کی درستی میں نمایاں حصہ لے۔ مردہ آرزوؤں کو زندہ کرنا، پست ہمتوں کو ابھارنا اور خفتہ جذبات میں تلاطم و ہیجان پیدا کرنا شاعر کا فرض اولین ہے۔ شعر فطری وجدان کو برانگیختہ کرتا ہے، طبیعتوں کو جوش اور ولولہ، خیالات کو جدت اور لطافت اور دلوں کو مسرت اور تازگی بخشتا ہے۔ جب قوم کا ذوق شعر کند ہو جائے سمجھ لو کہ اس کے آثار حیات زائل ہو چکے اور وہ تنزل کی جانب مائل ہے۔ پس معلوم ہوا کہ قوم کو زندہ باخبر رکھنے اور اس میں جد و جہد کی روح پھونکتے رہنے کے لئے شاعر کی شخصیت اتنی ہی ضروری ہے جتنی فلسفی و مقنن کی لیکن دراصل ان سب سے زیادہ ضروری نقاد کا وجود ہے، جو ہر چیز کو نقد کی روشنی میں پیش کر کے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیتا ہے۔ تنقید وہ کسوٹی ہے جس سے شعر کے حسن و قبح کا اندازہ کیا جاتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شاعر نے کہاں تک اپنا فرض انجام دیا اور اس کی شاعری کس حد تک شاعری کہی جانے کی مستحق ہے۔ اس وقت نظیر اور نظیر کا کلام ہمارے پیش نظر ہے۔ اب ہم نقد کی کسوٹی پر کس کر دیکھیں گے کہ نظیر کیا تھے اور ان کا کلام کیا اہمیت رکھتا ہے۔

گمنامی | نظیر کا نام لیتے ہی جو چیز سب سے پہلے سامنے آتی ہے وہ ان کی گمنامی ہے۔ نظیر کو گلشن جناں کی سیر کرتے ہوئے تقریباً ۹۴ برس ہو گئے۔ یہ مدت اتنی کافی ہے کہ اگر ہمارے وطن اس مرحوم سخنور کی طرف توجہ کرتے تو تحقیق اور تنقید کا بڑا ذخیرہ ارباب مطالعہ کے قبضے میں ہوتا۔ ایک صدی کی مدت اتنی کافی ہے جس میں زندہ اور باخبر قوموں کے شعرا مدارج شہرت و قبولیت طے کر کے آسمان عروج و سربلندی کے ستارے بن جاتے ہیں اور ان کے کلام کا شمار ادب العالیہ کی برگزیدہ فہرست میں ہونے لگتا ہے۔ لیکن ہندوستانی ادب قدیم کے ستون جو اپنے حسن میں کامل اور اپنی

نوع میں یگانہ ہے ہنوز روز اول ہے۔ حیف ہے اس ملک اور ملت کی خفتہ بختی پر جس نے اپنے گوہر یک دانہ کو گرد گمنامی سے اس طرح آلودہ کر رکھا ہو۔ پورے یقین کے ساتھ نہیں بتایا جا سکتا کہ نظیر کی حیات میں ان کی قدر دانی کا کیا عالم تھا۔ اتنا ضرور قیاس کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ ساٹھ ستر برس کی مدت میں جیسا روح فرسا اور جوہر کش برتاؤ ان کے ساتھ کیا گیا اس سے بدرجہا بہتر قدر دانی غالباً ان کی حیات میں ہوئی ہوگی۔ لیکن اس پر بھی بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظیر فی الحقیقت جس قدر دانی کے مستحق تھے اتنی قدر ان کی حیات میں بھی نہیں ہوئی۔ تاریخ ادب اردو اس امر کی شاہد ہے کہ ذوقِ شعری نے اس وقت تک ارتقا کی اس منزل میں قدم نہ رکھا تھا جہاں سے نظیر کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ بلکہ شاعری ابھی ترقی کے ابتدائی مراحل بھی طے نہ کر چکی تھی کہ اس فطری مُغنّی نے اپنے الہامانہ نغمے چھیڑ دیے۔ زمانے کی بھونڈی قدامت نواز طبیعت کسی اور طرف مائل تھی اور ان کے نفیس و اختراع پسند خیالات کا رجحان کسی اور جانب تھا۔ یہاں تک کہ اُن کی تیز رفتاری نے ادبیات کے سُست رو کارواں کو کوسوں پیچھے چھوڑ دیا۔ پس اس طرح نظیر تو اپنے ہی وقت میں روشِ زمانہ سے بہت آگے نکل گئے لیکن اہلِ ملک میں یہ صلاحیت اتنی پیدا نہ ہو سکی کہ اُن کی کُنہ بیان کو سمجھتے اور اس کی مناسب داد دے سکتے۔ ہاں ایک نئی اور دلچسپ چیز سمجھ کر تھوڑی بہت واہ واہ ضرور کرتے رہے۔ نظیر کے معاملے میں اتنی سخت حق تلفی اور انصاف کا خون ہونے کی غالباً یہی سب سے بڑی تاریخی وجہ ہے جس تک رسائی ممکن ہے۔ مگر چونکہ وہ ایک مستغنی مزاج والے اور غیر ستائش پسند بزرگ تھے انھوں نے کبھی اس کی کچھ پروا نہ کی۔ اپنے کو جس کام پر مامور سمجھتے تھے وہ کام انھوں نے ہمیشہ نہایت اطمینان و خاموشی سے انجام دیا اور جو پیغام قسامِ ازل نے انھیں ودیعت کیا تھا عمر بھر اس کی تلقین کرتے رہے۔ جدید تمدن کی معرفی نے نظیر کے محاسن کو حقیقی روشنی میں پیش کیا ہے اور اب ہمارے نزدیک وہ وقت آ گیا ہے جب ان کی پوری پوری قدر شناسی کی جائے گی۔

کوئی بڑا شاعر اتنا گمنام نہیں

نظیر کی مخصوص سربلندی اور انتہائی گمنامی دونوں کو ایک جا جمع کر کے لازمی طور پر یہ کہنا پڑتا ہے کہ کوئی بڑا شاعر اتنا گمنام نہیں۔ ہر چند متعدد فارسی تذکروں میں ان کا ذکر موجود ہے لیکن تفصیل کے ساتھ کسی میں نہیں اس لئے اس کا عدم اور وجود برابر ہے۔ البتہ پروفیسر شہباز نے جو تذکرہ مرتب کیا ہے اس سے بہت

کچھ حالات کا پتہ چلتا ہے۔ عوام اور سطح نظر گروہ تو ایک طرف بالغ نگاہ اور اصحاب تحقیق کی نظر سے نظیر کا پوشیدہ رہنا بظاہر بہت تعجب انگیز ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد صاحب تذکرہ آب حیات کی وسیع دانش و جستجو سے نظیر کے پوشیدہ رہنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آزاد نظیر کو شاعر نہ سمجھتے تھے، دوسرا یہ کہ ان سے سہو ہوا۔ آزاد کی جوہر شناس نگاہ کے متعلق یہ شبہ کرنا کہ وہ نظیر کے قائل نہ تھے ہم بہتان سمجھتے ہیں۔ پس یہ خیال تو ایک منٹ کے لئے بھی قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ البتہ دوسری وجہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ گزشتہ زمانے میں مذاق سخن اس درجہ مصنوعی ہو گیا تھا کہ فطرت شناسوں کے لئے کوئی جگہ باقی نہ تھی۔ اس عام بدمذاقی نے لوگوں کو روز بروز نظیر کی جانب سے غافل کرنا شروع کر دیا۔ آخر کار زوال اس حد پر پہونچ گیا جہاں سے پھر کمال کی ابتدا ہونے لگتی ہے۔ اس ماحول کے زیر اثر اگر آزاد سے سہو ہوا ہو تو زیادہ تعجب خیز نہیں۔ گمنامی کی ایک وجہ اور بھی سمجھ میں آتی ہے اور اس کے غالباً نظیر خود ذمہ دار ہیں۔ وہ ایک درویش صفت صاحب دل، قانع، باوضع، مستغنی، خود دار، عالی ظرف، بلند حوصلہ اور سیر چشم بزرگ تھے۔ اس لئے انہوں نے کبھی کسی دربار کی ملازمت یا حاضر باشی پسند نہ کی۔ کئی درباروں سے طلبی بھی ہوئی مگر جانا پسند نہ کیا۔ شہباز کی رائے کے مطابق راجا کاشی مقیم اکبرآباد کے یہاں ان کا تعلق ثابت ہے لیکن وہ برائے نام تھا۔ کسب معاش یا حصول زر کی خاطر نہ تھا۔ غالباً خودداری اس امر کی اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ رئیسوں کی دربرداری کریں اور ان کی بیجا خوشامد یا جھوٹی سخن پروری اور ناز برداری کا بار اپنے حقیقت پرور نفس پر ڈالیں۔ وہ شاعری کا صحیح مفہوم جانتے تھے اور اس کو کسی فرد واحد کی تعریف و توصیف سے آلودہ کرنا باعث ننگ سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ شعر دل کی تڑپ سے ظہور پذیر ہو سکتا ہے نہ کہ روسا کی فرمائشوں اور حصول خطاب کی خواہشوں سے۔ شاعری ان کا شغل شوق تھا وہ اسے کسب معاش کا ذریعہ بنانا گوارا نہ کر سکتے تھے۔ درباروں سے تعلق نہ پیدا کرنے اور امرا کی مجلسوں سے الگ رہنے کی ایک وجہ غالباً ان کی فارغ البالی اور معاش سے بے فکری بھی تھی۔ وہ اپنے گھر کے خوش حال کھاتے پیتے آدمی تھے کسی کی امداد و مراعات کے محتاج نہ تھے۔ غالباً یہی وہ بات ہے جس نے ان کے مزاج کی شریفانہ خصوصیات کے ساتھ مل کر ان کو ہمیشہ محدود رکھا۔ پس چونکہ تمام عمر خانہ نشینی سے کام لیا اس لئے ملک میں مشہور و مقبول نہ ہو سکے۔ صرف آگرہ و نواح کے تلامذہ

قدر سے قلیل واقف رہے۔ چونکہ ملک میں مراسلت اور تبادلۂ خیالات کے ذرائع اس وقت تک اتنے ترقی یافتہ نہ تھے کہ کوئی شاعر گھر بیٹھے پہنچے اور اس کا کلام شہر بہ شہر پھیل جائے اس لئے ملک عموماً اُن سے بے خبر رہا، ہاں اکبر آباد میں ان کی عزت و توقیر اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں طبقوں میں ہمیشہ بہت زیادہ رہی۔

شاعرانہ اہلیت | نظیر کے متعلق ایک متنازعہ فیہ امر یہ بھی ہے کہ آیا وہ شاعر ہیں یا نہیں۔ گزشتہ زمانے میں جبکہ ایشیائی شاعری کے مصنوعی شاہنے کا رنگ دلوں پر نہایت گہرائی کے ساتھ غالب تھا اور تعصب اور تنگ خیالی نے آنکھوں پر پردے ڈال رکھے تھے، ملک میں ایک بادقعت گروہ ایسا تھا جو نظیر کی شاعری کا قائل نہ تھا۔ لکھنؤ اور دہلی کے شعرا خصوصاً آخر الذکر جو ہمیشہ زبان اور شاعری کو اپنی میراث سمجھتے رہے ہیں، اس خیال کے بہت بڑے حامی رہے ہے۔ یہ جماعت نظیر کو ایک ہزل گو، فحش پسند، صحت لفظی سے معرا، یاوہ گو، ناظم اور مبتذل طبقے کا آدمی سمجھتی رہی۔ ان کے اجتہاد اور مافوق العادت کمالِ شاعری کا اعتراف تو درکنار نظیر کو زمرۂ شعرا میں بھی جگہ دینا انھیں پسند نہ تھا۔ یہ تو خیر متقدمین کا ذکر ہے، لیکن اس زمانے میں بھی جب کہ علم کا چرچا گھر گھر، اور ذوق کی جنس اس قدر عام ہے، پُرانی لکیر کے پیٹنے والے قدامت پرست لوگ موجود ہیں جو نظیر کی اہلیت کے قائل نہیں اور ان کو اب تک ایک تک بند ہی سمجھتے ہیں۔ اس مخالف گروہ کی سب سے بڑی کوتاہی یہ ہے کہ وہ نظیر کا کلام اور ان کی زبان اپنے زمانے کے معیارِ سخن سے جانچنا چاہتے ہیں۔ یہ فاش ادبی و تاریخی غلطی ہے اور اس سے سراسر نادانی ٹپکتی ہے۔ وہ لوگ اس بات کو مدنظر نہیں رکھتے کہ نظیر جس زمانے کے شاعر ہیں وہ اُردو کا بچپن تھا اور اس وقت یہ زبان منازل تکوین طے کر رہی تھی۔ تراکیب میں آج کل کی سی شستگی اور پاکیزگی نہ تھی۔ بھاشا کے الفاظ کثرت سے شامل تھے۔ ان سب باتوں کے علاوہ شاعری اس قدر لسانی اور عروضی قیود کی پابند نہ تھی۔ انشا کے بعد سے عروض، زبان، اور صحت لفظی کے متعلق جو جو قیود لگائے گئے وہ اس وقت نافذ نہ تھے۔ پس نظیر پر جو انشا کے معاصر اور دورِ تکوین کے سخنور ہیں، ان قیود کا اتباع کیونکر فرض ہو سکتا تھا۔ وہ اس زمانے کی ضروریات کے خلاف ان قواعد کی پابندی خود اپنے اوپر کیونکر عائد کر لیتے۔ بہرحال اُس وقت کی مشکلات جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں، نظیر کے لئے کیا کم تھیں کہ وہ اور قیود اپنے اوپر لگاتے۔ اس لئے نظیر پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا۔ مخالفوں کے غلط فتووں اور جوہر کش ہرزہ سرائی

سے نظیر کی شانِ شاعری اور اہمیت سخنوری میں کچھ فرق نہیں آتا۔ خود اس طبقے کے تعصب، بدذوقی اور کم نظری کا اظہار ہوتا ہے۔ غالباً وہ لوگ شاعری کا صحیح مصرف نہ جانتے تھے اور اگر جانتے تھے تو کم سے کم یہ خیال ضرور رکھتے تھے کہ خود وہی شاعری کا بہترین حق ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کاش ان کا عقیدہ یہ ہوتا کہ وجدان کسی فردِ واحد یا مخصوص طبقے کی ملک نہیں ہوتا۔ جدت کی الہام آفریں روح پرور نسیم جہاں چاہتی ہے اپنے خوش گوار جھونکوں سے دماغوں کو تر و تازہ اور روحوں کو معطر کر سکتی ہے۔ قسّامِ ازل کی فراغ حوصلگی نے کسی جمعیت کو اپنی بے پایاں نعمتوں سے بے بہرہ نہیں رکھا۔ ملک کا کوئی گوشہ، جہاں رمز شناس موجود ہوں فطرت کے فیضِ عام سے محروم نہیں رہ سکتا۔ رموزِ الوہیت کا سرچشمہ ہر جگہ جاری ہے اور عام اجازت ہے کہ لوگ اس سے سیراب ہوں۔ جس کے پاس ظرف موجود ہے اور جس پر تشنگی غالب ہے وہی اس سے سیراب ہو سکتا ہے۔ نظیر کے پاس یہ ظرف جملہ خصوصیات کے ساتھ موجود تھا اور تشنگی بھی غالب تھی۔ انھوں نے خود سیر ہو کر پیا اور ہزاروں کو سیراب کیا۔ اب تک جو شخص نظیر کی مدد کا طالب ہو، وہ اس کو چشمۂ فیضان کا راستہ بتا سکتے ہیں۔ پس ایسے شخص کے لیے کیونکر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ محض ایک ہزل گو اور بازاری شاعر ہے۔ نظیر کے کلام کو سوقیانہ طرزِ سخن کا مترادف سمجھنا بہت بڑی اخلاقی غلطی ہے۔ وہ ایک نغز گو، بذلہ سنج اور رمز شناس شاعر تھے۔ انھوں نے باتوں باتوں میں کھیل کود اور تماشوں میں لے جا کر ظرافت اور تفنن کے پیرایے میں وہ وہ کار آمد اصول بتانے اور مفید نصیحتیں کی ہیں جن پر اگر سچے دل سے غور اور عمل کیا جائے تو انسان کبھی دھوکا نہیں کھا سکتا اور دنیا کے پیچیدہ راستوں کو بہت آسانی کے ساتھ طے کر سکتا ہے۔ نظیر نے نئی بندشوں اور ترکیبوں کا اضافہ کیا۔ قدیم فرسودہ استعارے اور تشبیہوں کو چھوڑ کر جدید باتوں کی ترویج کی اور انواع و اقسام کے نئے خیالات پیدا کیے۔ زندگی کے واردات پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالی اور جس شعبے کو اٹھایا اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ایشیائی شاعری میں نیچرل شاعری کا پیوند لگانے کا فخر سب سے پہلے اکبرآباد کے اسی قدیم شاعر کو حاصل ہے۔ زبان پر قدرت، معاشرت پر عبور، فطرت کی رمز شناسی، مناظرِ قدرت سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت، نفسیات کا علم، مختلف علوم و فنون کا وقوف، ذوق، زمانے سے دلچسپی، سیاسی بصیرت، صنعت و حرفت سے واقفیت، ہمدردی، ظرافت، سوز و گداز، ترنم، محبت، غرض یہ کہ

شاعری کے سارے لوازم اور شاعر کے جملہ محاسن نظیر کی ذات میں جمع ہیں۔ انھیں شاعر نہ سمجھنا غلطی ہے۔

علمیت | نظیر کو شاعر نہ سمجھنے والا طبقہ ان کی علمی لیاقت کا بھی منکر ہے۔ کہتے ہیں کہ میاں نظیر علم سے بے بہرہ اور جاہل آدمی تھے۔ اب رہا شاعرانہ کمال تو اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ زورِ طبیعت نے انھیں تُک بند بنا دیا تھا۔ یہ نظریہ قطعی غلط ہے۔ نظیر کا شمار اُن کے زمانے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں میں تھا۔ بہت سے لوگوں کا اس ایک نظم پر استدلال ہے جو انھوں نے اپنے متعلق کہی ہے اور جس میں انھوں نے اپنی بے علمی اور کم مائیگی کا اعتراف کیا ہے۔ قدیم تمدن کو مدنظر رکھتے ہوئے جس کی رو سے انکسار اور ہیچمدانی کا اظہار اعلیٰ ترین اخلاقی خوبیوں میں شمار کئے جاتے تھے، نظیر کے اشعار کے ظاہری معنی لینا انصاف کا خون کرنا ہے۔ عربی میں تو غالباً نظیر کو زیادہ استعداد نہ تھی مگر فارسی کے وہ بہت بڑے عالم تھے۔ فارسی کی جملہ درسی کتب تو انھوں نے طفولت اور تعلیم ہی کے زمانے میں پڑھ لی تھیں لیکن ادب عالیہ کی مشہور تصانیف تمام عمر اُن کے مطالعے میں رہیں۔ اُن کا پیشہ معلمی تھا۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے کے مکاتب کی حالت آج کل کے مکاتب کی طرح زبوں نہ تھی۔ طلبا وہیں سے فارغ التحصیل ہو کر اور اعلیٰ تعلیم کی سندیں لے کر نکلتے تھے۔ پھر ہر قسم کی سیاسی، ملکی، آئینی ذمہ داریاں اُن کے سپرد کی جاتی تھیں۔ لہٰذا ایسے مکاتب میں درس دینا بھی کسی معمولی شخص کا کام نہ تھا۔ جب تک مسلم الثبوت استاد اور مستند لیاقت کا معلم نہ ہو اتنی بڑی ذمہ داری ہرگز اس کو سپرد نہ کی جا سکتی تھی۔ اس لئے نظیر کا معلم ہونا ہی اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے منتخب فاضل اور بڑے ذی علم بزرگ تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی شہادتیں ہیں جن سے ان کا صاحبِ علم ہونا ثابت ہے۔ علمی قابلیت کے ماسوا وہ زبانوں کے بہت بڑے ماہر تھے اور یہ قدرت اُن میں خداداد تھی۔ فارسی، عربی کو چھوڑ کر وہ ہندی، پنجابی، مارواڑی، پوربی اور برج بھاشا یہ پانچ زبانیں اور جانتے تھے۔ اس طرح اردو ملا کر آٹھ زبانوں میں دخیل تھے۔ مختلف علوم اور فنون میں ان کے عام معلومات نہایت وسیع تھے اور ہر شعبۂ علم میں تھوڑی بہت واقفیت ضرور رکھتے تھے۔ چنانچہ رمل، نجوم، ہندسہ، موسیقی، منطق، وغیرہ میں شغف کا پتہ ان کے کلام سے چلتا ہے۔ اپنے ملک کی سیاست کو وہ اچھی طرح سمجھتے تھے لیکن تاریخ سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ تاریخی ناموں کے حوالے اور تاریخی واقعات کے جابجا تذکروں سے مترشح ہوتا ہے

کہ تاریخ پر ان کو بڑا عبور تھا اور یہ علم ان کے پسندیدہ ترین مضامین میں سے تھا۔

رنگ کے موجد نظیر خود اپنے رنگ کے موجد ہیں۔ اس لئے تقدم کی فضیلت اُن کا حصہ ہے۔ انھوں نے اپنا رنگ خود پیدا کیا، خود ہی اس پر چلا کیے اور اپنے ہی پر اس کو ختم کر دیا۔ شاعری میں وہ کسی کے شاگرد نہ تھے۔ طبیعت کے زور نے انھیں شاعر بنایا تھا۔ فطرت نے اُن کے ذوق کی تربیت کی تھی اور حقیقت شناسی نے انھیں مکمل کر دیا تھا۔ اپنے طرزِ سخن میں وہ کسی کے پیرو یا مقلد نہ تھے۔ چونکہ انگریزی سے محض ناواقف تھے اس لئے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے مغربی شعر کا تتبع کیا۔ مجبوراً یہی کہنا پڑتا ہے کہ استادِ ازل نے انھیں خود ہی سبق پڑھا کر آمادہ کیا تھا۔ جو رنگ ان میں ذاتی طور پر نمایاں تھا وہ مصورِ حقیقی ہی نے اُن میں بھرا تھا۔ عمر کا بہت ابتدائی حصہ تو حیرت و استعجاب میں گزرا لیکن جب مناسب وقت آیا تو حجاب کے پردے ان کی آنکھوں سے اٹھنے لگے۔ رموزِ فطرت و دقائقِ شعری ان پر روشن ہونے لگے۔ اب ان کی داخلی قوتوں نے جو ان کو ازل میں ودیعت کی گئی تھیں انھیں مجبور کیا کہ وہ بھی اپنی آنکھیں پوری پوری کھول دیں۔ جو دیکھیں وہی محسوس کریں اور جو محسوس کریں وہی زبان پر لائیں۔ جو زبان پر لائیں وہی عقیدہ رکھیں اور اس عقیدہ کو اربابِ نگاہ کی ہدایت اور معلومات کے لئے بے تکلف سامنے کھینچ دیں۔ نظیر کی بدنامی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ فرسودہ راستے سے بہت کترا کے چلے۔ لوگ جس کو صراطِ مستقیم سمجھے ہوئے تھے انھوں نے اسے ٹیڑھا راستہ تصور کیا اور ملک کے مذاق پر زبردست نکتہ چینی کی۔ اپنے غلط راہوں سے معاملت کرنی نہ چاہی بلکہ شاعر کا پیغمبرانہ فرض اپنے ذمہ لیا کہ غلط راہوں پر جو ہیں وہ حقیقی راہوں پر آئیں۔ ملک کے مصنوعی طرزِ سخن کو وہ نہ صرف ناپسند ہی نہ کرتے تھے بلکہ ناپسند کرنے پر مجبور تھے۔ قدیم مذاق کا جامہ تنگ اب بہت تنگ ہو چلا تھا۔ نظیر کی بلند پرواز وسیع تخیل اس میں نہ سما سکتی تھی۔ ان کی طبیعت کا متواتر تقاضا تھا کہ وہ ان خود ساختہ بندشوں سے رہا ہو کر آزادی کی وسعتوں میں پرواز کریں اور فطرت کے صاف شفاف منظروں میں مشغول ہو جائیں۔ ادھر انھیں پرانی عادت کھینچتی تھی ادھر فطرت اپنی طرف۔ کچھ دنوں تک تو یہ کشمکش رہی لیکن طبیعت کا فطری زور غالب آ گیا معلوم ہوا [illegible] شعر کا [illegible] آزادی نے ان تمام مصنوعی بندشوں کو توڑ دیا۔ پھر تخیل کو بالکل آزاد کر دیا [illegible] فطرت کی [illegible]

نظیر کا آرٹ نظیر کی شاعری میں عظیم الشان خودداری اور احساس بشریت کی ایسی جھلک پائی جاتی ہے جو بیباکانہ جذبات اور دل کی پُرغضب تحریکوں کی ترویج کے لئے "موزوں ہے اور ان کے کلام کو شریفانہ حسین، اور موثر خیالات کے اظہار کا لاثانی ذریعہ بناتی ہے۔ یہ اثر کچھ تو سعدی اور دیگر قدیم اساتذہ کے دانستہ اتباع سے پیدا ہوتا ہے اور کچھ سطحی خیالات سے احتراز کرنے سے۔ دنیا کے تماشوں کو محض تماشا سمجھنا اور دنیا کی دلچسپیوں میں شامل ہو کر اُن کی بُرائیوں سے علیحدہ رہنے سے کلام میں ایک وقار پیدا ہو گیا ہے جو علوئے تخئیل سے متحد ہو کر دلوں پر نہایت گہرا اثر ڈالتا ہے۔ نظیر کی نادر خصوصیت شاعری بالکل نمایاں ہے اور بہت آسانی سے پہچانی جا سکتی ہے۔ یہ خصوصیت اُن کا خلوص اور غیر متنازعہ فیہ حقیقت پسندی ہے۔ نظیر کے تخئیل اور حیات میں افسانوی مسرت والم، بے معنی اثر پزیری، اور نمائشی نفاست نہیں۔ وہ ہمارے سامنے جس جذبے کی کیفیت پیش کرتے ہیں اس کی برقی رو پہلے اُن کے ذی حیات قلب میں دوڑ چکتی ہے۔ نصیحتوں کی اُن کے کلام میں بڑی کثرت ہے لیکن وہ کسی ایسی بات کی تلقین نہیں کرتے جو پہلے خود ان کی رہنمائی نہیں کر چکی وہ جو کچھ لکھتے ہیں سماعی شہادت کی بنیاد پر نہیں بلکہ عینی مشاہدے اور ذاتی تجربے کی بنا پر۔ وہ اُن مناظر معاشرت کا نقشہ کھینچتے ہیں جن کے درمیان رہ کر انھوں نے زندگی کے رموز پر غور کیا ہے اور جن نے ان کی روح کو حسین جذبات، پاکیزہ خیالات اور مستحکم ارادوں کا مستقل نشیمن بنا دیا ہے۔ اُن کے جذبات کسی ذاتی مقصد یا نمائش کی خاطر ظاہر نہیں ہوتے بلکہ اس لئے ابل پڑتے ہیں کہ اُن کا رقیق دل اُن کے ضبط پر قادر نہیں۔ اپنے جذبات کے اظہار میں وہ پورا پورا ترنم صرف کرتے ہیں۔ زبان اگرچہ کبھی کبھی بازاری ہو جاتی ہے لیکن کبھی صحت اور حقیقت سے معرا نہیں ہوتی۔ خلوص کے علاوہ اُن میں ایک اور کمال ہے جس کا اظہار انتخاب عنوان میں ہوتا ہے۔ نہیں بلکہ یوں کہنا زیادہ درست ہے کہ کمال کا اظہار عنوان سے بے پرواہ رہنے میں ہوتا ہے۔ نظیر ہر عنوان کو دلچسپ بنا دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔ معمولی شاعر معمولی انسان کی طرح ہمیشہ بیرونی واقعات سے اُس مدد کا طالب رہتا ہے جو اس کو صرف اپنے باطن سے مل سکتی ہے۔ نظیر میں یہ کمال ہے کہ وہ ادنیٰ باتوں، گھریلو واقعات اور سادہ مناظر سے وہ کیفیات اور مطالب پیدا کر لیتے ہیں جو معمولی شعرا دقیق مسائل سے بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ نوعی ہمدردی کے ساتھ رواداری اور

رواداری کے پہلو بہ پہلو مذہبی بے تعصبی نظیر کے کلام کا وہ وصف زریں ہے جو ہندوستانی شعرائے متقدمین میں عموماً ناپید ہے۔ یہ جوہر سرزمین ہندوستان کے اس مغنی کے کلام دل فریبی میں فائق ترین عنصر ہے۔ خوش دلی و زندہ دلی کے باوصف رکاکت اور ابتذال نظیر کے کلام سے چھو کر نہیں نکلے۔ ارسطائی جمالیاتی فلسفہ کے نزدیک آرٹ کی تکمیل اور محاکات کی مترادف ہے جو جذبہ اثر موجود ہے۔ لیکن اس کی غایت صرف اظہار واقعہ ہے کسی قسم کا تنقید یا استکراہ مقصود نہیں جس طرح ایک نقاد کسی تصویر پر تنقید کرتے ہوئے جہاں اس کے محاسن کا ذکر کرتا ہے وہاں اس کے معائب کا بھی ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا اسی طرح نظیر جب معاشرت کا سماں کھینچتے ہیں تو خوبیوں کے ساتھ عیبوں پر بھی لامحالہ ان کی نگاہ پڑتی ہے۔ چونکہ وہ ایک صاف گو اور ایماندار مصور ہیں اس لئے وہ معائب کو بھی اسی آزادی کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں جتنا دوسری خوبیوں کو لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کو دکھاتے ہوئے وہ ایک پوشیدہ درد ایک غیر محسوس شرمندگی محسوس نہیں کرتے جب وہ اپنی جنس کو شرمناک حرکتوں میں مبتلا دیکھتے ہیں تو ان کی فطری غیرت کو صدمہ پہنچتا ہے۔ لیکن فوراً ہی ان کی انسانی شرافت جوش میں آتی ہے اور ترحم غم اور غصہ ہمدردی اور حمایت میں مبدل ہو جاتا ہے۔

نظیر نے اپنے روانی دار اور پرنور خیالات کو ادب قدیم کے پرسکون آئینہ کا جامہ پہنایا ہے جس سے راحت اور انبساط کی ذی حیات کیفیت طاری ہوتی ہے اور کچھ لمحوں کے لئے دنیا کا تمام غم و الم فراموش ہو جاتا ہے۔ بیان کا تسلسل ترکیب کی دلکشی، بحر کا ترنم، ناگزیر الفاظ کا تجانس ان کے اسلوب کی خصوصیات ہیں۔ دقیقہ رسی نظر و صداقت شعار مصور کی حیثیت سے نظیر کا کوئی مدمقابل نہیں۔ دقیق النظری کے ساتھ ساتھ قدرتی مسلمات کا ایک عامیانہ ذوق بھی ان کی فطرت میں شامل ہے جو ان کی تمثیلوں تشبیہوں اور استعاروں کو جو مناظر قدرت سے اخذ کئے جاتے ہیں دوگنا موثر بنا دیتا ہے اور جب ان پر کلام کی لذت بخش موسیقیت و شیرینی اصوات سے معانی پیدا کرنے کی قوت کا بھی اضافہ کر دیا جاتا ہے تو پھر نظیر کی حیرت انگیز دلفریبی و دل نوازی کا راز منکشف ہونے لگتا ہے۔

(نظیر کا موضوع انسان اور انسان کی معاشرت ہے۔ یہی وجہ ہے [illegible] ان کے نزدیک [illegible] اہمیت ہے اور [illegible] کی متعلق دلچسپی کا باعث ہے اس لئے [illegible]

اور ہر مقام پر اس کے ساتھ رہتے اور اس کی ہر قسم کی حرکات و سکنات سے بخوبی واقف ہو کر اس کو دنیا کے جملہ نشیب فراز سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

انسان کا کوئی فعل ان میں نفرت و امتلاک کے جذبات پیدا نہیں کرتا۔ ایک طرف تو وہ انسان کو جرم و خطا کا پتلا اور قدم قدم پر بہک جانے والا سمجھتے ہیں، دوسری طرف وہ دنیا کی رنگا رنگیوں اور نظر فریبیوں سے خوب واقف ہیں۔ اس لئے وہ اپنے موجب ہمدردی کی خطاؤں اور غلطیوں کو لائق سرزنش خیال نہیں کرتے، بلکہ اس کی کمزوریوں کو سمجھ کر اس پر رحم کھاتے ہیں۔ اس کو جملہ آلودگیوں سے نکال کر حقیقت کا صحیح راستہ دکھانا چاہتے ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ دنیا کے لئے ایک پر امن و سکون زندگی اور وسیلۂ نجات بہم کریں۔ وہ اپنے کو اسی خدمت پر مامور سمجھتے ہیں اور یہی کام انجام دینے کے لئے ہم اُن کو ہر صحبت، ہر شغل، ہر مجمع میں دیکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ انسان کی ہر دلچسپی میں دلچسپی لیتے اور معاشرت کے ہر رنگ میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ اس پر لطف یہ ہے کہ جس آزادی کے ساتھ وہ اعلیٰ مجلسوں میں حصہ لیتے ہیں اسی بے باکی کے ساتھ ادنیٰ طبقوں میں نشست و برخاست کرتے ہیں۔ وہ صرف انسان اور اُس کی معاشرت پر فدا ہیں اور اس کے بہبود و فلاح کی فکر میں ہر وقت غرق رہتے ہیں۔ وہ غالباً نیک و بد، اعلیٰ و ادنیٰ کے فرق کے قائل نہیں۔ ہر چیز ان کے نزدیک ایک ہے۔ وہ وحدت کو ہر شے میں دیکھتے ہیں اور اُسی کے گیت جا بجا گاتے پھرتے ہیں۔

یہ ایسا کیوں ہے؟

معشوق کی تذکیر دورِ قدیم کے اردو شعرا نے مرد کو اپنا معشوق گردان کر اسی جنس کر رخت پر تمام نازک خیالیاں صرف کی ہیں اور اسی کو اپنے جذبات محبت و یگانگت، درد و خلش، سوز و گداز کا مرکز قرار دیا ہے۔ کلام میں جا بجا مذکر کی ضمیر استعمال کی گئی ہے جس کی وجہ سے گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ تخاطب عورت کی طرف ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فارسی شعرا کا غیر محسوس اثر ہے جو اب تک دلوں پر اسی قدر گہرائی کے ساتھ قائم ہے۔ ایرانی ادبیات کا اضطراری اتباع اور اس کے ساتھ بھاشا کی شاعری کی عدم واقفیت بھی بہت کچھ اس فاش ادبی غلطی کی ذمہ دار ہے۔ فطری ماحول میں غیر فطری وجود کا ذہنی ورود بدنمائی پیدا کرنے اور شعر کی نزاکت و نفاست زائل کر دینے کے علاوہ فی نفسہٖ نہایت مذموم ہے۔ اس نوع کے تخئیل کا

نقل کنندہ شخص کا ایسا کرنا وہ بار دماغ پر ڈالتا ہے جس کی گرانی شعر کے لطیف اجزا پر غالب آکر اس کی مسرت آفریں کیفیت محسوس نہیں ہونے دیتی۔ نظیر کی شاعری ہر قسم کے تصنع و جدید غیر فطری آرائش سے مبرا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا عام عیب ہے جس سے ان کا دامن عصمت بھی بالکل پاک نہ رہا۔ مثلاً نظیر نے جگہ جگہ عورت سے خطاب کیا ہے، اور ضمیر و افعال دونوں مؤنث استعمال کئے ہیں لیکن کہیں کہیں [مرد] معشوق سے بھی خطاب ہے اور ضمیر مذکر ہے۔ بہرحال ان کے یہاں اس عیب کا جزوی وجود بھی نہایت تعجب خیز ہے۔ یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ ان کی فطرت پسند طبیعت نے اس امر کو کیونکر جائز رکھا۔ وہ جانتے زبان کے بہت بڑے ماہر اور اس کی شاعری کے بڑے ماہر تھے۔ اس کے علاوہ یہ بات ان کی حقیقی اور اصلی فطرت پرستی کے بھی منافی ہے۔ غالباً ملک کے مذاق کی رعایت اور شعرا کی روشِ عام کی مطابقت نے ان سے ایسا کرایا۔ پہلے ہی وہ وقت سے دیرینہ قیود اور قدیم بندشیں توڑ چکے تھے اگر اس قانون کی بھی بالکل خلاف ورزی کرتے تو نامعلوم اور کتنے متہم کئے جاتے۔ غالباً یہی وجہ اس کی پابندی کی ہو سکتی ہے۔ مگر ان کی آزادیاں دیکھتے ہوئے یہی کہنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی طبیعت کو کسی پابندی کا تحت دیکھنا نہ چاہتے تھے۔ پھر اپنے مزاج کے خلاف انھوں نے اس رکاکت کو کیونکر جائز رکھا۔ یہ نکتہ نظیر کی شاعری کا ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ بہرحال اس فروگذاشت کے ارتکاب کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ عمداً یا سہواً کسی کے تتبع میں یا بطور خود جس وجہ سے بھی یہ عیب کلام میں موجود ہے اور بہرحالت میں خود نظیر اس کے ذمہ دار ہیں۔

خالص ہندوستانی شاعر |نظیر| حقیقت میں ہندوستانی شاعر ہیں وہ ہندوستان کے باشندے ہیں وہ ہندی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ انھوں نے کبھی اپنے ولایتی ہونے کا دعویٰ کر کے لوگوں پر غلط اثر ڈالنا یا ان کو مرعوب کرنا نہیں چاہا۔ قطعی ہندوستانی افکار جو ہندیوں کے رگ و ریشے میں سرشت ہیں وہ سب ان میں موجود تھے۔ نظیر کی مادری زبان اردو ہے اور اسی زبان کو انھوں نے اپنے اظہار خیال کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ نہ اس وجہ سے کہ وہ اردو کے سوا کوئی زبان جانتے ہی نہ تھے بلکہ اس لئے کہ فطرت کا وہ تقاضا یہ تھا۔ وہ پیغام [illegible] ہندوستانیوں کو پہنچانا تھا۔ [illegible] زبان [illegible] تھی [illegible] تھی۔ وہ زبان [illegible] فارسی [illegible] ان [illegible] تھی۔ [illegible]

ہندوستانی ہے جس میں بھاشا اور اردو دونوں کے معمولی معمولی الفاظ شامل تھے۔ فارسی میں بھی نظیر کا کلام نظم و نثر موجود ہے لیکن وہ اردو کلام کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ صرف ذاتی تفریح اور اپنی خاص صحبت کے ارباب علم کی ضیافت طبع کے لئے تھا۔ عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کو وہ بدیشی زبانیں سمجھتے تھے اس لئے ان پر انحصار کرنا اور اُن سے زیادہ مدد لینا انھیں گوارا نہ تھا۔ ان دونوں زبانوں کے ثقیل الفاظ کے استعمال سے بھی وہ اجتناب کرتے تھے بلکہ حُب وطن یہاں تک مجبور کرتی تھی کہ زیادہ تر بھاشا کے الفاظ کی ترویج اُردو میں کریں اور اس طرح انھیں مانوس بنائیں۔ جذبات و محسوسات کے لحاظ سے بھی نظیر قطعی ہندوستانی شاعر ہیں۔ ہندوستان کے دریا، ہندوستان کے پہاڑ، ہندوستان کے مناظر انھیں بہت گرویدہ کرتے اور ان کی دلچسپی کا سبب ہیں۔ وہ خیالی مناظر سے لطف اندوز نہیں ہوتے، خیالی بہار کا سماں نہیں کھینچتے بلکہ ہندوستان کی برسات کی بہاریں اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور انھیں نظم کرتے ہیں۔ اُن کی تشبیہیں اُن کے استعارے، ہندوستانی مناظر قدرت کی چیزیں ہیں اور ان کی مثالیں ہندوستانی زندگی پر مبنی ہوتی ہیں۔ عرب کے خانہ بدوش بدوی کی پُر حرب زندگی اُن کے لئے کوئی جاذبیت نہیں رکھتی مگر ہندوستان کا امن کوش صحرا نورد، بنجارہ اُن کے دل پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ وہ اس کی معاشرت سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کی تمثیل سے فوراً اپنی اعلیٰ ترین تخئیل کے لئے لباس تیار کر لیتے ہیں۔ ایرانی بادشاہوں کی عظمت و شان کے افسانے شعرا کے کلام میں عام طور پر مذکور ہیں لیکن نظیر کے قلب پر اکبر کی پُرشکوہ زندگی اور ہندوستان کے دیگر جلیل القدر سلاطین کی شوکت و جبروت کا نقش مرتسم ہے۔ دارا و سکندر، جمشید و فریدوں کا ذکر کرتے ہوئے انھیں اپنے ملک کا عظیم الشان شہنشاہ اکبر فوراً یاد آجاتا ہے اور اس کی تلمیح وہ اپنے کلام میں قائم کر لیتے ہیں۔ ایران و عرب، بابل و نینوا اور دیگر قدیم ممالک کے مشہور مقامات، ہندوستانی شعرا کے نوک زبان سہی مگر نظیر اپنے وطن کے تاریخی مقامات کا رتبہ کسی طرح، چاہ بابل اور دیوار چین سے کم نہیں سمجھتے۔ وہ ہانسی حصار، چتوڑ گڈھ، کالنجر کا ذکر کر کے سلف کے فراموش شدہ کارناموں کی یاد تازہ کرنا چاہتے ہیں۔

ذہنی گلستاں اور خیالی چمن ان کے لئے کوئی وقعت نہیں رکھتے کیونکہ اس قسم کی ہزاروں چیزیں ان کے دماغ میں موجود ہیں۔ وہ ہمیں ہندوستان کے باغوں کی سیر کرانا چاہتے اور وہاں کے ہر پھول کی خوشبو سے ہمیں مانوس کرنا چاہتے

ہیں۔ بلبل ہندوستان کی سرزمین میں ناپید ہے۔ اس لئے نظیر کو اس کی نیاتی ہزار داستانی میں کوئی واقعی دلچسپی نہیں پیدا ہوتی۔ ڈھیچر کی لرزاں آہیں، کوئل کی دردبھری کوک، پپیہے کی پیہم نالہ و زاری، پی کہاں پی کہاں کی پُر الم صدائیں وہ اپنے کانوں سے سنتے ہیں اس لئے ان کی غمخواری پر آمادہ ہیں۔ لال، بیئے، مینا، طوطی، کبک اور مور کے دلکش نغمے ان کے فطری ترنم کو متحرک کرتے ہیں اور وہ ان کی مسرتوں میں حصہ لینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ان کی بازی و اشغال کے طور سارے ہندوستانی ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں وہ نظیر کو طرح طرح سے بھاتے ہیں اور شعر کہتے وقت تخیل میں وہ تشبیہیں بن کر ان کے سامنے آحاضر ہوتے ہیں۔ ہندوستانی پھولوں کی عطر بیز پتیاں ان کے دماغ کو ہر وقت معطر رکھتی ہیں۔ ان ہی کی نظارہ خوش رنگیاں ان کی نگاہوں کو ہر لحظہ بشاش و خنداں رکھتی ہیں۔ راء بیل، سیوتی، بیلا، چنبیلی کی بھینی بھینی خوشبوئیں، چمپے کی مست نکہتیں، گلاب کے قرابے ہر وقت ان کے لئے وقف ہیں۔ ان ہی کنجوں میں متمکن ہو کر مبدا سے فیض سے وہ اپنا الہام حاصل کرتے ہیں اور اہل ذوق کی تفریح کے لئے وہ اس کو نغموں کی شکل میں منتشر کرنے کے لئے شعر کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ جاڑا، گرمی، برسات خاص ہندوستان کے موسم ہیں اس لئے ان کو عزیز ہیں۔ اور اس کی اہمیت صرف ہندوستان میں ہوتی ہے اس لئے وہ اس کا ذکر اپنے ملک کی خصوصیت مان کر سمجھتے ہیں۔ بسنت ہندوستان کا موسمی تیوہار ہے اس لئے انھیں مرغوب ہے۔ کورا برتن خاص ہندوستان کی مٹی کا بنا ہوا ہے اس لئے وہ اس کی سوندھ پر فدا ہیں۔ کورے برتن میں گنگا کا پانی پینا انھیں آب حیات سے زیادہ خوش گوار ہے۔ اسی لئے وہ اس کو جام جمشید پر ترجیح دیتے ہیں۔

معاشرت نگاری: نظیر کا کلام ان کے زمانے کی معاشرت کے ہر پہلو سے متعلق ہے۔ مغربی تمدن نے ہمارے ہندوستانی طرز زندگی میں بڑا تغیر پیدا کر دیا ہے۔ نشست و برخاست کے قوانین، اکل و شرب کے طریقے، رفتار و گفتار کے انداز، باہمدگر تعلقات و موانست کے قواعد، آداب مجلس غرض ہر قسم کے معاشرتی معاملات پر گہرا اثر پڑا ہے اور ان میں پیشتر کی بہ نسبت اب بہت بڑا اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے اس زمانے میں ہندوستان کی معاشرت ایک مخلوط شے ہے جس سے قدیم طرز زندگی کا بمشکل صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ قدیم صحبتیں اور ان کے رونق دینے والے تو اب کہاں میسر ہیں ان کا

ذکرِ خیر افسانۂ یارانِ کہن کی طرح کتب سیر یا قدیم اساتذہ کے کلام میں ضرور دستیاب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ نظیر کا کلام اسی قبیل کی شاعری ہے جس سے قدیم معاشرت کے ازیادرفتہ حالات مستنبط کئے جا سکتے ہیں۔ اُن کے کلام میں خالص ہندوستانی معاشرت کا تذکرہ ہے اور کسی نہ کسی پہلو سے معاشرت کے ہر شعبے پر کچھ نہ کچھ روشنی ضرور ڈالی گئی ہے۔ نظیر کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ممکن ہے کوئی شخص یہ خیال کرلے کہ نظیر سے صرف مسلمانوں کی قدیم معاشرت کا حال معلوم ہوگا۔ ایسا سمجھنا غلطی ہے۔ وہ ہندوؤں کی معاشرت کے بھی اتنے ہی بڑے ماہر ہیں جتنے مسلمانوں کے، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ہندو شعرا میں ایسے بہت کم نکلیں گے جو ہندو معاشرت دانی میں نظیر کا مقابلہ کر سکیں۔ اُن کی نگاہ کی وسعت انھیں ہر طبقے کی حالت سے بخوبی واقف رکھتی ہے۔ کچھ ہندو مسلمانوں ہی پر منحصر نہیں ہندوستان کی ہر قوم کی معاشرت کا ان کو یکساں علم و تجربہ ہے۔ اُمرا کے طریقِ زندگی اُن کے روزمرہ کے مشاغل، اُن کی دلچسپیوں اور تفریحوں کے اسباب، متوسط طبقے کی طرزِ معاشرت، غربا کے عادات و اطوار، عام شہریوں کے لہو و لعب، شہر کے مختلف پیشہ وروں کے چال چلن، ہنود کے تیوہار، مسلم اور ہندو خواتین کے رسم و رواج، خانگی زندگی کی کیفیت، صوفی اور فقرا کے خصائل، آزادوں، بدمعاشوں، تماش بینوں کی بدوضعی، پھکڑوں کی عریانی، میلے ٹھیلوں کی رنگ رلیاں، ان کے علاوہ اور بہت سی باتیں، غرض معاشرت کے جتنے کوائف ہیں سب کا کچھ نہ کچھ ذکر ان کے یہاں موجود ہے۔ پرانے زمانے کے رسوم میں بہت سے ایسے ہیں جن کے جاننے والے اب تک موجود ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جن کا چرچا صرف ادنیٰ یا بہت ذلیل طبقے میں ہے، شریفوں میں ان کا رواج ترک ہو چکا ہے، لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جن کا عامل اب کوئی نہیں بلکہ ان کے جاننے والے بھی ناپید ہو چکے۔ بعض رسوم اب قطعی مفقود ہو چکے ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہیں جن کی صرف صورت بدل گئی ہے۔ پہلے وہ کچھ تھے اور اب امتدادِ زمانہ سے بدل بدلا کر کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں مگر بہ صورت مبدّل قائم اور جاری ہیں۔ بہرحال نظیر کے کلام سے ہر رواج کا سراغ بخوبی لگ سکتا ہے اور اگر کوئی شخص چھان بین پر آمادہ ہو تو تمام رسوم و رواج کو ان کی اصلی ہیئت میں دیکھ سکتا ہے۔ معاشرت کے مورخ کے لئے نظیر کا کلام نہایت بار آور مرکزِ تلاش و جستجو ہے۔ تمدن کی تاریخ کی ترتیب و تدوین کے لئے نظیر کے کلام سے نہایت پُر معنی اور نتیجہ خیز معلومات حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

حاکیانہ انداز| اردو زبان کے شعرا نے عام طور پر غزلیں زیادہ کہیں اور جہاں تک ممکن ہوا اس طرزِ سخن کو روز بروز ترقی دینے کی کوشش کی۔ طرح طرح کے مضامین پیدا کئے، بندشوں میں جدت پیدا کی، طرزِ ادا کے انوکھے ڈھنگ نکالے۔ ان باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عمقِ تخیل کے ساتھ الفاظ میں شستگی اور دلفریبی پیدا ہوتی گئی مگر شاعری پر رنگِ تغزل غالب رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج عاشقانہ جذبات سے تو اردو شاعری اس قدر مالا مال نظر آتی ہے لیکن اساتذہ کے کلام میں بیانیہ کلام کا سرے سے پتہ ہی نہیں۔ شعرائے متقدمین تغزل میں اس قدر منہمک رہے کہ اس طرف کبھی کسی نے توجہ ہی نہ کی۔ ہاں کسی کسی نے مثنویاں لکھ کر بیانیہ طرزِ سخن کا کچھ کچھ حق ادا کیا ہے۔ لیکن مثنویوں میں بھی عشق و محبت، ہجر و وصل، سوز و گداز کا عنصر اس قدر زیادتی کے ساتھ موجود ہے کہ مثنوی کا منشائے صحیح [illegible] میں خلط ملط ہو کر ایک حد تک مفقود سا ہو جاتا ہے۔ بہر حال واقعہ نگاری کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اساتذہ میں نظیر ہی ایک شخص ہے جس نے اس نوع کے انداز میں خامہ فرسائی کی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے کلام میں بیشتر حصہ بیانیہ نظموں ہی کا ہے۔ نظیر اس طرز خاص کے شیدائی ہی نہ تھے بلکہ اس کے بڑے ماہر بھی تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ موجد اپنی ایجاد کو تکمیل پر نہیں پہنچا سکتا بلکہ متاخرین اس کی کمی اور کوتاہیوں کو پورا کیا کرتے ہیں۔ نظیر کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا۔ انھوں نے بیانیہ طرزِ سخن کو اردو میں خود ہی پیدا کیا اور خود ہی اس کی تکمیل بھی کر دی۔ انھیں معاملہ بندی اور واقعات نظم کرنے کا بڑا ملکہ تھا۔ میلوں کی کیفیتیں، ہندو مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی تقریبوں کو جہاں بیان کیا ہے تو معمولی سی معمولی تفصیل بھی نظر انداز نہیں کی۔ جس جگہ فصل کی دلچسپیوں اور موسم کی دلفریبیوں کا نقشہ کھینچا ہے وہاں شاعرانہ رنگ آمیزی کے ساتھ اصلیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ہر شعبے کی ادنیٰ ادنیٰ چیز بیان کی خاطر [illegible] اس کو بیان کر دینے سے ان کے کلام کی زینت دوبالا ہوتی ہے۔ برسات کے موسم میں [illegible] [illegible] سے پیدا ہو جاتے ہیں وہ بھی ان کی باریک بین نظر سے نہیں بچتے۔ [illegible] [illegible] کی تفصیلات کی بیان کر ڈالتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی [illegible] [illegible] اور بیان میں کتنی وسعت ہے۔ [illegible] کی [illegible] کے لئے [illegible] [illegible]

کی نگاہ عادی ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کو اپنے کلام پر بھی قدرت ہو۔ اگر یہ دونوں چیزیں موجود ہوں تو بہترین مرقع بن سکتا ہے۔ نظیرؔ میں یہ دونوں خصوصیتیں کمال کے ساتھ موجود تھیں۔ واقعات و احوال عالم کی بصیرت و واقفیت کے علاوہ وہ زبان پر پورا عبور اور محاوروں پر بڑا تجربہ رکھتے تھے۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ تخئیل کی رنگینی اور بیان کی سلاست و روانی ان کے مرقع پر رنگ تکمیل کا کام کرتی ہیں۔ اس پر نظم کی برجستگی و بیساختگی، ادائے مطالب کی سہولت و بےتکانی، کلام کی زیب و زینت پر اور چار چاند لگا دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جس قدر تصویریں کھینچی ہیں وہ ہر لحاظ سے مکمل اور ہر عنوان سے نظر فریب ہیں، جن میں خد و خال کے اعتبار سے اصل اور نقل کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ قوت بیان اور صورت گری میں نظیرؔ انیسؔ کے ہم پلہ ہیں۔ یہ مملکت انہی دونوں تخنوروں کے درمیان بٹی ہوئی ہے۔ قادر الکلامی کی وجہ سے، بیان میں جو شیرینی و فصاحت ہے وہ حسن شعری کو اور افزوں کر دیتی ہے۔ ٹیگور کی نظموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ایک خیال کو بار بار دہرایا جاتا ہے۔ یہ التزام نظیرؔ کے کلام میں عام طور پر موجود ہے۔ مسدسوں اور مخمسوں کے آخری مصرعوں کا ہر بند میں اعادہ شعر کے اثر کو بڑھاتا اور ایک قسم کا دل گداز ترنم پیدا کرتا ہے جس کا لطف صرف بار بار پڑھنے سے ہی آ سکتا ہے۔

اخلاقی پہلو | نظیرؔ کی قوت بیان دکھا کر اب اُن کا کلام اخلاقی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں شاعرانہ ذوق و طبیعت نے غیر معمولی بیباکی اختیار کر لی ہے۔ اُن کا مطالعہ بلاشبہ سنجیدہ طبائع کو شاق گزرتا ہے لیکن اس کراہت و گرانی سے قطع نظر، کلیات نظیرؔ میں بہت بڑا اجزو ایسا ہے جو متین خیالات، سنجیدہ جذبات اور پاکیزہ نظریات سے مملو ہے۔ میرے پیش نظر اس وقت صرف یہی حصہ ہے اور اس تحت میں صرف اسی سے بحث کی جائے گی۔ نظیرؔ کے اخلاق کا سب سے زیادہ تاباں جوہر اُن کی بےتعصبی ہے (اگر وہ کسی جگہ اسلامی معاشرت کے کسی صیغہ پر روشنی ڈالتے ہیں تو دوسری جگہ فوراً ہی ہندو سوسائٹی کے ہم رتبہ و ہم رنگ شعبے کا تذکرہ اسی حیثیت سے اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک مصرعے میں مسجد کا ذکر ہے تو دوسرے میں مندر کا ذکر لازمی ہے) جس طرح کسی منطقی قیاس میں کبریٰ کے بعد صغریٰ کا وجود اخذ نتیجہ کے لئے ضروری ہے، اسی طرح نظیرؔ کے یہاں درود مثال

اور صوفیوں کی حالت رقم ہونے کے بعد ہندو جوگی اور تیاگی کا بیان ناگزیر ضروریات اخلاقی میں سے ہے۔ نظیر نے دینی
شاعری میں ہندو مسلم جذبات کا ایسا نازک توازن قائم رکھا ہے جس پر مذہبی تفریق کا بڑے سے بڑا حامی اور بڑے سے
بڑا متعصب بھی اعتراض نہیں کر سکتا۔ یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ نظیر اپنے مذہب میں بڑے راسخ الاعتقاد تھے۔
ایسی صورت میں اتنی کامل رواداری اور ایسی خالص بے تعصبی دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے۔ بادی النظر میں دونوں امور
کے افراد کے لئے نظیر کے مطمح نظر کی یہ دوئی محال معلوم ہوتی ہے لیکن وحدت شناسوں کے لئے کچھ دشوار نہیں۔
کاش ملک میں نظیر جیسے دو چار شاعر اور پیدا ہو جاتے تو آج ہندوستان کو یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔

اب نظیر کے واعظانہ انداز کو لیجئے۔ نصیحت کرنے کے ہمیشہ دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک بالواسطہ دوسرا
بلاواسطہ۔ نظیر نے اپنے کلام میں ان دونوں طریقوں سے کام لیا ہے لیکن اول الذکر کا مصرف بہت زیادہ ہے۔ بلاواسطہ
نصیحت کا اثر سننے والے پر محض ایک نظرے کا سا ہوتا ہے۔ نہ اس کی یاد دیرپا ہوتی ہے نہ اس کا اثر قیام پذیر ہوتا ہے۔
لیکن بالواسطہ نصیحت ہمیشہ نہایت کارگر ثابت ہوتی ہے۔ نظیر نے زیادہ تر بالواسطہ نصائح سے کام لیا ہے۔ انسان کی
فطرت کا اقتضا ہے کہ جب کوئی بات ممنوع قرار دیدی جاتی ہے تو اس کی طرف طبیعت خواہ مخواہ زیادہ مائل ہوتی ہے
اور اس کی خیالی دلچسپیاں خواہ وہ فعل اُن سے قطعی معرا ہی کیوں نہ ہو طرح طرح سے دل لبھاتی اور استقلال پر
غالب آنے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن جب اسی چیز کا نقشہ اچھی طرح دکھا کر اس کے جملہ معائب کی تفصیل پیش نظر
کر کے اس سے احتراز کرنے کے لئے کہا جائے تو طبیعت فوراً قبول کر لیتی ہے۔ پس نظیر کو جب کسی معیوب شغل
زندگی یا مضمون معیشۂ معاشرت کی برائیوں سے متنبہ کرنا ہوتا ہے تو وہ سب سے پہلے اس فعل کا من و عن نقشہ کھینچتے
اور اس کی تمام ظاہری دلفریبیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جب اس کی سیمیائی نظر فریبیوں کی جملہ تفصیل کی تشریح کر چکتے ہیں تو
نہایت دلپذیر پیرایہ میں اس کے معائب کی مکمل تصویر پیش کر کے اس سے علیحدہ رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس طرح
پڑھنے والے کے دل پر ایسا مستقل نقش قائم ہو جاتا ہے جس کو کوئی شیطانی وسوسہ زائل نہیں کر سکتا۔ ذرا سے دو
دلچسپ سے نکتوں کے ذریعے سے نصیحت کرنے اور ذہن پر مستقل اثر ڈالنے کا جو طریقہ آپ نے [illegible]

رائج کیا ہے وہ صدیوں بیشتر اس ہندوستانی سخنور کے کلام میں مستعمل ہے۔ لقمان کی بابت مشہور ہے کہ وہ اپنے عارضی مالک کو نصیحت کرنے کے لئے مدت تک مناسب موقعے کا منتظر رہا۔ فصل کٹنے کا وقت اس کے نزدیک نصیحت کا بہترین محل تھا۔ اس نے پوری قوت سے اپنا فرض انجام دیا اور اس کی نصیحت نے بالیقین اپنا مستقل اثر چھوڑا۔ نظیر انسانی نفسیات کے ماہر ترین نباض تھے۔ وہ کبھی بے موقعہ نصیحت نہیں کرتے لیکن کسی موقعے کو ضائع بھی نہیں ہونے دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام کو مقبولیت اور ان کی موعظت کو پُر اثری کا فخر حاصل ہے۔ نظیر کے حکیمانہ پند و نصائح کی تفصیل تو کہاں تک دی جائے مگر نیک کرداری، خوش معاملگی، پاکبازی، خدا ترسی، اہمدردی، ایمان داری، وسعت اخلاق اور صداقت کی پُر تاکید تلقین، بخل، محبت زر، مکاّ ئدگری، دنیا پرستی اور لہو بازی کی ہجو، سخاوت، شجاعت، منکسر مزاجی اور خود داری کی تعریف، غرض ہر قسم کے مواعظ حسنہ جس جس اسلوب سے بیان کئے ہیں وہ اُن کا حصہ ہیں اور اُن کی اہمیت میں کسی کو مجال دم زدن نہیں۔

لوکل کلر یا مقامی رنگ | اُردو میں لوکل کلر یا مقامی رنگ کی آمیزش نظیر کے اولیات میں سے ہے۔ یہ وہ غیر منفک صفت ہے جو کلام کے ساتھ مستقل طور پر وابستہ ہوتی ہے۔ اس کا ایک لازمی خاصہ یہ ہے کہ کلام سے اس کی علیحدگی بہر نوع ناممکن ہوتی ہے۔ اگر کوئی لوکل کلر اپنے مقام سے جدا کر لیا جائے تو اثر و لطف زائل کر دینے کے ساتھ ساتھ اس کی غایت مقصد اصلی کو بھی فوت کر دے گی۔ یعنی جس نتیجے کی توقع کی جاتی ہے وہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہنا غالباً زیادہ درست ہوگا کہ لوکل کلر کی موجودگی میں نظم کی ساری بنیاد صرف اُسی پر قائم ہوتی ہے۔ نظم یا فسانہ جو کچھ بھی ہو وہ مقامی خصوصیات کے ساتھ اس طرح مخلوط ہوتا ہے کہ دوسرے ماحول میں اس کا وقوع محض ایک لایعنی سی بات ہو جاتی ہے۔ مثالاً نظیر کی "ہولی" پیش کی جا سکتی ہے۔ ہولی کا تہوار خاص ہندوستان کی سرزمین اور آب و ہوا سے وابستہ ہے، انگلستان یا عرب میں اس کا وقوع ناممکن ہے۔ وہاں کی موسمی کیفیات وہاں کے رسم و رواج اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اس لئے وہاں کے شعرا میں اس قسم کے جذبات ہرگز پیدا نہیں ہو سکتے۔ اُردو میں اس لطیف عنصر کا فقدان شاعری کے فطری شعبے میں بڑی ہزیمت ہے۔ قدیم اساتذہ کے کلام میں اس کا

استعمال قطعی نہیں لیکن نظیر کی شاعری اس الزام سے بری ہے۔ غالباً نظیر ہی ایسا شاعر ہے جس نے اپنے وطن کی خصوصیات کو شاعری میں داخل کیا ہے، دیکھئے :-

اس سیہ ابر میں یوں اڑتے ہیں بگلے جیسے — شب ناہید دسی میں دنداں کی ضیا
جگنو اس طرح چمکتے ہیں ہر اک وقت شام — ماتھے پر ہاتھی کے شنگرف ہے گویا چھوا
مور کا شور، فغاں غوک کی، جھینگر کی جھنکار — پی پی ہر آن پپیہے کی ہے کوئل کی صدا

سیہ ابر میں بگلے کا اڑنا، جگنو کی چمک، غوک کی فغاں، جھینگر کی جھنکار، پپیہے کی پی پی، سب ہندوستان کی مقامی دلفریبیاں ہیں۔ اس کے ساتھ کمال یہ ہے کہ جن چیزوں سے ان کو تشبیہ دی گئی ہے، مثلاً شب ناہید دسی، ہاتھی پر ہاتھی کے شنگرف، وہ بھی خالص ہندوستانی چیزیں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ صنعت کسبی یا اختیاری نہیں فطری اور حقیقی شاعری کا حصہ اور ناگزیر جزو طبیعت ہوتی ہے۔ اس لئے جو شخص جس مقام کا باشندہ ہے اور ذرا بھی صحیح حس شعری رکھتا ہے وہ وہاں کے مناظر اور مخصوص چیزوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر کسی شاعر کی نظر اپنے ملک کے امتیازات پر کسی نہ کسی عنوان سے نہیں پڑتی تو اس کے فطری شاعر ماننے میں کلام ہے۔ ظاہر ہے کہ نظیر نے کسی کے تتبع میں لوکل کلر اختیار نہیں کیا بلکہ یہ خیال ان کا طبع زاد تھا۔ اسی سے صاف ظاہر ہے کہ بعض صنائع شعری فطری ہوتے ہیں اور شعر سے ان کا تعلق ہوتا ہے کہ حسن طبیعت انھیں خود بخود پیدا کر لیتی ہے۔

امیجری یا تمثیل (لفظ امیجری یا تمثیل قریب قریب شاعری کا مترادف ہے۔ اس سے کہ شاعری خود ایک قسم کی لفظی واقفیت ہے جس میں پسندیدہ الفاظ کے ذریعے سے اصل و حقیقت کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ امیجری اور شاعری دونوں میں افکار مجرد وہیولانی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ اس طرح پہلی طرح تشبیہ ہے، اس طرح تمثیل یعنی استعارہ ہوتی ہے۔ امیجری مصنف کے مطالب، دلائل، اور خواہ انسانی یا مادی شکل میں ہوں، ان کو پڑھنے والے کے ادراک سے قریب تر کر دیتی ہے۔ اس طرح مفہوم کا تجزیہ کر کے ان خود قوت سے معنوی مطالب اخذ کرنے میں جو ذہنی کاوش

شامل ہوتی ہے وہ بھی فی نفسہ نہایت دل آویز اور پُر اثر بن جاتی ہے۔ ایلیگری میں قصہ اور معنوی مفہوم ایک دوسرے کے متقابل ہوتے ہیں لیکن یہ تو قریب قریب کبھی نہیں ہوتا کہ یہ تقابل جملہ مراتب میں مکمل ہو جائے۔ پس ایک مسلسل اور مطوّل ایلیگری میں ایلیگری عموماً افسانے پر غالب آکر اس کی دلچسپی کو زائل کر دیتی ہے۔ بہرحال اس وقت ایلیگری کی ماہیت اور اس کے تاریخی ارتقا پر بحث کرنی منظور نہیں۔ صرف اتنا دکھانا ہے کہ نظیر کے کلام میں یہ لطفِ ادب بھی موجود ہے اور لوکل کلر کی طرح یہ بھی ان ہی کا طبع زاد ہے۔ ایلیگری کا استعمال ہر قوم و ملت کے مذہبی اور آسمانی صحائف اور یونان و روما کے ادب قدیم اور دیگر ادب القدما میں بھی ہے لیکن اردو کے شعرا کو اس سے مس نہیں رہا۔ یوں تو تمثیلی نظمیں نظیر کے کلام میں متعدد ہیں لیکن بنجارہ نامہ، ہنس نامہ اور خواب خاص دلچسپی کی چیزیں ہیں۔ اول الذکر دو نظمیں تو بہت ہی عمیق اور بلند پایہ تمثیلیں ہیں۔ خواب میں کسی قدر رندانہ جھلک ہے تاہم اس میں بھی احوال دنیا کی فوری دگرگونی اور تماشا گاہ عالم کے سیمیائی جلووں کی بے ثباتی کا نقشہ نہایت لطیف اور شاعرانہ انداز میں کھینچا ہے۔

"بنجارہ نامہ" میں نہایت مؤثر پیرائے میں یہ دکھلایا ہے کہ انسان حرص و ہوا میں مبتلا ہو کر حصول زر کی خواہش کرتا ہے اور اسی مدعا کو پورا کرنے کے لئے طرح طرح کی کوششیں کرتا اور قسم قسم کی تکالیف و صعوبتیں برداشت کرتا ہے۔ اس عمل اور جد و جہد کے دوران میں وہ موت سے جس سے کسی حالت میں مفر نہیں بالکل بے خبر سا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ موت یکایک اس کو آ دباتی ہے اور اس کا تمام مال و جواہر، ساز و سامان، سیم و زر، عزیز و اقارب حتیٰ کہ اس کی اولاد بھی اس کے کام نہیں آسکتی۔ یہ نظم نہایت دلگداز پیرائے میں لکھی گئی ہے۔ اس پر لطف یہ ہے کہ اول سے آخر تک نظم میں ایک واعظانہ انداز ہے۔ تمثیل کے لئے بنجارے اور اس کی زندگی کا تلازمہ اختیار کیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے کہ بنجارے کی تمثیل اہل ہند کو نصیحت کرنے کے لئے ایک حکیمانہ تلاش ہے، بنجارے کا نام اور پیشہ کچھ ایسی رومانی اور پُر فسانہ چیزیں ہیں جن کا ذکر آتے ہی جد و جہد، سفر، بے سر و سامانی، عارضی قیام، اور خانہ بدوشی کے مصائب خود بخود سامنے آنے لگتے ہیں جن سے رحم کا جذبہ برانگیختہ ہوتا ہے اور جب ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتا دیا جائے کہ اس کی ساری کوششیں لاحاصل، جملہ مساعی بے سود ہیں، اس کی پیہم جد و جہد، مستقل سفر و بے سر و سامانی کا آخر میں

اُسے کوئی ثمرہ نہیں ملے گا تو دنیا کے تمام مشاغل اس کا انہماک ہیچ معلوم ہونے لگتا ہے۔

'' ہنس نامے میں طیور کا تلازمہ ہے۔ مختلف اقسام و متباین عادات و خصائل کے باشندگانِ عالم کو مختلف النسل طیور کا مترادف و ہم طریق قرار دیا ہے۔ اس نظم میں بھی مسلسل تمثیل ہے اور تمثیل کے جملہ مراتب فسانے کے ہم رتبہ مقامات پر حاوی ہیں۔ ظاہر ہے کہ سوسائٹی کے جملہ افراد کو باہم دگر انس و محبت ہو جاتی ہے بلکہ بعض اوقات تو یہ جذبات اس قدر ترقی کر جاتے ہیں کہ یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ بغیر ایک دوسرے کے دیکھے کوئی چارہ نہیں، بغیر زیست محال ہے۔ ہنس کی ہم جلیسی نے سارے طائروں میں یہی خیال پیدا کر دیا تھا کہ اس کی فرقت برداشت نہ ہو سکے گی۔ اس لئے سب نے اپنی اپنی ہمت کے موافق اس کی رفاقت کی کوشش کی لیکن سب تھک تھک کر رہ گئے۔

آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

اسی طرح انسان جب اپنے وطنِ حقیقی کی طرف مراجعت کرتا ہے تو اس کی اولاد، عزیز و اقارب، دوست احباب اس کی جدائی کے خیال سے اپنا برا حال کرتے ہیں، ورکم سے کم تھوڑی دیر کے لئے یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کاش ہم بھی اسی کے ساتھ چلے جاتے کہ یہ رنج دیکھنا نہ پڑتا۔ آخرکار ہر شخص اپنے تعلقات کے مطابق اس کے جنازے کو ایک خاص مقام تک پہنچا آتا ہے۔ کچھ لوگ نمازِ جنازہ پڑھ کر رخصت ہو آتے ہیں، کچھ قبرستان تک پہنچا کر چلے آتے ہیں، کچھ قبر میں اتار کر نکل آتے ہیں، کچھ دفن میں شامل ہو کر مٹی دے کر واپسی اختیار کرتے ہیں لیکن قبر میں کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ وہاں سے ہنس بچارا اکیلا ہی سدھارتا ہے۔ ہنس نامہ اول سے آخر تک نہایت عبرت انگیز نظم ہے۔ اس میں فریب محبت اور اس کے دل شکن نتائج کا جیسا پُر درد مرقع پیش کیا ہے وہ قطعی غیر فانی ہے۔''

ادب القدو [illegible] میاں نظیر کا [illegible] ادب [illegible] کے لئے ادب القدو کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادب قدیم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قدیم کے علاوہ سادہ اور رنگین بھی ہوتا ہے۔ اس میں الفاظ کی شان و شوکت کم ہوتی ہے مگر معانی کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ نظیر کے کلام کی بھی بڑی خوبی یہی ہے کہ اس میں صاف سیدھے سادے مفہوم مقصد میں نظم

کیے گئے ہیں۔ شعری آرائشوں مثلاً تشبیہ اور استعاروں کا اس حد تک لحاظ نہیں رکھا گیا کہ نفس مضمون پر ان کا کوئی اثر پڑے اور وہ ذہن سے بالکل مفقود ہی ہو جائے۔ حسن بیان اور طرز ادا سے وہ کام لیا ہے جو تلازمے اور تلمیح کی ٹھونس ٹھانس سے لیا جاتا ہے۔ اسی باعث معمولی معمولی تشبیہوں میں خاص لطف ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے اثر و نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ سادگی اور عدم تصنع کے ماسوا نظیر نے روایات پارینہ اور اساطیر قدیمہ کو جامۂ شعری پہنا کر اپنے جذبۂ قدامت پرستی کا بھی ثبوت دیا ہے۔ بھارت ورش کے ماقبل تاریخ واقعات اور ہندو علم الاصنام کے نیم مذہبی افسانوں اور حکایات کو جس خوبی اور حسن عقیدت سے نظم کیا ہے وہ کسی ہندو شاعر سے بھی ممکن نہیں ہوا۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ ہندو مذاق اور تہذیب کی جو چیزیں ہیں وہ خالص اسی قدیم رنگ اور ٹھیٹھ اسی زبان میں نظم کی گئی ہیں۔ نظیر نے صرف سادہ واقعات ہی کو نظم نہیں کر دیا بلکہ ایسی کامل مصوری کی ہے جس سے ہزاروں برس پیشتر کی ہندی معاشرت کا سماں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے میں اسلاف کی جس قدر تصویریں کھینچی ہیں وہ ساری ابھی تک اُسی آب و تاب کے ساتھ باقی ہیں۔ حاصل کلام نظیر کے کلام میں، سادگی، عریانی، پراثری، صداقت، ترنم غرض ادب قدیم کی جتنی نوعی خصوصیات ہیں سب موجود ہیں۔

شیکسپیئر
شیکسپیئر کی عظمت شاعری چونکہ مسلم الثبوت ہے اور چونکہ دنیائے مغرب میں وہ آسمان ادب کا روشن ترین ستارہ ہے اس لئے اُردو کے انگریزی خواں ناقدوں میں یہ ایک فیشن سا ہو گیا ہے کہ وہ اپنے موضوع تنقید شاعر کو شیکسپیئر کا مقابل قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نظیر میں ہر حیثیت سے شیکسپیئر کا ہم پلہ ہونے کی اہلیت ہے۔ اوّل یہ کہ گمنامی دونوں کی صفت مشترک ہے۔ جس طرح شیکسپیئر کی قدر دانی اس کی حیات میں نہ ہوئی اسی طرح میاں نظیر بھی اپنی زندگی میں زیادہ مشہور نہ ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں ہم اوصاف شعرا کے حالات و سوانح عمری اس قدر کم دستیاب ہوتے ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ شیکسپیئر زبان کا بڑا زبردست ماہر تھا تو نظیر کو بھی اپنی زبان پر بڑا عبور تھا۔ دونوں نے الفاظ کا استعمال اس کثرت سے کیا ہے کہ دونوں زبانوں کے کسی شاعر نے اتنا نہیں کیا۔ دونوں کو ہمہ دانی، ہمہ گیری، نفسیات اور معاشرت کے سمجھنے میں یدطولیٰ حاصل ہے۔

دونوں پر کچھ نگاہ اس نقطے سے ڈالتے ہیں تو اس کی خدمات ہی کی قدر اس کمال سے لکھی ہوئی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے شیکسپیر نے ڈرامے لکھے ہیں لیکن نظیر نے ڈرامے نہیں لکھے۔ ڈرامہ نویسی کے لئے اس کی بڑی ضرورت ہے کہ شاعر انسانی اطوار و عادات میں کامل بصیرت رکھتا ہو۔ نظیر کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان کے کردار کی ہر کنہ سے خوب واقف تھے اس لئے ان میں ڈرامہ نویسی کی قوت بدرجہ اتم موجود تھی۔ اگر وہ ڈرامہ لکھتے تو یقیناً ان کے کیرکٹر شیکسپیر کے کرداروں کا مثنیٰ ہوتے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ [illegible]
اردو میں ڈرامے کا رواج نہ ہونے کے دو وجوہ ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اہل ہند ڈرامے سے ناواقف تھے دوسرے یہ کہ اصناف سخن میں کوئی صنف ایسی نہ تھی جو ڈرامے کا پتہ ذرا بھی دے سکتی۔ اس لئے [illegible] موجودگی نے اردو میں ڈرامے کی ترقی نہ ہونے دی۔ اب اس شعبے میں تو کوششیں ہو رہی ہیں لیکن افسوس نے ابھی تک واضح صورت اختیار نہیں کی۔

تذکرہ و تاریخ کلام پر بحث کے دو طریقے ہیں۔ ایک طرف یہ ہے [illegible] شعرا کا کلیات تاریخ کے اعتبار سے مرتب کرتے ہیں۔ اردو میں تو سب سے تمام شعرا خود ہی اس کا خیال رکھتے ہیں لیکن جن [illegible] کے زمانے میں یہ طریقہ رائج نہ تھا [illegible] نگاروں نے بھی [illegible] سے ان کے کلام کو بھی [illegible] ترتیب دے دیا ہے۔ اس سے بہت سے [illegible] مطالعہ کرنے والے کو شاعر کی ذہنی ترقی کا حال بخوبی معلوم ہو جاتا ہے [illegible] ترتیب کے ساتھ ساتھ کلام میں اور واقعات میں تطبیق و تنقید بھی ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ تاریخی ترتیب سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ جس زمانے کا کلام دیکھئے [illegible] اوقات تو یہ [illegible] اس حد تک [illegible] ہے کہ [illegible] کی ترقیاں بھی عنوان کے ساتھ ساتھ دکھائی دیتی ہیں۔ باوجود [illegible] شیکسپیر کے کلام کی اس قدر چھان بین کی گئی ہے کہ یہ بھی [illegible] تحقیق ہو چکا ہے کہ کون سا ڈرامہ کس [illegible] میں لکھا گیا [illegible]

کا کلام اس طرح مرتب کرنا چاہیں تو کوئی بڑی بات نہیں۔ محض غزل گو شعرا کے کلام میں تو یہ کسی قدر دشوار ہوگا لیکن نظیر کے کلام میں جہاں مستقل عنوانوں پر نظمیں کثرت سے موجود ہیں نفس مضمون کی شہادت اور رہنمائی سے نظموں کی تقدیم تاخیر تحقیق کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ لیکن اس کام میں بڑی محنت اور جانفشانی تلاش اور جستجو تحقیق اور تنقید کی ضرورت ہے اور یہ کسی فرد واحد کا کام بھی نہیں۔ مؤلف نے اس باب میں کسی قدر کوشش کی لیکن راہ کی دشواریوں اور پیچیدگیوں کو دیکھ کر آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مجبوراً اس ارادے کو ملتوی کرنا پڑا۔ ایک وجہ نظر اندازی کی یہ بھی ہے کہ اس چھوٹے سے رسالے میں ایسی دقیق اور وسیع علمی تحقیقات کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ یہ کام بڑے پیمانے پر شروع کرنے کا ہے۔ بہرحال اس شعبہ میں کامیابی سے بالکل ناامیدی نہیں ہے۔ لہذا اس وقت صرف اس عنوان سے روشناس کرا کے اس کام کو آئندہ قدردان کلام نظیر کے لئے چھوڑا جاتا ہے۔

مقبولیت | باوجود اس گمنامی اور کس مپرسی کے نظیر کے کلام کو جیسی مقبولیت حاصل ہوئی وہ بہت کم شعرا کو میسر ہوتی ہے۔ عوام الناس کو ان کے کلام میں جیسی دلچسپی ہے دوسرے شعرائے متقدمین یا حال کے کلام میں نہیں۔ تعلیم یافتہ، جہلا، ارباب نشاط، ہنود میں مختلف خیال، مشاغل اور معاشرت کے لوگ غرض ہر قسم کے افراد کی زبان پر نظیر کا کلام کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ ساتھ ہی اس کے یہ لوگ یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ ان کی زبانوں پر کس کا کلام ہے۔ یا یہ کہ جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں اسے شعر کہتے ہیں۔ اگر کسی کو شعر صحیح طریقے پر یاد نہیں تو وہ اپنے طور پر توڑ مروڑ ہی کر پڑھتا اور اس سے لطف اٹھاتا ہے اور موقع موقع سے اس کا حوالہ دیتا ہے۔ لیکن جو اتنا بھی کرنے سے قاصر ہے تو کم سے کم شعر کا خیال ضرور اس کے ذہن نشین ہے اور مناسب جگہ وہ اس کو مثل کی صورت میں دھرا بھی دیتا ہے۔ اکبرآباد اور دوسرے شاہی شہروں کے قدیم شریف گھرانوں کی پردہ نشین خواتین نظیر کے کلام کی بہت بڑی محافظ ہیں۔ حرم کے اندر نظیر کے اشعار اور ان کی نظموں کا مذہبی کلام اور مناقبوں کے علاوہ اتنا چرچا نہیں۔ لیکن مثالیں، کہاوتیں اور کلیے جو ان کے کلام سے مستنبط ہوتے ہیں عام طور پر بی بیوں کے زبان زد ہیں۔ اس ضمن میں میاں نظیر امیر خسروؒ کے ہمدوش ہیں۔ جس طرح ان کی پہیلی اور کہہ مکرنیاں شریف خاندانوں میں تفریح و تفنن کے لئے رائج ہیں اسی طرح نظیر کی کہاوتیں

مثلاً "غریب کی جورو سب کی بھابی"، "کوڑی نہیں تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں" عام طور پر مستعمل ہیں۔ عورتوں کو یاد ہونا ان کی مقبولیتِ عام کی بہت بڑی دلیل ہے۔ ان جملہ باتوں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ نظیر نے اپنی جادو بیانی سے قلوب کو تسخیر کیا اور ان کا سحر اثر کلام دلوں کا مالک ہے۔ شاعر کے نام و نشان سے ناواقف ہونے کے باوجود اس کا کلام لوگوں کے طبائع پر نقش ہے اور دلوں کا جزو بنا ہوا سینوں سے لگ رہا ہے۔ آہ یہ حافظانِ کلامِ نظیر امتدادِ زمانہ کے ساتھ روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں اور نظیر کے ریزہ ہائے دل و جگر ان کے ساتھ پیوندِ خاک ہو رہے ہیں۔

کثرتِ کلام نظیر کے کلام کی کثرت اور ہمہ گیری دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طاقتِ گویائی کتنی غیر معمولی تھی جس نے انھیں پُرگو شاعر بنا دیا۔ اردو کلام کے علاوہ فارسی کا غیر مطبوعہ کلام بہت سا موجود ہے جس سے دنیا اب تک روشناس نہیں ہوئی۔ اس میں نظم اور نثر دونوں شامل ہیں۔ سہ نثر ظہوری کے انداز پر جو نثر میاں نظیر نے لکھی ہے وہ اس نوع کی نثر کا نمونہ اور آپ اپنی نظیر ہے۔ باوجود اس پُرگوئی اور کثرتِ کلام کے ان کے کلام میں سلاست اور روانی ایسی موجود ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موزوں کرنے میں انھیں کوئی دقت محسوس نہ ہوتی تھی اور نہ کوئی خاص ذہنی سعی کرنی پڑتی تھی۔ "چکیدے سخن بر زباں آوریں" نے ان کا دماغ ہی موزوں بنایا تھا اور اس موزونیت کا یہ عالم تھا کہ شاید غلط بات زبان سے نکلتی ہی نہ تھی۔ شاعری پر نثر کی سی قدرت کا راز اسی ازلی موزونیت میں پنہاں ہے۔

تضییعِ کلام تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ نظیر کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا۔ لیکن جو کچھ باقی رہا وہ بھی پورا طبع نہیں ہوا۔ کلیات کے علاوہ بہت سی نظمیں اور ہیں جو انھوں نے لوگوں کو کہہ کر دے دی تھیں اور پھر کبھی ان کا نام بھی نہیں لیا۔ فقیر، خوانچہ والے اور پیشہ ور ان سے بہت سی نظمیں کہوا کر لے گئے تھے جن کا کلیات میں پتا بھی نہیں۔ نظیر کا قاعدہ تھا کہ اگر کوئی شخص ان کے پاس آ کر کسی مضمون پر کہنے کی فرمائش کرتا تھا تو وہ فوراً کہہ کر بغیر کسی دقت کے دے دیا کرتے تھے۔ یہ لوگ ان نظموں کو لے جا کر تبرک کے طور پر اپنے پاس رکھتے تھے۔ بہرحال اس قسم کی کسی نظم کا اندراج کلیات میں نہیں اور یہ چیزیں قطعی ضائع ہو جانے کے برابر ہیں۔ میرے ایک بزرگ جنھیں میاں نظیر کے صاحبزادے خلیفہ گلزار علی اسیر سے شرفِ تلمذ حاصل ہے، بیان فرماتے تھے کہ انھیں محلہ ڈھولی تال میں ایک بوڑھا شخص ملا جو میاں نظیر کی ایک نظم پڑھ

کرتا تھا۔ یہ نظم اس نے خاص اپنے ہی لئے کہوائی تھی۔ اس کا قصہ اس نے اس طرح بیان کیا کہ "جب میں جوان تھا مجھے ایک عورت سے عشق سرزد ہوا۔ جب میں اپنی محبوبہ کی محبت میں بہت بےچین ہوا اور اس کا فراق مجھ سے کسی طرح برداشت نہ ہو سکا تو میں میاں نظیر کے پاس تاج گنج گیا اور اُن سے اپنا حال دل بیان کرکے چارہ گری کی خواہش کی۔ میاں نظیر نے مجھے یہ نظم کہہ دی۔ چنانچہ جب مجھے درد ہجر بہت ستاتا اور بےچین کرتا تھا تو میں اس نظم کو پڑھا کرتا تھا اس سے مجھے ایک گونہ تسکین ہو جاتی تھی"۔ اس بڈھے عاشق کی جوانی اور اس کا ولولۂ محبت اور جوش جنوں تو اب خود اسی کی زندگی کے لئے ایک بھولا ہوا خواب' ایک افسانۂ پارینہ بن گیا تھا مگر ایام نشاط کی باقیات صالحات وہ فراقیہ نظم یادِ ایام کی حیثیت سے اب تک اس کی زبان پر تھی جسے وہ بڑے لطف سے پڑھ پڑھ کر فریب آرزو کو یاد کیا کرتا تھا۔ نظیر کے عہد زریں کی زندہ یادگار قدیم رنگین صحبتوں کا نام لیوا' پیر فرسودہ' آہ نظیر کی مجلس جا وداں میں جا پہنچا اور اب ان سے عشق حقیقی کا راز دریافت کر رہا ہے لیکن وہ فراقیہ نظم بھی جو ایک مدت تک اس کی مونس تنہائی اور غمگسار فرقت بنی رہی تھی' عاشقان سماوی کی دلدہی اور دل سوزی کے لئے اسی کے ساتھ دنیا سے اُٹھ گئی۔ پروفیسر شہباز کا قوم اور ملک اور اُردو زبان پر خصوصاً بڑا احسان ہے کہ انھوں نے غیر معمولی تکلیفیں اُٹھا کر اور طرح طرح کی مشکلوں کا سامنا کرکے کلامِ نظیر ایک جگہ صحت کے ساتھ جمع کر دیا اور اُن کے سوانح عمری جو کچھ مہیا ہو سکے زندگانی بےنظیر میں جمع کرکے ملک کے مردہ شاعر کو زندہ کر دیا ورنہ رہا سہا کلام بھی ضائع ہو جاتا اور سوائے کفِ افسوس ملنے کے کوئی چارہ باقی نہ رہتا۔

تخریب کلام نظیر کے کلام کی جیسی روح فرسا تخریب کی گئی ہے وہ نہایت افسوس ناک ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ کلام سے لوگ بےخبر رہے کیونکہ بہت سے ایڈیشن موجود ہیں لیکن کلام کا کُشتا ایسا کیا گیا ہے جس کو دیکھ کر بڑا درد محسوس ہوتا ہے۔ شاعر کی دماغی کاوشوں کی داد جس عدیم المثال تغافل سے دی گئی ہے' وہ ملک کے لئے نہایت شرم انگیز ہے۔ جتنا کچھ کلام باقی ہے اور میسر آ سکتا ہے وہ بھی بہت زیادہ غلط ہے۔ نہایت تمسخر انگیز غلطیاں موجود ہیں جن کو دیکھ کر پہلے ہنسی اور پھر غصہ آتا ہے۔ افسوس ہے کہ چھاپنے والوں نے ذرا صحت کا خیال نہیں کیا' جیسا ہاتھ لگا غلط سلط

چھاپ ڈالا۔ بہت سی غلطیاں تو ایسی ہیں جو امتداد زمانہ اور دور کی عہد نظیر کی وجہ سے پیدا ہوئیں لیکن بہت سی ایسی بھی ہیں جو محض مطابع اور کاتبوں کی غفلت اور سہل انگاری سے پیدا ہوئیں جن کی تصحیح اب بہت دشوار کام ہو گیا ہے۔ میں نے صحت کی بہت کوشش کی ہے لیکن پھر بھی بہت سے شکوک باقی رہ گئے ہیں۔ شہباز کا مرتب کلیات اس وقت کلام نظیر کا بہترین اور مستند مجموعہ ہے لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ اس میں بھی غلطیاں موجود ہیں۔ اس سے شہباز مرحوم کی لیاقت یا اس کی محنت پر معاذ اللہ کسی قسم کا اعتراض کرنا منظور نہیں ہے صرف تصحیح کی دشواری پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔ شہباز مرحوم کے یہاں غلطیاں باقی رہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اکبرآباد کے باشندے نہ تھے۔ اس لئے یہاں کی زبان کے محاورے اور مقامی اصطلاحات سے انہیں واقفیت نہ تھی۔ نظیر کا کلام اس قدر غلط اور غلط ملط ہو جانے کی ذمہ داری ملک کی عام بدمذاقی، اہل علم کا تغافل، کاتبوں کا جہل اور بے پروائی، مطابع کی اپنے فرائض سے بے خبری ہے۔ ایسے مہتمم بالشان شاعر کا کلام بگڑ بگڑا کر غلط کر دینا ہمارے دامن پر ایسا دھبہ ہے جو قیامت تک یا کم سے کم اس وقت تک جب تک قوم کی قدر دانی تصحیح نہ ہو جائے اس کے دامن سے نہ دُھلے گا۔

اکبرآباد کی قدیم زبان

نظیر کی زبان اکبرآباد کی خالص قدیم زبان ہے اور یہی ان کی وہ بات ہے جو زمانۂ حال میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ نظیر کی زبان کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ نظیر کی زبان کو دہلی اور لکھنؤ کی زبان سے کوئی علاقہ نہیں اور نہ وہ کسی وقت ان مقامات کی زبان کی دست نگر رہی۔ چونکہ نظیر متقدمین اور متاخرین دونوں زمانے کے شاعر ہیں اس لئے یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کی زبان خالص اکبرآبادی ہے۔ دیگر مقامات کی زبانیں اس کی شاخیں ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کے استادوں نے متاخرین نے آگرہ کی اس زبان کو دیکھا جو نظیر کی زبان تھی۔ پس انہوں نے اس کو اصل قرار دے کر اس میں ترمیمیں اور اصلاحیں کیں۔ اس لئے دہلی اور لکھنؤ کی شستہ زبانیں اکبرآباد کی قدیم زبان کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ نظیر کی زبان کو خاندان اردو میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو اردو شعرا میں ولی دکنی کو۔ زمانۂ حال میں حضرت آدم کو جو تاریخ زبان مرتب کرنے کے سلسلہ میں کوئی شخص قدیم اردو زبان کا پتہ لگانا چاہے تو کلام نظیر اس کی پوری

رہبری کرے گا اور اس حیثیت سے اس کو پوری سیرابی ہو سکے گی۔ اکبرآباد کی ڈیڑھ صدی پیشتر کی زبان کا سراغ صرف نظیر کے کلام سے لگ سکتا ہے۔ کلام چونکہ مقدار میں کثیر ہے اس لئے ایک ہی جگہ تحقیق و تفحص کے لئے بڑا سرمایہ اور ہر قسم کے نمونے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ الفاظ کا استعمال اس کثرت سے ہے کہ اردو کا بڑے سے بڑا شاعر سوائے میر انیس کے مقابلہ نہیں کرسکتا۔ طیور کے نام، کبوتروں کی قسمیں، ہندو مذہب کی اصطلاحیں، پیشہ وروں کے لٹکے، لہو و لعب کے چٹکلے غرض ہر رنگ کے الفاظ اور پھر اُن کے مترادف اس کثرت سے کلام میں ملتے ہیں کہ اُردو کو نامکمل اور محتاج زبان کہنا غلط معلوم ہونے لگتا ہے۔ نظیر کے کلام سے قدیم الفاظ کی ایک اچھی خاصی کتاب لغات تیار ہوسکتی ہے جو نہایت کارآمد ثابت ہو۔ الفاظ کی کثرت اور لغت دانی میں نظیر عربی زبان کے اساتذہ کے ہم پلہ ہیں۔

زبان پر اجتہاد | نظیر اُردو کے ایامِ طفولیت کے شاعر ہیں (اس زمانے میں شعرا کے پاس الفاظ کا ذخیرہ بہت کم تھا۔ اس لئے جو لوگ صاحب نظر و استعداد تھے وہ حسب ضرورت دوسری زبانوں کے مناسب الفاظ تلاش کرکے اُردو میں کھپاتے تھے۔ یہی ضرورت نظیر کو بھی درپیش تھی۔ انھوں نے بھی اپنی ضروریات کے لئے نئے نئے الفاظ وضع کرکے زبان پر اجتہاد کیا۔ مترادفات تلاش کرنے میں انھیں بڑی قدرت تھی اور یہ کمال انھیں ہر زبان میں یکساں حاصل تھا۔ فارسی عربی الفاظ کے لئے بھاشا سے اور بھاشا کے لفظوں کے واسطے فارسی سے اتنا موزوں مترادف ڈھونڈھ لاتے ہیں جس کو دیکھ کر بیساختہ منہ سے واہ نکل جاتی ہے) اجتہاد زبان اور عروض کی بہت سی مثالیں میر اور دیگر اساتذۂ متقدمین کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں (نظیر کے کلام میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو اب نئے اور عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ نظیر کے وضع کردہ محاورے اور الفاظ کثرت سے ہیں۔ اُن میں سے بہت سے تو مقبول ہو کر زبانوں پر چڑھ گئے اور زبان کا جزو بن کر اس طرح مخلوط ہو گئے کہ اب تمیز بھی نہیں کئے جاسکتے لیکن وہ الفاظ جو اب نئے نئے معلوم ہوتے ہیں حقیقت میں وہ ہیں جو کسی وجہ سے عام نہ ہو سکے اور صرف اُن ہی کے کلام تک محدود رہے) اب چونکہ اس زمانے میں مستعمل نہیں ہیں اس لئے عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کو کم نظر غلط اور اہل بصیرت اجتہاد کہتے ہیں۔ اس بنا پر نظیر کے کلام کو دہلی اور لکھنؤ کی زبان کے جدید معیار سے جانچنا غلط ہے۔ نظیر نے اپنے کلام میں ادبی، کو لوکل

یا روزمرہ اور سلینگ یا بازاری و مبتذل۔ تین قسم کی زبانوں کا استعمال کیا ہے۔ ادبی زبان میں تو انھوں نے زیادہ تر عربی فارسی کے مانوس الفاظ پر اکتفا کی ہے اور یہ زبان پاکیزہ خیالات اور سنجیدہ جذبات اظہار کرنے کے لئے تجویز کی ہے۔ روزمرہ میں انھوں نے جگہ جگہ اجتہاد کیا ہے۔ یہاں ہندی کے الفاظ دل کھول کر استعمال کئے ہیں۔ فارسی محاوروں کا ترجمہ اور بہت الفاظ کی ترویج بھی اسی صیغے میں کی گئی ہے۔ اب رہی سلینگ یا بازاری زبان۔ اسے وہ غیر سنجیدہ اور عریاں موقعوں پر استعمال کرتے ہیں۔ میلے ٹھیلے، لہو و لعب، عوام الناس کی ہر قسم کی بری بھلی صحبتوں میں وہ اس زبان کو بولتے ہیں اور یہ ہر طرح جائز ہے۔ زبان کی عالمانہ تقسیم اور ہر موقعے پر مناسب حال زبان کا استعمال نظیر کی ایک اور اُن کے مجتہدانہ کمال کا بین ثبوت ہے۔

زبان پر احسان | نظیر کا اردو زبان پر بڑا احسان ہے۔ اس معاملے میں سب سے پہلے اُن کی دور بینی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ انھوں نے کتنی مدت پہلے تاڑ لیا تھا کہ یہ زبان جس کی اب ابتدا ہے ایک دن ہندوستان کی علمی اور دفتری زبان بن کر رہے گی۔ مستقبل کی اس بصیرت کے ساتھ اردو کی کم مائیگی اور بے بضاعتی بھی اُن کے پیش نظر تھی۔ اس لئے انھوں نے اپنی تمام کوششیں اس زبان کو وسیع کرنے اور سرمایہ دار بنانے کے لئے وقف کر دیں۔ اُن کا کلام شاہد ہے کہ انھوں نے اپنی اور اپنے زمانے کی زبان کو اس قدر وسیع کر لیا تھا کہ انھیں الفاظ کی کمی محسوس نہ ہوتی تھی اور اس وجہ سے وہ کوئی خیال کسی انداز سے ادا کرنے میں قاصر و عاجز نہ تھے۔ اردو کو وسیع کرنے کے لئے فطری انتخاب سے انھوں نے ہندی کو زیادہ مناسب زبان خیال کیا۔ چنانچہ بھاشا کے موزوں اور عام فہم الفاظ چھانٹ چھانٹ کر استعمال کرنا شروع کئے اور عبارت میں اس خوبی سے کھپائے کہ سیاق سے اُن کے معانی اور مطالب خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس حسن استعمال سے دو فائدے ہوئے۔ اوّل تو یہ کہ الفاظ بہت جلد چل گئے۔ دوسرے یہ کہ سامع کو ناگوار نہ معلوم ہوئے۔ نئے الفاظ کا سامع کو ناگوار معلوم نہ ہونا اُن کے جزو زبان بن جانے کی بہت بڑی شہادت ہے۔ بھاشا کے الفاظ کی معرفی کے پہلو بہ پہلو نظیر نے عربی فارسی کے ثقیل الفاظ کو ترک بھی کرنا شروع کیا۔ فارسی سے انھوں نے محاوروں کے معاملے میں مدد لینی زیادہ مناسب سمجھی۔ فارسی محاوروں کا ترجمہ اُن کے کلام

میں بہت دستیاب ہوتا ہے۔ زبان کی ضرورت کو اس حد تک سمجھنا اور پورا کرنے پر اتنا قادر ہونا معمولی آدمی کا کام نہیں ہے۔ کوئی شاعر جب تک خاص لسانی ملکہ اور مختلف زبانوں پر کامل تبحر نہ رکھتا ہو اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر نہیں لے سکتا۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ نظیر بڑے ماہر لسانی تھے اور اُن کو رموز فصاحت و بلاغت سے خاص واقفیت تھی۔ نامانوس کو مانوس بنا کر بھی کلام میں روانی اور سلاست کوٹ کوٹ کر بھر دینا ان ہی کا حصہ تھا۔

قومی شاعر ہے محض ادبی نہیں | غالب اور بیدل کی طرح نظیر خالص ادبی شاعر نہیں ہیں، بلکہ اسکوٹ لینڈ کے مشہور شعرا اسکوٹ اور برنس کی طرح قومی مغنی ہیں۔ غالب اور بیدل کے مانند اِن کا موضوع فلسفہ اور تصوف نہیں۔ وہ عریاں ہیں پوشیدہ کو نہیں ڈھونڈھتے بلکہ انسان کو بہترین مظہر حقیقت و الوہیت سمجھتے ہیں۔ اس لئے اُن کا موضوع جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے انسان اور اُس کی معاشرت ہے۔ وہ اِن شعرا کی طرح مشکل پسند بھی نہیں ہیں۔ اِن کا کلام معمولی فہم کی دسترس سے باہر نہیں۔ وہ بالخصوص عوام کے شاعر ہیں اور ان ہی کے جذبات اور حیات کی ترجمانی اپنا فرض اولیں سمجھتے ہیں۔ باوجود کوئی قدیم مثال سامنے نہ ہونے کے ان کی تیز نگاہوں نے کائنات اور انسان کا سچا تعلق معلوم کر لیا۔ اس انکشاف نے ان کی ذہنی قوت اور بڑھادی اور پھر اُنھوں نے نفسی تحقیقات کی تیاری شروع کی۔ صداقت اور دلکشی اُن کے شاعرانہ امتیازات ہیں اور شاعرانہ حیثیت سے نہیں بلکہ انسانی حیثیت سے وہ ہمارے لئے زیادہ دلچسپ اور مؤثر ہیں۔ نظیر کی روح حقیقی شاعرانہ روح ہے۔ اِس کو صرف چھیڑ دینے کی ضرورت ہے۔ اس سے نغمہ پیدا ہونا لازمی ہے۔ چھیڑنے کے لئے کسی خاص مضراب کی حاجت نہیں۔ فطرت کا معمولی سے معمولی جزو حتیٰ کہ ایک نفس انسان بھی اُن کے لئے مستقل حسن ہے۔ نظیر کو خصوصاً اس وقت دیکھو جب کہ وہ اپنی مرغوب جماعت میں بے تکلف ہوتے ہیں۔ اِس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی سرگرم، ہمہ گیر اور پُرخلوص انسانی ہمدردی کا کیا عالم ہے۔ اُن کی پُراعتماد، نامحدود محبت کا کیا رنگ ہے اور وہ اپنے محبوب خاص انسان کے لئے کیسی کیسی فیاضیاں کر سکتے ہیں۔ اُن کا شہری دوست اور گندم رنگ دوشیزہ اُن کے لئے ذلیل اور معمولی نہیں بلکہ ہیرو اور ملکہ ہیں جن کی وہ بادشاہوں سے زیادہ عزت کرتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ انسانی قلوب کی پُراسرار صناعی اور مقدرات کی ناقابل

قیاس ظلمت دنیا کے مظہر صرف چند نہرست نوٹ دیوان ہی نہیں بلکہ ان کا اظہار ہر جگہ ہے جہاں انسان بستا ہے ہو سکتا ہے۔ ہم نظیر کو عوام کی صحبت میں دلچسپی لیتے ہنستے بولتے ملتے جلتے ان کے مشاغل میں حصہ لیتے اور ان ہی کی زبان بولتے دیکھتے ہیں لیکن ان کے روز مرہ میں رکاکت اور ابتذال نہیں ہے۔ کسی موقعے پر وہ عالی ظرفی اور بلند حوصلگی کو ہاتھ سے اور ان کی شریف بشریت کے عناصر ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ یہی وسیع نظری اور صفائی قلب ان کے کمال کی بنیاد ہے۔

نواب آزاد اور نظیر کے در دولت کا دروازہ ہمیشہ وا رہتا تھا اور ان کی صحبت ہر شخص کے لئے عام تھی۔ ہر مذہب و ملت اور ہر رنگ کا آدمی حاضر ہوتا تھا۔ یہ ادنیٰ طبقے کے لوگوں اور غربا کے ساتھ زیادہ ملاقات کرتے تھے اور یہ لوگ بھی ان کی خدمت میں خاص طور پر رجوع ہوتے تھے۔ چنانچہ نظیر ان سے فرمائشیں کر کے نظمیں لکھواتے اور ان کی پھیری کے خوانچے والے لڑکے کو گا گا کر بیچا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نظیر کے بہت سے کلام میں ... خوانچے والوں کی اسی قسم کی نظمیں خاص طور پر ہوتی ہیں جو گانے میں موزوں اور آسانی کے ساتھ خوب پڑھی جا سکیں۔ نظیر کا کلام اکبرآباد اور مضافات اکبرآباد کے علاوہ دور دراز کے شہروں کے فقیروں کی زبان پر ہے اور جاتا ہے کہ بنگال کے فقیروں کو بھی ان کا کلام ... یاد ہے۔ فقیروں کو چونکہ تبلیغ ... ہے اس لئے نظیر کے یہاں جو ... حسب حال ... ان میں ... بہت کم ہوتی ہے ... یہ فقیر بہت تھوڑے ... [illegible] ... اور جو کچھ ... [illegible] ... کے کلام کی صورت بہت کچھ بدل جاتی ہے ... [illegible] ... چیزی ... [illegible] ... نظیر کا ... [illegible] ... [illegible] ... [illegible] ... نظیر کی ... [illegible] ... [illegible] ... نظیر کے وقت ... [illegible] ... [illegible] ... نظیر کے ... [illegible]

متروکات ومعائب مردہ زبانوں کا تو خیر کوئی ذکر نہیں، جو زبانیں زندہ ہیں یعنی جن کی بولنے والی قومیں روئے زمین پر موجود ہیں اُن میں روزمرہ تبدیلیاں اور آئے دن اختلافات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اگر نوشیرواں کے دربار کا کوئی امیر اس وقت زندہ ہو جائے تو وہ ایران کی موجودہ زبان سے بہ مشکل کوئی مطلب سمجھ سکے گا۔ نظیر کے زمانے سے اس وقت تک زبان اُردو میں بڑی بڑی ترمیمیں اور تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔ سینکڑوں الفاظ اور محاورے ایسے ہیں جو اب قطعی متروک ہیں۔ اسی طرح نظیر کے کلام میں جو بہت سی ترکیبیں مستعمل ہیں وہ اب رائج نہیں۔ پس جس طرح اور اساتذہ کے کلام میں متروکات کا استعمال ناجائز نہیں سمجھا جاتا اسی طرح نظیر کے کلام کا بھی عیب نہیں خیال کیا جا سکتا۔ نظیر کے کلام پر یہ ایک بڑا اعتراض ہے کہ اُن کے یہاں صحت لفظی کا التزام نہیں۔ یہ اعتراض بھی جملہ متقدمین پر ایک ہی طرح صادق آتا ہے۔ ہر چند اس زمانے میں صحت لفظی کی کوئی قید نہ تھی لیکن نظیر کے معاملے میں اس کا ایک خاص جواب موجود ہے۔ وہ یہ کہ نظیر عوام کے تلفظ کے مطابق لفظوں کو باندھتے ہیں اور چونکہ وہ عامۃ الناس کے ہی مخصوص شاعر ہیں اس لئے اس معاملے میں انھیں ہر طرح کا اختیار اور پوری آزادی حاصل ہے۔ یہ بات کیسی بے محل ہوتی کہ وہ کنھیا جی کے جنم میں ہندو عورتوں کی زبان کی جگہ لکھنؤ کی خواتین کی زبان لکھتے اور بلدیو جی کے میلے میں بسنت کے گنواروں کی بجائے دہلی کے ثقات کی۔ نظیر کی شاعری پر بعض لوگ یہ بھی اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ وہ مرصع نہیں ہے۔ یہ اعتراض اگر صحیح بھی تسلیم کیا جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بہت سے موجد اپنی ایجاد کو مرصع اور مکمل نہیں بنا سکے۔ یہ متاخرین اور متبعین کا فرض ہے کہ تقلید کے راستے میں جو فروگذاشت اور کمی دیکھیں پوری کر دیں لیکن نظیر کا کلام مرصع اور مکمل بھی ہے۔ وہ اپنا رنگ اپنے ہی پر ختم کر گئے۔ جب ٹھنڈے دل سے نظیر کی شاعری پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کی بنا مخصوص محاسن پر قائم ہے۔ وہ اٹھارویں اُنیسویں صدی عیسوی کے صرف بہت بڑے شاعر ہی نہ تھے بلکہ ہندوستان کی سرزمین کے ایک نہایت عالی وقار صناع بھی تھے۔ یہ اعتراض کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے کلام نامکمل چھوڑا۔ ان کے کلام کی ماہیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ کیا وہی بہت زیادہ ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ تمام

عناصر جن سے ان کی شاعری مرکب ہے، ان کو خود ہی دریافت بھی کرنے پڑتے تھے۔ یہ سارے جواہر جن کی تلاش میں وہ ہر وقت سرگرم کار رہتے تھے ایک ایسے ویرانے میں مدفون تھے جس کا وجود اور کسی فرد کو نہیں بلکہ صرف ان ہی کی نگاہ نے دریافت کیا تھا۔ اس باب میں یہاں تک کہنا پڑتا ہے کہ ان کو کھود نکالنے کے لئے اوزار بھی ان ہی کو بنانے پڑتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کو ایسی شدید ظلمت میں پایا جہاں کوئی مددگار اور کوئی نمونہ موجود نہ تھا اور اگر کوئی نمونہ موجود تھا تو وہ نہایت ذلیل اور ادنیٰ قسم کا۔ کہا جاتا ہے کہ نظیر کے کلام میں بیجا اعادے کا عیب ہے۔ فی الواقع یہ شعر کا بڑا عیب ہے لیکن اعادے کی کثرت صرف اس وقت ناگوار ہوتی ہے جب ایک ہی بات یا خیال بار بار دہرانے سے طبیعت پر بار پڑے اور یکسانیت سے جی اکتا جائے۔ لیکن جس صورت میں ایک ہی خیال مختلف موقعوں پر گو ہر مرتبہ نئے خیالات کے ماحول میں پیش کیا جائے تو برا نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس سے کلام میں زور اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ فن موسیقی کی شہادت اس عیب کے حسن کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ ترنم کے ساتھ جو روانی اور سلاست پیدا ہو جاتی ہے وہ مزید برآں ہے۔

عروض | نظیر کے عروض پر تفصیلی بحث کرنے میں طول کا اندیشہ ہے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ نظیر کے کلام میں بظاہر عروضی غلطیاں موجود ہیں۔ اب یہ سوال کہ یہ عروضی غلطیاں کلام غلط ہو جانے سے بعد میں پیدا ہو گئیں یا خود نظیر سے سرزد ہوئیں اس کی تحقیق سردست بہت دشوار ہے۔ اس وقت جو کلام میسر ہے اس میں خامیاں موجود ہیں۔ موجودہ صورت میں صرف اسی کلام پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ غلطیاں کس نوعیت کی ہیں۔ ان میں بعض غلطیاں تو قافیہ سے متعلق ہیں اور بعض وزن شعر سے یعنی یہ کہ تقطیع کرتے وقت بعض حروف مثلاً ع، ح، ہ تقطیع سے گر جاتے ہیں۔ اس قسم کے معائب نظیر کے کلام میں چھوٹی بات نہیں۔ شہباز نے مثالیں دے کر دکھایا ہے کہ قدیم اساتذہ کے کلام میں بھی یہ نقائص کثرت سے موجود ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ابتدائی زمانہ شاعری میں شعراء پہلے ان قیود کا خیال نہ رکھتے تھے جن کو بعد کے دور میں شعراء نے مناسب نہ سمجھا۔ اس عام جواب سے نظیر پر اعتراض کا بھی جواب ہو جاتا ہے لیکن ان سے متعلق ہمیشہ یہ ایک خاص بات یاد رکھی جانا چاہئے

کہ وہ بسا اوقات الفاظ کا تلفظ عوام کی زبان کے مطابق کر جاتے ہیں اِس نکتے کو یاد رکھنے سے نہ صرف اِس بات کا بلکہ اور بہت سے اعتراضات کا جواب مل جاتا ہے۔ عوام کی زبان کے مطابق تلفظ کر کے مصرع پڑھنے میں بہت سے حروف جو بظاہر تقطیع سے گرتے معلوم ہوتے ہیں خارج نہ معلوم ہوں گے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ نظیر نے جو کچھ کیا وہ عمداً اور دانستہ کیا۔ وہ کسی طرح عروض میں عاجز نہ تھے۔ ہاں مشرقی عروض کی سخت بندشوں سے تنگ آ کر ان کی فطری آزادی پسند طبیعت نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر تخئیل کی صحت اور شگفتگی کی خاطر کہیں عروض کے قواعد قربان ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ وہ عروض کو شعر کا صرف جز و ضروری سمجھتے تھے جزو لاینفک نہ سمجھتے تھے اور اس نظریے میں وہ ارسطو کے ہم خیال تھے۔

فحشیات | نظیر کے کلام میں جہاں فحش اور غیر سنجیدہ باتیں ہیں اُن کے متعلق کئی جگہ بتایا جا چکا ہے کہ ان کا وجود محض معاشرت نگاری کی بنا پر ہے۔ ان کو اگر نظر انداز کر دیا جاتا تو انسانی زندگی کا ایک بہت بڑا پہلو پوشیدہ رہ جاتا' جس سے نظیر کی اہلیت اور ہمہ گیری پر اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس موضوع پر زیادہ بحث کی حاجت نہیں۔ صرف سید محمد فارق صاحب شاہ پوری کے فاضلانہ تبصرے مطبوعہ نقاد اگست ۱۹۱۳ء کا ایک حصہ پیش کیا جاتا ہے' جس سے اس عنوان پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

"بعض نظمیں جو غیر مہذب ہیں' اُن سے نظیر کی شاعری کو حقیقتاً کوئی تعلق نہیں۔ بلا شبہ ان کا شمار نظیر کے نتائج افکار میں ہو سکتا ہے لیکن چونکہ اُن کا وجود تفنن طبع یا کسی خارجی تحریک پر مبنی سمجھا جاتا ہے اس لئے کلام نظیر کی تنقید کے واسطے وہ بطور معیار کے کام نہیں دے سکتیں۔ ان مخرب اخلاق و اشتعال انگیز نظموں کی شانِ نزول یا غرض و غایت کیا تھی؟ اس کا صحیح جواب اس وقت دینا محال ہے لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ معاشرت انسانی کے جو تاریک پہلو نظیر نے دکھلائے ہیں وہ غیر فطری یا سر تا پا غلط ہیں۔ ممکن ہے کہ سوسائٹی کی اصلاح کی غرض سے' شاعر نے یہی مناسب سمجھا ہو کہ لوگوں کے آگے' اُن کی مذموم عادات و خصائل کا تذکرہ' من و عن کر دیا جائے کہ انھیں اپنی دردناک اور غیرت سوز حالت پر غور کرنے کا موقع ملے اور اس سے شاید اتنا ہو کہ وہ اپنے خصائلِ اخلاق

کی درستی یا از خود مائل ہو جائیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی بعید از امکان نہیں کہ ناشر نے اپنی طبعی خواہش سے ایسا کیا ہو۔ تاہم اس کے لیے نظیرؔ کو خصوصیت سے ملزم گرداننا ناانصافی ہے خصوصاً اس صورت میں کہ سعدی ایسے متین گراں پایہ فلسفی شعرا کا دامن بھی ہزل گوئی کے بدنما داغ سے ملوث نظر آتا ہے۔ ہمیں "خذ ما صفا ودع ما کدر" کے عاقلانہ اصول پر کاربند ہونا چاہیے۔ اچھے مال کی قدردانی کرنا چاہیے اور خراب چیز کی طرف نظر بھی نہ ڈالنا چاہیے۔ اس مسلک کو اختیار کرنے کے بعد ارباب نظر متلاشی ہوں گے تو انھیں دیوانِ نظیرؔ کی خاک سے بہت سے بیش قیمت جواہر ریزے ایسے ملیں گے جن سے ادب و لٹریچر کا تاج غیر معمولی زیب و زینت پا سکتا ہے۔ متعدد نظمیں نظیرؔ کی اس قسم کی ہیں کہ ان کا انتخاب تعلیمی کورس میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کا منتخب مجموعہ نونہالانِ قوم کے ہاتھ میں بلا کسی خدشے کے بغرض استفادہ دیا جا سکتا ہے۔

رسم خط | ہر شخص جانتا ہے کہ بعض قدیم الفاظ کی کتابت کا طرز بھی پرانا ہے۔ لیکن اب قدیم الفاظ کے ترک کے ساتھ ان کا طرز کتابت بھی بدل گیا ہے۔ اس تالیف میں رسم خط کہیں تو قدیم ہی قائم رکھی ہے کہیں جدید کر دی ہے۔ قدیم کتابت صرف ان مقامات پر قائم رکھی ہے جہاں ضرورت شعری نے اس کے قائم رکھنے کے لیے مجبور کیا۔ جو [illegible] اور [illegible] نہیں [illegible] الفاظ کو اسی شکل میں لکھا گیا ہے۔ [illegible] بدل دیے جاتے تو شبہہ ہو سکتا تھا کہ نظیرؔ نے اسی طرح لکھا ہوگا۔ لیکن [illegible] ان کو [illegible] نہیں کر دیا گیا ہے اس لیے کہ ایسا کر دینے سے تلفظ میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور کوئی شبہہ پیدا ہوتا ہے۔ اب بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کی کتابت بدل دینے سے بعض وقت تو مصرع کی موزونیت پر اثر پڑتا ہے اور بعض وقت نہیں پڑتا مثلاً "پڑھ" و "دھر" جیسے [illegible] جگہ تلفظ صاف [illegible] "پڑھ" ہے اور پڑھنے سے مصرع ناموزوں ہو جاتا ہے وہاں کتابت اسی طرح رکھی ہے۔ لیکن جہاں تلفظ "دھ" ہے اور پڑھنے سے بھی مصرع موزوں رہتا ہے وہاں بے خوف کتابت بدل دی گئی ہے۔

سوانح نظیر | [illegible]

زندگی کے واقعات کی روشنی میں دکھانے کی کچھ کچھ کوشش کی ہے۔ اس سے نظیر کی پیدائش، وطن، پیشہ، مزاج، چال چلن، اخلاق، اشغال، معاشرت، سیرت، غرض زندگی کے جملہ حالات بخوبی واضح ہو جاتے ہیں لیکن اس مجموعے کو دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نظیر کی تذکرہ نگاری کا مسئلہ پورے طور پر حل ہو گیا۔ اس سے واقعات کی کمیابی کی جانب اشارہ کرنا مقصود نہیں بلکہ اس پر نظر ہے کہ تذکرے کا مدعا حاصل کرنے کے لئے اُن کا محدود اور ناکمل استعمال کیا گیا ہے۔ اگر کوئی فرد واحد واقعی اس کا اہل ہے کہ اس کی حیات کے واقعات اور خصائل یادگار کے طور پر ضبط تحریر میں لائے جائیں تو انصاف کا یہی فیصلہ ہے کہ عوام الناس خصوصاً اس کے اہل وطن کو اس کی سیرت کے جملہ اندرونی سرچشموں اور وسائل سے روشناس کرا دینا چاہیئے۔ زمانے کو دکھا دینا چاہیئے کہ دنیا اور انسانی زندگی اس کے ذاتی نقطۂ نظر سے اس کے نفس پر کس حیثیت و رنگ میں منکشف ہوئیں۔ اس کے عہد کے خارجی واقعات نے اس میں کیا ترمیم کی اور اس نے اپنی شخصیت اور باطنی تاثرات سے ان میں کیا تغیر پیدا کیا۔ وہ کس کس کوشش اور قابلیت سے ان پر غالب آیا اور کیسے کیسے تصادم اور کن کن صعوبتوں کے بعد اُن سے مغلوب ہو گیا۔ ان سب باتوں کو ایک فقرے میں یوں کہنا چاہیے کہ سوسائٹی نے اس پر اور اس نے سوسائٹی پر کیا اثر ڈالا۔ کسی فرد کی حیات کے متعلق جو شخص ان سوالات کا شافی جواب دے وہ اس کے تذکرے کا مکمل نمونہ پیش کر سکتا ہے۔ بے شمار انسانوں میں صرف محدودے چند نفوس اس نوعیت کا مطالعہ کئے جانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ بہت سے تذکرے لکھے جاتے ہیں اور معدوم دعجائب پسند طبائع کو خوش اور مطمئن کرنے کے لئے لکھے جانے بھی چاہئیں لیکن جو اس مفہوم کو ادا نہ کریں گے وہ صرف ایک بار مطالعے کے بعد ہمیشہ کے لئے طاق نسیاں کے سپرد کر دئے جائیں گے۔ اب میں غلطی نہیں کرتا تو نظیر اسی فہرست کے چند افراد میں سے ہیں۔ لیکن ان کا ایسا مطالعہ جس کا یہ ماحصل ہو اب تک نہیں کیا گیا۔ اس ضمن میں میری کوشش ناکافی اور کمزور ثابت ہوتی اس لئے میں نے اس سے گریز کیا۔ نہ ایسی بحث اس مختصر حریدے کا موضوع بن سکتی ہے۔

قطعات | اب دو قطعات تاریخ درج کئے جاتے ہیں جن سے میاں نظیر کی وفات کا سن نکلتا ہے۔ ان میں پہلا نظیر

نظیر کے صاحبزادے خلیفہ گلزار علی اسیر کا نتیجۂ فکر ہے اور دوسرا حکیم قطب الدین خان باطن کا جو نظیر کے شاگرد رشید تھے۔ قطعات حسب ذیل ہیں :۔

(۱) چہ خوش در ملتش آورد فکر طبع تاریخے — نظیر اکبرآبادی چوں زیں دنیائے ابتر شد
نظام نظم باہم درہم و برہم شدہ دیکھو — مخمس بے سر و پا بیت بیدل فرد بے سر شد

۱۲۴۶ھ

دوسرا ملاحظہ ہو :۔

(۲) ہزار حیف ز باطن گزشت استادم — کہ بے نظیر جہان و نظیر مسلم آموز
دوازدہ چہل و شش بود چوں سنہ ہجری — گذاشت نظم جہان و جہان علم آموز
سن وصال طبیعت بانتظام آورد — سر غزل درد بھی و مقطع و دل سوز

۱۲۴۶ھ

غرض نظیر کا کلام جس بحث و تنقید کا مستحق ہے، مجھے اعتراف ہے کہ اس کا حق ادا نہ ہو سکا۔ کلام کے صنائع بدائع، انواع و اقسام، حقیقت و معنویت، نظیر کا شغف موسیقی، غرض بہت سے نکات ایسے ضروری ہیں جن پر اس وقت روشنی نہیں ڈالی جا سکی۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ نظیر کی محاسن شاعری میری محدود قابلیت سے بہت بالاتر ہے۔ اس وقت جو مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے وہ منتشر بیاضوں کا ایک مجموعۂ پریشان ہے جس میں کلیات نظیر کا احصا محال ہے۔ سب ارباب کرم سے استدعا ہے کہ اس کلام کو بہ نظر اصلاح ملاحظہ فرمائیں اور جو صاحب اور کوئی بیاض رکھتے ہوں میری اعانت سے دریغ نہ فرمائیں، ذرہ نوازی نظر انداز نہ کریں، ان کی جانب میری توجہ ہو۔ اس تصنیف کا مقصد کلام نظیر پر روشنی ڈالنا نہیں بلکہ ان کے کلام سے جدید نظریے پر عرف کرانا اور اہل ذوق کی توجہ اس کی جانب مبذول کرانا ہے تاکہ اس کی چاشنی سے ان کے کلام کی ترتیب و تدوین کا خیال پیدا ہو سکے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اگر نظیر کے متعلق کوئی اہم داستان ترتیب شعرا کی گئی تو یہ مجموعہ اس وقت صرف ایک پیش خیمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس وقت نمونے کا کام دے گا اور اس عالی شان دیوان کا سنگ بنیاد رکھا جا سکے گا۔

تبصرة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تبصرہ

نظیر کے کلام کے عام اور نمایاں محاسن پر سرسری بحث کرنے کے بعد اب اُن خاص نظموں کی طرف توجہ کی جاتی ہے جو اس صحیفے کے لئے منتخب کی گئی ہیں۔ یہاں ہر ایک نظم کو جدا جدا لے کر اس کے داخلی لطائف دکھانے اور اُن پر تبصرہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

آلہی نامہ ایک عبرت مندانہ نظم ہے جس میں فنائے جہاں اور بقائے رحمان کے مسلم الثبوت کلیے کی تشریح کی گئی ہے اور دقیق حکیمانہ نکات کو عام فہم نصیحتوں میں منتقل کر کے شعر کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔ اول

تو اس نظم میں ایک بہت بڑا کمال یہ ہے کہ مختلف موجودات عالم اور جو ہے کائنات پر باریکی سے نظر ڈال کر عالم اسباب کی ناپائداری اور خلاق عالم کا دائمی قیام ثابت کیا ہے۔ دوسرے دل سے آخر تک صداقت اور حقیقت کی ایک ایسی برقی رو اس نظم میں دوڑتی چلی جاتی ہے جو قلب کو بے حد مضطرب کر دیتی ہے۔ ورنہ دنیا سے تو صرف غلط تعلقات ہیچ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ جن چیزوں کو مثال کے طور پر ناقابل ثبات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ بادی النظر میں استحکام و استقامت کا ایسا مجموعہ پیش کرتی ہیں کہ ان کا خاتمہ گمان بھی نہیں ہوتا۔ لیکن جب ایسی عظیم الشان و مستحکم اشیاء سے عالم کی فنا کا مرقع پیش نظر ہوتا ہے تو عبرت و ہیبت کے دہشت انگیز آثار دل پر طاری ہونے لگتے ہیں۔ دیکھئے یہ بند کس قدر عبرت آموز ہے:

جو شاہ کہاتے تھے کوئی ان سے یہ پوچھو — دارا و سکندر وہ کہاں ہیں ذرا ڈھونڈو
مغرور نہ ہو شوکت و حشمت پہ زیادہ — اس دولت و اقبال پہ مت پھولو میاں تم
نے ملک نہ دولت نہ یہ حشم رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

نظم کا بہت بڑا کمال یہ ہے کہ وہ سنجیدہ موضوعوں پر بھی چیزوں سے اس طرح بحث کرتے ہیں کہ اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی بھی موضوع پر اس سے زیادہ سروکار رکھتے ہوں گے۔ دنیا کی فنا اور دنیا کی چند روزہ حیات منطقی نتیجہ وہ پیش کرتے ہیں کہ بغیر تذکرہ وقت ضائع کئے نہیں بیٹھے۔ وہ بحث میں اور اس سے بے تعصب اور لاپرواہ ہو کر زندگی بسر کرنے کی تلقین اس طرح کرتے ہیں:

جھگڑا نہ کرے ملت و مذہب کا کوئی یاں — جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آن
زنار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآں — عاشق تو قلندر ہے نہ ہندو نہ مسلماں
کافر نہ کوئی صاحب اسلام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

نظیر کی اس نظم کا یہ بند الہامی ہے۔ شاعر کی پیغمبرانہ خصوصیات، معلوماتِ عامّہ، بصیرت، دوربینی اور پیشین گوئی کی اس سے بہتر مثال غالباً دنیا کے کسی لٹریچر میں میسر نہیں آ سکتی۔ اس کو دیکھ کر لامحالہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ نظیر ہندوستان کے موجودہ سیاسی تلاطم کو اپنی دوربین نگاہوں سے دیکھ چکے تھے اور اس زمانے کے مذہبی اتحاد کی رہنمائی کے لئے انھوں نے یہ کلیہ وضع کیا تھا۔

/برسات کی بہاریں، فصل اور موسم کے متعلق خاص مشرقی مذاق کی نظم ہے اور شاعر کے طبعی ہندوستانی ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ اس میں جابجا اپنے وطن کی خصوصیات فائقہ کا تذکرہ ہے۔ اس لئے برسات کی بہاریں، مناظر کی دلفریبیاں، سوسائٹی کے مشاغل ساری باتیں ہمارے لئے نہایت دلچسپ ہیں۔ موسم کے تغیر سے روزمرّہ کی زندگی میں جو جو واقعات پیش آتے اور تبدیلیاں ہوتی ہیں سب کا سچا حال اور صحیح مرقع شاعر نے پیش کیا ہے۔ اس نظم میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کی بے سود کوشش نہیں کی گئی بلکہ ہندوستان کی برسات کے قطرے قطرے کے دریا ہونے کا ثبوت دیا گیا ہے۔ نظیر کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آواز سے صورت کی تخلیق اور ترنم سے کیفیت کی صورت گری کرتے ہیں۔ اس نظم میں یہی التزام کیا گیا ہے۔ اس نوع کی مصوری کے لئے انھوں نے جابجا ایسے موزوں اور مترنم الفاظ استعمال کئے ہیں کہ صورت مفہومہ کا سچا منظر اور کیفیت متعلقہ کا سچا اثر باصرے اور سامعے کے لئے پیدا ہو جاتا ہے:-

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں — سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاوٹ قطرات کی بہاریں — ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

سبزے کی لہلہاہٹ، بوندوں کی جھمجھاوٹ، ایسی ترکیبیں ہیں جن میں لہلہاہٹ کے صرف تلفظ سے سبزے کی تازگی، ہلکے دھانی پن اور خفیف جنبش کا سماں بندھ جاتا ہے اور جھمجھاوٹ کے محض ترنم سے بوندوں کے تواتر کی موسیقی سامعہ نوازی کرنے لگتی ہے۔ اس نظم کے تیسرے اور پانچویں بندوں میں بھی اس قسم کی صنعتیں موجود ہیں۔ برسات

کے لطائف کی ہو بہو مگر سادہ اور غیر مصنوعی تصویر اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے۔

جنگل سب اپنے تن پر ہریالی سج رہے ہیں   گل پھول جھاڑ بوٹے کر اپنی دھج رہے ہیں
بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہے ہیں   اللہ کے نقارے نوبت کے بج رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہندوستانی برسات کی دلفریبیاں اس قیامت کی ہوتی ہیں کہ ان میں مبتلا ہو کر کسی شخص کو دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی۔ لیکن نظیر کی رمز شناس بصیرت برسات کے مجازی حسن میں حقیقی جمال کی جھلک دیکھ سکتی ہے۔ وہ حسن مطلق کی ناقابل برداشت جلوہ ریزیوں سے متاثر ہو کر بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں:-

کوئل کی کوک میں بھی تیرا ہی نام ہے گا   اور مور کی زٹل میں تیرا پیام ہے گا
یہ رنگ سو مزے کا جو صبح و شام ہے گا   یہ اور کا نہیں ہے تیرا ہی کام ہے گا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

برسات کی بہاروں میں عشق کے اضطراب اور درد فرقت کا جہاں تذکرہ ہے وہاں بھی ہندی شاعری کی نازک ترین خصوصیت قائم رکھی ہے۔ جنس لطیف کو عاشق قرار دے کر ہجر کی کلفتیں اور پیا سے دوری کی صبر آزما دکھ درد بیان کیا ہے۔ دراصل سے شو کا مرپیائی پپیہوں اور بے قرار برہنوں کی قلبی کیفیات کی مصوری میں جو خوبی ہے وہ تحریر میں نہیں آ سکتی۔ صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔ برسات کا پر لطف لوٹنے والی سنوری نین پریوں کی عیش آمائیاں شوخ و شنگ حسیناؤں کے حسن بے پناہ کا دلفریب مظاہرات شباب اور متوالی ادا والیوں کی پرشکن رنگ رلیاں اگرچہ عشاق کے لئے بجائے خود نہایت مہلک و تباہ کن ہیں لیکن نظیر نے ان کا نقشہ ان پیارے الفاظ میں کھینچا ہے وہ خاص انہی کے حصے کی چیز ہے آپ کہتے ہیں:-

اور جن صنم کے تن میں جوڑا ہے زعفرانی   گلنار یا گلابی یا زرد و سرخ دھانی
کچھ حسن کی چڑھائی اور کچھ نئی جوانی   جھولوں میں جھولتی ہیں اور پڑ رہا ہے پانی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اس بند سے پہلا ایک اور بعد کے دو بند بھی اسی سستم کے ہیں، گو شاعرانہ رنگ غالب ہے اور جوانی کی رندانہ بے باکی اپنی جھلک دکھا رہی ہے مگر جس رنگ میں ہیں محاکات کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں۔ برسات کی مصوری کرنے میں اس کے اثرات اور لازمی نتائج کسی کو نظر انداز نہیں کیا۔ امرا و غربا کے مکانوں کی حالتیں، ان کے طرز معاشرت، سب کا موقعہ بہ موقعہ تذکرہ ہے۔ غرض کہ بیر بہوٹی، کنسلائی، دھتورے، پھنسی، پھوڑا، کچھ بھی ان کی نظر سے نہیں بچا۔ یہاں تک کہ ظرافت کے لئے برسات میں پھسلنے پھسلانے کا بھی حال موجود ہے۔

UR.12

(بنجارے نامہ ایک حکیمانہ تمثیل یا ایلیگری اور ناصحانہ نظم ہے۔ یہ معنوی اعتبار سے نہایت بلند پایہ ہے۔ اس کے پوشیدہ مطالب جس قدر عمیق ہیں اس کی ظاہری دلچسپی اسی قدر نمایاں ہے۔ حقیقی معانی سے قطع نظر کر لیا جائے تو بھی نظم بالذات نہایت لطیف اور مکمل رہتی ہے) میرے نزدیک اس سے زیادہ دقیق و عمیق نظم نظیر کے کلام میں نہیں ہے اور اس پر لطف یہ ہے کہ غالباً اس سے زیادہ مقبول بھی ان کی کوئی نظم نہیں ہوئی۔ اول تو اس کی بحر نہایت مترنم اور حسرت و یاس کے خیالات اظہار کرنے کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔ اس کی روانی و تسلسل سے ایک قسم کا سکون قلب پر طاری ہو جاتا ہے جو فی نفسہ حسرت و یاس کا بڑا معاون ہے۔ دوسرے خیالات اور الفاظ بحر سے اس طرح وابستہ ہیں کہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر یہ نظم کسی دوسری بحر میں لکھی جاتی تو اس میں اتنی دلکشی اور جاذبیت پیدا نہ ہوتی اور نہ اس پر اختراع فائقہ کا اطلاق ہو سکتا تھا۔ علاوہ اس کے کہ شاعر نے بنجارے کی خانہ بدوش زندگی سے انسان کی نقش بر آب ہستی کی تمثیل پیدا کی ہے، اظہار خیال اور مرقع کشی کے لئے الفاظ اتنے موزوں، مناسب اور بچے تلے منتخب کئے ہیں جن کا جواب ناممکن ہے۔ الفاظ کثرت سے استعمال کرنے، غیر مانوس کو مانوس بنانے اور مترادف بہم کرنے کا جو کمال نظیر میں بدرجۂ اتم ہے، وہ اس نظم سے بخوبی عیاں ہو جاتا ہے۔ اس بند کو دیکھئے ا۔

(گر تو ہے لکھی بنجارہ اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
اے غافل تجھ سے بھی چڑتا اک اور بڑا بیوپاری ہے)

کیا شگفتہ مزاجی تند گری کیا سنجیدہ گفتاری ہے   کیا دل کا شوق مذاق کیا سیہ پوشی سیاہ کاری ہے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

عاشق تو ایک خارجی نظریہ ہے۔ داغ کی غزلوں میں نہایت عام ہے۔ اس تصوف سے عقائد و یقین کی جدت کی تشریح اس سے بہتر غالب نہیں ہو سکتی۔ ان نظموں سے تو ظاہر ہے نہایت صداقت سادہ پاکیزہ اور صاف الفاظ میں ہے۔ اول تو نظم کا ہر مصرع بیساختہ ہے لیکن جو چند سطر چوتھے مصرعے میں بیساختگی اور جدت کی انتہا نظر آتی ہے یا ہم چند بند جانے خود اس قدر پر معنی اور مکمل ہے کہ تعجب ہوتا ہے لیکن حقیقت کی تپش کی جو جھلک میں دکھائی جاتی ہے نفاست و لطافت و موزونیت سب سے بڑھ کر ہے۔ ملاحظہ ہو:

ہجران میں ہم راست میں ہر ڈھنگ میں بیچین   عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

نظیر تو دلبر کو ہر آن ہر بات ہر ڈھنگ میں پہچان سکتے ہیں لیکن ٹیگور کہتے ہیں:

"وہ وہاں ہے جہاں کاشتکار سخت زمین میں ہل چلا رہا ہے جہاں سڑک بنانے والے پتھر توڑ رہے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ دھوپ اور بارش میں ہے اور اس کا لباس خاک میں اٹا ہوا ہے۔ اپنا مقدس لباس اتار کے پھینک دے اور اسی کی طرح خاک زمین پر آ جا۔"

دوسری جگہ اسی خیال کو ٹیگور نہایت پُرلطف و رنگین الفاظ میں یوں ظاہر کرتے ہیں:

"کیا تم نے اس کی خاموش آہٹ نہیں سنی؟ وہ آتا ہے، آتا ہے اور ہمیشہ آتا ہے۔ ہر لمحہ اور ہر زمانہ میں، ہر دن اور ہر رات وہ آتا ہے اور ہمیشہ آتا ہے۔

میں نے بہت سے گیت مختلف کیفیات میں گائے ہیں، مگر ان سب کا مضمون ہمیشہ یہی رہا کہ وہ آتا ہے اور ہمیشہ آتا ہے۔

اپریل کے معطر دنوں میں جنگل کے راستے سے وہ آتا ہے اور ہمیشہ آتا ہے۔ جولائی کی برسات کی اندھیری راتوں میں بادلوں کے رتھ پر وہ آتا ہے اور ہمیشہ آتا ہے۔

تو اہتر الم کی حالت میں اسی کے قدم ہیں جو میرے دل کے اندر گرد جاتے ہیں اور اسی کے قدموں کا زریں مس ہے جو میری مسرتوں کو درخشاں بنا دیتا ہے۔"

شخصیتوں کا مقابلہ ایک ناپسندیدہ سی کوشش ہے لیکن اتنا بتا دینا نہایت دلچسپ ہوگا کہ ٹیگور کی اس نظم کے بہت خیال کا مترادف عاشق نامے میں مل سکتا ہے۔ دونوں نظموں کو ساتھ پڑھنے سے بہت لطف حاصل ہوتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کے محاسن پر خوب روشنی ڈالتی ہیں۔

(آدمی نامہ ایک قسم کی فلسفیانہ نظم ہے جس میں انسانی سوسائٹی کے مختلف و متباین مراتب دکھائے گئے ہیں۔ نظیر چونکہ انسان کے مذاق اور معاشرت کے شیدائی ہیں اس لئے وہ یہ نظم کہنے پر مجبور ہوئے وہ دیکھتے ہیں کہ ہر متنفس فطری اعتبار سے اور خدا کے نزدیک بھی ایک ہی سی حیثیت رکھتا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ دنیوی اعتبار سے ہر شخص برابر اور حیثیت و شان میں یکساں نہ سمجھا جائے۔ اپنے خیال اور مطمح نظر کے خلاف "مراتب میں اختلاف اور حیثیات میں فرق دیکھ کر انھیں خاص تعجب ہوتا ہے۔ اس لئے وہ انسانی معاشرت اور مشاغل کے مختلف پہلو ایک جگہ جمع کر کے دکھلاتے اور اہل امیرت کی توجہ دنیا کے واقعات کی گوناں گونی کی طرف مبذول کرنے کے لئے کہتے ہیں:-

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی — اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی — نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی)

ایک شخص کو بادشاہ اور دوسرے کو ٹکڑے چباتا دیکھ کر خداوند عالم کے ناقابل درک و فہم رموز کا احساس ہونے لگتا ہے اور شیت کا لاینحل پہلو پیش نظر ہو جاتا ہے۔ اس نظم کی سادگی، شستگی اور روانی میں ادب اللہ ما کی سی جھلک پائی جاتی ہے اور نظیر کی بیساختہ گوئی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ نظم اس قدر مسلسل، بے تکان اور بے تصنع ہے کہ مصرعوں پر نثر کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اگر مصرعے کی نثر کرنا چاہیں تو الفاظ کی نشست و

ترتیب دینے کی ضرورت نہ پڑتی لیکن نظیر کا یہ خیال ہوا کہ سوائے [illegible] کے جب کوئی شعر پیدا کرنا
سعدی سے بھی آدمی نامے کی مثال ایک نظم [illegible] صنعت کی تحقیق [illegible] میں ملتی ہے نظیر اور سعدی کی دونوں اساتذہ
کا موضوع ایک ہی ہے لیکن نظیر نے صنعت کو مخصوص کرنے کے لئے آدمی کو اس کا نقطہ قرار دے لیا
ہے یہ انتخاب بہتر ہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نظیر کی نظم بہت زیادہ بسیط اور جامع ہے سعدی کی اتنی نہیں
سعدی فرماتے ہیں:

یکے [illegible] بادشاہ   یکے دادخواہ و یکے تاج خواہ
یکے تاجدار و یکے [illegible]   یکے سرفراز و یکے خاکسار
یکے بے نوا و یکے مالدار   یکے نامراد و یکے کامگار

آدمی نامہ جیسی سنجیدہ نظم میں کہیں کہیں ظرافت کا چٹپٹا پن بھی موجود ہے اور کیوں نہ ہو شاعر کا فطری چلبلا پن
کسی طرح چھپائے نہیں چھپ سکتا۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں

نظیر صرف [illegible] نماز پڑھنے گئے ہوں گے جوتا [illegible] ہوگا۔ کوئی صاحب
موقع دیکھ کر اڑا لے گئے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی دوسرے کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہو اور یہ اس
وقت دیکھ رہے ہوں۔ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

چلتا ہے آدمی ہی [illegible] مسلسل [illegible]   [illegible] میں ڈال

ان شعر کا کسی قدر [illegible] تعلق معلوم ہوتا ہے۔ نظیر کے زمانے میں [illegible] کی [illegible]
تھی [illegible] اس وقت [illegible] کی تحقیق [illegible] یہ [illegible] زمانہ
[illegible] تھے [illegible] میں [illegible] تھے [illegible]
[illegible] میں [illegible] اس طرف اشارہ ہے

ہنس نامہ ایک مشہور حکیمانہ تمثیل یا ایلیگری ہے۔ اس میں دو نصیحتیں پہلو بہ پہلو کی گئی ہیں۔ پہلی اور بالکل نمایاں تو یہ ہے کہ انسان کی زندگی عارضی ہے۔ جب وہ دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو تن تنہا جاتا ہے۔ کوئی دوسرا خواہ کیسا ہی ہمدم اور رفیق ہو ساتھ نہیں دیتا۔ دوسری سطح سے کسی قدر نیچی یہ ہے کہ محبت سے اس قدر مغلوب نہ ہونا چاہیے کہ اپنی حقیقت اور ماہیت نظروں سے پوشیدہ ہو جائے قبل اس کے کہ تجربہ نااہل ثابت کرے ہمیں خود اپنی طاقت کا اندازہ کر لینا چاہیے۔ اب ہنس نامے کی داخلی شعریت کو لیجیے۔ اس کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک تو ناصحانہ جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا اور دوسرا حاکیانہ۔ نظم میں حکایت یہ ہے کہ ایک ہنس نے کسی شہر سے آ کر ایک پیڑ کی کسی شاخ پر اپنا گھر بنا لیا۔ اس شجر پر رہنے والے جتنے پرندے تھے، سب کو چند روز میں اس سے کمال محبت ہو گئی۔ آخر کار ہنس کے وطن جانے کا دن آیا۔ پہلے تو پرندوں نے اس بات کو باور کرنا نہ چاہا لیکن جب یقین ہو گیا کہ یہ کسی طرح نہیں رک سکتا تو اس کی محبت نے یہاں تک مجبور کیا کہ اس کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ ہر ایک اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق اس کے ساتھ اڑا۔ آخر کو سب نے تھک تھک کر رفتہ رفتہ رجوع کیا اور ہنس اکیلا ہی سدھارا۔ اس نظم کی ایک بہت بڑی ظاہری خوبی یہ ہے کہ طیور کے نام اس میں کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں۔ ایک مقام پر اتنے نام اردو میں غالباً کہیں نہ ملیں گے۔ اس سے شاعر کی عام واقفیت اور زبان دانی کا کمال ثابت ہوتا ہے۔ مزید معنوی خصوصیت یہ ہے کہ مختلف اقسام کے پرندوں سے مختلف قسم، خیال، مزاج، ہیئت اور طبائع کے انسان مراد ہیں۔ ہر طائر کی حیثیت و اہلیت کے مطابق اس کے ساتھ اوصاف منسوب کئے گئے ہیں۔ وہ جس خدمت کی صلاحیت رکھتا ہے وہی اس سے وابستہ کی گئی ہے۔ مثلاً بلبل چونکہ چھوٹی چڑیا اور بہار کی مغنیہ ہے اس لئے اس کے سپرد گانے کا کام ہے۔ کوے اور کوئل کے دل میں ہنس کی محبت دکھائی ہے اس لئے کہ یہ ہمیشہ سے ناکام اور ازل سے اہل درد ہیں۔ کلنجن اور کلنگ چونکہ بڑے جثے کے پرندے ہیں اس لئے وہ جنگ بجانے پر مامور ہیں۔ سیمرغ ایک عالی حوصلہ اور پر احتشام پرندہ ہے اس کی عظمت اس طرح

قائم رکھی ہے کہ وہ ... ہوا گو وہ ... چونکہ ... اس لیے اُسے پنکھا جھلنے کا کام دیا گیا ہے۔ غرض جس ... کی حیثیت اور ... خدمت تھی وہ ... دکھائی گئی ہے۔ آٹھویں اور نویں بندوں میں چڑیوں کی ... امن و سکون ... کا نقشہ پیش کیا ہے۔ لیکن دسویں اور گیارہویں بندوں میں لطف و ... ہوتے ... دل پر رقت ... کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جس وقت انسان مرنے لگتا ہے اور اس کو ... ہونے کا یقین ہو جاتا ہے تو اس قسم کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ کسی سے تقصیر معاف کراتا ہے کسی سے رخصت ہوتا ہے اور کسی کو وصیت کرتا ہے۔ غرض کہ عجب پُر حسرت سماں ہوتا ہے جس کے ... سے ... نظر آتا ہے۔ ... اس وقت انس کی دکھائی ہے۔ اس کے بعد پرندوں کا اضطراب ... کیفیت ہے جو ... کے مرجانے کے بعد ہوتی ہے۔ آخر کے پانچ بندوں ... پرندوں کی ... زندگی ... کی حسرت سے دکھائی ہے۔ آخر کے بند میں ساری نظم کا ماحصل ہے۔ فرماتے ہیں:۔

دنیا کی جو لذت ہے ... پھر ... ...
ناچاری ہو جس جا تو وہاں ... ...
آخر کے تئیں ... ...

روضۂ ... گنج ... عورت کے متعلق ہے اس سے ... کہہ سکتے ہیں۔ نظم کا لہجہ ... ہے۔ اس میں ... رنگ اپنے ... کے ساتھ موجود ہے۔ ... شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ کہیں ... سے ... نہیں ... عورت ... تصویر ... ہے۔ ... دیہاتی ... ہے کہ ... رنگ آمیزی ... نہیں کر سکتیں۔ ... کی سادہ ... فطرت کی ... سے ... نہیں ... سکتے ہیں:

... ...

ہر ماہ جس کے غم پہ مہ نو نثار ہے

اس کے بعد کے بند کی لطافت بار بار پڑھنے سے اور زیادہ بڑھتی اور دوبالا ہوتی ہے۔ آگے چل کر عمارت کی صناعیاں الفاظ میں منتقل کی ہیں اور محاکات کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ یہ قادر الکلامی کی انتہا ہے کہ سنگ تراشی کے نازک ترین نمونے اور کامل ترین صنعتیں کاغذ پر دکھائی ہیں۔ دیکھئے :-

ہیں بیچ میں مکان کے وہ دو مرقد میں جو یاں   گرد ان کے جالی اور محجر ہے درفشاں
سنگین گل جو اس میں بنائے ہیں تا نشاں   پتے کلی سہاگ رگ و رنگ ہے عیاں
جو نقش اس میں ہے وہ جواہر نگار ہے

آخری سے پہلے دو بند باغ کی تعریف میں ہیں جن کو پڑھنے سے غیر معمولی شگفتگی پیدا ہوتی ہے اور طبیعت نہایت تر و تازہ ہو جاتی ہے۔ کسل و انقباض کے لمحوں میں اس نظم سے بہتر رفیق کوئی نہیں ہو سکتا۔ تمام تکدر اور اُداسی آن واحد میں فرو ہو جاتی ہے۔ میرے نزدیک شعر کا یہ بہترین فریضہ ہے اور اسی کا نام شاعری کا کمال ہے۔

۳ تندرستی نامہ ایک اعلیٰ درجہ کی ناصحانہ نظم ہے جس کی ابتدا واعظانہ انداز میں ہوتی ہے۔ اس میں اول سے آخر تک یہ جتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دنیا میں آبرو اور تندرستی دونوں بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ آگے چل کر اسی خیال کو وسیع کیا ہے جا بجا اسی کی تشریح کی ہے اور مختلف مثالیں دے کر سمجھایا ہے۔ زبان کے اعتبار سے یہ نظم نہایت صاف ہے۔ البتہ کہیں کہیں متروک الفاظ کا استعمال ہے۔ دیکھئے یہ بند حقیقت کا کیسا سچا مرقع ہے :-

ہوں گرچہ لاکھ دولتیں بسیار کے کنے   اور نعمتوں کے ڈھیر لگے ہوں سب بنے ٹھنے
بہتر ہیں مفلسی کے میاں جا سب بنے ٹھنے   جو تندرست ہیں وہی دولہا ہیں اور بنے
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست

اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

اس بند کی معنویت و صداقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ علالت میں کوئی چیز بھلی نہیں معلوم ہوتی اور تندرستی میں اگر سوکھی روٹی بھی ہو تو شیر و شہد کا مزہ دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سعدی سا حقیقت شناس حکیم تندرستی کو لوازم حیات میں نہایت ضروری سمجھتا ہے:

اے خالق ہر بلند و پستی   شش چیز عطا کن ز ہستی
علم و عمل و فراغ دستی   ایمان و امان و تندرستی

ذکر عرفان ایک پر معنی اصولی نظم اور ادب بالکل نئی چیز ہے۔ یہاں نظیر نے اپنے وجود اور خلاق ہونے کا ثبوت دیا ہے اور شاعرانہ و منطقیانہ رنگ کا پورا کمال دکھایا ہے۔ وہ ہر شام و سحر طیور اور حشرات الارض کی آوازوں میں نغمۂ وحدانیت سنتے اور اسے صوت سرمدی کی آواز بازگشت سمجھ کر اس پر وجد کرتے ہیں۔ حافظ نے اپنی ہستی کو عارفانہ منفیت کا مترادف قرار دے کر کہا ہے:

در چمن امشب نوحی عندلیب آشفتہ شد   [illegible]

نظیر کا خیال ہے کہ خدا جو کچھ مجھ سے کہواتا ہے میں چڑیوں کی طرح کہتا ہوں۔ یہی نظیر اپنی وہ ذکر خوشی محسوس کر کے چڑیوں کی حالت پر رشک اور اپنی غفلت پر افسوس اور ندامت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کس کس طرح کا اس نام میں ہیں جتنے جانور دیکھو   وہ سب سے ہیں توانا ذکر وقت سحر رب قدیر
قادر و سب یا کریم اور ہم غفلت میں ڈوبے پڑے   ہم سا غافل نہیں ہے سب کوئی نہ ہوگا اے نظیر

سنا جو میں سویرے چڑیاں ہیں کرتی چوں چوں کرتی ہیں
جو بولیں چوں چوں سب تیری چوں چوں کرتی ہیں

غالباً اسی قسم کے کسی جذبے نے نظیر کے دل میں یہ صورت اختیار کر لی ہے جس کا اظہار اس پیرائے میں ہوا ہے:

"جب تو مجھے گانے کا حکم دیتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا قلب اس لطف پرستش کی سمائی اپنے دل میں نہ پاکر فخر و غرور سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، میں تیری صورت دیکھتا ہوں اور میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

جو کچھ میری زندگی میں سخت و کرخت ہے، ایک شیریں نغمۂ واحد کی صورت میں رقیق ہو کر تبدیل ہو جاتا ہے اور میری پرستش اس مسرور طائر کی طرح جو سطح سمندر پر اڑ رہا ہو اپنے بازو پھیلا دیتی ہے۔ میں جانتا ہوں تو میرے گانے میں دلچسپی لیتا ہے، میں جانتا ہوں کہ صرف ایک مغنی کی حیثیت سے میں تیرے حضور میں آتا ہوں۔

میں اپنے وسیع البسط بازوئے نغمہ کے کنارے سے تیرے قدموں کو چھو لیتا ہوں، جن تک پہنچنے کا حوصلہ میں کبھی نہیں کر سکتا تھا،

مسرت سرود سے سرشار ہو کر میں اپنے تئیں بھول جاتا ہوں اور تجھے اپنا دوست کہتا ہوں حالانکہ تو میرا مالک و آقا ہے۔"

ذکر مرغان میں معنوی محاسن کے علاوہ لفظی و شعری صنائع بھی ہیں۔ ایلیٹریشن (یعنی ایک حرف سے شروع ہونے والے الفاظ کا بالالتزام ایک مصرع میں آنا) کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ نظم کو ذرا لحن کے ساتھ پڑھنے سے نہایت خوش گوار ترنم پیدا ہوتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔

((فنا نامہ ایک عبرت مندانہ نظم ہے۔ میاں نظیر کو جو دلچسپی تاریخ سے تھی وہ اس نظم سے صاف ظاہر ہے۔ پوری نظم اول سے آخر تک عبرت کا ایک بسیط اور پُر درد سبق ہے) اہل بصیرت کے لئے اس سے زیادہ سامان پند و نصیحت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتا (اس کی زبان نہایت صاف ہے لیکن خال خال قدیم اصطلاحوں کا استعمال ہے جو اس وقت غیر مانوس معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کا استعمال ناگزیر تھا۔ مثالوں اور تشبیہوں میں ہند و مسلم جذبات کا توازن قائم رکھا ہے۔ پوری نظم سنجیدہ خیالات عبرت آموز واقعات اور سود مند

پند و نصائح کا ایک پرمعنی چمن ہے جس میں عبرت کے پھول جا بجا کھلے ہوئے ہیں) حق یہ ہے کہ حوادث اور تغیرات عالم کا اس سے بہتر اور موثر الفاظ میں تجزیہ بہت دشوار بلکہ محال ہے۔ دیکھئے یہ بند کیسے کیسے اولوالعزم راجاؤں اور عالی نسب فرماں رواؤں کے قدیم واقعات یاد دلاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا اب صرف نام ہی نام دنیا میں باقی رہ گیا ہے:-

اک راج بھی ہو کر دنیا میں ان پر ۔۔۔ چھتر گردوں سے ۔۔۔ لاکھوں بنایا
جب توپ نے اجل کی آ کر چھوڑ لگایا ۔۔۔ سب ڈھنگ ہوا پر کوئی نہ کام آیا
گولہ ہوا کوٹ توپ گولہ سنگ ہو اڑ پھر گیا

طفلی کے عنوان سے جو نظم ہے وہ نہایت پاکیزہ، سادہ اور فطری جذبات سے لبریز ہے۔ ہندوستانی شعرا میں ایسے بہت کم ہیں جنھوں نے جوانی کے علاوہ دوسرے حصۂ عمر پر نظر ڈالی ہو، ورنہ سب نے عاشقانہ جذبات محبت کے اور صرف محبت سے ہی متاثر ہوئے ہیں۔ اس نظیری ہمہ گیری نے ان پہلوؤں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ طفلی میں ہندوستانی نقطۂ نظر بھی موجود ہے (دوسرے ممالک کے بچوں پر بھی صادق آتی ہے) ہندوستانی بچوں کی معاشرت، ان کے ناز و نخرے، پرورش کئے جانے کے حالات اور بچوں کے متعلق والدین کے جذبات کا صحیح نقشہ اس میں موجود ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بچپن نکل جانے کے بعد جب دنیا کے آلام و مصائب انسان کو گھیر لیتے ہیں تو طفلی کی سب فکروں سے آزادی یاد آتی ہیں) اور بے اختیار اس کے منہ سے نکل جاتا ہے:-

کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

اس نظم کی زبان بہت صاف ہے لیکن کہیں کہیں متروک الفاظ جیسے "دوال" "گھرانا" "وٹے" وغیرہ کا استعمال ہے۔ دیکھئے بچوں کی بے فکری زندگی و معاشرت کس طرح کھینچی ہے:-

بوا ان کو دو مٹھائی چیکا ہو یا کھلونا ۔۔۔ جی بہلے جب تک ۔۔۔ کھلونا

جس جا پہ نیند آئی پھر واں ہے ان کو سونا　　پروانہ کچھ پلنگ کی نے چاہیے بچھونا
ہو نیند کوئی بجا لے پھرکی کوئی نچا لے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

اس محبت بھری نظم کا جو ہر صاحب اولاد کے نازک ترین حسیات کو برانگیختہ کرتی ہے، اس سے بہتر کیا خاتمہ ہو سکتا ہے :-

جیتے رہیں سبھوں کے آس و مراد والے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

جوانی عاشقانہ وجوانانہ نظم ہے اور رندانہ لہجے میں لکھی گئی ہے۔ یہ نظم جوانی دیوانی کی کرشمہ سازیوں سے سرتاپا لبریز ہے اور اس میں انسانی فطرت کے خلاف ایک حرف نہیں بتایا جا سکتا۔ اس نظم میں شباب کی بے لگام عیش سامانیوں اور بے حجاب لطف اندوزیوں کا منظر تو پیش نظر کیا ہی گیا ہے لیکن بیان کی بیساختگی و بے باکی نے اس نظم میں ایک خاص کیفیت اور لطف مکرر پیدا کر دیا ہے۔ انداز بیان میں اگر ثقاہت یا سنجیدگی سے کام لیا جاتا تو عنوان کی پوری پوری داد دی جا سکتی تھی۔ فطری جذبات کی فطری داد صرف فطری شاعر ہی دے سکتا ہے اور صرف وہی فطری لطف برانگیختہ کر سکتی ہے۔ جوانی وہ عمر ہے جس میں انسان اندھا ہوتا ہے اور اس میں جو کچھ نہ کر بیٹھے تھوڑا ہے۔ شباب کی کارفرمائیاں کہاں تک گنوائی جائیں، ہر شخص اپنے دل سے پوچھ لے کیا حالت ہے :-

لڑتی ہے کہیں آنکھ کہیں دست کہیں سین　　چھوٹا ہے کہیں پیار کسی سے ہیں لگے نین
وعدہ کہیں اقرار کہیں سین کہیں نین　　نے جی کو فراغت ہے نہ آنکھوں کے تئیں چین
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

یہ نظم حقیقت میں کسی تبصرے کی محتاج نہیں۔ یہ بات اس قدر صاف ہے کہ کسی تشریح اور وضاحت کی حاجت باقی نہیں رہ گئی۔ آرٹ اگر عریانی کا نام ہے تو یہ نظم اس کا بہترین مظاہرہ ہے۔

بڑھاپے کی نظم بہت سے عناصر کا مجموعہ ہے۔ آزردگی، خوش طبعی، ظرافت، رندی تو ایسے اجزا ہیں جو سطح پر نظر آتے ہیں لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو ساری نظم عبرت کا نہایت پر تاسف و دردانگیز مرقع ہے۔ جوانی میں جو باتیں جزو فطرت اور طبیعت ثانیہ ہو جاتی ہیں وہ پیری میں بہ مشکل چھوٹ سکتی ہیں لیکن زمانہ ان کو جائز نہیں رکھتا اور عمر ان کی اجازت نہیں دیتی۔ بڑھاپے کی تکلیفیں خود ہی کیا کم ہوتی ہیں۔ اس پر بلا ستم ہے کہ مشاغل لطف و مسرت سے بھی ہاتھ اٹھا لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ دست کش ہونا ہوتا تو اپنے ہاتھ کی بات ہے لیکن اس وقت تو یہ مجبوری آ پڑتی ہے کہ عیش و عشرت خود بڑھے کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ دل تو لاکھ چاہتا ہے کہ جوانانہ افعال اس سے سرزد ہوں لیکن دیکھنے والے ان کا اعتراف نہیں کرتے۔ اعتراف کی بجائے ان کا تو یہ حال ہے کہ:

نقلیں کوئی ان بوڑھے ہونٹوں کی بنا دے چل کر کوئی کبڑے کی طرح قد کو جھکا دے
ڈاڑھی کے تلے انگلی کو لا لا کے نچا دے یہ خواری تو اللہ کسی کو نہ دکھا دے

سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

ع عشق جو کرتے ہیں سنتے ہیں جوان مر جاتے ہیں لیکن اگر کوئی عاشق بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس غریب کو جیتے جی موت آ جاتی ہے۔ قویٰ ضرور بوڑھے ہو جاتے ہیں مگر دل تو جوان رہتا ہے۔ اس کی وہی حالت رہتی ہے مگر حالات بدل جاتے ہیں۔ پس اس کو جو جو مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں اس کا دل خوب جانتا ہے کہ حق ہے

حسن بے نیاز باشد عشق بے نیاز نیست

نظیر کی یہ نظم نہایت مشہور و مقبول ہے اور آرٹ کے اعتبار سے ممتاز ہی نہیں بلکہ اختراع فائقہ سمجھی جاتی ہے۔ شہباز لکھتے ہیں کہ یورپ میں خصوصاً بہت مقبول و دلپسند ہے۔ ڈاکٹر فیلن بھی اس کے بڑے مدّاح ہیں۔

فقیروں کی صدا ایک ناصحانہ نظم ہے جس کا لہجہ قلندرانہ ہے۔ نظم کا تخاطب بوڑھوں سے ہے اور مضمون مختصر طور پر یہ ہے کہ اب زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں ہر لحہ موت کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ دنیا کے جس قدر تعلقات ہیں اُن کو ختم کرو اور عقبیٰ کی فکر میں لگو۔ نظم کو پڑھ کر حسرت و یاس کے جذبات کا ہجوم ہوتا ہے اور دل بے اختیار بھر آتا ہے۔ زندگی کا اختتام اور موت کا قرب کچھ ایسے پُر اثر، مناسب حال، اور موزوں الفاظ میں بیان کیا ہے جس سے بے بسی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں :-

یہ عمر جسے تم سمجھے ہو یہ ہر دم تن کو چُنتی ہے   جس لکڑی کے بل بیٹھے ہو دن رات یہ لکڑی گھُنتی ہے
تم گٹھڑی باندھو کپڑے کی اور دیکھو اجل سر دُھنتی ہے   اب موت کفن کے کپڑے کا یاں تانا بانا بُنتی ہے
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

اس نظم میں ایک اور خاص لطف یہ ہے کہ موت کے قرب کے علامات بیان کئے ہیں اور وہ جون بنین کی مشہور تمثیلی تصنیف "پلگرمس پروگریس" کے بعض مقامات سے ملتے جلتے ہیں۔ جن حضرات نے اس کتاب کو پڑھا ہے وہ سمجھ لیں گے کہ کرسچین اور اس کی زوجہ کے علامات مرگ ذیل کے بند سے کس قدر یگانگت رکھتے ہیں :-

سر کانپا چاندی بال ہوئے منہ پھیلا پلکیں آن جھکیں   قد ٹیڑھا کان بھئے بہرے اور آنکھیں بھی چندھیا گئیں
سُکھ نیند گئی اور بھوک گھٹی دل سست ہوا آواز نہیں   جو ہونی تھی وہ ہو گزری اب چلنے میں کچھ دیر نہیں
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا

اب موت نقارہ [illegible] چلنے کی فکر کرو ۔۔

اب شاعر کی طبیعت ملاحظہ فرمائیے ۔ ایسی نازک حالت اور ایسے پر آشوب وقت میں اعمال صالح اور اخلاق حسنہ کی تلقین کرتا ہے ۔ انہیں خیالات کے تحت اس نظم میں موت سے استعارہ کیا ہے اور دل سے آخر تک اس خوبی سے [illegible] ہے ۔ اب ذرا دل کو متوجہ فرمائیے ایسی خشک اور سنجیدہ نظم میں بھی ظرافت سے باز نہیں رہتے ۔ چنانچہ ملاحظہ کیجئے :

خوشامد ایک [illegible] نظم ہے جس سے نظیر کی عالی ظرفی اور وسعت خیال کا ثبوت ملتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] بہت اچھی طبیعت پائی تھی اور [illegible] وہ [illegible] ان سب [illegible] اس نظم سے [illegible] اخلاقی تلقین بھی ہوتی ہے ۔ خوشامد سے [illegible] کمینوں کی طرح [illegible] خوشامد کرے اور اپنے کو اس قدر گرا دے کہ خود داری ہاتھ سے جاتی رہے ۔ اس کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں نمونہ ایک بڑا [illegible] کو عمل کرتا ہے جس سے [illegible] دوسرے لفظوں میں [illegible] شاعر [illegible] رہتے اور [illegible] ہے ۔ [illegible] خوشامد [illegible] کرنے والے کی سوسائٹی بڑی عادت کرتی ہے :

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ایک [illegible] سے پوری مطابقت [illegible]

[illegible]

[illegible]

سامنے پھرتا دیکھنے لگتا ہے۔ جس شاعر نے نظیر کی طرح تقریباً ایک صدی دنیا میں رہ کر اس کے نشیب و فراز کو دیکھا اور باہمی تعلقات کو برتا ہو وہی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ دنیا جائے مکافات ہے۔ اس میں جو جیسا کرے گا ویسا پائے گا:-

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی ساتھ لے　　نیکی کا بدلہ نیک ہے بد سے بدی کی بات لے

اس نظم کی بہت بڑی اور بڑی اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں افعال کا توازن نمایاں کیا ہے۔ یعنی یہ کہ جس قسم کی نیکی کروگے اسی قسم کا معاوضہ ملے گا۔ جس انداز کی برائی پر کمر باندھوگے اسی طرز کا بدلہ سہنا پڑے گا۔

میوہ کھلا میوہ ملے، پھل پھول دے پھل پات لے　　آرام دے آرام لے دکھ درد دے آفات لے

اظہار خیال اور نیک و بد افعال کی مصوری کے لئے جیسے مناسب جملے تلاش کئے ہیں وہ بجائے خود قابل داد اور کانٹے کے تلے ہوئے ہیں۔ ہر ٹکڑا اپنے مقام پر شاعر کی تلاش اور قادر الکلامی کا بیّن ثبوت ہے۔ بحر ایسی ہے جس کا ترنم مغنیٔ فطرت نے خاص اسی نظم کے لئے خلق کیا ہے۔

کانٹا کسی کے مت لگا گر مثل گل پھولا ہے تو　　وہ تیرے حق میں زہر ہے کس بات پر پھولا ہے تو
مت آگ میں ڈال اور کو پھر گھانس کا پولا ہے تو　　سن رکھ یہ نکتہ بے خبر کس بات پر پھولا ہے تو

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہات لے

نظیر کے ناصحانہ کلام میں، یہ نظم میرے نزدیک ہر اعتبار سے فوقیت رکھتی ہے۔ اس کے بیش قیمت نصائح اس قابل ہیں کہ ہم انہیں اپنے بچوں کے نصاب تعلیم میں داخل کریں تاکہ انھیں خوش اخلاقی اور نیک کرداری کی تلقین ہو اور وہ آئندہ زندگی میں دنیا کے انقلابات اور عالم کے تغیرات سے ڈرتے رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اعمال کی سزا و جزا کی تشریح اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ لقمان نے جو نصیحت اپنے عارضی آقا کو کرنے کے لئے مدت تک موقعے کا انتظار کیا وہ نصیحت نظیر ان سادہ الفاظ میں کرتے ہیں۔

زبان کی سادگی اور عام فہمی کی کہاں تک تعریف کی جائے۔ سنئے:-

جو اور کو پھل دیوے گا وہ بھی سدا پھل پاوے گا | گیہوں سے گیہوں جو سے جو چانول سے چانول پاوے گا
جو آج دیوے گا یہاں ویسا وہ کل واں پاوے گا | کل دیوے گا کل پاوے گا کل پاوے گا کل پاوے گا

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

مفلسی مصورانہ نظم ہے لیکن موضوع مصوری چونکہ دلچسپ نہیں اس لئے نظم میں کوئی خاص لطافت و جاذبیت پیدا نہیں ہوئی۔ نظیر کے کلام میں یہ ایک معمولی سی نظم ہے۔ اس میں کوئی خاص حسن شعری نہیں۔ نہ تخیل کا عمق ہے نہ الفاظ کی رنگینی مگر سادہ الفاظ میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ واقعات کا بالکل صحیح عکس ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ ہر چیز کا صحیح اندازہ تجربے کے بعد ہوا کرتا ہے۔ دنیا کی بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو بہت سے لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے اس لئے کہ وہ کبھی ان کے تجربے میں نہیں آتیں۔ مثلاً ایک دولتمند جو ہمیشہ عیش و عشرت میں بسر کرتا رہا ہے عسرت اور مفلسی کی تکالیف سے ہرگز واقف نہیں ہو سکتا۔ میاں نظیر نے اس موقعے پر کتنا سچ فرمایا ہے:-

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی | کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی | بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی

یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

دلچسپ عنوان اور رنگین موضوع پر نظم کو مقبول اور دلچسپ بنا دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ دوسرے درجے کے شعرا بھی ایسا کر لیتے ہیں لیکن خشک مضامین میں شعریت پیدا کرنا طبقہ اول کے اساتذہ کا کام ہے۔ اس قسم کی نظموں سے میاں نظیر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہر چند وہ مفلس نہ تھے بلکہ برخلاف اس کے نہایت فارغ البالی و بے فکری سے بسر کرتے تھے لیکن پھر بھی انھوں نے مفلسی کی حالت اس

خوبی سے لکھی ہے گویا خود اُن پر یہ حالت گزر چکی ہے۔ اس نوع کی مصوری شیکسپیر کی خصوصیت کبریٰ سمجھی جاتی ہے لیکن نظیرؔ میں بھی کمال کے ساتھ موجود ہے۔ یہ کہنا کہ یہ نظم بیساختہ اور بے تصنع ہے نظیرؔ کے لئے کوئی ستائش نہیں لیکن اس کے علاوہ اس نظم کے اور بھی محاسن ہیں اور وہ مجملاً یہ ہیں کہ باوجود طویل ہونے کے اس میں بدمزگی یا تواردنہیں ہر جگہ ایک نیا خیال نظم کیا گیا ہے اور جو خیال جس موقعے پر ہے اس کا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ زبان بہت صاف ہے اور متروکات کا استعمال شاذ ہے۔ یوں تو مفلس کی مجبوریاں ہر جگہ نہایت افسوس ناک ہیں لیکن یہ بند کس قدر دل شکن اور پُر درد ہے۔ اس کے علاوہ انسانی فطرت کا کیسا حقیقی اور غائر مطالعہ ہے :-

رکھتی نہیں کسی کی یہ غیرت کو آن کو — سب خاک میں ملاتی ہے حرمت کی شان کو
سو محنتوں میں اس کی کھپاتی ہے جان کو — چوری پہ آکے ڈالے ہے مفلس کے دھیان کو
آخر ندان بھیک منگاتی ہے مفلسی

معجزہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک عقیدت مندانہ نظم ہے اور اس کا اختتام سپاس مندانہ الفاظ میں ہے۔ اس معجزے کی واقعیت کا کوئی پتہ نہیں چلتا، اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ معجزہ واقعی ہوا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نظیرؔ تک اس کی اطلاع کیونکر پہنچی اور راوی کس حد تک معتبر ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ معجزے کا واقعہ نظیرؔ کی خیال آرائی کا ثمرہ ہے۔ لیکن جس ذات سے یہ معجزہ منسوب کیا جاتا ہے اس سے ایسے ایسے بے شمار معجزے ظہور میں آئے ہیں، اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ نظیرؔ کا خیال بے بنیاد یا خلاف عادت واقعے کی طرف رجوع ہوا۔ بہر حال ہمیں اس سے بحث بھی نہ ہونی چاہیئے، کیونکہ یہ کام وقائع نگاروں اور مورخوں کا ہے۔ ہمیں تو صرف شاعرانہ اعتبار سے نظم پر نگاہ ڈالنی ہے۔

معجزے کی ابتدا بالکل اس طرح ہوتی ہے جس طرح کوئی شخص بیٹھا ایک جماعت کے سامنے کچھ بیان کر رہا ہے۔ کسی واقعے یا قصے کے شروع کرنے کا یہ بہترین طریقہ ہے :-

سنتے ہو اے علی کے محبان دوستدار — اک ماجرا میں کہتا ہوں اس شہر کا آشکار
ہے تازہ واردات یہ از نقل روزگار — تھا کوئی شخص دولت و حشمت میں نامدار
اک روز وہ گیا تھا کہیں کھیلنے شکار

دوسرے بند میں شیر اور شیرنی کے مسکن کا نقشہ ہے۔ تیسرا بند اس قدر پُر اثر ہے کہ بے اختیار جی بھر آتا ہے۔ اول کے دو مصرعوں سے شیرنی کی بے فکری اور مسرت کا اظہار ہوتا ہے اور آخر کے تین مصرعوں سے غم کی پوری کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ آخر کا مصرع خصوصاً نہایت پُر درد ہے۔ بہائم کے بچے حالانکہ جنگل میں اکیلے رہتے ہی ہیں ان کا ماں باپ سے چھوٹ جانا بھی کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن شاعر کے انداز بیان نے منظر کو اس قدر پُر درد بنا دیا ہے کہ یہ سن کر بچے جنگل میں اکیلے رہ گئے کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ جب شیر و شیرنی [illegible] تباہ ہو کر پہنچ گئے اور دونوں بچے گھر میں نہ دیکھے تو شیر سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ غش کھا کے گر پڑا لیکن شیرنی نے جو قصد کیا اس سے بڑی عالی ہمتی کا ثبوت ملتا ہے۔ اور مامتا کی فوقیت اور نسائیت [illegible] ضبط و تحمل کی برتری اس طرح دکھائی ہے:

وہ شیر تو غش کھا کے گرا [illegible] — اور شیرنی نے [illegible] کی [illegible]
سیدھی چلی وہ [illegible] سے سوگوار

آگے چل کر شیرنی کی نیت اور بے کسی کی تصویر جن پُر درد الفاظ میں کھینچی ہے وہ آپ اپنی مثال اور دل ہلا دینے والی چیز ہے۔ شیرنی کے دفعتہً [illegible] میں پہنچنے سے [illegible] ساتھ ہی [illegible] اس کے بیان میں خوف و دہشت کے مقامات کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ [illegible] پہنچنے کے بعد شیرنی کی حالت [illegible] شریفوں کا [illegible] شیرنی کی حالت [illegible] مقدس [illegible] سے [illegible] بچے [illegible] والے [illegible] ہونا [illegible] سے [illegible] شیرنی

کا اظہار سپاس واحسانمندی، یہ تمام واقعات اس خوبی کے ساتھ بیان کیے ہیں جن کا لطف بار بار پڑھ کر دل ہی خوب محسوس کر سکتا ہے۔ بہر حال اس نظم کا کوئی بند کیف سے خالی نہیں۔ پوری نظم ادب اور آرٹ کی ایک اختراع فائقہ ہے۔ ایک مذہبی نظم کو جس کا تعلق محض ایک فرقے کے عقیدت مندانہ حسیات سے ہو اس قدر دلچسپ، عام پسند اور مکمل بنا دینا صرف نظیر ہی کا کام تھا۔ جس شخص کا اخلاق، ظرف اور استغنا اس حد تک بڑھا ہوا ہو کہ وہ حضرت علی علیہ السلام جیسے صاحب جود و سخا کی بارگاہ کرم سے صرف آبرو کا طالب ہو وہی ایسی بلند پایہ نظمیں لکھ سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آبرو دنیا کی نعمتوں میں سب سے زیادہ سربلند ہے اور اس کی طلب سے نظیر کے نفسیات کی پاکیزگی اور علو کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس شخص کا دماغ نشو و نما کے ایسے اعلیٰ نقطے پر پہونچ چکا ہو اس کی زبان سے کیونکر کوئی معمولی شعر نکل سکتا ہے۔

دوالی ایک واقعاتی نظم ہے جس میں رندانہ خیالات کی اول سے آخر تک بھر مار ہے۔ اس نظم میں معاملہ بندی کی پوری داد دی گئی ہے اور دوالی کے معاشرتی پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے۔ دلچسپ اور رنگین باتوں کو نظر انداز کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دوالی کا تیوہار ہندوستان کی خصوصیات میں سے ہے اور اپنے اندر بڑی جاذبیت اور لطافت رکھتا ہے۔ افسوس ہے کہ نظیر نے اس کے زریں پہلو کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور محض مبتذل اور سیاہ رخ پر نظر ڈالی۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرت کا زیادہ تعلق انہی باتوں سے دیکھ کر انہی پر زیادہ زور دینے کی کوشش کی ہے۔ اصل میں اس لطیف تیوہار کی برائیوں کی جانب توجہ دلا کر اُن کی اصلاح کرنا مدنظر ہے۔ اس طرح اس نظم میں اخلاقی خوبیاں تو پنہاں ہیں لیکن شاعری کے اعتبار سے اس میں کوئی خصوصیت نہیں۔ جگہ جگہ بندش سست اور مصرعے کمزور ہیں۔ صحت لفظی کی بھی کہیں کہیں کمی نظر آتی ہے۔ متروکات کا استعمال بھی ہے۔ بہر حال دوالی پر جیسی دلچسپ اور مکمل نظم نظیر لکھ سکتے تھے یہ اس قسم کی نہیں۔ ہاں آخر میں نظیر نے اپنے رنگ کی خصوصیت قائم رکھی ہے۔ جواریوں کی برائیاں دکھا کر ان کا فطری رحم جوش میں آتا ہے اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ کہیں میری باتوں سے ان کا

دل نہ دکھا ہو۔ اس ڈر سے فوراً ان کی اشک شوئی کرنے کے لئے وہ اپنے کو بھی ان کے زمرے میں شامل کرکے کہہ اٹھتے ہیں:-

یہ باتیں سچ ہیں نہ جھوٹ ان کو جانیو یارو　　نصیحتیں ہیں انہیں دل سے مانیو یارو
جہاں کو جاؤ یہ قصہ سنا دیو یارو　　جو خوار ہوئے ہو اس کا مانیو یارو
نظیر آپ بھی ہے جو دیوانہ کا

حضرت سلیم چشتی ایک سپاس عقیدت نظم ہے، ورثی خصوصیت میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔ ایک ایسے شاعر کے قلم سے جس کا مذہب شیعہ ہو ایسی نظم دستی ہے تعجب خیز ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ شاعر وہی ہے جو حسن کو حسن سمجھ کر دیکھے اور مذہب کا صحیح احساس رکھتا ہو۔ مذہب بھی کسی بزرگ سے سوئے ظن رکھنا نہیں سکھاتا۔ محبت اور عقیدت کی تعلیم دیتا اور احترام کی تلقین کرتا ہے۔ مذہب تعصب کو نہ صرف برا سمجھتا ہے اور شاعر کے لئے تو یہ قاتل ہے جہاں تعصب نے در آنا شروع کی وہیں طبیعت نے یکطرفی پر کمر باندھی اور شاعری تباہ ہونی شروع ہوئی۔ نظیر کے یہاں تعصب کا نام نہیں ہے اسی لئے ان کے کلام میں ایسی حرارت پائی جاتی ہے۔ یہ نظم بہ اعتبار ہیئت مخمس ہے۔ تشبیہات میں علو، الفاظ میں شکوہ اور تراکیب میں شستگی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ بندشیں نہایت چست اور شستہ، مصرعے پختہ ہیں۔ ہر بند بہ برکات تمام ہے اور ہر شعر ایک رنگ میں ہے۔ زبان میں صفائی اور روانی ہے اور حشو و زوائد کا استعمال بالکل نہیں ہے۔ دیکھئے پہلے بند سے کس قدر محبت اور عقیدت ٹپکتی ہے:-

ہیں دو جہاں کے سلطان حضرت سلیم چشتی　　عالم کے دین و ایمان حضرت سلیم چشتی
مرد فقیر سلطان حضرت سلیم چشتی　　محبوب خاص یزدان حضرت سلیم چشتی
مرد رہ عرفان حضرت سلیم چشتی

دو جہاں کے سلطان، عالم کے دین و ایمان، مرد فقیر سلطان، مرد رہ عرفان، ان میں کس قدر احترام و عقیدت کی

انتہا ہے۔ یہی وہ مقامات ہیں جہاں تعصب پرزے پرزے ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس نظم میں جگہ جگہ نہایت پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا گیا ہے لیکن آخر کا بند خاص نظیر کے رنگ کی چیز ہے:۔

عالم ہے سب معطر تیرے کرم کی بو سے　　　حرمت ہے دوستوں کی حضرت تمہارے رو سے
یہ چاہتا ہوں اب میں سو دل کی آرزو سے　　　رکھیو نظیر کو تم دو جگ میں آبرو سے
اے موجد ہر احسان حضرت سلیم چشتی

اس بند کا دوسرا مصرع الہامی ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ دوستی کی اس سے زیادہ تعریف غالباً کسی لٹریچر میں میسر نہیں آسکتی۔ انتہا درجے کی محبت میں یہ الفاظ منہ سے نکل سکتے ہیں۔ ہر شخص کا ظرف ان کی خلاقی کی صلاحیت اور ہر زبان ان کے بیان کی قدرت نہیں رکھتی:۔

(ہولی ایک موسمی اور مصورانہ نظم ہے جو نظیر کے بہترین کلام میں سے ہے۔ اس نظم کو شروع اس خوبی سے کیا ہے کہ موسم کی حالت اور کیفیت کا پورا اندازہ صرف لفظوں سے ہو جاتا ہے۔ پہلے بند کا پہلا مصرع تو موسم کی حالت بہت ہی صاف صاف بتاتا ہے لیکن تیسرے مصرعے میں جو حسین ذریعہ موسمی کیفیت اظہار کرنے کا نکالا ہے اس کی لطافت کی پناہ نہیں:۔

پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی)

بحر کا ترنم اور الفاظ کی نشست تو نظم کی جان ہیں لیکن تیوہار کے رسوم کے جزویات کی مصوری جس انداز سے کی ہے اس سے معاشرت پر عبور کا اندازہ ہوتا ہے (ہولی کی رنگ رلیوں کا محفل کی دلچسپیوں سے جہاں تک تعلق ہے ان کا سماں دیکھئے کیسا کھینچا ہے اور کتنا ہیجان پیدا کر رہا ہے):۔

ساماں جہاں تک ہوتا ہے اس عشرت کے مطلوبوں کا　　　وہ سب سامان مہیا ہو اور باغ کھلا ہو خوبوں کا
ہر آن شرابیں ڈھلتی ہوں اور ٹھٹھ ہو رنگ کے ڈوبوں کا　　　اس عیش مزے کے عالم میں ایک غول کھڑا محبوبوں کا
کپڑوں پر رنگ چھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اس نظم کو بار بار دوہرا کر پڑھنے سے، قوت تخیل ہولی کا ایک ذہنی سماں پیش نظر پیدا کر دیتی ہے جس کا لطف صرف اسی حالت میں محسوس کیا جا سکتا ہے اور ضبط تحریر میں کسی طرح نہیں آ سکتا۔

نانک شاہ گرو بھی اسی رنگ کی نظم ہے اور اس سے نظیر کی وسعت نظر، مذہب سے بے تعصبی اور عام خلوص کا اندازہ ہوتا ہے۔ دیکھئے کس عقیدت اور احترام سے ذکر فرماتے ہیں:

ہیں کہتے نانک شاہ جنہیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو
وہ کامل رہبر جگ میں ہیں یوں روشن جیسے ماہ گرو
مقصود مراد امید سبھی بر لاتے ہیں دلخواہ گرو
نت لطف و کرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرباہ گرو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

یہ نظم کسی قدر خشک اور بے روح سی ہے لیکن بیان اچھا ہے۔ اس کا تعلق ایک فرقے کے عقیدت مندانہ جذبات سے ہے اس لئے ہر شخص کے دل پر اثر نہیں کرتی۔ اس کی بزرگی اور معنویت کا حال سکھوں سے پوچھئے۔ اس نظم میں سکھوں کی مذہبی اصطلاحوں اور پنجابی الفاظ کا استعمال بہت ہے جو ہم لوگوں کے لئے غیر مانوس ہیں۔ نظم میں کوئی فلسفہ یا کوئی تخیل یا غیر معمولی مضمون نہیں ہے اور ٹیپ کے دو مصرعے جو ہر بند میں دوہرائے گئے ہیں خاص دل سے نکلی ہوئی چیز ہیں اور دل پر اثر کرتے ہیں:

اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

کنہیا جی کا جنم ایک واقعاتی اور صاف نظم ہے اور خالص ہندو مذاق کی چیز ہے۔ یہ اس قبیل کی نظموں میں سے ہے جو کسی شاعر کو اس سے اردو میں ممتاز کرتی ہیں۔ ہر شاعر اپنے طبقے کی ایک نمایاں خصوصیت اپنے رنگ میں سب سے جدا رکھتا ہے جو صرف اسی کا حصہ ہوا کرتی ہے۔ یہ نظم نظیر کی اسی خصوصیت کی حامل ہے۔ اور تو یہ ہندوستان کے قدیم تہذیب سے متعلق ہے اس لئے خالص ہندو مذاق رکھنے والوں کے

لئے خاص دلچسپی رکھتی ہے۔ دوسرے مذہب سے متعلق ہے اس لئے ہندوؤں کی خاص دلچسپی کی شے ہے قدیم ہند معاشرت اور رسم و رواج کا بھی اس سے کافی اندازہ ہو جاتا ہے۔ بھاشا کے مانوس اور غیر مانوس دونوں قسم کے الفاظ کا اس میں کثرت سے استعمال ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نظیر ہندو فلسفے اور ہندو نجوم سے بھی کافی واقفیت رکھتے تھے۔ جگہ جگہ ان علوم کے بالواسطہ اور بلاواسطہ حوالے موجود ہیں۔ بھاشا کے الفاظ اس نظم میں خصوصاً اس قدرت کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں جس سے اس زبان پر بھی نظیر کا اجتہاد ظاہر ہوتا ہے۔ دیکھئے کرشن جی کے لئے کتنے صفاتی نام مہیا کئے ہیں:

پھر آیا واں ایک وقت ایسا جب آئے گرب میں منموہن ۔۔۔ گوپال، منوہر، مرلیدھر، سیکشن، کشورن، کیول من
گھنشام، مُراری، بنواری، گردھاری، سندرشیام برن ۔۔۔ پربھوناتھ، بہاری، کان للا، سکھدائی، جگ کے دکھ بھنجن

جب ساعت پرگٹ ہونے کی واں آئی مکٹ دھریا کی
اب آگے بات جنم کی ہے جے بولو کشن کنہیا کی

جہاں عورتوں کی رسموں کا سماں کھینچا ہے وہاں عورتوں کی زبان بڑے کمال کے ساتھ لکھی ہے۔ یہ خصوصیت جس کی اس موقعے کے لئے نہایت ضرورت تھی اگر اس کمال کے ساتھ نہ ہوتی تو اس نظم اور بالخصوص اس مقام کا پایہ بہت گر جاتا۔ نظم کا یہ مقام خصوصیت کے ساتھ دلچسپ ہے۔ گھر میں بچہ پیدا ہونے کے وقت خواتین کے مشاغل، ان کی سرگرمیوں اور مسرتوں کا، دیکھئے کیسا بے مثال صحیح اور مفصل نقشہ کھینچا ہے۔

سب ناری آئیں گوکل کی اور پاس پڑوسن آبیٹھیں ۔۔۔ کچھ ڈھول مجیرے لاتی تھیں کچھ گیت بجا کے گاتی تھیں
کچھ ہر دم مکھ اس بالک کا بلہاری ہو کر دیکھ رہیں ۔۔۔ کچھ تھال پنجیری کے رکھتیں کچھ سونٹھ سٹھورا کرتی تھیں

کچھ کہتی تھیں ہم بیٹھے ہیں نیگ آج کے دن کا لینے کو
کچھ کہتیں ہم تو آئے ہیں آنند بدھاوا دینے کو

کوئی گھٹی میٹھی گرم کرے کوئی ڈالے اسپند اور بھوسی ۔۔۔ کوئی لائی ہنسلی اور کھڑوے کوئی کرتہ ٹوپی میوہ گھی

کوئی دیکھے روپ اس بالک کا کوئی ہاتھ جوڑے سر جھکی — کوئی چرنوں کی تعریف کرے کوئی آنکھوں کی کوئی پلکوں کی

کوئی کہتی عمر بڑی ہووے اسے پیا تمہارے بالک کی

کوئی کہتی یہ واہوا داس آس مرادوں والے کی

کوئی کہتی بالک خوب ہوا اسے بھینا تیری ننگ گنی — یہ بالک ان کو ملتے ہیں جو دنیا میں ہیں بڑے بھاگی

اس کنبے کی بھی شان بڑھی اور بھاگ بڑھے اس گھر کے بھی — یہ باتیں سب کی سن سن کر یہ بات جسودا کہتی تھی

اے بیر یہ بالک جو اب سب میرے گھر میں جوت ہے

کچھ اوروں میں کیا قسمت بھگتوں کی دو پہر بات ہے

ان بندوں کی اور کوئی خصوصیت کسی کی نظر میں ہو یا نہ ہو لیکن ان کی موسیقیت تو اس غضب کی ہے کہ دل بے قابو ہو جاتا ہے:-

بانسری ہندو مذاق کی ایک دوسری نظم ہے جو کرشن جی کی زندگی کے محبوب ترین شغل شوق و تفنن کا نقشہ کھینچتی ہے۔ ہندوؤں کے لیے تو اس نظم میں خدا جانے کیسی جذب و عقیدت پنہاں ہے لیکن دوسرے لوگوں کے لیے بھی اس کا ترنم لطافت بہت پُرلذت و کیف ہے:-

جس آن کانہیا جی کو وہ بنسی بجانی آتی — جس کان میں وہ آواز گئی واں سدھ بدھ جاتی

ہر من کی ہو کے موہنی او چیت چرانی — نکلی جب سر دھن سالی وہ تیکھی سہ دانی

سب سننے والے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری

ایسی بجائی کرشن کنہیا نے بانسری

نظم کے عنوان اور نفس مضمون میں جس قدر شعریت ہے اتنی خود نظم میں نہیں ہے۔ متروک الفاظ اور لغت اور بھاشا کی اصطلاحیں اس کثرت سے استعمال کی ہیں کہ نظم کے معانی اس زمانے کے اردو دان طبقے کی نظروں سے پوشیدہ ہو گئے ہیں، لیکن جہاں کہیں بھی شستہ اور صاف الفاظ استعمال کئے ہیں جو

عام طور پر سمجھ میں آسکتے ہیں تو وہ مقامات ماد رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ ذیل کے بند کو ذرا پڑھئے اور پھر وہ سماں ذرا نگاہوں کے سامنے کھینچنے کی کوشش کیجئے۔ دیکھئے کیا کیفیت طاری ہوتی ہے:۔

موہن کی بانسری کے میں کیا کیا کہوں جتن   لے اُس کی من کی موہنی دھن اس کی چت ہرن
اس بانسری کا آن کے جس جا ہوا بجن   کیا چل پون نظیرؔ پکھیرو و کیا ہرن
سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

آگرے کی تیراکی ایک مصورانہ نظم ہے اور لوکل کلر یا مقامی رنگ کی آمیزش کا اچھا نمونہ ہے۔ نظیر نے برسوں آگرے کا یہ میلا دیکھا ہے۔ حقیقت میں بڑی حق تلفی ہوتی اگر وہ اس میلے کا اتنا حق بھی ادا نہ کرتے۔ آگرے کی تیراکی نے انہیں طرح طرح سے لبھایا اور ان کے لئے ہزاروں طرح کی دلچسپیاں اور مسرتیں پیدا کی ہیں۔ اس لئے ان تمام لطیف احسانات کے بدلے میں نظیر نے بھی اس میلے کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ کہتے ہیں:۔

جب پیرنے کی رت میں دلدار پیرتے ہیں   عاشق بھی ساتھ اُن کے غمخوار پیرتے ہیں
بھولے سیانے نادان ہشیار پیرتے ہیں   پیر و جوان لڑکے عیار پیرتے ہیں
ادنیٰ غریب مفلس زردار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

یہ نظم بڑی پاکیزہ ہے اور مشہور نظموں میں سے ہے۔ جہاں تک نظم کا تعلق ہے ہر مصرع نہایت پُرکیف بے تصنع اور برجستہ ہے۔ زبان بالکل صاف، شستہ اور متروکات سے معرّا ہے۔ اب رہا نفسِ مضمون تو اس کی خوبیاں بھی اپنی جگہ پر مستقل اور غیر فانی ہیں۔ آگرے میں دریا کنارے جس قدر مشہور مقامات اس وقت تھے اور جن کا تیراکوں سے کوئی لگاؤ تھا، ان سب کا تذکرہ کر کے ان کی تاریخ کو زندہ

کر دیا ہے۔ ان میں سے بہت سے مقامات کے جاننے والے بھی اب باقی نہیں۔ اگر نظیر کی یہ نظم نہ ہوتی تو ان مقامات کے نام بھی ان کی عمارتوں کے ساتھ مٹ جاتے۔ تاریخ پر نظیر کا یہ بہت بڑا احسان ہے۔ اس کے علاوہ پانی کی مختلف ہیئتوں کے نام ایک بند میں اکٹھے کئے ہیں۔ یہ زبان پر بڑا احسان ہے۔ یہ چند یہ نام تیراکوں کی زبان پر ہیں اور بہت سے وہ بھی نہیں جانتے لیکن عامۃ الناس ان سے قطعی بے خبر تھے۔ نظم میں ان کا ذکر لانے سے اول تو ان میں ادبی شان پیدا ہوگئی ہے اور جو کچھ عمومیت تھی وہ زائل ہوگئی ہے۔ دوسرے پانی کی ہیئتوں کے لئے جواب تک صرف دیکھی جاتی تھیں مگر بیان نہ ہو سکتی تھیں، الفاظ مہیا ہوگئے ہیں جن کو ہر شخص روزمرہ اور ادبیات میں بھی استعمال کر سکتا ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ اس نظم میں اور بہت سی شاعرانہ خصوصیات ہیں جو بالذات بڑی کیفیت رکھتی ہیں۔ تیراکی کا سماں دیکھئے!۔

جمنا کا پاٹ گویا صحن چمن ہے سارا — پیراک اس میں پیریں جیسے کہ چاند تارا
نینہ چاند کے سے ٹکڑے تن گورے گورے پیارے — پانیوں سے بھر رہے ہیں جمنا کے دو کنارے

کچھ وار پیرتے ہیں کچھ پار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

کتنے کھڑے ہی پیریں اپنا دکھا کے سینہ — سینہ چھپا رہے ہیں پیرے سے جوں نگینہ
آدھے بدن پہ پانی آدھے پہ ہے پسینہ — سروں کا یہ چڑھا ہے گویا کہ اک قرینہ

دامن کمر پہ باندھے دستار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

دوسرے بند کا چوتھا مصرع لاجواب ہے۔ اس کی تشبیہ بالکل نئی اور داد سے مستغنی ہے۔ موسم برسات ان کی خاص نظم ہے۔ اور اپنے مقدمہ پر نظیر کی نقاد نظر رکھتی ہے۔ اس نظم میں موسم کی حالت پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالی ہے اور کئی طرح سے برسات کی [illegible] سب سے پہلے

نفس زمستاں کی محاکات نگاری کی ہے۔ دیکھئے:۔

جب ماہ اگھن کا ڈھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
اور ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
دن جلدی جلدی چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
پالا بھی برف پگھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
چلّا خم ٹھونک اچھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

اس بند کا پہلا مصرع تو خیر ایک واقعے کا اظہار کرتا ہے لیکن دوسرے مصرعے میں صرف دو لفظوں ''ہنس ہنس'' سے شاعر نے کمال دکھایا ہے اور جاڑے کی انتہائی تکلیف پیش نظر کردی ہے۔ جاڑے کو ایک انسان قرار دے کر یہ دکھایا ہے کہ جب وہ اہل عالم کو سردی کی تکلیف میں مبتلا دیکھتا ہے تو اس کو ان کی حالت زار پر بجائے رحم آنے کے ہنسی آتی ہے۔ وہ اُن پر تمسخر کرتا ہے اور بجائے اس کے کہ ختم ہو کر دنیا کو سردی کی اذیت سے نجات دے اور سنبھل جاتا ہے۔ تیسرا مصرع پھر سردی کی فریب کاری کی شرح کرتا ہے اور ایک موسمی حقیقت کا بھی اظہار ہے۔ چوتھے مصرعے میں رات کا سماں اور جاڑے کی سختیوں کا ذکر ہے۔ پانچویں مصرعے میں دکھایا ہے کہ جاڑا اپنے افعال سے پہلے تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ چلا جائے گا اور پھر طرح طرح سے دھوکا دیتا ہے۔ آخر کار دنیا کا مقابلہ کرنے کے لئے پھر خم ٹھونک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنی سختیاں شروع کر دیتا ہے یعنی یہ کہ چلے کا جاڑا پڑنے لگتا ہے۔

یہاں تک تو زمستاں کے مظالم اور اس کی فریب کاریوں کا ذکر تھا۔ اب ان کا اثر انسانوں پر ملاحظہ فرمایئے۔ دیکھئے سردی میں انسان کی کیا حالت ہوتی ہے اور پھر اس حالت کو کس قدر تفصیل کے ساتھ شاعر نے دکھایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذیل کے بند میں نظیر نے محاکات کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور مصوری کی قرار واقعی داد دی ہے۔ دیکھئے سماں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔

دل ٹھوکر مار پچھاڑا ہو اور دل سے ہوتی ہو کشتی سی
تھر تھر کا زور اکھاڑا ہو بجتی ہو سب کی بتیسی
ہو شور پھپھو ہو ہو کا اور دھوم ہو سی سی سی سی کی
کلّے پہ کلّہ لگ کر چلتی ہو منہ میں چسکی سی

ہر دانت پتّے سے دلا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

تھر تھر کا زور، بتیسی بجنا، پھو ہو ہو ہو، سی سی سی سی، اکڑ کر لگنا، دانتوں کا چتنے سے دلنا، یہ ایسی باتیں تو ہیں نہیں جن کی تشریح کی ضرورت ہو۔ سردی کے موسم میں ہر شخص پر یہ حالت گزرتی ہے لہذا آپ بیتی کا خود اندازہ کر کے ہر شخص نظیر کی محاکات نگاری کی داد دے سکتا ہے۔ میرے بتانے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس نظم میں مصور شاعر کے عاشقانہ دجوانانہ جذبات خاص طور پر نمایاں ہیں۔ جاڑے کی مصوری کرنے میں آگے چل کر نظیر نے تخئیل سے بہت زیادہ کام لیا ہے اور سردی کو مکمل نمونۂ صنعت و آرٹ بنانے کی کوشش کی ہے۔ بظاہر یہ دو باتیں یعنی حقیقت نگاری اور خیال آرائی یوں کہیے کہ عکاسی و آرٹ نقیضین معلوم ہوتی ہیں۔ واقعات کی صورت گری اور صناعی یا آرٹ میں جس کی تمام تر بنا تخئیل پر ہوتی ہے بہت بڑا فرق ہے۔ پہلی صورت میں ایک حد مقرر ہوتی ہے اور نگاہ اس سے باہر کسی طرح نہیں جا سکتی۔ دوسری صورت میں خیال بالکل آزاد ہوتا ہے اور تصویر کی تکمیل خیال کی بلند ترین پرواز پر منحصر ہوتی ہے۔ اس لئے یہ دونوں باتیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ لیکن نظیر نے عکاسی اور آرٹ کو ایک جگہ جمع کر کے مافوق العادت کمال اور مجتہدانہ بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ حقیقت نگاری میں خیال آرائی کا لطف ملاحظہ فرمائیے:-

ہر چار طرف سے سردی ہو اور صحن کھلا ہو کوٹھے کا — اور تن میں نیمہ شبنم کا ہو جس میں خس کا عطر لگا
چھڑکاؤ ہوا ہو پانی کا اور خوب پلنگ بھی ہو بھیگا — ہاتھوں میں پیالہ شربت کا ہو آگے اک فراش کھڑا
فراش بھی پنکھا جھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

اس کے بعد کے دو بندوں میں عاشقانہ دجوانانہ جذبات کا اظہار ہے۔ یہ دونوں بند کسی قدر عریاں ہیں لیکن اتنی مہذب عریانی کی مثال مشکل سے کہیں مل سکتی ہے۔ پہلے بند کا یہ مصرع:-

مجوب گلے سے لپٹا ہو اور کھنی چٹکی لاتیں ہوں

محاکات کی اعلیٰ ترین و نادر ترین مثال ہے۔ ہر چند نہایت عریاں ہے لیکن پھر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا کھلے الفاظ میں کوئی بات نہیں کہی گئی۔ نہ الفاظ ہی فرداً فرداً ایسے ہیں جن میں خواہ مخواہ کوئی عریانی ہو۔ صرف الفاظ کی نشست اور مصرعے کے سیاق سے وہ سماں کھینچا ہے جسے ہزار تصویریں بھی ادا نہیں کر سکتیں۔

اومس ایک موسمی اور مصورانہ نظم ہے جسے صرف ہندوستان کا فطری شاعر ہی لکھ سکتا ہے۔ اس نظم میں اومس کی کیفیت اور اس سے جو جو اذیتیں انسان کو پہنچتی ہیں وہ سب نہایت خوبی کے ساتھ مفصل بیان کی ہیں اور ایسی مصوری کی ہے کہ نظم پڑھتے پڑھتے اومس کی کیفیت طبیعت پر طاری ہو کر جی گھبرانے لگتا ہے اور اومس کی سی اذیت ہونے لگتی ہے۔ دیکھئے برسات کے زمانے میں بڑی گرمی سے قلب میں جو اضطراب اور طبیعت پر جو ہجوم تکدر و انقباض ہوتا ہے اس کا یہ سماں کتنا مصورانہ ہے:۔

بدلی کے جو گھر آنے سے ہوتی ہے ہوا بند　　　پھر بند سی گرمی وہ غضب پڑتی ہے یک چند

پھیلنے کوئی پگڑی کوئی کھولے ہے کمرا بند　　　دم رک کے گھلا جاتا ہے گرمی سے ہر اک بند

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اومس

سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اومس

اس نظم میں بھی نظیر نے ایک جگہ عکاسی اور آرٹ کو ملا کر ایک نئی چیز پیدا کی ہے اور اومس کا ایک خیالی منظر پیدا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

اومس میں تو لازم ہے نہ پنکھا نہ ہوا ہو　　　ایک کوٹھری ہو جس میں دھواں آکے بھرا ہو

اور پھیوں کے واسطے گڑ تن سے ملا ہو　　　اس وقت مزہ دیکھئے اومس کا کہ کیا ہو

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اومس

سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اوس

"اوس" اول سے آخر تک مکمل چیز اور مصوری کی اختراع فائقہ ہے۔ نظم فی نفسہ نہایت پاکیزہ بے تصنع اور بے ساختہ ہے۔ زبان بالکل صاف اور متروکات سے معرّیٰ ہے۔ نظیر کی شاعری کے اعلیٰ نمونوں میں اوس بلا خوف تردید پیش کی جاسکتی ہے۔

"کورا برتن" وضاحانہ نظم ہے اور اس فہرست کی نظموں میں سے ہے جن پر اردو زبان اور ادب لطیف بجا ناز کرسکتے ہیں۔ اس کے بیان میں ادب قدیم کی سی سادگی اور لطافت اور اس کے خیالات میں الہامی کلام کی سی شادابی، وسعت و رفعت ہے۔ کہتے ہیں:-

کورے برتن میں کیاری گلشن کی — جس سے ٹھنڈی ہے ہر گلی تن کی
بوند پانی کی اُن میں جب ٹھنکی — کیا وہ پیاری صدا ہے سن سن کی
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

واقعہ یہ ہے کہ جنھوں نے سن سن کی وہ پیاری صدا سنی ہے اور کورے برتن کی وہ معصوم و شاداب کیفیت جو اس میں پانی پڑتے وقت ہوتی ہے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے وہ تو اس بند کا پورا لطف اٹھا سکتے ہیں لیکن جنھوں نے نہیں دیکھی اُن کے لئے بھی اس کی خیالی لطافت بادۂ ناب کے سرور کا حکم رکھتی ہے۔

دوسرے بند میں پانی کی نوکی بڑائی کا اعتراف کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ پانی جب کورے برتن میں ملتا ہے تو اس کے سامنے آب حیات کی بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔ حقیقت میں کوئی نہیں جانتا کہ آب حیات کیا چیز ہے لیکن پانی ہر روز آدمیوں نے کورے برتن میں پیا ہے جس سے یہ خوبی معلوم ہو گیا ہے کہ پانی وہ جو کورے برتن سے پیا جاتا ہے کسی چیز میں نہیں آسکتا۔ جب پانی کا اس

سے بہتر مزہ انسان کے تجربے میں نہیں تو یہ کہنا کہ کورے برتن میں پانی پینا آبِ حیات کے مزے کو مات کرتا ہے مبالغہ نہیں۔ اب ذرا ان مصرعوں کی تازگی اور شادابی ملاحظہ کیجئے :۔

سوندھی سوندھی ٹھنڈولیاں باندھیں　　ہم نے پانی کی گولیاں باندھیں

اب آگے بڑھئے اور کورے برتن اور اس کے متعلقات کے دوسرے لطائف دیکھئے :۔

کورا پنہاری کا جو ہے مٹکا　　اس کا جوبن کچھ اور ہی مٹکا
لے گیا جان پاؤں کا کھٹکا　　دل گھڑے کی طرح سے دے پٹکا
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

دوسرے مصرعے میں "مٹکا" صرف ایک لفظ سے جو مطلب ادا کیا اور سماں کھینچا ہے وہ دوسرے لفظوں میں پوری نظم سے بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ تیسرے مصرعے میں جو جاذبیت ہے اسے دیکھ کر ٹیگور کی یہ نظم یاد آتی ہے :۔

"جب دو بہنیں پانی لینے جاتی ہیں تو اس مقام پہ آتی ہیں اور مسکراتی ہیں۔ وہ ضرور کسی شخص سے واقف ہوں گی جو درختوں کے پیچھے کھڑا رہتا ہے جب کبھی وہ پانی لینے جاتی ہیں۔ دونوں بہنیں جب اس جگہ سے گزرتی ہیں تو آہستہ آہستہ آپس میں باتیں کرتی ہیں، انھوں نے ضرور اس شخص کے بھید کو تاڑ لیا ہوگا جو درختوں کے پیچھے کھڑا رہتا ہے جب کبھی وہ پانی لینے جاتی ہیں، یکایک ان کے گھڑے ہلتے ہیں اور پانی چھلک جاتا ہے جب وہ اس مقام پر پہنچتی ہیں۔ انھوں نے ضرور سمجھ لیا ہوگا کہ اس شخص کا دل دھڑک رہا ہے جو درختوں کے پیچھے کھڑا رہتا ہے جب کبھی وہ پانی لینے جاتی ہیں۔ دونوں بہنیں جب اس مقام پر آتی ہیں تو ایک دوسری کی طرف دیکھتی ہے اور مسکراتی ہے۔ ان کے تیز تیز بڑھنے والے پاؤں میں ایک خندہ مضمر ہے جو اس شخص کے دماغ کو پریشان کر دیتا ہے جو درختوں کے پیچھے کھڑا رہتا ہے

جب کبھی وہ پانی لینے جاتی ہیں:
ٹیگور نے جن خیالات اور جذبات کے اظہار کے لئے ایک پوری نظم لکھی ہے وہ نظیر نے صرف ایک مصرعے سے ادا کئے ہیں:-

لے گیا جان پاؤں کا کھٹکا

بہ ظاہر یہ ایک مصرع ہے اور صرف ایک معمولی سے خیال کو ظاہر کرتا ہے لیکن پاؤں کے کھٹکے میں جو جو واردات پنہاں ہیں ان کو سوچئے اور لطف اٹھائیے خیال کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اب دوسری کیفیت سے لطف اندوز ہوجئے نظیر فرماتے ہیں:-

کورے کوزوں کو دیکھ عالم میں کوزے مصری کے بھر گئے غم میں
یوں وہ رستے ہیں آب کے نم میں جیسے ڈوبے ہوں پھول شبنم میں
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

دیکھئے یہ بند کس بہار کا ہے۔ اس کی اور اس کے بعد کے بند کی لطافت گرمیوں میں محسوس کی جاسکتی ہے جس وقت پیاس لگ رہی ہو اس عالم کا پیش نظر ہو تو ہر گز اس بند کا پڑھنا ہی کافی ہے۔ دیکھئے کیا کیفیت قلب پر طاری ہوجاتی ہے اور کس قدر سکون محسوس ہوتا ہے۔ پہلے مصرعے میں صرف دو لفظوں "عالم میں" نے شاعر کے تمام ذہنی مطالب ادا کردئے ہیں اور کورے کوزوں کے جملہ ظاہری اور باطنی محاسن اور ان کی ساری جاذبیت دکھادی ہے۔ لیکن چوتھے مصرع کی لطافت و شگفتگی، شادابی و عطر بیزی کی انتہا نہیں۔ مسرت و سرور کی بے پناہ کیفیت قلب پر طاری کرتا ہے۔ نظم کا آخری بند کسی قدر زندانہ ہے لیکن آپ اپنی مثال ہے۔ پڑھئے اور سر دھنئے:

کوروں پہ جو نظیر ہے جو بن سے ٹپ ٹپ جو جوبن ہے میں کہاں وہ چھن چھن ہے

جس گھڑونچی پہ کورا باسن ہے　　　وہ گھڑونچی نہیں ہے گلشن ہے
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

تیسرے مصرعے میں "باسن" نے "باسن" کہنے والی بہت سی قدیم ہستیاں یاد دلا دیں۔ اِس لفظ کے بولنے والے آہ مدت ہوئی پیوندِ خاک ہو گئے اور اب کورے باسنوں میں جنت کی شراب طہور پی رہے ہیں۔ دنیا میں باسن کا وجود صرف اُن ہی کے ساتھ تھا اور اِن ہی کی زبان پر وہ اچھا بھی معلوم ہوتا تھا وہ بھی ان ہی کے ساتھ پیوندِ زمیں ہو کر اپنے کُل کا جزو جا بنا۔

کل شیٔ یرجع الیٰ اصلہ

کوّا اور ہرن کا بچہ ایک منظوم قصہ اور حاکیانہ نظم ہے جس کا ماخذ انوارِ سہیلی ہے۔ اس لئے اس کو منظوم ترجمہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں ایک کوّے اور ہرن کے بچّے کی دوستی کا فسانہ مذکور ہے، جس سے نظیر کی قوت بیان و حکایت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس نظم کی زبان نہایت صاف اور شستہ ہے اور نظم بھی فی نفسہ بالکل بے تکان اور بے ساختہ ہے۔ نظم کی وجہ سے مطالب ادا کرنے میں کوئی رکاوٹ یا تصنع پیدا نہیں ہوا اور قصہ بالکل اسی طرح ادا ہوا ہے جس طرح نثر میں ہوتا۔ اردو میں طویل منظوم افسانوں کی کمی نہیں لیکن اتنے مختصر منظوم فسانے بہت کم ہیں۔ یہ نظم اپنی نوعیت کی ایک خاص چیز ہے جو بچوں کے درس میں شامل کرنے کے لئے بہت اچھی ہے۔ آخر میں نظیر نے اس قصے سے ایک اخلاقی نتیجہ اخذ کیا ہے جو خود نہایت اہم اور سبق آموز ہے:-

گیدڑ نے اس ہرن کا جو چیتا تھا واں بُرا　　　پائی اسی نے اپنی بدی کی وہیں سزا
تھا یہ تو نثر میں سے اسے نظم میں کیا　　　پہونچا نظیر جب وہ خوشی ہو کے اپنی جا
کوّے کے ساتھ پھر وہ بہت خوش رہا ہرن

خواب کا طلسم ایک عاشقانہ نظم اور ایک پُر معنی ایلیگری ہے جس میں دنیا اور دنیا کی دلفریبیوں کی بے ثباتی کی مصوری کی ہے۔ نظم اول سے آخر تک ایک رنگ میں ہے اور نہایت دلچسپ ہے۔ اس کا لٹریچر اول درجے کا ہے اور الفاظ کے انتخاب میں شاعر نے خاص طور پر اہتمام کیا ہے۔ کوئی لفظ، کوئی بندش، کوئی مصرع ایسا نہیں جو لطافت سے خالی اور ادبیت سے عاری ہو۔ غرض کہ پوری نظم ایک پُر کیف چمنستان ہے جس کی دلکشی صرف اس کی سیر سے قلب پر اثر کرتی ہے۔ پہلے بند میں اس بے فکری اور فارغ البالی کا نقشہ ہے جو انسان کو کبھی کبھی میسر آجاتی ہے۔ اس کے بعد تین بندوں میں دنیا کی ان نظر فریب آرائشوں اور سیمیائی جلووں کا سماں ہے جو انسان کو طرح طرح سے لبھاتے اور اس کو مافیہا سے غافل کر دیتے ہیں۔ نظیر کی سماں بندی کا ایک مختصر نمونہ ملاحظہ فرمائیے :-

گلشن کہیں چمن کہیں شیشہ صراحی جام
فرش طلا بچھا کہیں کہیں گچ سر جڑت کا کام
تھی لعل کی زمیں تو شہرے تمام بام
طاق و رواق اس کے چمکتے تھے یوں مدام
گویا کہ اینٹ اینٹ جواہر کی ہے جڑی

اس کے بعد ایک مجسم دنیا کے حسن و جمال کا سراپا، اس کے شباب کی زاہد فریبیاں، اس کی شوخیاں اور طرحداریاں، اس کا سنگھار اور آرائشیں ان تمام باتوں کا تذکرہ ہے اور ان تمام کے مجموعے سے مراد دنیا ہے۔ اب اس کا بے پناہ عالم اپنی آنکھوں سے دیکھئے :-

خونریز ابرو جان کی قاتل ہر اک نگاہ
مژگاں وہ برچھیوں کو ستے جل رہی پناہ
مہندی سے انگلیوں نے کئے خون بے گناہ
آنکھوں میں کھنچ رہا تھا وہ کاجل غضب سیاہ
پڑ جائے جس سے دل میں فرشتوں کے ہڑبڑی

آخر کے مصرعے میں "ہڑبڑی" کا لفظ کو کسی قدر مبتذل اور سوقیانہ ہے لیکن اس سے مفہوم پورے طور پر ادا ہوتا ہے۔ مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ دوسرا لفظ یہ مفہوم ادا ہی نہیں کر سکتا۔ اگر یہ لفظ نہ ہوتا تو مصرع

تشنہ رہتا اور اس کا ذوق قطعی زائل ہو جاتا۔ سراپا کا ایک سماں اور دیکھیے :-

زلفیں وہ مشک ناب سی چہرہ وہ چاند سا جگنو رہا گلے میں ستارہ سا جگمگا
گہنے کا وصف یا کہ بدن کی کہوں صفا جاتا تھا سرخ جوڑے میں تن یوں جھمک دکھا
گویا شفق میں آن کے بجلی بھبک پڑی

یوں تو یہ بند کا بند بے مثال ہے لیکن اس کے چوتھے اور پانچویں مصرعوں کا جواب ناپید ہے سُرخ جوڑے کو شفق سے تشبیہ دینا تو خیر کوئی ایسی عجیب بات نہیں معمولی شاعر بھی ایسا کر سکتا ہے لیکن "تن کی جھمک" میں بجلی کی مشابہت دیکھنا صرف نظیر کی نازک بصیرت و شاعرانہ نظر کا کام ہے۔

اب اس کے بعد اس ستم ایجاد مہ لقا کی صحبت کا سماں دیکھئے۔ حقیقت میں یہ وہ حالت ہے جب عنانِ صبر و استقلال انسان کے ہاتھ میں کسی طرح نہیں رہ سکتی۔ اس سے دنیا کے فریب مراد ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ طرح طرح سے لبھا کر انسان کو پہلے بے قابو کر دیتے ہیں پھر اس کو اپنے دام میں گرفتار کر لیتے ہیں اور اس پر ستم یہ ہے کہ پھر بھی وفا نہیں کرتے۔ کم بخت' بدنصیب انسان کو محروم ہی رکھتے ہیں۔ خیر اس رنج کو چھوڑیے اور اب یہ سماں دیکھئے :-

آتے ہی اس کے دل کا مرے کھل گیا چمن عیش و طرب کے ابر کی پڑنے لگی بھرن
نازک کمر وہ صاف شکم اور وہ نرم تن گل سا ملا جو مجھ کو نیا گدگدا بدن
رگ رگ میں میری چھٹ گئی عشرت کی پھلجھڑی
لے کر بغل میں اس کو لگایا جو ٹک گلے سو عشرتوں کے دل پہ مرے کھل گئے دریچے
حاضر ہوئے جب آن کے سب عیش اور مزے سینے سے سینہ مل گیا اور لب سے لب ملے
لٹنے لگی بہار مزوں کی دھڑا دھڑی

یہ اس عالم کا ۔۔ن ہے جب انسان مسرتوں میں مواد عشرتوں میں چور ہو جاتا ہے اس کیفیت میں

یکایک یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے:-

ان عشرتوں میں آہ نصیبوں کو کیا کہوں　　　چاہا میں اس پری سے جو کچھ اور کچھ کہوں
اتنے میں ہائے یار مری آنکھ کھل گئی

یہ اس حالت کا سماں ہے جب عارضی مسرت و انبساط کے پردے آنکھوں سے ہٹ جاتے ہیں اور انسان پھر اپنی اصل حالت پر آجاتا ہے۔

آخر کا بند اس وقت کی حالت دکھاتا ہے جب عارضی عیش و نشاط کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور انسان پھر ایک غیر دلچسپ اور سادہ زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کی حالت ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ گزشتہ زمانے کے عیش و عشرت کا فراق اس کو بے حد مضطرب رکھتا ہے اور اس کا تمام وقت اسی کی یاد میں کف افسوس ملتے گزرتا ہے لیکن اس کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ دیکھئے یہ وہی حالت ہے:-

یہ حادثہ جو مجھ پہ پڑا آ کے یک بیک　　　آنکھوں سے میری اس گھڑی آنسو بہے ٹپک
نیند اڑ گئی قرار گیا جل گئی پلک　　　جاگا کیا نظیر میں پہر آٹھ صبح تک
مل مل کے ہاتھ رات کی کاٹی گھڑی گھڑی

ریچھ کا بچہ بظاہر تو ایک طفلانہ نظم معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں ایک حسینہ تمثیل یا ایلیگری ہے۔ ریچھ کے بچے سے انسان کا نفس شریر مراد ہے جو بمشکل رام کیا جا سکتا ہے۔ اور قلندر سے مطلب خود حضرت انسان ہیں جو اس کو طرح طرح سے سدھا سدھا کر اپنا مطیع کر لیتے ہیں۔ ریچھ کے بچے کی تعلیم و تربیت سے مراد ریاضت نفس ہے جس میں بہت زمانہ صرف ہوتا ہے۔ ذیل کے بند میں اس کی طرف اشارہ ہے:-

کل راہ میں جاتے جو ملا ریچھ کا بچہ　　　لے آئے وہیں ہم بھی اٹھا ریچھ کا بچہ
سو نعمتیں کھا کھا کے پلا ریچھ کا بچہ　　　جس وقت بڑا ریچھ ہوا ریچھ کا بچہ
جب ہم بھی چلے ساتھ چلا ریچھ کا بچہ

اس نظم میں باطنی معانی و معنوی مطالب کے علاوہ ظاہری خصوصیات اور شعری لطافتوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ دیکھئے ریچھ کے بچے کی کیا آرائش دکھائی ہے۔ واقعی پری معلوم ہوتا ہے:۔

جُھمکے وہ، جھمکتے تھے پڑے جس پہ کرن پھول
مقیش کی لڑیوں کی پڑی پیٹھ اوپر جھول
اور ان کے سوا کتنے بٹھانے تھے جو گل پھول
یوں لوگ گرے پڑتے تھے سرپاؤں کی سُدھ بھول
گویا وہ پری تھا کہ نہ تھا ریچھ کا بچہ

ذیل کا بند اس چھوٹے سے تماشے کا مرقع اور فلسفۂ اجتماع کا ایک مختصر کرشمہ ہے۔ دیکھئے اس کے چوتھے مصرعے میں کس قدر خیالات کا مجموعہ ہے۔ اس مصرعے میں سات لفظ ہیں اور ہر لفظ سے ایک مستقل خیال اور جداگانہ کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ دریا کو کوزہ میں بند کرنا اسی کا نام ہے اور یہ صرف مجتہدین سخن ہی کا کام ہے ملاحظہ ہو:۔

اک طرف کو تھیں سینکڑوں لڑکوں کی پکاریں
اک طرف کو تھیں پیر و جوانوں کی قطاریں
کچھ ہاتھیوں کی قیق اور اونٹوں کی ڈکاریں
غل، شور، مزے، بھیڑ، ٹھٹھ، انبوہ بہاریں
جب ہم نے کیا لا کے کھڑا ریچھ کا بچہ

کہتا تھا کوئی ہم سے میاں آؤ قلندر
وہ کیا ہوئے اگلے جو تمہارے تھے وہ بندر
ہم ان سے یہ کہتے تھے یہ پیشہ ہے قلندر
ہاں چھوڑ دیا بابا انہیں جنگلے کے اندر
جس دن سے خدا نے یہ دیا ریچھ کا بچہ

بندر سے ایام طفولت مراد ہیں جب تقلید کی قوت جوش پر ہوتی ہے۔ چوتھے مصرع کے یہ معنی ہیں کہ بچپن اور بے فکری کا زمانہ ختم ہو گیا اب ذمہ داری کا وقت آ گیا ہے اس لئے شریر نفس پر قابو پانے کی ضرورت ہے اس لئے اس کی تربیت میں مصروف ہیں۔

ذیل کے بند میں بڑا دقیق صوفیانہ راز مضمر ہے جس کا سمجھ لینا عارف ہی کا کام ہے۔ کوئی کتنا ہی

نفس کش اور مرتاض کیوں نہ ہو نفس کی مخالفت آخر عمر تک جاری رہتی ہے۔ دنیا میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ بعض اوقات نفس شریر غالب آ کر عمر بھر کی عبادت و ریاضت خاک میں ملا دیتا ہے۔ اس ضمن میں برصیصا زاہد کی مثال کس قدر دردناک اور عبرت انگیز ہے۔ پکا صوفی وہی ہے جو ہر وقت ہشیار رہے اور کسی وقت بھی نفس کے حملوں سے غافل نہ رہے۔ اس بند سے اسی کی تلقین فرماتے ہیں:۔

جب کشتی کی ٹھیری تو وہیں سر کو جھکایا   ٹکا رہتے ہی اس نے تو ہمیں آن پچھاڑا
گو ہم نے پچھاڑا اسے گر اس نے پچھاڑا   اب ڈیڑھ پہر ہو گیا کشتی کا اکھاڑا
گو ہم بھی نہ ہارے نہ ہٹا پیچھے کا [illegible]

آخر کے مصرعے میں اپنا کسر نفس اور نفس کی سرکشی دکھائی ہے۔ "بھی" کا لفظ بتا رہا ہے کہ نفس سختی کے ساتھ مخالفت کر رہا ہے مگر پھر بھی اس کے مغلوب کرنے کی کوشش جاری ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کو اپنی ریاضت کا کبھی غرہ نہ کرنا چاہئے۔ ہمیشہ امید و بیم میں رہے۔ اپنے کو کمزور اور اپنے مخالف کو قوی سمجھے۔ اس وقت اس کے لئے ترقی کا امکان ہو سکتا ہے۔

راکھی ایسا تہوار ہے جو مشتاقان نظر کے نزدیک ایک نرالی چیز ہے۔ سلونوں کا تہوار ہندوستان کا بڑا مشہور تہوار ہے۔ اس میں ہر شخص راکھی باندھتا اور رشتے کی گرہ میں [illegible] جاتا ہے۔ راکھی کی مذہبی اہمیت کچھ بھی ہو لیکن شاعرانہ نقطہ نظر سے اس میں بڑی لطافت اور جاذبیت ہے۔ جنس لطیف اور اس کے اس طبقے میں جو دوشیزگی سے ہمکنار ہے راکھی ایک مستقل حسن پیدا کر دیتی ہے جس کی ستم آرائیاں کوئی نظیر کے دل سے پوچھے۔ [illegible] کی موتیوں کی [illegible] کے تار کی راکھی سے متاثر ہو کر کہتے ہیں:۔

ادا سے ہاتھ اٹھتے ہیں گل راکھی جو ہلتے ہیں   کلیجے دیکھنے والوں کے کیا کیا آہ چھلتے ہیں
کہاں نازک یہ پہنچے اور کہاں یہ رنگ ملتے ہیں   چمن میں شاخ پر کب اس طرح کے پھول کھلتے ہیں
[illegible]

ساری نظم عاشقانہ جذبات اور حسین تاثرات کا ایک پُرکیف و سکر آگیں ہے جس میں طرح طرح کے خوش رنگ پھول جا بجا کھلے ہوئے ہیں، جو ہر اہل دل کو متوالا بنائے دیتے ہیں۔ راکھی اور راکھی باندھنے والیوں کی فسوں پاشیاں جب نظیرؔ سے ضبط نہ ہوسکیں تو آخر بیتاب ہوکر کہہ بیٹھے:۔

پھرے ہیں راکھیاں باندھے جو ہر دم حسن کے تارے تو ان کی راکھیوں کو دیکھ اے جان چاؤ کے مارے
پہن زنار اور قشقہ لگا ماتھے اُپر بارے نظیرؔ آیا ہے باہمن بن کے راکھی باندھنے پیارے
بندھا لو اس سے تم ہنس کر اب اس تیوہار کی راکھی

سخاوت اور عشرت ایک ناصحانہ نظم ہے جس میں دراصل بخل کی ہجو کرنی منظور ہے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے سخاوت کے باب میں کسی قدر مبالغہ کرنا ضرور تھا لیکن نہ اتنا کہ سخاوت خود ایک عیب کی شکل اختیار کرلے۔ اس مقام پر طبیعت کے زور اور اخلاق حسنہ کی حمایت کے جوش نے شاعر کے رواں قلم کو جادۂ اعتدال سے ہٹا دیا ہے کہتے ہیں:۔

زردار ہے تو ہرگز مت مار اپنے من کو تن زیب ان سکھوں سے ترسا نہ اپنے تن کو
جو زر چلن چلیں ہیں تو بھی چل اُس چلن کو مرشد کا ہے یہ نکتہ رکھ یاد اس سخن کو
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

اس بند کا پہلا مصرع عاقلانہ نصیحت سے کس قدر لبریز ہے۔ دوسرے مصرعے میں اسی کی تشریح ہے اور طبیعت نہ مارنے کا طریقہ بتایا ہے۔ تیسرے میں ایک شریفانہ پندار کا اظہار ہے جو قطعی قابل پذیرائی ہے۔ پانچویں میں بھی ایک معتدل روش کی تلقین ہے لیکن چھٹے مصرعے میں بڑی زیادتی پر کمر باندھی ہے۔ کوڑی کفن کو نہ رکھنے کی پُرتاکید تلقین فی نفسہٖ نہایت مذموم ہے۔ یہ دراصل ایک عامیانہ شیوہ ہے اور سنجیدہ طبائع کو اس قسم کے طرز زندگی سے گریز کرنا چاہیئے۔ آخر کے دونوں مصرعوں کی لے بھی قلندرانہ ہے

جس سے ان کی سنجیدگی میں بہت کچھ کمی ہو گئی ہے اور اس سے یہ بھی کسی قدر مترشح ہوتا ہے کہ یہ تلقین شریفانہ زندگی بسر کرنے والوں کے لئے نہیں ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس نظم کا مدعا کوئی فضول خرچی یا روپیہ برباد کرنا سکھانا نہیں۔ کارِ خیر میں صرف کرنے اور دل کھول کر صرف کرنے کی ہدایت نہایت مبالغہ آمیز لفظوں میں کی ہے۔ بہ مرگِ گنجہ تا بتپ رہمن شود کا اصول پیشِ نظر رکھا ہے۔ اب دیکھئے یہ کتنا بلند اور عارفانہ خیال ہے:-

جو جو بخیل کہتی زر چھوڑ کر مرے گا — نا کھائے تو جوانی پانی مر سکے گا
تیرا وہی ہے جو کچھ راہِ خدا میں دے گا — کھا کھلا کے بہشت تو بھی سدا رہے گا
دل کی خوشی کی خاطر کچھ ڈال مال دھن کو
گر مر گئے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

قناعت توکل اور خدا پر بھروسہ کرنے کی تلقین اس سے بہتر الفاظ میں اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس بند کا چوتھا مصرع اب ضرب المثل کا کام دیتا ہے:-

جس نے یہ زر دیا ہے پھر وہی دھن بھی دیگا — مال و مکان روپے باغ و زمین بھی دے گا
جیتا رہے گا جب تک کھانے کو ان بھی دیگا — مر جائے گا تو وہی تجھ کو کفن بھی دے گا
دل کی خوشی کی خاطر کچھ ڈال مال دھن کو
گر مر گئے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

چاندنی رات ایک مصورانہ اور عاشقانہ نظم ہے جس میں نظیر کا شاعرانہ کمال نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے۔ چاندنی رات پر اردو اور دوسرے ادبیات میں اور بھی بہت سی نظمیں ہیں لیکن کوئی اس قدر کامیاب اور شگفتہ نہیں جس سے چاندنی کا سماں من و عن آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے اور طبیعت میں غیر معمولی تازگی اور بشاشت پیدا ہو سکتے ہیں:-

صحنِ چمن میں واہ واز و رجھی تھی چاندنی   چاند ہلوریں لیتا تھا اور کھلی تھی چاندنی

نظیر کا ایک ادبی کرشمہ یہ ہے کہ وہ بحر ایسی مناسب حال اور مترنم چھانٹ کر لاتے ہیں جس سے مضامین کا لطف دو بالا ہوجاتا ہے اور نظم میں جان سی پڑ جاتی ہے۔ اگر الفاظ خیال کو سماں بندی میں مدد دیتے ہیں تو ترنم سماں میں ایک مزید فسوں پیدا کر دیتا ہے۔ یہ نظم ذرا لحن میں پڑھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ چاندنی رات کا منظر پیش نظر ہے اور دھیمی دھیمی موسیقی سامعہ نوازی کر رہی ہے۔ اس شعر میں چاند کا ہلوریں لینا بالکل اچھوتا خیال ہے اور اب تک کسی شاعر کو میسر نہیں ہوا۔ چاند کی غالباً یہی صفت ہے جو اس میں ایک خاص کیفیت و جاذبیت پیدا رکھتی ہے لیکن یہ کیفیت صرف محسوس کی جاتی تھی، اب تک اس کے بیان کے لئے الفاظ میسر نہ تھے۔ نظیر نے الفاظ مہیا کرکے فطرت کا ایک نازک و معصوم حسن ارباب ذوق و نظر تک پہونچا دیا۔ اب یار کے حسنِ گلگوں اور اس کے لباسِ زرنگار کی مصوری دیکھئے:-

آیا تھا یار گلبدن پہن کے بادلہ زری   چھکے تھی تار تار میں مہ کی جھلک ذری ذری

ذیل کا شعر دیکھئے کس قیامت کا ہے۔ صبح کا منظر اتنے کم اور ایسے لطیف اور مترنم الفاظ میں اور کہیں نہ دیکھا ہوگا:-

صبح ہوئی گجر بجا، پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی کی جی میں رہ گئی

صبح کا ہونا طرح طرح سے اور بہت طول طویل طریقوں سے دکھایا گیا ہے لیکن صبح کے ساتھ گجر بجنا، پھول کھلنا اور ہوا چلنا جو صبح کے لوازم خصوصی ہیں بہت کم دکھائے گئے ہیں۔ ان چند باتوں کے مجموعے نے ایک عجب پُر لطف و سکون کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اس حسن کا خیالی نقشہ اگر کھینچا جائے تو بڑا دلکش ہوگا۔

اب چاندنی رات میں عیش و طرب کی صحبت کا ایک اور منظر دیکھئے:-

چاندنی واہ چاندنی کرتی تھی کیا جھلک جھلک   چہک رہی تھیں بلبلیں، باغ رہا تھا سب مہک

جام کے لب سے ہر گھڑی نشے کی مے چھلک چھلک ۔۔۔ یا بغل میں غنچہ لب بوسوں کی سو لپک لپک
عیش و طرب کی لذتیں ہونے لگیں جو یک بیک ۔۔۔ ایسے مزے میں عیش میں آہ کہیں سے ہک نہ دھک

صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی کی جی ہی میں رہ گئی

یہ بند ایک طلسم مسرت و طرب ہے۔ اس کی کون کون سی خصوصیتیں اور کیا کیا لطف بتائے جائیں اور خوبیاں تو درکنار صرف چھلک چھلک، جھلک جھلک، مہک مہک، چھلک چھلک، لپک لپک، بیک بیک، ہک نہ دھک سے چاندنی کا سماں، باغ کی عطر پاشیاں، شراب کی شگفتگی، بوسوں کی پرلطف لذتیں، عیش و طرب کا اضطراب اور پھر سب سے آخر میں دل کی اضطراری کیفیت کی مصوری میں جو کمال دکھایا ہے وہ نظیر ہی کا حصہ ہے۔ یوں تو ساری نظم سماں بندی میں اپنی مثال و نظیر نہیں رکھتی لیکن اس بند میں صرف ایک لفظ کی تکرار سے اصل سماں اور ساری کیفیت بالکل و کمال آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ نظم فی نفسہٖ بالکل بے تصنع ہے۔ زبان صاف اور شستہ ہے۔ متروکات کا استعمال بہت کم ہے لیکن جمع موصوف کے لئے فعل بھی صیغہ جمع ہی میں لایا ہے جیسے:۔

تم بھی نشے میں مست تھے ساقی بھی لے کے پیالیاں ۔۔۔ جس کے نشے نے اس میں تھے آنکھیں الٹ ڈالیاں

اس قسم کی اور بھی امثلہ اس نظم میں موجود ہیں۔

ہولی ایک ہندوانہ و مصورانہ نظم ہے اور شاعرانہ صنعتگری کی انتہائی نقشہ ہے۔ ہولی میں مذہبی عنصر کے علاوہ ایک قومی پہلو بھی ہے۔ اس لئے نظیر کو یہ تہوار بہت مرغوب ہے۔ خود ہولی میں شعریت اس قدر ہے کہ نظیر اس سے کسی طرح قطع نظر نہیں کر سکتے تھے۔ نظیر کی پسندیدگی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ کلیات میں آٹھ نظمیں ہولی پر موجود ہیں۔ ہولی کی محفل کا سماں، رنگ کھیلنا، ہولی کے جشن کی سماں بندی کے لئے کیسے عمدہ الفاظ منتخب کئے گئے ہیں۔

کچھ طبلے کھڑکے تال بجے کچھ ڈھولک اور مردنگ بجی ۔۔۔ کچھ جھڑپیں بین ربابوں کی کچھ سارنگی اور چنگ بجی
کچھ تار طنبوروں کے جھنکے کچھ ڈھمڈھمی اور منہ چنگ بجی ۔۔۔ کچھ گھنگرو کھنکے چھم چھم چھم کچھ گت گت پر آہنگ بجی
ہے ہر دم ناچنے گانے کا یہ تار بندھایا ہولی نے

اور دیکھئے ہولی کی رنگ رلیوں کی مصوری کیسے لطیف پیرائے میں کی ہے :۔

ہر جا گتھال گلالوں سے خوش رنگت کی گلکاری ہے ۔۔۔ اور ڈھیر عبیروں کے لاگے سو عشرت کی تیاری ہے
ہیں راگ بہاریں دکھلاتے اور رنگ بھری پچکاری ہے ۔۔۔ منہ سرخی سے گلنار ہوئے تن کیسر کی سی کیاری ہے
یہ روپ جھمکتا دکھلایا یہ رنگ جمایا ہولی نے

پوشاکیں چھڑکی رنگوں کی اور ہر دم رنگ نشانی ہے ۔۔۔ ہر وقت خوشی کی جھمکیں ہیں پچکاری کی رخشانی ہے
کہیں ہوتی ہے دھینگا مشتی کہیں ٹھٹھری کھینچا تانی ہے ۔۔۔ کہیں لٹیاں جھمکیں رنگ بھری کہیں جوتا کیچڑ پانی ہے
ہر چار طرف خوش حالی کا یہ جوش بڑھایا ہولی نے

ہولی کی یہ نظم حقیقت میں کسی تبصرے کی محتاج نہیں ۔ ہر بات اس قدر عریاں، پرکیف اور موثر ہے جس کو خاص طور پر نمایاں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔

(جوگی نامہ اور جوگن نامہ دونوں ایک قسم کی نظمیں ہیں ۔ انہیں بہ ظاہر عاشقانہ اور بہ باطن عارفانہ نظمیں کہہ سکتے ہیں ۔ دونوں میں قریب قریب ایک سے مضامین ہیں اور جذبات بھی نوعیت میں یکساں ہیں ۔ فرق اتنا ہے کہ ایک میں عاشق مرد ہے اور دوسری میں عورت ۔ جوگن نامے کی ہیروئن عورت ہے، صرف اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اس میں نزاکت اور رقت زیادہ ہے لیکن جہاں تک خالص عاشقانہ جذبات کا تعلق ہے وہ دونوں میں یکساں ہیں ۔ اپنی معشوقہ کے فراق میں دیکھئے جوگی کہتا ہے :۔

دشت اور کوہ میں وحشی سا پڑا پھرتا ہوں ۔۔۔ برق کی طرح سے بیتاب سدا پھرتا ہوں
میں غرض تجھ سے صنم جب سے جدا پھرتا ہوں ۔۔۔ رات دن ہجر میں جوگی سا بنا پھرتا ہوں

بے قراری ہے ترے نام کی جپتا سمرن

اب دیکھئے اپنے دلدار کے ہجر میں جوگن دکھ کی ماری کہتی ہے :-

ہجر نے اب تو نہایت کیا بے دم مجھ کو ۔۔۔ پھرتی ہوں مثل بگولے کی میں ویراں ہر سو
اے مرے ماہ جبیں اے مرے ہمدم گل رو ۔۔۔ کون سے شہر میں ہے کون سی جا پہ ہے تو

اے مرے ہمدم جاں اے مرے من جان و تن من

دونوں بندوں کا موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جوگی کے جذبات میں درد کے ساتھ کسی قدر کرختگی ہے لیکن جوگن کے جذبات میں درد کے ساتھ ایک قسم کی ملاحت ہے۔ یہ بالیقین اس کی نسائیت نے پیدا کی ہے۔ جوگی کے خیالات سے بیقراری اور اضطراب کا اظہار ہے جسے وہ کسی طرح ضبط نہیں کرسکتا۔ جوگن کی باتوں سے ہر چند غیر معمولی کرب و اضطراب ٹپک رہا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ انتہا درجے کے ضبط کو کام میں لا رہی ہے اور عاشقانہ خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ جوگن کی اس خصوصی کیفیت نے اس کے درد میں ایک علو اور اس کے عاشقانہ پندار میں ایک تاؤ پیدا کر دیا ہے جو جوگی کی عریاں بیانی پر بہت زیادہ فوقیت رکھتا ہے۔

ان دونوں نظموں کو دیکھ کر بلا محابا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ نظیر پورے ماسٹر تھے۔ صرف جوگی نامہ لکھ کر ان کی سیری نہ ہوئی۔ اس کے لکھنے کے بعد وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ جوگن نامہ کے بغیر عشق کے معاملات ادا نہیں ہو سکتے نہ آرٹ کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ مجتہدین سخن ہی ایسا مکمل ذوق لیکر آتے ہیں۔ ان ہی کا مجتہدانہ ذہن اپنے ذوق لطیف کی پوری پوری داد دے سکتا ہے۔ اس ذوق کے لوگ ہر عہد میں کم پیدا ہیں۔ جوگی جوگن نامے میں انگلستان کے مشہور شاعر اور مصور روسیٹی کی معروف نظم ایسٹورس کے سے مضامین ہیں۔ ان نظموں کو اردو میں ایسٹورس کا یا ایسٹورس کو انگریزی میں جوگی جوگن نامہ کا مترادف کہا جائے تو بجا ہوگا۔ ان دونوں کو ساتھ پڑھنے میں عجیب لطف آتا ہے۔ اسی

ضمن میں یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ نظمیں طول ہو جانے کی وجہ سے کسی قدر بدمزہ ہو گئی ہیں اور تفصیل کی کثرت نے بھی لطف میں کمی کر دی ہے۔ کہیں تصنع بھی پیدا ہو گیا ہے جس نے نظم کے حسن کا ازالہ کر دیا ہے۔ زبان بہت صاف ہے لیکن ہندو مذہب کی اصطلاحوں اور متروکات کے استعمال سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال اس حالت میں بھی نظم کا مجموعی اثر ایک خاص انداز رکھتا ہے جو کسی نوع دلچسپی اور جدت سے خالی نہیں۔

موتی ایک وصفانہ نظم ہے جس میں موتی کی طرح طرح سے تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ موتی کی اس قدر ثنا و صفت کرنا اور ہر زیور میں موتی ہی کے حسن پر نظر ڈالنا اور صرف اسی کی داد دینا بے معنی نہیں۔ شہباز اپنی تحقیق سے لکھتے ہیں کہ موتی نظیر کی معشوقہ کا نام تھا اور یہ نظم اسی کی تعریف میں لکھی گئی ہے۔ اب تو نظیر کے موتی کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاتا۔ نظیر کی 'موتی' ضرور گوہر یک دانہ ہوگی۔ ان کا انتخاب ہی ان کے ذوق کی پوری پوری داد ہے۔ موتی میں نظیر دیکھئے کیا کیا ادائیں دیکھتے ہیں۔ کیوں نہ ہو اپنی چیز ہے:-

کبھی وہ ناز میں ہنس کر جو کچھ باتیں بناتی ہے — تو اک اک بات میں موتی کو پانی میں بہاتی ہے
ادا و ناز میں چنچل عجب عالم دکھاتی ہے — وہ سمرن موتیوں کی انگلیوں میں جب پھراتی ہے
تو صدقے اس کے ہوتے ہیں پڑے ہر پور پر موتی

غلط ہے اس لب رنگیں کو برگ گل سے کیا نسبت — کہ جن کی ہے عقیق اور پنے اور یاقوت کو حسرت
اداھٹ کچھ مسی کی اور کچھ اس پر پان کی رنگت — وہ ہنستی ہے تو کھلتا ہے جو اہر خانۂ قدرت
ادھر لعل اور ادھر نیلم ادھر مرجان ادھر موتی

دوسرے بند کا چوتھا مصرع الہامی ہے اور اس دنیا کی چیز نہیں معلوم ہوتا۔

اکبر آباد ایک وصفانہ نظم ہے جس میں نظیر نے اپنے شہر کی خصوصیات بیان کر کے وطن کی محبت

کا حق ادا کیا ہے۔ کہتے ہیں :-

شہرِ سخن میں اب جو ملا ہے مجھے مکاں　　کیونکر نہ اپنے شہر کی خوبی کروں بیاں
دیکھی ہیں آگرے میں بہت ہم نے خوبیاں　　ہر وقت اس میں شاد رہے ہیں یہاں تہاں
رکھیو الٰہی اس کو تو آباد جاوداں

پہلے مصرعے میں نظیر اکبر آباد کو شہرِ سخن فرماتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں یہاں شعر و سخن کا بڑا چرچا تھا۔ کیوں نہ ہو نظیر کا زمانہ تھا۔ حیف صد حیف اب یہاں ذوق کی جنس کس قدر کم یاب ہے۔ اب ذرا اس بند کی شعری لطافتیں ملاحظہ کیجیے۔ مصرعے کس قدر بے ساختہ۔ زبان کس قدر پاکیزہ اور تشبیہیں کس قدر مکمل ہیں :-

ہر صبح اس کی رکھتی ہے وہ نور گستری　　شرمندہ جس کو دیکھ کے ہو عارضِ پری
ہر شام بھی وہ مشک ملاحت سے ہے بھری　　لیلیٰ کی جعد کر نہ سکے جس کی ہمسری
دن روئے مہر طلعت و شب زلفِ مہوشاں

اکبر آباد کی آب و ہوا ہمیشہ مشہور رہی ہے۔ مشہور ہے کہ پہلے یہاں کوئی وبا نہ پھیلتی تھی۔ اسی خصوصیت پر ناز کرتے ہیں :-

آب و ہوا کے لطف کوئی کیا کیا اب کہے　　دیکھو جدھر ادھر گلِ عشرت ہیں کھل رہے
ایدھر کو جھکتے ہیں تو اودھر کو چہچہے　　اشجار، باغ و شہر وہ سرسبز لہلہے
سبزوں کو جن کے دیکھ کے حیراں ہو آسماں

نظیر نے اپنے شہر میں جو جو خوبیاں دیکھیں وہ آپ کے سامنے کس خوبی سے بیان کی ہیں۔ اس نظم کی زبان کی صفائی اور شعری لطائف کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ یہ سادگی اور شیرینی میں ادبِ قدما کی ہم پلہ ہے۔ یہ نظم شروع بھی نظیر نے دعا کے ساتھ کی تھی اور دعا ہی پر ختم بھی کرتے ہیں :-

یارو عجب طرح کا یہ دلچسپ ہے مقام — ہوتے ہیں ایسے کتنے ہی خوبی کے اژدہام
ہر طور خوش رہے دل اور طبع شاد کام — میری نظیرؔ دل سے یہی ہے دعا مدام
ہنستا رہے یہ شہر بصد امن اور اماں

ذیل کا حصہ، دوسری اشاعت میں اضافہ کیا گیا ہے۔

پری کا سراپا ایک مصورانہ نظم ہے جس میں نظیرؔ نے اپنا پورا شاعرانہ کمال صرف کیا ہے۔ یہ شاہ کار لفظی مصوری کا جیتا جاگتا معجزہ اور جزئیات نگاری کا زندۂ جاوید کرشمہ ہے۔ اردو زبان کے شعری سرمائے میں، یہ ایک عدیم النظیر جمال پارہ ہے جسے دنیا کے کسی ادب کے، بہترین عہد کے کارناموں کے مقابلے میں آسانی سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میں نظیرؔ کا آرٹ اپنی پوری ندرت و قوت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس کا لفظی سرمایہ جس سے وہ ہر نوع کی صورت گری پر قادر ہے، ایک بے نہایت گنجینہ ہے جس کے علاوہ فطرت نے اسے انتخاب کا لازوال و بے خطا ذوق بھی عطا کیا ہے۔ چنانچہ اس نظم کی مرصع کاری کے لئے اس نے اس ودیعے سے بیش از بیش مدد لی ہے اور اپنے بے حساب خزانے کے بہترین جواہر منتخب کر کے، صورت و معنی کی حیرت ناک طلسم بندی کی ہے۔ لفظوں کی ترتیب، ان کا توازن، ان کا ترنم، سارا اہتمام لاجواب و بے نظیر ہے بحر کی موسیقیت ان محاسن پر مستزاد اور اپنی جگہ خود ایک لذت و مسرت ہے۔ پوری نظم اول سے آخر تک، انیسویں صدی کی ڈیرے دار بیسوا کی ہو بہو تصویر اور اس کے کردار کا سچا مرقع ہے۔ جس طرح چارلس کنگسلے (۱۸۱۹ - ۱۸۷۶) نے اپنی مشہور تصنیف ہائیپیشیا میں فریجیا کے وجود اور اناطول فرانس (۱۸۴۴ - ۱۹۲۴) نے طاعس کے لباس میں مصر کی ماقبل و مابعد مسیح سوسائٹی کی طوائف کا کردار پیش کیا ہے،

اسی طرح نظیر نے اس نظم میں پری کے نام سے انیسویں صدی کی ڈیرے دار (طوائف) کے لباس، معاشرت اور کردار کی مصوری کی ہے۔ تاریخی اعتبار سے نظیر پہلے کا قدرے معاصر اور دوسرے کا متقدم ہے۔ نظم کا مفاد صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ پری کے پردے میں، عورت کی فطرت کے بہت سے رموز بے نقاب کئے ہیں۔ نسوانی نفسیات کی مرقع کشی، اس دقت نظر کے ساتھ کی ہے کہ جگہ جگہ واقعیت کے ساتھ محاکات کا بھی پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ لطف یہ ہے کہ مصوری میں اتنی وضاحت و جامعیت ہے کہ حسن و شباب کی صوری آرائش و زیبائش اور دلستانی کے معنوی اسباب و ذرائع کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی نظر انداز نہیں ہوئی۔ عورت کے ناز و غمزے، عشوے اور کرشمے کے بیان کے ساتھ، عہد کے زنانہ فیشن لباس اور زیوروں کا بھی مکمل جائزہ لیا ہے۔ انیسویں صدی کی ایک پُرجمال نازنین، اپنے بھرپور شباب، اپنے قاتل الزہین اور دلربائی کے سارے فنون و لوازمات سے آراستہ پیراستہ ہو کر اس طرح سامنے آکھڑی ہوتی ہے کہ یکایک آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں، اور بے اختیار دل پر بجلی سی گر پڑتی ہے۔ فیشن کی تبدیلی کے ساتھ، بہت سے پرانے زیور اور کپڑے موجودہ سماج کی مجبوریوں نے ترک کر دیے ہیں لیکن ان کے نام اور ان کی لفظی تصویریں اس نظم میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہیں۔ یہی حال، اداؤں اور دل لبھانے کے بہت سے طریقوں کا بھی ہے۔ چنانچہ اپنے حدود کے اندر یہ نظم لباس اور زیوروں کے ناموں کی ایک قاموس اور عشوہ گری کے مرقعوں کی ایک البم ہے، جو معاشرت کی تاریخ کے ایک باب کی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ان محاسن سے بالاتر، صفت اور اسم صفت کا بیشتر نادر و بدیع استعمال اس نظم میں میسر آتا ہے، جو اردو ادب کا ایک لسانی تجربہ ہے۔ حسن کی طرح نظیر کو بھی دو صفتیں استعمال کرنے کا بڑا شوق ہے۔ چنانچہ، اس نظم کے مصرعے مصرعے میں ایک اسم کے لئے دو دو صفتیں نظر آتی ہیں۔ پہلے بند کے پانچوں مصرعوں اور پھر ہر بند کے پانچویں مصرعے میں، اسم صفت بطور قافیہ استعمال ہوا ہے اور لفظی حیثیت سے ہر محل پر نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے۔ معنوی اعتبار سے، پانچواں مصرعہ کیفیات و تاثرات کا نقطۂ عروج ہے جس کی بنیاد

لطافت و موسیقیت پر قائم ہے۔ اس نظم میں نظیر کے تصور کی نزاکت و شگفتگی نے، الہامی و ماورائی قوت کا مظاہر کیا ہے جو اس کے عظیم الشان تخلیق ہونے کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ نظم کا پہلا بند یہ ہے:

خوں ریز کرشمہ، ناز ستم، غمزوں کی جھکاوٹ ویسی ہے / مژگاں کی سناں، نظروں کی انی، ابرو کی کھنچاوٹ ویسی ہے
عیار نظر، مکار ادا، تیوری کی چڑھاوٹ ویسی ہے / قتال نگہ اور دہشت غضب، آنکھوں کی لگاوٹ ویسی ہے
پلکوں کی جھپک، پتلی کی پھرت، سرمے کی گھلاوٹ ویسی ہے

اس بند میں تشبیہوں کے اہتمام نے خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔ محبوبیت و عشوہ گری کے سارے لوازم کو ایک نوع کی چیزوں سے تشبیہ دے کر، شاعر نے اپنی صناعانہ عظمت ظاہر کی ہے۔ تیسرے مصرعے میں "نگہ" کو "قتال" کہہ کر اس کی، بار بار قتل کرنے کی عادت بتائی ہے۔ یہ استعمال نظیر کی اختراع ذائقہ ہے لیکن غمزوں کی جھکاوٹ، ابرو کی کھنچاوٹ، تیوری کی چڑھاوٹ، آنکھوں کی لگاوٹ، پلکوں کی جھپک، پتلی کی پھرت، سرمے کی گھلاوٹ جیسے جملوں کی وضع و تراش اور ان میں اسم صفت کا نادر و پُر مغز استعمال، غائر بیکری و نفسی مطالعے کی شہادت اور نظیر کے ذہن کی جدت طرازی ہے۔ ان جملوں میں دنیائے معانی پنہاں ہے اور ان لفظوں کا یہ استعمال اردو میں کہیں میسر نہیں آیا۔ دوسرا بند ملاحظہ ہو:-

جو کافر اس کا عالم ہے، وہ عالم حور کہاں پاوے / گر پردہ منہ سے دور کرے، خورشید کو چکر آجاوے
جب ایسا حسن بھبھوکا ہو، دل تاب بھلا پھر کیا لاوے / وہ مکھڑا چاند کا ٹکڑا سا جو دیکھ پری کو غش آوے
گالوں کی دمک، خوبی کی جھمک، رنگوں کی گھلاوٹ ویسی ہے

اس بند کے پہلے مصرعے میں "کافر" پہلی مرتبہ استعمال ہوا ہے اور آگے کے بندوں میں مختلف متوقعات کے ساتھ بار بار سامنے آتا ہے۔ اس مصرعے میں "عالم" کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ اس ایک لفظ میں دلربائی کی وہ پوری کیفیت سمو دی ہے جو حسن، شباب، آرائش اور ناز و غمزے کے مجموعی اثر سے پیدا ہوتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ "ایک نور صورت، ہزار نور کپڑا، لاکھ نور نخرا"۔ یہاں "عالم" کی معنویت و ہمہ گیری صورت

آرائش اور دلستانی کے فنوں کی مجموعی کیفیت کو نچوڑا ہے۔ دوسرے مصرعے میں "پردے" سے گھونگٹ مراد ہے۔ اس عہد کا یہ فیشن تھا کہ ہر عورت خواہ کسی طبقے کی ہو، تھوڑا سے قلیل گھونگٹ ضرور نکالتی تھی۔ اس نوع کا گھونگٹ اصطلاح میں کانا گھونگٹ کہلاتا ہے۔ یہ عوام کا جزو اعظم تو تھا ہی لیکن اس سے عورت کی جاذبیت بدرجہا بڑھ جاتی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ یہاں پردے کی جگہ نظیر نے گھونگٹ ہی استعمال کیا ہو اور کتابت کی حرکت سے بدل کر پردہ ہو گیا ہو۔ تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں "تن" کے لئے "جھمکا" اور مکھڑے کے لئے "چاند کا ٹکڑا" کیسی موزوں، مفصل اور تمام تشبیہیں ہیں۔ میں اس بند کی کوئی وجہ نہیں بتا سکتا لیکن مجھے "چاند" کی جگہ "چاند کا ٹکڑا" کہنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ پانچویں مصرعے میں "کانوں کی دمک" "خوبی کی جھمک" "رنگوں کی کھلاوٹ" بڑے پرمغز جملے اور بڑا پاکیزہ بیان ہے۔ کانوں کے لئے دمک اور رنگوں کے لئے کھلاوٹ کا انتخاب ایک دقیقہ رس مصور سے ممکن ہے لیکن "دمک" اور "کھلاوٹ" جیسی دو کیفیتوں میں فرق امتیاز کرنا اور دونوں کو پیش نظر کر دینا صرف نظیر کی نظر اور قوت بیان کا حصہ ہے۔ "خوبی کی جھمک" بھی اپنی جگہ نہایت نادر و بدیع ہے۔ تیسرا بند ملاحظہ ہو:

تھی نور دار است سر و پر سنجاف ڈوپٹے کی لٹی — جدار شیں تصویر جیسی جکڑی مینڈھیں اینچی کنگھی
دل آئینے میں تکتے رہے سب ہو کر او دیکھ نہ آئے کو نظر ہی — وہ رات اندھیری بالوں کی وہ مانگ چمکتی بجلی سی
زلفوں کی کھلت، پٹی کی پھبت، چوٹی کی گندھاوٹ ویسی ہے

اس بند کے پہلے مصرعے میں "نور" نظیر کا خاص لفظ ہے۔ وہ اپنے کلام میں جگہ جگہ خوب، بڑے، عجیب وغیرہ وغیرہ الفاظ کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ یہاں نور عجیب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ دکھانا یہ مقصود ہے کہ ڈوپٹے کی سنجاف سر پر کس انداز سے الٹی ہوئی تھی۔ اس کا کوئی نام ہی نہیں ہے۔ ڈوپٹے کی سنجاف الٹ کر یہاں شاعر نے بڑی مصوری کی ہے۔ تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں بجز و تسلسل صرف اس شاعر سے پیدا کیا ہے۔ سنجاف الٹنے سے سر کھل گیا ہے۔ دل دار شیں تصویر جیسی ہیں جکڑی مینڈھیں اور اینچی کنگھی

نمایاں ہوگئی ہے۔ کنپٹی کے چھتر سے بال زلف کہلاتے ہیں۔ اس بند میں نظیرؔ نے زلف کی جگہ ہندی لفظ لٹ استعمال کیا ہے جو بلدار کے ساتھ ترکیب پاکر' اس سیاق میں زلف سے زیادہ حسین معلوم ہوتا ہے۔ بل دار زلفیں اگر کہا جاتا تو بل دار لٹوں سے زیادہ حسین نہ ہوتا۔ انیسویں صدی اور بیسویں کے پہلے ربع تک مینڈھیں گوندھنے کا رواج تھا۔ سنگھار کے وقت کنپٹی کے بال تو آزاد چھوڑ دئے جاتے تھے اور کانوں کے پیچھے کے کچھ بال گوندھ کر، باریک چٹیاں بنالی جاتی تھیں جو سر کے دونوں پہلوؤں پر سے گزر کر، چوٹی کے ساتھ گندھ جاتی تھیں۔ اس نوع کی گندھاوٹ کا نام مینڈھیں تھا۔ جکڑی مینڈھیں سے' یہاں کسی ہوئی مینڈھیں مراد ہے۔ جبیں کو تصویر کہنا بھی بڑا پاکیزہ استعارہ ہے۔ مینڈھیں گوندھنے کی طرح' اس عہد میں پٹی جھکانے کا بھی رواج تھا۔ مانگ کے دو طرفہ پیشانی پر بال جھکا کر' اس طرح جمائے جاتے تھے کہ ماتھے پر' ابروؤں کے مقابل دو ہلالی شکلیں بن جاتی تھیں۔ اس کو پٹی جھکانا کہا جاتا ہے اور اسی کا نام نیچی کنگھی بھی تھا۔ تیسرے مصرعے میں بلدار لٹوں اور نیچی کنگھی کا قلب پر اثر دکھایا ہے۔ چوتھے مصرعے میں نیچی کنگھی یعنی جھکی ہوئی پٹی کو معنًا اندھیری رات کے جھکاؤ سے مشابہ کیا ہے اور استعارہ بالکنایہ سے یہ لطیف پہلو پیدا کیا ہے۔ چمکتی بجلی سے مانگ کی تشبیہ بھی نہایت نادر ہے اور "سی" کے اضافے سے حُسن بیان کا حق ادا کیا ہے۔ پانچویں مصرعے میں زلفوں کی ظلمت سے بلدار لٹوں' پٹی کی جہت سے نیچی کنگھی اور چوٹی کی گندھاوٹ سے جکڑی مینڈھوں کی طرف اشارہ ہے۔ اس اشارے سے' اس بند کا معنوی تسلسل اور مصورانہ کیف و اثر بہت بڑھ گیا ہے۔ اسمائے صفت کے بدیع استعمال کا جو التزام پہلے بند کے قافیوں سے شروع ہوا ہے' وہ اس بند میں بھی موجود ہے اور پوری نظم میں قائم ہے۔ اب چوتھا بند ملاحظہ ہو:۔

بے درد، ستم گر، بے پروا، چنچل، بے کل، چٹکیلی سی — دل سخت قیامت پتھر سا اور باتیں نرم رسیلی سی
ڈوروں کی بان رنگیلی سی، کاجل کی آن کٹیلی سی — وہ آنکھیں مست نشیلی سی، کچھ کالی سی پیلی سی
چتون کی دغا، نظروں کی کپٹ، سینوں کی لڑاوٹ ویسی ہے

اس بند کے پہلے دو مصرعوں میں پری کے کردار کے چند مثبت، بافائدہ اور نمایاں اجزا پیش کئے ہیں۔ تیسرے میں جسمانی آرائش کا کچھ بیان ہے اور چوتھے اور پانچویں میں حسن صورت کے دلبرانہ عنوانات کی تفصیل ہے۔ پہلے مصرعے میں صوتی اعتبار سے بائے موحدہ اور جیم فارسی کا مخلوط الیٹریشن (تواتر حروف) اور چنچل اور چلبلی جیسے لفظوں کا انتخاب اور حسن استعمال قابل داد ہے۔ تیسرا مصرعہ خصوصیت سے بڑا مصورانہ ہے۔ ڈوروں سے آنکھوں کے لال لال ڈورے مراد ہیں۔ ڈوروں کی صفت بان اور بان کی صفت رنگیلی ہے۔ اسی طرح کاجل کی صفت آن اور آن کی صفت کٹیلی ہے۔ بان کے مقابلے پر آن اور رنگیلی کے مقابلے پر کٹیلی لانا قادر الکلامی اور مصوری کے کمال کا ثبوت ہے۔ چوتھے مصرعے میں آنکھوں کی تعریف میں بھی ایسی ہی مصوری اور ایسے ہی متوازن الفاظ سے کام لیا ہے۔ اس کے علاوہ "سی" کے استعمال نے اس پورے بند میں بڑی معنویت پیدا کر دی ہے۔ چار مصرعوں میں "سی" ردیف کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے، تیسرے اور چوتھے مصرعوں کے درمیان میں بھی "سا" اور "سی" کے وجود نے ایسی ہی لذت پیدا کر دی ہے۔ الفاظ نظیر کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ پانچویں مصرعے میں جوبن کے لئے دغا کرنے کے بعد نظروں کے لئے کپٹ تلاش کر لینا قوت انتخاب و جودت بیانی کا کارنامہ ہے۔ "سینوں کی لٹا اوٹ" بالکل نیا اور انوکھا انداز بیان ہے اور نظیر کے اولیات میں سے ہے۔ اس سے شباب کے جذباتی عالم کی عکاسی کی ہے۔ انگریزی زبان میں اس کا متبادل "ایڈیسول یوتھ فل" موجود ہے مگر اردو میں اس کے وضع کرنے کا شرف نظیر کو حاصل ہے۔ اب پانچواں بند ملاحظہ ہو:-

اس کافر نخرے اور نکھ کے انداز قیامت شان بھرے — وہ نظرے جو بن تخیل میں سو آفت کے طوفان بھرے
وہ مکھڑے صاف ستارہ سے اور موتی سے دامن بھر کے — وہ کان نزاکت طوفان بھرے کن چھولوں پر جان بکھرے
بندوں کی بات جھمکوں کی جھلک بالے کی ہووت دیکھی

اس بند میں ناک اور کان کے حسن اور ان کے زیوروں کی دلکشی کا ذکر ہے۔ نظیر نے اپنے کلام میں جابجا دو

صفتیں اس طور پر استعمال کی ہیں کہ ایک اسم سے پہلے آتی ہے اور دوسری بعد کو۔ اسی طرح نظیرؔ کو بھی کئی کئی صفتیں استعمال کرنے کا شوق ہے اور اس نظم میں یہ التزام ہر بند میں موجود ہے۔ اس بند کے پہلے مصرعے میں پہلے تو بینی اور نتھ کو کافر کہا ہے اور پھر ان کے انداز کو "قیامت" اور "شان بھرے" کہا ہے۔ "قیامت شان" کو اگر "ستم ظریف" کی قسم کی ترکیب سمجھا جائے تو معنی میں دوسری قسم کی ندرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ناک میں نتھ پہننے کا رواج، ہندی عورتوں کی زینت کا ایک اہم جزو ہے۔ اس لئے اس کو کافر کا لقب دینا، بڑا دلکش انداز بیان ہے۔ اس نظم میں جس عہد کا کردار پیش کیا گیا ہے اس میں نتھ کا رواج عام تھا اور یہ زیور سہاگ کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہاں نتھ کو نتھنی سے تمیز کرنے کی ضرورت ہے۔ نتھنی کنواری لڑکیوں اور نتھ بیاہی عورتوں کے لئے مخصوص تھی۔ دوسرے مصرعے میں زنخداں کو چاہ کہا ہے جو اردو شاعری کا ایک عامۃ الورود استعارہ ہے لیکن اس کو "نکھرا" اور سو آفت کے طوفان سے بھرا بتا کر اپنے مخصوص انداز بیان کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ یہ بند چہرے کے بعض خاص اجزا کے حسن کی تعریف کے لئے مخصوص ہے، اس لئے زنخداں کا ذکر ہے، لیکن زنخداں چونکہ نتھ کے پس منظر کے طور پر بھی سامنے آتی ہے، اس لئے بھی اس کا ذکر ضروری تھا۔ تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں کان کی لو اور کان کے زیوروں کا ذکر ہے۔ کانوں کی آرائش کن پھولوں سے کی ہے اور کن پھولوں میں بالے پڑے ہیں۔ یہ سب چیزیں گول ہوتی ہیں اور ہمیشہ کم و بیش جنبش کرتی رہتی ہیں۔ ان کی گولائی اور جنبش سے ذہن چکر کی طرف منتقل ہوتا ہے اور چکر، طوفان کا لازمہ ہے۔ اس نسبت سے کان کو طوفان بھرا کہا ہے۔ استعارہ بالکنایہ کی یہ ایک نہایت لطیف و نازک مثال ہے جس کی بنا پر نظیرؔ کو اعلیٰ فن کار تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ پانچواں بند بتاتا ہے کہ کن پھولوں اور بالوں کے علاوہ کانوں میں بندے اور جھمکے بھی ہیں۔ چنانچہ بندوں، جھمکوں اور بالوں کی دلربائی کا طریقہ الگ الگ اسم صفت سے ظاہر کیا ہے۔ بندوں کے لئے ہلت، جھمکوں کے لئے جھکت اور بالے کے لئے ہلاوٹ کہہ کر ان کے مخصوص انداز دلربائی کی مصوری کی ہے۔ الفاظ کی اس نوع کی فطرت شناسی، مصوری کے علاوہ، لسانی

بصیرت کا بھی مظہر ہے۔ اب چوتھا بند ملاحظہ ہو:۔

چہرے پہ حسن کی گرمی سے ہر آن جھمکتے موتی سے　　خوش رنگ پسینے کی بوندیں سو بار جھلکتے موتی سے
ہنسنے کی ادائیں پھول جھڑیں باتوں میں ٹپکتے موتی سے　　وہ پتلے پتلے ہونٹ غضب وہ دانت چمکتے موتی سے
پاؤں کی رنگاوٹ قہر ستم دھڑیوں کی بناوٹ ویسی ہے

یہ بند نظیر کی خلاقانہ قدرت کا شاہکار ہے۔ حسن کی گرمی حسن کی شدت و فراوانی سے ہے اور چہرے پر پسینے کی بوندیں حسن کی گرمی نے پیدا کی ہیں۔ پسینے کی بوندیں گول اور چمکیلی ہوتی ہیں اس لئے موتی کی طرح جھمک رہی ہیں۔ یہ بوندیں پری کے چہرے کے پسینے کی بوندیں ہیں اس لئے خوش رنگ ہیں اور ایک بار کی جگہ سو سو بار جھلک رہی ہیں۔ اس بند میں اگرچہ موتی [illegible] کا کہیں ذکر نہیں ہے مگر خوش رنگ پسینے کے موتیوں کی جھلک سے میرا ذہن خود بخود اس طرف منتقل ہوتا ہے۔ ہنسنے میں پھول جھڑنا، باتوں میں موتی ٹپکنا، ہونٹوں کا پتلا ہونا اور دانتوں کا موتی کی طرح چمکنا سب حسن صورت کے نہایت پاکیزہ اور دلفریب لوازم ہیں جن سے پری کے حسن کی شگفتگی و دل پذیری کی تصویر نظروں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ پانچویں مصرعے میں پاؤں کی مہندی کو بجا طور پر قہر و ستم بتایا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل تک ہونٹوں پر مسی کی دھڑی جمانے کا فیشن تھا۔ مسی کی سیاہی پان کی سرخی سے مل جل کر ہونٹوں پر ایک عجیب کیفیت پیدا کرتی تھی جو قلب و نظر دونوں کو متاثر کرتی تھی۔ اس کو لاکھا جمانا بھی کہا جاتا تھا۔ اس کی ساری کیفیت [illegible] وضاحت سے ظاہر کی گئی ہے۔ اب [illegible] بند ملاحظہ ہو:

نقشہ یہ بیان سے باہر ہے وہ کافر حسن [illegible]　　کچھ آن نئی کچھ حسن نیا کچھ جوش جوانی کا ادمکا
پلکیں جھپکیں ان محبوب کی [illegible]　　وہ ہنسنے [illegible] عاشق سے کھیلیں بانکپن [illegible]
[illegible] غضب بانکوں کی بناوٹ ویسی ہے

اس بند میں حسن و شباب کی [illegible] پہلے مصرعے

میں ”اہاہا“ کے فجائیہ استعمال سے، قلب پر حُسن اور شباب کا متحدہ اثر دکھایا ہے۔ دوسرے مصرعے میں ”آپ نئی“ سے جوانی کے اٹھان اور الھڑپن کی طرف اشارہ ہے۔ ”حسن نیا“ سے تازگی و شگفتگی مراد ہے۔ ان دونوں جملوں کے ساتھ ”کچھ“ نے خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔ ”اومکا“ کے معنی میں تحقیق نہ کر سکا مگر قرینے سے ”چھا جانا“ معلوم ہوتے ہیں یعنی جوانی کا جوش چھایا ہوا تھا۔ تیسرے مصرعے میں جوانی کے جوش کے اثر و اقتضا کی مصوری کی ہے۔ باہوں کی لپک جھپک، طبیعت کی شوخی، چلبلے اور نچکے پن سے پیدا ہے۔ تیزی و طراری کے لئے لپک جھپک کا انتخاب نہایت موزوں ہے اور باہوں کی حسین اضطراری حرکات کی سچی مصوری ہے۔ ”لپک جھپک“ کے لفظ کو اپنی حرکت سے کچھ ایسی صوتی مناسبت ہے کہ اس کا تلفظ اپنے متلازم فعل کی خود بخود صورت گری کرنے لگتا ہے۔ ایسے الفاظ بروئے کار آنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو زبان پر عسرت و تہی مائیگی کا الزام بے بنیاد ہے۔ یہ زبان نوع بہ نوع تصورات و مفاہیم سے مالامال ہے اور کسی قسم کے اظہار و بیان سے عاجز و قاصر نہیں۔ تلاش و نظر کی شرط سے ہر قسم کا لفظ اور انداز بیان میسر آ سکتا ہے۔ تیسرے مصرعے میں نظیر نے پہلے لپک جھپک کی مصوری کی ہے اور پھر خود ہی ”واہ“ کہہ کر اس کی داد بھی دی ہے۔ چوتھا مصرعہ اعلیٰ شاعری اور اعلیٰ مصوری کی جان ہے۔ پری کی اُٹھتی جوانی ہے۔ اس کے بازو بھرے بھرے، جوش شباب سے صحت ور، تنومند اور گول گول ہیں۔ صحت وری عورت کا بڑا حُسن ہے اور بعض کے نزدیک عین حُسن ہے۔ بانکا اس زمانے کا فیشن ایبل سپاہی تھا، اس لئے حسین اور تیکھی چیزوں کا بانکے سے استعارہ کیا جاتا تھا۔ نظیر نے بھی پری کے بازوؤں کی صحت وری اور تنومندی کا بانکے سے استعارہ کیا ہے اسم کے دائیں بائیں، دو صفت لانے کا التزام و اہتمام یہاں بھی موجود ہے۔ بازو بانکے بھی ہیں اور ہوش ربا بھی ہیں۔ اپنے سڈول پن کے حسن اور اپنی صحت وری کے گداز دونوں سے ہوش ربائی کرتے ہیں۔ یہ تو ان کا ہر نظارگی کے ساتھ عام سلوک ہے لیکن عاشق سے بانک پٹا کھیلتے ہیں گویا بڑھ کر برابر کا مقابلہ کرتے ہیں۔ پانچویں مصرعے میں پہنچی کی تقدیر کی رسائی پر بالکنا یہ رشک کیا ہے۔

غضب کہہ کر رشک وتحسین دونوں جذبوں کو ایک بیان میں سمویا ہے۔ اس مصرعے کا آخری ٹکڑا "بانکوں کی بندھاوٹ ویسی ہے" نظیر کے حصے کا مشاہدہ اور بیان ہے۔ ذوقِ حسن نگر کا یہ انتہائی کمال ہے کہ اُسے "بندھاوٹ" میں بھی حسن نظر آئے۔ نظیر کی حسن پرستی کا یہ نقطۂ عروج ہے کہ اُسے پری کے بازو پر بانک کی بندھاوٹ بھی ایک منفرد جمال نظر آتی ہے۔ بانکے، بانک پٹا اور بانک میں جو تجنیس ہے وہ لطف بالائے لطف ہے اور چوتھے پانچویں مصرعوں میں باسے موحدہ اور باسے فارسی کا جو ایلٹریشن (تواترِ حروف) ہے وہ اس پر مستزاد ہے۔ اب آٹھواں بند ملاحظہ ہو:

وہ گورے گورے ہاتھ غضب وہ نرم کلائی ناز بھری
کچھ شوخ کڑوں کی جھنکاریں کچھ جھنکے چوڑی باہوں کی
یہ عالم دیکھ کے عاشق کا سینے میں تڑپے کیوں نہ جی
وہ مہندی پیاری پیاری سی وہ پوریں نازک نازک سی
مہندی کی رنگت فندق کی بنت پھولوں کی پھبوٹ ویسی ہی

اس بند کے پہلے مصرعے میں گورے گورے سے صرف ہاتھوں کی فطری سادگی اور ستھراپن دکھایا ہے۔ پھر کلائی کو دو صفتوں سے موصوف کرکے نرم اور ناز بھرا کہا ہے۔ یہاں پھر نظیر نے اپنی مردم شناسی اور زبان دانی کا ثبوت دیا ہے۔ کلائی بازو کے مقابلے میں نازک تر عضوِ بدن ہے اور عورت کی کلائی خصوصیت سے اپنی نزاکت کے لئے ضرب المثل ہے۔ ہاتھ کا حسن یہ ہے کہ وہ بھری بھری اور تنومند ہو۔ کلائی کا کمال یہ ہے کہ وہ پتلی اور نازک ہو۔ دوسرے مصرعے میں کڑوں کے لئے جھنکار اور چوڑی کے لئے جھنک کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ان الفاظ کا صوتی فرق فوراً جالبِ توجہ کرتا ہے۔ چوڑی کڑے کے مقابلے میں نازک زیور ہے اس لئے اس کی آواز کڑے کی آواز سے زیادہ نرم اور شیریں ہے۔ جھنکار اور جھنک کا صوتی فرق سمجھنے والے شاعر کی قوتِ امتیاز کی نزاکت کی داد دے سکتے ہیں۔ تیسرا مصرعہ خالص شاعرانہ ہے اور چوتھے میں انگلیوں اور پوروں کے حسن ونزاکت کی تعریف کی ہے۔ پانچویں مصرعے کا چوتھا حصہ خاص طور پر مہندی کی رنگت سے متعلق ہے کہ ہتھیلیوں اور انگلیوں میں مہندی رچی ہوئی ہے فندق ... گشت کر سکتے ہیں۔

اس جزو کا ذکر علیحدہ کرکے یہ بتایا ہے کہ پور کا حسن انگلی کے حسن پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس فوقیت کی وجہ یہ ہے کہ پور پر چھلے کی موجودگی نے خاص جمال پیدا کر دیا ہے جو "بنت" سے ظاہر کیا گیا ہے۔ پرانی آرائش میں انگلیوں کے پور پور پر چھلا پہنا جاتا تھا۔ اس مصرعے میں نظیر نے لسانی اجتہاد کیا ہے اور لفظ گر (نیولوجسٹ) کی سچی خدمت بڑی قدرت کے ساتھ انجام دی ہے۔ چھلے سے چھلاوٹ اسم صفت بنا کر اس نے چھلے کی دلکشی کے اظہار کے لئے ایک نیا لفظ وضع کر دیا ہے جو اصطلاح کے طور پر بھی استعمال ہو سکتا ہے۔

اب نواں بند ملاحظہ ہو:۔

کچھ ناز و ادا کی مغروری کچھ جور و جفا کا بانک پنا ‏ ‏ ‏ کچھ آمد حسن کے موسم کی کچھ کافر جسم رہا گدرا

یہ شور جوانی اٹھتی کا آتا ہے امنڈ کر جوں دریا ‏ ‏ ‏ وہ سینہ ابھرا جوش بھرا وہ حسن کا عالم جھوم رہا

شانوں کی اکڑ گردن کی ترلٹ، مونڈھوں کی کھنچاوٹ ویسی ہے

اس بند کا لطف و کیف اپنی جگہ نرالا ہے۔ اس میں شباب اور لوازم شباب کی مصوری کی گئی ہے۔ پہلے مصرعے میں مغروری کا لفظ نمائش کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور "بانک پنا" تیکھے پن کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ شباب کی آمد کے وقت، خود نمائی کا جذبہ عورت میں بہ شدت کار فرما ہوتا ہے اور اس نمائش میں ایک قسم کا تیکھا پن پیدا کر دیتا ہے جو نظارگی کے لئے اس عالم کو ناقابل برداشت بنا دیتا ہے۔ انگریزی زبان میں اس عالم کو ایگریسو اور فارسی محاورے میں گلو سوز کہتے ہیں۔ دوسرے مصرعے میں "آمد" رسیدگی اور "حسن کا موسم" جوانی کا مترادف ہے۔ یہاں موسم کا استعمال لاجواب اور قابل داد ہے۔ چونکہ عنوان شباب ہے، اس لئے جسم میں گدراہٹ پیدا ہو رہا ہے۔ گدراہٹ کا مفہوم کسی شرح و وضاحت کا محتاج نہیں ہے لیکن جو جسم گدرا رہا ہو اسی کی صفت میں کافر لانا مشاہدے، محل شناسی اور مصوری کا انتہائی کمال ہے۔ گدراہٹ کے ساتھ جسم میں جو بھرا بھراپن اور اعضا میں جو گولائی، تناسب اور جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے، وہ صنمیت کا لازمہ ہے۔ اس لئے اگر گوشت پوست کے جیتے جاگتے صنم کو، جو ایمان فریب و ہوش ربا ہی کے اعتبار سے کفر مجسم ہے،

کافر کہا جائے تو اس کی ستائش میں مبالغہ نہ ہوگا۔ تیسرے مصرعے میں "شور" کے انتخاب سے بڑی شاعرانہ قدرت کا ثبوت دیا ہے۔ جوانی کے لئے "شور" کے استعمال سے، جوانی کی عالم آشوبی کا اعلان کیا ہے۔ جسمانی کیفیت یا عالم کے لئے لفظ منتخب کرنے کے سلیقے کا ثبوت اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ جوانی کے جوش، اس کی بیباکی، اس کی بلند آہنگی کے مظاہرے کے لئے "شور" سے بہتر لفظ میسر نہیں آ سکتا تھا۔ اسی مصرعے میں اٹھتی جوانی کے شور کو امنڈ کر آنے والے دریا سے تشبیہ دی ہے جو صوری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے مکمل ہے۔ ہندی زبان کے کسی شاعر نے جوش شباب کو بھنور سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا ہے :-

جیسے بھنور پڑے ندیا میں　　جوبن ناچے ڈولے انگیا میں

مگر یہ تشبیہ نظیر کی تشبیہ سے زیادہ جامع اور مکمل نہیں ہے۔ اس سے جوانی "پھٹی پڑنے" کا مفہوم تو پورا پورا ادا ہو جاتا ہے لیکن جوانی کے دوسرے لوازم و مفاہیم تشنہ رہ جاتے ہیں۔ "دریا امنڈ کر آنا" خود ایک محاورہ ہے۔ لطف یہ ہے کہ تشبیہ کے سلسلے میں ایک محاورے کا لطیف استعمال بھی پیش کر دیا ہے۔ چوتھے مصرعے کا پہلا حصہ تیسرے مصرعے کی شرح و وضاحت کرتا ہے۔ اسی مصرعے کے آخر میں "عالم جھوم رہا" لکھ کر یہ دکھایا ہے کہ حسن و شباب آپ اپنے نشے میں سرشار رہتے ہیں۔ یہاں تصویر کا تکملہ ہو جاتا ہے۔ پانچویں مصرعے میں حسن صورت کی مزید تفصیل دی ہے۔ اکڑ تناؤ کے معنی میں ہے اور مڑت خم گردن کا مفہوم ادا کرتی ہے۔ یہ خم وہ خم ہے جو گردن کو صراحی دار بنا کر مینا کا ہم شکل کر دیتا ہے۔ مونڈھوں کی کھنچاوٹ کے معنی گداز و تناؤ کے ہیں جو کہ صحت و بدن کے حسن کے اہم اجزا ہیں۔ اب دسواں بند ملاحظہ ہو :-

یہ ذرگندی کا عالم جھلکے ایڑی بھی دیکھ سکتے　　دُر گوش صاف کھرا ایسا جیسے ہو موتی دیکھو جیسے
دل ہوتے ٹکڑے تڑپے ہاتھ سے اور غش کھا دیتے ہی دیکھتے　　وہ گردن موتی سی جھری کٹ جانے صراحی دیکھو جیسے
دانتوں کی مڑت اندنیں کی بھرت مونڈھوں کی کھنچاوٹ ویسی ہے

اس بند کے پہلے مصرعے میں نہایت لطیف کنائے سے 'گدّی کی سفیدی کو پری کا ہمرنگ بتایا ہے۔ پانی پانی ہونا شرمندگی کے موقعے پر بولا جاتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں گورے صاف گلے کی چمک کو موتی کی دمک سے تشبیہ دی ہے لیکن موتی، اس کے مقابلے میں اپنے کو اتنا حقیر سمجھتا ہے کہ شرم سے پانی پانی ہوکر بہا جا رہا ہے۔ تیسرے مصرعے میں عاشق کے قلب کی کیفیت ظاہر کی ہے۔ چوتھے میں اونچی، حسن بھری گردن کو صراحی سے مشابہ کیا ہے۔ صراحی سے 'گردن کی تشبیہ' اگرچہ عامۃ الورود ہے لیکن اس سے بہتر میسر بھی نہیں آتی۔ نظیر نے اس کی عمومیت کو اپنے انداز بیان سے زائل کیا ہے۔ پانچویں مصرعے کے قافیے میں کتابت کی تحریف معلوم ہوتی ہے۔ قلمی نسخے اور شہباز ایڈیشن دونوں میں یہ مصرع ایک ہی طرح ہے پھر بھی میرا خیال یہ ہے کہ یہاں "مونڈھوں" کی جگہ "کولھوں" ہونا چاہیے۔ مونڈھا کندھے کو کہتے ہیں اور کولھا، چوتڑ کے اوپر کے حصّے کا نام ہے۔ اس مصرعے میں، دائیں اور بائیں کے ساتھ، مونڈھوں کے مقابلے میں کولھوں زیادہ قرین سیاق ہے چنانچہ اس مصرعے میں چوتڑوں کی منضبط جنبش اور کولھوں کے بھاری پن کا بیان ہے۔ کولھوں کا گداز، عورت کی صحت کی علامت ہے اور پیکری حُسن کا خاص جزو سمجھا جاتا ہے۔ اب گیارھواں بند ملاحظہ ہو:-

اس سینے کا وہ چاک ستم اس کرتی کا تنزیب غضب ۔ اس قد کی زینت قہر بلا اس کا فرچھب کا زیب غضب
اُن ڈبیوں کا آزار بُرا اُن گیندوں کا آسیب غضب ۔ وہ چھوٹی چھوٹی سخت کچیں، وہ کچے کچے سیب غضب
انگیا کی بھڑک، گوٹوں کی جھمک بندوں کی کساوٹ ویسی ہے

اس بند کے پہلے مصرعے میں، سینے کے چاک سے، کرتی کا گریبان مراد ہے جس میں سے انگیا جھلک رہی ہے۔ نفاست پسند عورتیں ہمیشہ مہین سے مہین کپڑے کی انگیا پہنتی ہیں۔ بعض کپڑے، اس جزو لباس کے لئے مخصوص ہیں۔ ان میں سے ایک تنزیب بھی ہے۔ تنزیب نہایت باریک قسم کی ململ کا نام ہے۔ چاک کو ستم اور تنزیب کو غضب کہہ کر دونوں مناظر کے اثر میں توازن پیدا کیا ہے اور دوسرے مصرعے میں قد

کی موزونیت کو تہہ بلا بنا کر رعنائی کا مجسمہ بنایا ہے۔ کافر کی طرح "چھب" بھی نظیر کا بڑا محبوب لفظ ہے اور کلام میں جگہ جگہ وارد ہوا ہے۔ "چھب" کے معنی میرے نزدیک یہاں حسن و شباب کا مجموعی تاثر ہے۔ لطیف صاحب کے خیال میں "چھب" تختی کے معنی انگریزی لفظ "پروفیل" کے مترادف ہیں۔ یہاں "چھب" کو کافر کہہ کر اس کی دلربائی کو بہ درجۂ اتم بڑھا دیا ہے۔ تیسرے مصرعے میں "ڈبیوں اور گیندوں" سے پستانوں کا استعارہ کیا ہے اور ان کے کیف و اثر کو ایک جگہ آزار اور دوسری جگہ آسیب کہا ہے۔ آسیب آزار سے شدید تر آفت ہے اور قسم میں بھی اس سے جدا ہے۔ آزار کا تعلق مادیت سے بھی ہے مگر آسیب خالص غیر مادی بلا ہے۔ اس لئے دوسری تشبیہ پہلی کے مقابلے میں زیادہ لطیف ہے بلند تر ہی اور اتم بھی ہے۔ [illegible] کے کیف و اثر کو اب تک آسیب سے تشبیہ نہیں دی گئی۔ یہ نظیر کے حصے کی بات ہے۔ چوتھے مصرعے میں تیسرے کی مفصل شرح و وضاحت کی ہے۔ چھوٹی چھوٹی "سخت" اور "کچے کچے" کے استعمال سے مصوری کا حق ادا کیا ہے۔ پانچواں مصرعہ تیسرے اور چوتھے سے زیادہ پُر اثر ہے۔ پستانوں کی تعریف کے ساتھ انگیا کی ستائش لازمی ہے۔ "بھڑک" انتہائی دلکشی کے اظہار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ انگیا نہایت بھڑکدار ہے۔ عہد کے فیشن کے مطابق اس میں خوشنما گوٹ بھی لگی ہوئی ہے جو پڑی بھڑک اور وضع دے رہی ہے۔ انگیا کے بند بہت کس کر بندھے ہوئے ہیں جو جوانی کا اقتضا ہے۔ جوان عورت عادتاً انگیا کے بند بہت کس کر باندھتی ہے۔ تیسرے چوتھے اور پانچویں مصرعوں کا پیکر نقطۂ نظر سے مصوری کا حق ہے۔ [illegible] ظاہر کیا جائے۔

اب بارہواں بند ملاحظہ ہو:

اس گورے گورے سینے پر وہ کرتی کی قزاز چھلی | چھب لاتی ہے [illegible] جھلمل سے بڑھی
[illegible] | [illegible]
[illegible]

اس بند میں زیور کا بدن سے تعاون دکھا دیا ہے۔ ہیرے جڑی چمپا کلی، توڑے، جگنو، ہیکل اور بدھی نے مل کر گورے گورے سینے پر ایک باغ کھلا رکھا ہے۔ انواع و اقسام کے زیور ایک چمنستان ہیں اور گورا سینہ اس کا پس منظر ہے۔ اس عالم میں دل کا لوٹنا، تڑپنا اور بے قابو ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ چوتھے مصرعے میں پیٹ کی ملائی اور ناف کی تارے سے تشبیہ نہایت نادر اور مکمل ہے۔ ملائی جیسی سفید، پاکیزہ، ملائم اور نرم سطح والی چیز سے پیٹ کو اور تارے جیسی گول، چمکیلی اور حسین چیز سے ناف کو تشبیہ دینا، اعلیٰ مصوری ہے۔ ان جمال پاروں سے مس ہو کر نظارگی کی نگاہ اگر پھسلی جاتی ہے تو کون سے تعجب کی بات ہے۔ شعر میں اتنی واقعیت اور مبالغے میں اتنی حقیقت باقی رکھنا نظیر ہی کے بلوغ نظر کا کام ہے۔ نظیر سچا واقعہ نگار اور حقیقت طراز شاعر ہے، جب وہ مصوری کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو حق ادا کر دیتا ہے۔ کوئی تفصیل، قطع نظر اس سے کہ وہ کسی نوع کی ہو، نظر انداز نہیں کرنا چاہتا۔ اس بند کا پانچواں مصرعہ، نظیر کے فنی نقطۂ نظر کا منطقی نتیجہ ہے۔ اب تیرہواں بند ملاحظہ ہو:-

ہر آن نرالی ہر ایک سے، اس شوخ پری کی محبوبی — کچھ ناز و ادا کی مرغوبی، کچھ شرم و حیا کی محجوبی
اب گھنے کی تعریف کروں، یا کافر جوڑے کی خوبی — پوشاک سنہری عطر بھری، سر پاؤں جواہر میں ڈوبی
جگنوں کی دمک، سینے کی صفا، کرتی کی پھنساوٹ ویسی ہے

یہ بند اپنی خوبی اور دلکشی میں دوسرے بندوں کے برابر ہے۔ پہلے مصرعے میں پری کا جبلی نچلا پن دکھایا ہے۔ محجوبی یہاں عشوہ گری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ہر لمحہ، اس سے ایک نہ ایک ایسی ادا ظہور پذیر ہوتی ہے، جو نہ صرف اسی کی پہلی ادا سے مختلف ہے بلکہ اور محبوبوں کی اداؤں سے بھی جدا ہے۔ وہ دلبری کے انداز و طریق میں لمحہ بہ لمحہ تنوع پیدا کرتی رہتی ہے۔ کبھی ناز و ادا سے دل لبھاتی ہے، کبھی شرم و حیا سے قلب کو متاثر کرتی ہے۔ ان دو مصرعوں میں محبوبی، مرغوبی اور محجوبی تینوں لفظ جن میں دو قافیے ہیں، مغز و مفاہیم سے لبریز ہیں۔ اس بند میں دو گونہ مصوری کا التزام کیا گیا ہے۔ پہلے دو مصرعوں میں حسن صورت

سے جنم لینے والی اور نفسیاتی اداؤں کا ذکر ہے اور آخر کے تین مصرعوں میں جسمانی آرائش اور سنگھار کی دلکشی و دلفریبی کا جائزہ لیا ہے۔ تیسرے مصرعے میں "اب" کا استعمال بہت معنی خیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب کسی تعریف کی گنجائش ہی نہیں ہے لیکن اگر گنجائش نکال بھی لی جائے تو یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ پہلے گہنے کی تعریف کی جائے یا کامدار جوڑے کی خوبی بتائی جائے۔ خوبی کا استعمال بھی نظیر کی زبان میں مخصوص ہے۔ وہ اس لفظ کو جاذبیت کے مترادف کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ تیسرے مصرعے میں یہ بھی بتایا ہے کہ پری کی آرائشی محبوبیت کا راز گہنے اور جوڑے دونوں کے حسن میں مرکوز ہے مگر قوت انتخاب محدود ہے۔ یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کس کو کس پر فوقیت ہے۔ جوڑا سنہرا ہے اور عطر میں بسا ہوا ہے۔ اس حد تک بسا ہوا ہے کہ عطر میں ڈوبا ہوا کہا جائے تو بجا ہے۔ سر سے پاؤں تک سارا زیور جڑاؤ ہے جس کو پہن کر پری جواہر میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس عہد میں سنہرا جوڑا اور مرصع زیور خصوصیت کے ساتھ دولتمندوں اور امیرزادیوں کی پوشاک تھا۔ پانچواں مصرعہ حسب معمول عروج تک رہبری کرتا ہے چمک اور دمک کے مفاہیم میں بین فرق ہے۔ گورے سینے میں اگر چمک ہے تو جگنو کو جو خود مرصع بھی ہے اس سے متمیز ہونے کے لئے دمکنا چاہیے۔ چست لباس ہمیشہ کسی نہ کسی عنوان آرائش کا جزو رہا ہے اور سینے کا لباس ہر قوم و ملت میں چست ہی پسند کیا جاتا ہے۔ پری کی کرتی اس کے بدن پر خوب چست ہے اور اس کی چھب وٹ جو کوشش کرکے پیدا کی گئی ہے قیامت برپا کر رہی ہے۔ اب چودھواں بند ملاحظہ ہو:

پازیب کڑے پاؤں گھنگرو اڑیاں چھڑیاں گجرے توڑے
وہ کافر دھج جو دیکھے سو بار قیامت کا لرزے
ہر جنبش میں سو جھنکاریں ہر ایک قدم پر سو جھمکے
وہ تنہیں پیاں جوتی کی اونچی ایڑی نیچے چپ نیچے
کفشوں کی کھٹک دامن کی جھٹک ٹھوکر کی قیامت ایسی ہے

اس نظم میں "کافر" بار بار استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ نیا لطف رکھتا ہے۔ نظیر کو یہ لفظ اس لئے بہت خوب ہے کہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں یہ معشوق کی حیثیت کے اظہار کے لئے بہت موزوں اور بڑے

وسیع مفاہیم کا حامل ہے۔ پہلے مصرعے میں یہ لفظ دہج کی تعریف کرتا ہے۔ دہج یہاں "عالم" یا "سبھاؤ" یا قامت یا انگریزی لفظ بیرنگ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ "کافر دہج" کہہ کر خوش قامتی کی تعریف کی ہے۔ اردو اور فارسی شاعری میں چال کا قیامت سے استعارہ کیا جاتا ہے۔ اس بند میں چونکہ پاؤں، پاؤں کے زیور، جنبش، قدم، چال، ایڑی، پہنچے، کفش، ٹھوکر کا ذکر ہے، اس لئے اول ہی سے قیامت کا دل لرز رہا ہے اور سو سو بار لرزتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں پاؤں کے زیوروں کا ذکر ہے۔ نظیر کو بیان پر یہ قدرت حاصل ہے کہ ایک قسم کے سارے زیوروں کے نام بے تکان ایک ہی مصرعے میں گنوا دیئے ہیں۔ جس طرح پانچویں بند میں کانوں اور ناک کے زیوروں، ساتویں میں بازو اور پہنچے کے زیوروں، اور آٹھویں میں کلائی اور انگلیوں کے زیوروں کا ذکر ہے اسی طرح بارھویں اور چودھویں بندوں کے دوسرے مصرعوں میں گلے اور پاؤں کے زیوروں کا ذکر ہے۔ پاؤں میں انواع و اقسام کے گہنے کی موجودگی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر جنبش میں سو جھنکاریں اور ہر قدم پر سو جھمکے پیدا ہوتے ہیں۔ تبکے سے یہاں کمر کی لچک مراد ہے۔ جوانی کی چال میں مستی اور شوخی فطرتاً موجود ہوتی ہے لیکن پری کی چال میں چنچل پن بھی ہے اور وہ ایڑی اونچی اور پنجے نیچے کر لینے سے پیدا ہوا ہے۔ اونچی ایڑی اور نیچے پنجے کا فیشن بیسویں صدی کی ابتدا میں فرانس میں پیدا ہوا اور عورتوں کی دنیا میں بہت مقبول ہوا۔ چوتھے مصرعے سے ثابت ہے کہ نظیر کو اس نوع کی رفتار کے حسن و دلربائی کا احساس بدا ہتاً ڈیڑھ صدی پہلے سے تھا۔ ایران اور ہندوستان کے شعرا نے چال کی طرح طرح سے تعریف کی ہے لیکن اس پہلو سے کسی نے روشناس نہیں کرایا۔ جس دلدار کی رفتار کی شوخی و طراری کا یہ عالم ہو کہ زمین پہ بہ مشکل پاؤں ٹکائے وہ دامن جھٹک کر الگ ہی الگ رہنا پسند کرتی ہے۔ دامن کی جھٹک سے حسن کی نخوت و تمکنت اور ٹھوکر کی لگاوٹ سے شباب کے پندار کی طرف اشارہ کیا ہے۔ محبوبہ کی ٹھوکر سے "مردہ زندہ ہو جانا" مشہور بات ہے۔ اب پندرھواں بند ملاحظہ ہو:

قاتل ہر آن نیا عالم، کافر ہر آن نئی جھلکیں — بانکی نظریں، ترچھی پلکیں، بھولی صورت، میٹھی باتیں
دل بس کرنے کے لاکھوں ڈھب، جی لینے کی سو گھاتیں — ہر آن پھبن، ہر آن سجن، ہر دم میں بدلے لاکھ دھجیں
آنکھوں کی لگاوٹ، قہر ستم، باتوں کی رکھاوٹ ویسی ہے

اس بند میں پری کی نفسیاتی کیفیت بیان کی ہے۔ پہلے مصرعے میں "عالم" اور "جھلک" کا تقابل ہے۔ ہر لمحہ اس کا حسن ایک نیا روپ بھرتا ہے جو عاشق کو قتل کر دیتا ہے اور ہر لمحہ اس کے پیکر پر ایک نئی صنمیت طاری ہوتی ہے جو ایمان میں خلل ڈال دیتی ہے۔ یہ عشوہ گری وہ اپنی بانکی نظروں، ترچھی پلکوں، بھولی صورت اور میٹھی باتوں سے کرتی رہتی ہے۔ نظیر مغلیہ آرٹ کا سچا پرستار ہے۔ جس طرح مغلوں کو اپنی عمارت میں جواب بنانے کا شوق ہے اسی طرح نظیر کو اپنے کلام میں مترادفات و متقابلات جمع کرنے کا شوق ہے۔ بانکی نظر کے مقابل ترچھی پلک اور بھولی صورت کے مقابل میٹھی بات لانا، اس کا شعری و لسانی ایمان ہے۔ اس سے اس کی تلاش کی قوت اور انتخاب کے ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ پہلے مصرعے کے پہلے ٹکڑے کو قاتل اور دوسرے کو کافر سے شروع کیا ہے۔ ان دونوں لفظوں کو علی الترتیب دوسرے مصرعے کے دونوں ٹکڑوں سے نسبت ہے۔ بانکی نظریں اور ترچھی پلکیں قاتل اور بھولی صورت اور میٹھی باتیں کافر ہیں۔ یہ ہر لحظہ نیا عالم پیدا کر کے قتل کرتی ہیں اور وہ ہر لحظہ نئے جھمکوں سے دین و ایمان ہر لیتی ہیں۔ تیسرے مصرعے میں "دل بس کرنے" کے بعد ہی "جی لینے" کا فقرہ منتظر ہے۔ دوسرا شاعر ایسا متوازن جملہ پیدا کرنے سے قاصر رہتا۔ چوتھے مصرعے میں "پھبن" و "سجن" جیسے مترادفات سے صنعت کا استعمال لفظی جادوگری کا نمونہ ہے۔ پانچواں مصرعہ ہر بند کی طرح اس بند میں بھی عروج پیدا کرتا ہے۔ اس مصرعے میں عورت کے کردار کا ایک اہم راز بے نقاب کیا ہے۔ آنکھیں عورت کی نخوت کا بڑا کارآمد ذریعہ ہیں۔ سارے وار خالی جانے کے بعد بھی ان کا وار خطا نہیں پڑتا اور بار ار ہوتا ہے۔ یہاں یہ بتایا ہے کہ پری اس

ہتیار کا بھرپور وار نہیں کرتی۔ محض لگاوٹ سے کام لیتی ہے۔ لگاوٹ، نگاہوں کے تبسم کا دوسرا نام ہے۔ یہ تبسم ہی اپنی جگہ قہر و ستم کی اہمیت رکھتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ ایک طرف نگاہوں سے لگاوٹ کرتی ہے اور دوسری طرف باتوں کی رکھائی سے، اس کا اثر زائل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ سادہ لوح عاشق اقرار انکار کی عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کے اشاروں پر ناچنے لگتا ہے۔ اب سولھواں بند ملاحظہ ہو:

تصویر کا عالم نکھ سکھ سے، چھب تختی صاف پری کی سی　　کچھ چین جبین کے اینٹھ رہے اور ہونٹوں میں کچھ گالی سی
بیدردی سختی بہتیری اور مہر محبت تھوڑی سی　　بھولی عیاری ناک چڑھی، بھولی سیانی، پکی بیسی
ٹھٹھوں کی اڑاوٹ اور غضب قہقہ کی ہنساوٹ ویسی ہے

اس بند میں ڈیرے دار کا نوعی کردار پیش کیا ہے۔ پہلا مصرعہ سنگھار کے بیان سے شروع ہے۔ پری خوب بن ٹھن کر، نوک پلک سے درست ہو کر دل ستانی پر آمادہ ہے۔ اس کی نکھ سکھ میں تصویر کا عالم ہے۔ جسمانی آرائش، بہ تفصیل کے اعتبار سے، تصویر کے حسن کی طرح بے عیب ہے۔ تصویر تکمیلے کا نمونہ سمجھی جاتی ہے اس لئے تصویر سے تشبیہ دے کر ہر طرح مکمل اور بے عیب دکھانے کی کوشش ہے۔ اس بناؤ سنگھار کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر بالمقابل نظر پڑے تو ایک پیکر تصویر معلوم ہوتی ہے اور اگر پہلو سے دیکھی جائے یعنی چھب تختی (پروفیل) سامنے ہو تو پری نظر آتی ہے۔ اس مصرعے میں، مرئیات کے ایک اہم مسئلے کی حیرت ناک شرح کی گئی ہے۔ مصوری کے فن میں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مقابل اور پہلو کی تصویروں میں فرق ہوتا ہے۔ بعض صورتوں میں یہ فرق اتنا نمایاں ہوتا ہے کہ ایک ہی فرد کی دو طرح کی تصویریں، دو الگ الگ آدمیوں کی تصویریں معلوم ہونے لگتی ہیں۔ یہ نظیر کی اعلیٰ مصورانہ قدرت کا ثبوت ہے کہ انہوں نے اس نکتے کی مدد سے، پری کی دو رخی تصویر پیش کی ہے۔ بہر عنوان پری اس طرح بن ٹھن کر سامنے آتی ہے کہ جس طرف سے نظر ڈالو ایک نیا عالم نظر آتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ابروؤں پر بل بھی ڈالے

رکھتی ہے تاکہ تیوری چڑھی دیکھ کر کوئی حرفِ مدعا لب تک نہ لانے پائے۔ اس خشونت کی تصویر دوسرے مصرعے میں پیش کی ہے۔ ابروؤں کے بل سے خفگی و بیزاری ظاہر ہوتی ہے اور ہونٹ بُرا بھلا کہنے پر آمادہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ آخر کے تین مصرعوں میں کردار کی خوب وضاحت کر دی ہے۔ تیسرے میں بتایا ہے کہ بیدردی اور سختی کا عنصر اس میں بہت زیادہ اور مہر و وفا کا بہت کم ہے۔ چوتھے میں بتایا ہے کہ جھوٹی مکاریاں کرتی ہے روٹھی ہے، خوب سیانی ہے مگر بھولی بنتی ہے اور بے مروتی میں کامل ہے۔ چوتھے مصرعے میں پکی پیسی کا سمجھنا ذرا دشوار ہے۔ یہ اکبر آباد اور مضافات اکبر آباد کا خاص محاورہ ہے۔ ڈھیٹ اور بے مروت انسان کو پکے پیسے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ یہاں نظیر نے پکے پیسے سے مؤنث کا صیغہ بنایا ہے۔ اس نواح کے روزمرہ کے کاروبار میں کسی زمانے میں پکا پیسہ چلتا تھا۔ پکے پیسے کی اہمیت یہ تھی کہ اس کے قبول کرنے سے کسی حالت میں انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پکی پیسی سے نظیر نے یہاں یہ مفہوم رکھا ہے کہ وہ اپنی حرفت میں اتنی کامل ہے کہ جس طرح پکا پیسا رائج الوقت سکے کی حیثیت سے ہر جگہ اور ہر وقت نافذ ہے اسی طرح اس کے فسون ہر جگہ اور ہر وقت کامیاب ہیں۔ اگرچہ عمر کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ اس میں اس نوع کی عیاری اور مکاری پیدا ہو جائے مگر ماحول اور معاشرت نے اس کو سب کچھ سکھا پڑھا کر پکا کر دیا ہے۔ اس خشونت و پچپن کے علاوہ اس میں یہ بھی وصف ہے کہ عاشقوں کو ٹھٹھے میں اُڑاتی ہے۔ ٹھٹھے میں اڑانا ایک محاورہ ہے جس کے معنی مذاق میں بات ٹال دینے کے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ بات مذاق میں ٹال دیتی ہے بلکہ اس کے قہقہوں میں بھی سچی ہنسی نہیں ہے۔ اس کی ہنسی بناوٹی ہنسی ہے جو صرف وقت گزارنے اور بات ٹالنے کے لیے بنا دی جاتی ہے۔ اب سترھواں بند ملاحظہ ہو:

نظروں میں بس رہا ہے زمانے دل میں ٹھوڑی کا فرعیاری ۔۔۔ اور ہونٹ بنا رہے سو کوس پرے گر بات کہو کچھ مطلب کی
ہنسی ٹھٹھے چھیڑ میں ملے پیچھے سے جھڑکے دیوے گالی ۔۔۔ ہر آن چہ خوش ہر دم اچھا ہر بات ہنسی کی پھلجھڑی

رمزوں کے ضلعے، غمزوں کے جگت پھبتی کی پھباوٹ ویسی ہے

اس بند میں بھی ڈیرے دار کا کردار ہے۔ پہلے مصرعے میں بتایا ہے کہ پری، دلبری کے فن میں اتنی طاق ہے کہ نظروں سے دل چھین لیتی ہے۔ "صاف" سے عیاری کا کمال ظاہر کیا ہے۔ "نظروں ہی نظروں میں اڑانا" بھی ایک محاورہ ہے جس کے معنی "کھلم کھلا" یا "سب کے سامنے" ہیں۔ لیکن اس مصرعے میں چونکہ نظروں کی تکرار نہیں ہے اس لئے یہ معنی قرین قیاس نہیں ہیں۔ دوسرے مصرعے میں کردار کا ایک اور دقیق رمز بے نقاب کیا ہے۔ اس طبقے کے افراد کو دل لینے میں جیسی مہارت ہوتی ہے ویسا ہی امیدیں بندھانے اور ترسانے میں بھی کمال حاصل ہوتا ہے۔ یہ دونوں باتیں، انیسویں صدی کی ڈیرے دار کو فن کی حیثیت سے سکھائی جاتی تھیں۔ چنانچہ، پری سے، جب مدعا بیان کیا جاتا ہے تو وہ اتنی بیگانی بن جاتی ہے کہ گویا کوئی واسطہ ہی نہیں۔ "پرے" اس زمانے میں آگرے میں نہیں بولا جاتا لیکن اس مصرعے میں اس لفظ کی موجودگی ثابت کرتی ہے کہ نظیر کے زمانے میں یہ لفظ یہاں رائج تھا۔ تیسرے مصرعے میں بتایا ہے کہ وہ اس حد تک بے تکلف ہو جاتی ہے کہ جسمانی چھیڑ چھاڑ بھی شروع کر دیتی ہے لیکن یہ اس کی حد بھی ہے۔ وہ اس سے آگے ہرگز نہیں بڑھتی۔ اس نوع کی ہمت افزائی سے اگر کوئی کچھ اور اقدام کرتا ہے تو پھر اس کو بنانے کی کوشش کرتی ہے اور بات بات پر اس کا مذاق اڑاتی ہے۔ چوتھے مصرعے میں مذاق اڑانے کے طریقے بتائے ہیں۔ لحمہ بہ لحمہ "چہ خوش" اور "اچھا" کہہ کر بات ٹالنے اور سوال کو ہنسی میں اڑانے کی کوشش کرتی ہے۔ پانچویں مصرعے میں بتایا ہے کہ وہ ضلعے اور جگت میں بھی طاق ہے اور بات ٹالنے کے لئے اس تدبیر سے رمز و غمزے کی نمائش شروع کر دیتی ہے اور آخر کار نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ کھل کر پھبتی کہنے لگتی ہے۔ انیسویں صدی کی طوائف کو خصوصیت سے ان باتوں کی تربیت دی جاتی تھی۔ وہ امراء کی دربارداری کے قرائن اور محفل آرائی کے آداب سے خوب واقف ہوتی تھی۔ اس میں اتنا ادبی سلیقہ بھی ہوتا تھا کہ ادبی لطائف کو سمجھے اور

ان میں برابر کا حصہ لے سکے۔ اب اٹھارواں بند ملاحظہ ہو:-

یہ ہوش قیامت کافر کا جو بات کہوں وہ سب سمجھے　　روٹھے مچلے سو سوانگ کرے باتوں میں لڑے نظروں میں ملے

یہ شوخی پھرتی ایسا پن، اک آن کبھی نچلی نہ رہے　　چنچل اچپل مٹکے جھٹکے سر کھولے ڈھانپے ہنس ہنس کے

باہوں کی جھٹک گھونگھٹ کی ادا جوبن کی دکھاوٹ ویسی ہے

اس بند میں دوسرے پہلو سے کردار کی مصوری کی ہے۔ پہلے مصرعے میں ہوش سے ہوش مندی مراد ہے۔ یعنی وہ اس قدر بیدار و ہوش مند ہے کہ کوئی بات کہتے ہی آپ سے کہی جائے فوراً سمجھ لیتی ہے۔ نہ صرف بات تاڑنے میں اتنی کامل ہے بلکہ طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے بھی خوب واقف ہے۔ کبھی روٹھ جاتی ہے کہ آپ منائیں، کبھی مچل جاتی ہے کہ آپ خوشامد کریں۔ بہرحال عاشق کو اپنی ذات میں ہر وقت مصروف رکھنے کے لئے قسم قسم کی تدبیریں کرتی ہے۔ باتیں کرتے کرتے لڑنے لگتی ہے کہ عاشق کہیں زیادہ بے تکلف نہ ہو جائے۔ اسی دوران میں یکایک اس کو یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ عاشق کہیں اس برتاؤ کا برا نہ مان جائے تو قبل اس کے کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچ کر کوئی فیصلہ کرے، وہ خود التفات کی نگاہوں سے مدارات شروع کر دیتی ہے اور اس کا دل بہلانے لگتی ہے۔ تیسرے مصرعے میں جسمانی حرکات کی شوخیوں کو اجاگر کیا ہے اور چوتھے میں نفسی کیفیات کی مصوری سے ایک سماں دکھایا ہے۔ وہ اپنی شوخی اور چلبلے پن اپنی مٹک چٹک سے لبھاتی ہے، بار بار سر کھولتی اور ڈھانپتی ہے اور ساتھ ساتھ ہنستی بھی جاتی ہے۔ "سر کھولے ڈھانپے" لکھ کر نظیر نے بتایا ہے کہ وہ عورت کی فطری نمائش پسندی کا دقیق مطالعہ کر چکے ہے۔ عورت کی یہ ایک خلقی عادت ہے کہ وہ سر ڈھکنے اور آنچل سنبھالنے کے بہانے سے بار بار اپنی نمائش کرتی رہتی ہے۔ گو یہ نمائش غیر ارادی ہوتی ہے لیکن جب [illegible] میں اہتمام اور تواتر و تسلسل بھی نظر آنے [illegible] کی نیت میں ارادے کی موجودگی کا یقین ہو جاتا ہے۔ بہرحال [illegible] میں جب وہ [illegible] طرح یہ محسوس کرے کہ اس کے عاشق [illegible] خوشامد [illegible] کی جاتی ہے اس کے

وجود میں اضطرار کی ایک برقی رَو دوڑ جاتی ہے اور یہ مشقِ ستم تیز تر ہو جاتی ہے۔ نظیرؔ نے اپنے عہد میں عورت کی اس دلکش ادا کا مطالعہ کیا تھا اور عہدِ حاضر کی سوسائٹی میں بھی یہ مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ نظیرؔ نے جس پری کا سراپا نظم کیا ہے اس میں یہ ادا مستزاد ہے کہ وہ سر کھولنے ڈھانپنے کے وقت ہنستی بھی جاتی ہے۔ "ہنس ہنس کے" سے صاف پتہ لگتا ہے کہ اس کو اپنی کوشش کا احساس اور اپنی فتحمندی پر ناز ہے۔ باتوں باتوں میں لڑ لینے کے بعد دوبارہ مسرور و بے تکلف نظر آنے کے دوران میں جن جن اداؤں کی نمایش ہوتی ہے ان کا ذکر پانچویں مصرعے میں ہے۔ سر کھولنے، ڈھانپنے کے لئے اس کی باہیں بار بار اور مختلف انداز میں جنبش کرتی ہیں۔ یہ جنبش کبھی ہلکی ہوتی ہے اور کبھی جھلک کی حد تک پہونچ جاتی ہے۔ اس خودنمائی کے ڈرامے کا ایک منظر یہ بھی ہے کہ وہ یکایک گھونگٹ نکال لیتی ہے اور یہ ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ اب بالکل ہی چھپ رہنا مقصود ہے لیکن یہ غمزہ بھی آنی اور آتشِ شوق کے تیز تر کرنے کی ایک نئی تدبیر ہے۔ مختصر یہ ہے کہ چھپنے اور سامنے آنے کی اداؤں کے دوران و تسلسل میں اس کے جوبن کی خوب خوب نمایش ہوتی رہتی ہے اور یہی اس کا مقصد ہے۔ اب انیسواں بند ملاحظہ ہو:۔

ایک شورِ قیامت ساتھ چلے نکلے کافر جس دم بن ٹھن — بل دار کمر رفتار غضب دل کی قاتل جی کی دشمن
مذکور کروں میں اب یارو اس شوخ کے کیا کیا چنچل پن — کچھ ہاتھ ہلیں کچھ پاؤں ہلیں اچھلیں بازو پھڑکے سب تن
گاتی وہ بلا تالی دے ستم انگلی کی نچاوٹ ویسی ہے

یہ بند چال کی تعریف میں ہے۔ پہلے مصرعے میں قیامت کے شور سے رفتار کا استعارہ کیا ہے۔ جس وقت وہ آراستہ پیراستہ ہو کر نکلتی ہے تو دُہائی پڑ جاتی ہے۔ دوسرے مصرعے میں لف و نشر مرتب ہے۔ بل دار کمر کو "دل کی قاتل" اور رفتار کو "غضب" اور "جی کی دشمن" کہا ہے۔ کمر اتنی نازک ہے کہ بار بار لچکتی ہے اور لچکنے میں بار بار بل کھاتی ہے۔ کمر کی نزاکت کا بیان، اس سے حسین تر الفاظ میں دشوار ہے۔ تیسرے مصرعے میں اشارہ ہے کہ خرامِ ناز کے وقت سارے بدن میں ایک لطیف و تسہیل

رقصندگی سی پیدا ہو جاتی ہے جس کو لفظوں میں ظاہر کرنا دشوار ہے۔ چوتھے میں علم مصوری کی مدد سے چنچل پن کی تفصیل دی ہے اور بتایا ہے کہ ہاتھ پاؤں بازو غرض سارا جسم ہاں پہ رقص نظر آتا ہے۔ ایسی چال جس کے یہ لوازم ہوں بہر عنوان رقص کی مترادف ہے۔ ہاتھ اور پاؤں کے لئے ہلنا، بازو کے لئے اچھلنا اور تن کے لئے پھڑکنا کہہ کر نظیر نے پھر کنہ زبان سے واقفیت اور حسن بیان کی قدرت کا ثبوت دیا ہے۔ پانچویں مصرعہ میں رقص کے عالم کی بے نقاب تصویر ہے۔ سینے اور کمر کے درمیانی حصے یعنی پیٹ کو گاتی بھی کہتے ہیں۔ رقص کے عالم میں عورت کے بدن کا یہ حصہ خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہو جاتا ہے۔ چنانچہ گاتی کی انتہائی جاذبیت و دلفریبی کو [illegible] ہے۔ [illegible] میں تالی بجائی جاتی ہے اور ایک خاص انداز سے بجائی جاتی ہے انگلیاں نچانے کا بھی ایک خاص انداز ہے۔ نظیر نے گاتی کے حسن و جمال کے ساتھ ان دونوں اداؤں کی بھی داد دی ہے۔ اب [illegible] ہوا۔

جو ایسا حسن کا دریا ہو کس طور نہ لہروں میں بہتے [illegible] ہو جنتر اور [illegible] ہو تو سکے
دل ہاتھ گیا سب عشق [illegible] آ کے [illegible] [illegible] نظیر ایسی جو پری چھاتی سے لپٹ کر سوئے
[illegible] سینوں کی مروڑ [illegible]

[illegible] نظیر کی طرح اس [illegible] تشبیہ دی ہے جو نہایت [illegible] ہے۔ [illegible] تشبیہ دی گئی ہے لیکن وہ شباب کو دریا کی روانی سے زیادہ اور قوی [illegible] ہے۔ [illegible] تشبیہ کے بعد [illegible] بہنے اور بہہ جانے کی خواہش بڑی دلچسپ بات ہے۔ دوسرا مصرعہ [illegible] پسندی کی اچھی [illegible] ہے۔ عاشق صادق کی طرح یہ قبول کریں [illegible] اگر [illegible] دیا جائے تو بہادر [illegible] قبول کرنے

کی وجہ بھی صاف صاف بتادی ہے۔ دل کا ٹوٹ جانا نظیر کا خاص محاورہ ہے۔ چوتھے مصرعے میں اپنی انتہائی آرزومندی اور فطری شوخی کا اظہار ہے۔ پانچویں میں جو تین اسمائے صفت چپک، لپٹ اور ملاوٹ نظیر نے استعمال کئے ہیں، ان میں پہلا خاص اسی کا وضع کردہ ہے۔ دوسرے اور تیسرے کا استعمال بالکل نیا ہے۔ بہرحال یہ تینوں الفاظ اردو کے انداز بیان میں نئے اسالیب کا اضافہ اور ایک مستقل و معتدبہ سرمایہ ہیں۔

آئینہ ایک فلسفیانہ تمثیل ہے جس میں نظیر نے انسان اور نفس انسان کی عظمت کا گیت گایا ہے۔ کیٹس (۱۷۹۵ - ۱۸۲۱) حسیات کا شاعر اور جمالیات کا والہ و شیدا ہے۔ وہ مرئیات کے جذب و سحر پر مفتوں نظر آتا ہے۔ نظیر پر بھی واقعیت کے ردّعمل کی حیثیت سے اکثر جمال پرستی کا دورہ پڑجاتا ہے۔ لیکن اس نظم میں اس نے واقعیت و مرئیات، رومان و رومانیات سب سے قطع نظر کرکے ذہنیات کے بحرذخار میں غوطہ لگایا ہے۔ اس کے عہد کا موقت مغربی معیار جس نے آخرکار روسو (۱۷۱۲ - ۱۷۷۸) کے سیاسی عقائد و تلقین کی صورت اختیار کی اور جس سے وہ ایک نظریے کی حیثیت سے قطعی نابلد تھا، نظیر پر بداہتًا مؤثر ہوا۔ وہ روح حیات سے جو کائنات پر ساری و طاری ہے متاثر ہوکر خود انسان کو مخاطب کرتا اور کہتا ہے :-

لے آئینے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ — صورت میں اپنی قدرت پروردگار دیکھ
خال سیاہ اور خط مشک بار دیکھ — زلف دراز و طرۂ عنبر نثار دیکھ
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

مشہور انگلستانی شاعر ورڈسورتھ (۱۷۷۰ - ۱۸۵۰) کی طرح جو نظیر کا معاصر ہے، نظیر کے نزدیک بھی ساری مخلوق میں انسان سب سے زیادہ اہم اور محترم ہے۔ ورڈسورتھ میں انسان کی محبت، اس کے

ذہنی نشوونما کے تیسرے دور میں پیدا ہوئی (۱) اس بیداری کے دو محرک بتائے جاتے ہیں۔ پہلا فرانس کا انقلاب اور دوسرا کولرج (۱۷۷۲ - ۱۸۳۴) سے ملاقات جس کے واسطے سے وہ جرمن عینیین کے فلسفے سے روشناس ہوا۔ ہمیں نظیر کی زندگی کے حالات تفصیل و تسلسل کے ساتھ معلوم نہیں ہوسکے۔ جو واقعات جستہ جستہ میسر آئے ہیں ان کا اب تک اس نظر سے مطالعہ نہیں کیا گیا کہ ان سے شاعر کے ذہنی نشوونما کے مدارج پر روشنی ڈالی جائے۔ بہرحال اس کے دل میں انسان کی محبت و عظمت کے پاکیزہ جذبات موجود ہیں اور اس وقت موجزن ہیں جب مغرب میں ان کی نمائش پر فخر کیا جاتا ہے۔ آئینے میں نظیر نے بتایا ہے کہ انسان کائنات کی اہم ترین حقیقت ہے اور دنیا اسی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ انسان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ خود اپنا مطالعہ کرے۔ مقطع کے بند میں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ مظاہر کی خارجی خوبیوں سے جو محض کر ان پر مفتوں ہو جانا غلط طریقہ کار ہے۔ کائنات میں مفتون کرنے کی اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف انسان ہے:۔

باغ جہاں کے غنچہ و گل میں نہ ہو اسیر قمری کی سن نفیر نہ بلبل کی سن صفیر
اپنے تئیں تو دیکھ کہ کیا ہے تو بے نظیر ہیں حرف من عرف کے یہی معنی اے نظیر
جو لطف اپنے تن میں ہے نقش و نگار دیکھ
سب گل تو آپ ہے تن کی آپ ہی بہار دیکھ

اس نظم میں دل کو آئینے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ تشبیہ خود ایک تصنیف افروز اور قابل داد ہے۔ اس کے علاوہ اس میں [illegible] جو مطلب سے پیوستہ کار آسکتی ہیں اس شاعر کے نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے اس کے داخلی حقائق پر بار بار غور کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱) [illegible] کی تفسیر بھی پیوستہ ہو سکتی ہے اور [illegible] کی روشنی میں بھی [illegible] کارل مارکس (۱۸۱۸ - ۱۸۸۳)

کے فلسفے کا بنیادی اصول بھی مستنبط ہوتا ہے۔ نظیر، حقائق کے علاوہ، جزویات کا شاعر بھی ہے اور ادنیٰ ادنیٰ اور پیش پا افتادہ باتوں سے اہم نتائج اخذ کرنے کی قدرت و بصیرت رکھتا ہے۔ بادی النظر میں، خصوصاً ان کے نزدیک جن کو بے فکری سے میسر آتی ہے، روٹی ایک حقیر و فرومایہ چیز ہے۔ ان کا ذہن اس کے حصول کی دشواری و اہمیت کی طرف کبھی منتقل نہیں ہوتا۔ لیکن، اگر ایک مفکر کی نظر سے دیکھا جائے تو روٹی کے حصول کی کشمکش سے اہم تر کام دنیا میں کوئی نہیں۔ زندگی کی ساری تگ و دو اور تنازع للبقا کی ساری جد و جہد، اسی کے لیئے ہے۔ لطف یہ ہے کہ صاحبان ثروت پر جب اس کا نشہ چڑھتا ہے تو انہیں دور کی سوجھنے لگتی ہے۔ نظیر نے کیا خوب کہا ہے:-

روٹی سے جس کا ناک تلک پیٹ ہے بھرا ۔۔۔ کرتا پھرے ہے کیا وہ اُچھل کود جا بجا
دیوار پھاند کر کوئی کوٹھا اُچھل گیا ۔۔۔ ٹھٹھا، ہنسی، شراب، صنم، ساقی، اس سوا
سو سو طرح کی دھوم مچاتی ہیں روٹیاں

خلوص مقصد کے ساتھ سچائی، نظیر کی بنیادی خصوصیت ہے۔ جب وہ کہنے پر آتا ہے تو لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ کھل کر کہہ گزرتا ہے۔ اس نے آخر کار صاف صاف کہہ دیا ہے کہ یہ لوگ جو روحانیت اور تصوف کا کرگا ٹھٹے بیٹھے ہیں، یہ اصل میں روٹی کمانے کا ڈھونگ ہے اور بس۔ جو فقیر حقیقت میں کامل ہے وہ اس راز سے خوب واقف ہے۔ کیا خوب کہا ہے ملاحظہ ہو:-

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے ۔۔۔ یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا، بابا، خدا تجھ کو خیر دے ۔۔۔ ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا! ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

پھر پوچھا اس نے کہیے یہ ہے دل کا نور کیا ۔۔۔ اس کے مشاہدے میں ہے کھلتا ظہور کیا
وہ بولا سن کے تیرا گیا ہے شعور کیا ۔۔۔ کشف القلوب اور یہ کشف القبور کیا

جتنے ہیں کشف سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی میں یہ قوت ہے کہ اس کے بغیر زندگی کا کوئی کام یہاں تک کہ عبادت بھی ممکن نہیں۔ سعدیؒ نے اسی فلسفے کو دوسری طرح بیان کیا ہے :-

شب چو عقد نماز بر بندم — چہ خورد بامداد فرزندم

نظیرؔ نے اسی حقیقت کو ذرا شرح و وضاحت سے بیان کیا ہے :-

روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو — میلے کی سیر خواہش باغ و چمن نہ ہو
بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو — سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو

اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

نظیرؔ نے اس نظم کے چھٹے بند کے پہلے مصرعے میں "روٹی کا ناچ" باندھا ہے۔ یہ اسلوب بیان خود ان کا پیدا کردہ ہے۔ اسی معنی کا ایک محاورہ "ڈانس اٹینڈنس" یعنی رقص مصاحبت انگریزی زبان میں بھی ہے، جس میں اتنا ہی ذم ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ حصول منفعت کے لئے جو اصل میں روٹی کمانے کا دوسرا نام ہے ذلیل قسم کی مصاحبت کی جائے۔ ساتویں بند کے چوتھے مصرعے میں زندگی کے کردار پر قدرے تفصیل روشنی ڈالی ہے۔ ساری نظم اجتماعی زندگی کی دلکشی کا سچا تجربہ ہے۔ ہندوستان کا موجودہ فرقہ وارانہ تنازعہ اصل میں روٹیوں ہی کا رونا ہے ورنہ نظم کی موضوعی خوبیوں کی یہ کثرت ہے کہ لسانی اور ادبی خوبیوں پر جو دب کر رہ گئی ہیں نظر ڈالنے کی فرصت نہیں رہتی۔

آدمی ایک [illegible] نظم ہے جس میں نظیرؔ نے دل پھینک عاشق کی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ مزاح کا عنصر نظم کے اول تا آخر پایا جاتا ہے۔ [illegible] میں انیسویں صدی کے بانکے کی تصویر ہے جو شیکسپیئر کے ڈراموں کے ایک کردار فالسٹاف سے بہت مشابہ ہے۔ ساری نظم بانکپن کا ایک حسین و جمیل مرقع ہے۔ بانکے کے کردار کے پہلو بہ پہلو آدمی کے خصوصیات و

جزویات کی تفصیل بھی نہایت پرلطف انداز میں پیش کی ہے۔ جمالیات کا یہ ایک اہم مسلمہ ہے کہ کوئی منظر، اپنے پس منظر کی مدد کے بغیر حسین ونظر فریب نہیں بنتا۔ نہ خود اس کے وجود کی مستور جاذبیت بروئے کار آتی ہے نہ وہ اپنی فطرت کا حقیقی جمال بے نقاب کر سکتا ہے۔ چنانچہ آندھی کے سماں کو بانکے کی فریب کارانہ چھل اور دل لگی بازی کی آماجگاہ کا پس منظر بنایا ہے۔ نظیر کے آرٹ کی خلاقی اور کمال بالائے کمال یہ ہے کہ ایک شوخ وشنگ اور طبعاً خودنما فطرت کی نمائش کا پس منظر بنانے کے لئے آندھی کو منتخب کیا ہے جو کارگاہ فطرت کا خود ایک خودنما اور طوفانی مظاہرہ ہے۔ اس التزام سے شاعر کے ذہن کے توازن و تناسب اور اس کی نظمت کی یکسانی وہمواری کا اندازہ ہوتا ہے۔ آندھی کے محاکات اور ذی حیات ہیجان واضطراب کی تفصیل تریب قریب ہر بند میں موجود ہے۔ ساتویں بند میں آندھی کا اپنی ذات پر داخلی اثر دکھایا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

اسی آندھی نے گلشن کر دیا یار دم سے گھر کو ۔ بچھایا شاد ہو میں نے پلنگ پر جھاڑ بستر کو
صراحی کی خبر لی اور سنبھالا جا کے ساغر کو ۔ اٹھا کر طاق سے شیشہ لگا چھاتی سے دلبر کو
نشوں میں عیش کے کیا کیا کیا دل سیر آندھی میں

نظیر کی دقیقہ رسی کا یہ عالم ہے کہ کوئی ضروری تفصیل اس سے نظر انداز نہیں ہوتی۔ آندھی میں بستر پر خاک پڑ جانی لازمی بات ہے۔ چنانچہ دوسرے مصرعے میں جب وہ شاد ہو کر پلنگ پر بستر بچھاتا ہے تو پہلے اس کو جھاڑ لیتا ہے تاکہ خاک نکل جائے۔ اس کی رجائیت پسندی کی حد ہے کہ فطرت کا آندھی جیسا غیر دلکش مظاہرہ جو دوسرے انسانوں کے لئے آلام ومصائب کا پیش خیمہ ہے، اس کے لئے مسرت کی نوید لاتا ہے۔ چنانچہ کہا ہے:۔

یہ دن آندھی کے یارو یوں تو سب کے ہوش کھوتے ہیں ۔ جنہیں ہے عیش وہ آندھی میں موتی سے پروتے ہیں
مزا ہے جن کو ہنستے ہیں جنہیں غم ہے سو روتے ہیں ۔ نظیر آندھی میں کہتے ہیں کہ اکثر دیو ہوتے ہیں

میاں ہم کو تو لے جاتی ہیں پریاں گھیر آندھی میں

داخلی محاسن کے علاوہ، اس نظم میں زبان، محاورے اور حسن بیان کی بھی بے شمار خوبیاں ہیں۔
اژدہے کا بچہ ایک فلسفیانہ تمثیل ہے۔ اس میں اژدہے کے بچے سے فطن کی انفرادیت مراد ہے۔
یہ نظم نظیر کے خیال کی عظمت اور فکر کی گہرائی کی ایک اختراع فائقہ ہے۔ اس میں زندگی کی ایک اہم حقیقت سے ایک پرمغز نسبت پیدا کرکے جدت طرازی کا حق ادا کیا ہے۔ معنوی محاسن کے علاوہ صوری حیثیت سے بھی یہ نظم، ایک کارنامہ ہے۔ قلندر کے پیشے کو، خیال کے اظہار کا ذریعہ اور اس کے لب و لہجے کو بیان کا عنوان بنایا ہے جس سے نظم میں ایک خاص کیفیت و ندرت پیدا ہوگئی ہے۔ صاحب فطنت کی عظیم الشا ذہنیت زندگی کے میدان عمل میں ہمیشہ سربلند نظر آتی ہے۔ اس کا انوکھا انداز اپنی نوعیت میں جداگانہ اور اس کا رویہ، اپنے انداز میں بالکل الگ تھلگ ہوتا ہے۔ اس کی ذہنی و اخلاقی بے راہ روی کی وجہ سے سوسائٹی عموماً اس کی مخالف رہتی ہے۔ پہلے بند میں عام ذہنیت کی فرومائیگی اور فطن کی شخصیت کے وقار کی طرف اشارہ ہے۔ ملاحظہ ہو:-

بیچے ہے اب تو کوئی بلبل بئے کا بچہ   اور بیچتا ہے کوئی، طوطے ہرے کا بچہ
مینا، بیا، لٹورے اور ابلقے کا بچہ   تیتر، بٹیر، سارس، شکرے، لوے کا بچہ
سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچہ
ہم بیچتے ہیں یارو لو اژدہے کا بچہ

فطن کی وہ امتیازی خصوصیت جو اس کو سماج کے عام ذہن سے متمیز کرتی ہے اور جس کے سمجھنے سے اجتماعی ذہن ابتدا میں عموماً قاصر رہتا ہے، بسا اوقات خود اس کے لئے وبال جان بن کر رہ جاتی ہے۔
دوسرے بند میں نظیر نے صاحب فطنت کی روشنیٔ طبع کا چالیس من کی ڈلیا سے استعارہ کیا ہے۔ جس طرح قلندر چالیس من کی ڈلیا کے بوجھ سے عاجز آجاتا ہے اسی طرح صاحب فطنت کی فطانت، عموماً اس کے

لئے بلا ہو جاتی ہے۔ تیسرے بند میں پرانے اژدہے سے قدیم زمانے کے ارباب فطنت مراد ہیں۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ مغلوں کے ابتدائی دور میں اہل کمال کی جو قدر تھی، وہ اس دور میں نہیں ہے۔ نظیر کا زمانہ مغلیہ دور کا وہ زمانہ ہے جب یہ حکومت روز بہ روز تنزل کی طرف مائل تھی۔ اس زمانے کے نام نہاد بادشاہوں کو اپنے ذاتی عیش و عشرت اور روزمرہ کے خانگی اور سیاسی جھگڑوں سے، اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ کمال اور اہل کمال کی طرف اعتنا کریں۔ چھٹے بند میں سومن گیہوں اور سو گھال پانی سے، فطن کی ذہنی و اخلاقی ضروریات مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ فطن کے عہد میں اس کی ناز برداری نہیں کی جاتی۔ نویں بند میں سماج کے ذہنی و اخلاقی تنزل پر افسوس کیا ہے:۔

سب اٹھ گئے جہاں سے وہ تھے جو لوگ جیا — وہ رہ گئے ہیں جن کے گھر میں نہیں ہے ہنسیا
اس بات کو تو عمدہ ہو بھوگ کا بلسیا — جو اژدہے کو پالے ایسا ہے کون رسیا
سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچہ
ہم بیچتے ہیں یارو لو اژدہے کا بچہ

آخر بند میں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ دَور انحطاط میں اہل کمال کی پرداخت خدا کرتا اور وہی اس کی آبرو رکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

آگے تو گھر بہ گھر تھے اکثر تمام داتا — سیمرغ پالتے تھے کرنے کو نام داتا
اپنے تو کوئی ہرگز آیا نہ کام داتا — سچ ہے نظیر آخر اجگر کے رام داتا
سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچہ
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچہ

ککڑی ایک مسرور انہ نظم ہے جو خالص شاعرانہ قدروں سے لبریز ہے۔ اس کے بیان کی لطافت و سادگی اور تشبیہوں کی ندرت و تازگی نگاہوں کے سامنے، جمال کا ایک عالم پیدا کر دیتی اور

قلب پر خاص اثر کرتی ہے۔ اس نظم میں بیان کے سارے اسالیب اور قافیے خاص نظیر کے مذاق اور حصّے کے ہیں۔ پہلے بند کے دوسرے مصرعے میں "چھم کو خوبی بھرا" کہہ کر بیان کی پاکیزگی اور قافیے کی خلاقی کا ثبوت دیا ہے۔ تیسرے بند میں پرسے اور درسے کے استعمال سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظیر کے عہد میں یہ الفاظ آگرے میں بھی رائج تھے۔ دوسرے بند کے پہلے اور دوسرے مصرعوں میں پتلی پتلیاں اور ریشم کی تکلیاں نہایت حسین ترکیبیں ہیں اور زبان کی شیرینی سے لبریز ہیں۔ تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں فرہاد و شیریں اور مجنون و لیلیٰ کے افسانوں سے تشبیہ پیدا کرنے میں مدد لی ہے اور تیسرے بند میں یہی کام ہیر اور رانجھے کی روایت سے لے کر وطنیت کا ثبوت دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

کوئی ہے زردی مائل، کوئی ہری بھری ہے پکھراج منفعل ہے، پنّے کو تھرتھری ہے
ٹیڑھی ہے سو تو چوڑی وہ ہیر کی ہری ہے سیدھی ہے سو وہ یارو! رانجھے کی بانسری ہے
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

پانچویں بند میں ککڑی کو "آنکھوں سکھ" "کلیجے ٹھنڈک" اور "پری" کہہ کر بیان کے نہایت حسین و دلنشیں اسالیب پیدا کئے ہیں لیکن چھٹا بند اپنی مصورانہ نوعیت کے لحاظ سے لاجواب اور داد سے مستغنی ہے:

بیل اس کی ایسی نازک جوں زلف پیچ کھائی بیج ایسے چھوٹے چھوٹے خشخاش یا کہ رائی
دیکھا اس کی ایسی نرمی باریکی اور گلائی آتی ہے یاد ہم کو محبوب کی کلائی
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

(۱) نظیر زندگی کا شاعر ہے اور ہر چیز کی معاشری اہمیت اسے خصوصیت سے متاثر کرتی ہے۔ ککڑی سے معاشرت میں جو دلچسپیاں پیدا ہوتی ہیں ان کو اس طرح بیان کیا ہے:-

لیتے ہیں مول اس کو گُل کی طرح سے کھل کے ‏ ‏ معشوق اور عاشق کھاتے ہیں دونوں مل کے
عاشق تو ہیں بجھاتے شعلوں کو اپنے دل کے ‏ ‏ معشوق ہیں لگاتے ماتھے پر اپنے چھلکے
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

چھٹے بند میں ”زلف پیچ کھائی“ اور ”گلائی“، ساتویں میں ”گل کی طرح سے کھل کے“ اور آٹھویں کا یہ مصرعہ

”ڈی ہیں سو بھی گویا خوباں کی گالیاں ہیں

حسن بیان اور شاعرانہ لطائف کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

بھونچال ایک بیانیہ نظم ہے جس میں جزئیات کی مصوری سے محاکات کا حق ادا کیا گیا ہے اور فطرت کے ایک عظیم الشان مظاہرے سے انسان کو عبرت دلائی ہے۔ یہ بھونچال محض خیالی یا رومانی نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے جس کا سنہ تاریخ، دن اور وقت خود نظیر نے تیسرے بند میں نظم کیا ہے۔ نظیر واقعات و حیات کا شاعر ہے۔ اس کا اتنے بڑے حادثے سے متاثر ہو کر نظم لکھنا، کوئی تعجب کی بات نہیں اگر نہ لکھتا تو ضرور تعجب کیا جا سکتا تھا۔ نظم کا انداز بیان اور قافیے، خصوصیت سے نظیر کے رنگ کے ہیں اور جا بجا ایسے الفاظ اور جملے نظر آتے ہیں جو اب متروک ہیں لیکن جن کا نعم البدل زبان اب تک پیدا نہیں کر سکی۔ ان کو پھر سے زبان میں شامل کر لینا اور رواج دینا ضروری ہے تاکہ بہت سے وہ مفاہیم، جو اس وقت الفاظ کی کمی کی وجہ سے ظاہر نہیں ہو سکتے، ادا ہونے لگیں۔ چوتھے بند میں طوفان کی شدت و عالمگیری کی طرف اشارہ ہے اور پانچویں میں، حیات پر اس کا اثر دکھایا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

اجزائے ارض قاف سے تا قاف ہل پڑے ‏ ‏ اجگر اچھل اُٹھے کے کلیجے اُگل پڑے
انسان گھر سے دشت سے وحشی نکل پڑے ‏ ‏ طائر بھی آشیانوں میں اپنے اُچھل پڑے
دریا، کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

پہلے مصرعے میں "قاف سے تا قاف" کے معنی ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہیں۔ انگریزی زبان میں "فروم پول ٹو پول" اس جملے کا مترادف موجود ہے۔ اس مصرعے کے قافیے میں ہائے ہوز کی حرکت، موجودہ تلفظ کے خلاف فتحہ ہے۔ نظیر کے عہد میں، اس فعل کا یہی تلفظ تھا اور اب بھی خال خال سننے میں آتا ہے۔ دوسرا مصرعہ اپنے بیان کے اعتبار سے لاجواب ہے۔ اجگر کی تعریف، اچل اور اٹل سے کی ہے۔ یعنی ایسے دیو پیکر اژدہوں کے بھی کلیجے نکل پڑے جو اپنے قامت کی بزرگی و ثقل کی وجہ سے نہ جنبش کرتے تھے اور نہ کر سکتے تھے۔ اچل اور اٹل دونوں الفاظ مفاہیم سے لبریز ہیں۔ ان میں اٹل تو اب بھی رائج ہے مگر اچل متروک ہے جس کو پھر رائج کر لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے مصرعے کے قافیے "اوگل" سے اضطرار کا مفہوم پیدا کیا ہے۔ اژدہوں نے، اپنے کلیجے خود نہیں اوگلے۔ طوفان کی شدت نے غیر محسوس طریقے پر انھیں خود بخود ایسا کرنے پر مجبور کر دیا۔ ایسا ہی اضطرار تیسرے اور چوتھے مصرعوں کے قافیوں نکل اور اوچھل سے ظاہر ہے۔ چھٹے بند میں بھونچال کا اثر، غیر ذی حیات پر دکھایا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

گڑھ، کوٹ، قلعہ، روئے زمیں پر ڈہل گئے　　کانپیں النگیں، برج کے کنگور سے ہل گئے
سنگین محل، مکان تھے سو وہ بھی اوسل گئے　　اینٹوں کے زہرے پھٹ گئے پتھر پگھل گئے

دریا و کوہ شہر و جنگل، سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

اس بند کے دوسرے مصرعے میں النگ کے معنی سلسلے یا قطار کے ہیں مگر ان دونوں سے النگ کا پورا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ تیسرے مصرعے میں اوسل بہت معنی خیز ہے۔ سلنا، مرتب کرنے کے معنی میں بولا جاتا ہے اور اکثر پلنگ کے ساتھ آتا ہے۔ یہ لفظ بڑھئی اور لکڑی کا کام کرنے والوں کے زبان زد ہوتا ہے۔ پلنگ سلنے کے معنی، پلنگ مرتب کرنے کے ہیں۔ جس طرح سلنے کے معنی جڑنے اور

مرتب کرنے کے ہیں، اس کے خلاف، اوسلنے کے معنی بگاڑنے اور اکھاڑنے کے ہیں۔ بہرحال اوسلنا، سُلنے کا متخالف ہے اور بس۔ ان میں، سلنا اب بھی بولا جاتا ہے لیکن اوسلنا، کم سے کم ثقات اور اہل علم و ادب کی زبان پر نہیں ہے۔ اس قسم کے الفاظ اور جملے اس نظم میں جابجا میسر آتے ہیں۔ ان محاسن کے علاوہ یہ نظم بہت سی خالص شاعرانہ قدروں سے لبریز ہے۔ گیارھویں، چودھویں، پندرھویں، سولھویں، سترویں اور انیسویں بندوں میں قدیم عقائد اور مذہبی روایات کی تلمیحیں ہیں۔ تیئیسویں بند میں، حکیمانہ خیالات و محسوسات کو شاعری کے رنگ میں رنگ کر پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

بھونچال میں کہاں تھا یہ عالم مجال کا　　سب حکم تھا یہ حضرت ایزد تعال کا
ایک دم میں یوں بڑھا دیا شعلہ جلال کا　　ایک دم میں یوں دکھا دیا جھمکا جمال کا
دریا، کوہ، شہر و جنگل، سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

کوڑی نامہ، ایک طنز ہے جو روٹی نامے کی طرح اقتصادی نقطہ نظر سے پیدا ہے۔ نظیر نے اس قسم کی کئی نظمیں لکھی ہیں۔ روٹی نامے، کوڑی نامے کے علاوہ پیسے نامہ بھی ہے۔ یہ سب ایک ہی خیال کے نئے نئے پہلو اور ایک ہی قسم کے مطالعے کے مختلف نتیجے ہیں۔ دنیا میں مدارج کی ناہمواری اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کو نظیر بہت ناپسند کرتا ہے۔ سماج کے اس غلط نظام پر، اس نے اپنے کلام میں جگہ جگہ طنز کیا ہے۔ کہیں یہ طنز بالکنایہ ہے، کہیں بالراست ہے اور کہیں زیادہ قوی ہو کر بیزاری کی حد تک پہونچ جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں، مسلمانوں کی ذہنی و اخلاقی پستی نے یہ صورت اختیار کر لی تھی کہ اہل ثروت کو اہل دل اور اہل وجاہت کو اہل باطن بھی تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ لطف یہ ہے کہ اس مفروضہ بزرگی کی بنا پر، پیری مریدی کے واسطے بھی پیدا کر لئے جاتے تھے۔ دست بوسی بھی شروع ہو جاتی تھی۔ نظیر نے پہلے بند کے پہلے مصرعے میں اسی قومی تنزل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کوڑی ہے جن کے پاس وہ اہلِ یقین ہیں   کھانے کو ان کے نعمتیں سو، بہترین ہیں
کپڑے بھی ان کے تن کے نہایت مہین ہیں   سمجھے ہیں اس کو وہ جو بڑے نکتہ چین ہیں
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہیں تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

مریدوں میں کشف و کرامت کی شہرت ہو جانے پر پیر صاحب کے لئے تحفے اور سوغاتیں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ کھانے کے لئے نعمتیں اور پہننے کے لئے مہین کپڑے آسانی سے میسر آنے لگتے ہیں لیکن وہ لوگ جو اہلِ نظر ہیں ان تدبیروں کو خوب سمجھتے ہیں۔ نکتہ چیں اس بند کے چوتھے مصرعے میں ذی فہم دقیقہ رس کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ تیسرے بند کے دوسرے مصرعے میں اپنے عہد کے پیشہ ور فوجی جنرلوں اور ہرجائی فوج کی طرف اشارہ ہے۔ چوتھا بند بڑا معنی خیز ہے اور اس کا چوتھا مصرعہ خصوصیت کے ساتھ نہایت بلیغ ہے۔ یہاں سائیں کے میلے کے معنی بہت وسیع ہیں اور زندگی کے ہر پہلو پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

کوڑی نہ ہو تو پھر یہ جھمیلا کہاں سے ہو   رتھ خانہ، فیل خانہ، طویلا کہاں سے ہو
منڈوا کے سر فقیر کا چیلا کہاں سے ہو   کوڑی نہ ہو تو سائیں کا میلا کہاں سے ہو
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

پانچویں بند میں زر کی محبت کی حد دکھائی ہے اور ساتویں میں بتایا ہے کہ یہ عقائد و ایمان تک میں خلل ڈال دیتی ہے۔ انگلستان کے مشہور وزیر اعظم والپول (۱۶۷۶ - ۱۷۴۵) کا مقولہ ہے کہ ہر آدمی خریدا جا سکتا ہے۔ نظیر نے بھی بالکنایہ اسی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔ قبرستان بیچنے اور مسجد کھدوانے کا الزام اسی عہد کے بعض ایمان فروش مسلمانوں پر نہیں، نظیر کے زمانے میں بھی اس قسم کے زر پرست موجود

تھے جو ذاتی منفعت کے لیے سب کچھ کر سکتے تھے۔ بہر حال، یہاں کسی خاص فرد کی طرف اشارہ نہیں، محض زر کی قوت و کارفرمائی دکھانی مقصود ہے۔ نویں بند میں کوڑیوں کے جھاڑ کا حوالہ ہے۔ یہ آگرے کی ایک خاص تلمیح ہے۔ ذاتی اغراض کی بنا پر ایک خاص طبقے کے لوگوں نے کسی زمانے میں یہ مشہور کر دیا تھا کہ گیارہ سیڑھی کے کنویں میں پیسے کوڑی کا جھاڑ آویزاں ہے۔ جمنا کے بائیں کنارے پر ایک امرود کا باغ ہے جو گیارہ سیڑھی کہلاتا ہے۔ مشہور ہے کہ یہ نورجہاں کا امرودوں کا باغ ہے اور اس کے درخت گلاب اور کیوڑے سے سینچے جاتے تھے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایک سالم پتھر سے گیارہ سیڑھیاں تراش کر، یہاں ایک جگہ نصب کر دی گئی ہیں۔ یہاں ایک باؤلی بھی ہے جو اپنی قدامت اور طرز عمارت سے اپنے مغلیہ ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ان سیڑھیوں کا نجوم و فلکیات سے کوئی تعلق ہے۔ چنانچہ نو عمر اور ناتجربہ کار لڑکوں کو بہلا پھسلا کر، کوڑی پیسے کا جھاڑ دکھانے کے بہانے سے، فریب دے کر، یہاں لایا جاتا تھا۔ نظیرؔ اپنے سماج کی رگ رگ سے واقف ہے۔ اس نے اپنے عہد کی اس مذموم شرمناک عادت پر طنز کیا ہے۔ دسویں بند میں دکھایا ہے کہ دولت چند ہی روز میں انسان کا معاشری درجہ کہاں سے کہاں پہونچا دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

بن کوڑی، خُردے کے برابر بھی پت نہ تھی — کوڑی جب آئی پاس تو بن بیٹھے سیٹھ جی
آگے گماشتوں کے کھلی ہر طرف بہی — پھر وہ جو کچھ کہیں تو وہی بات ہے، سہی
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

اس بند کے چوتھے مصرعے میں "سہی" کا استعمال نہایت غیر معمولی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظیرؔ کو چونکہ عامۃ الناس کا تلفظ پسند ہے اس لئے صحیح کو "سہی" نظم کر دیا ہے۔ یہ خیال اگر قائم ہو تو غلط ہے۔ یہاں "سہی" اپنی اصل حیثیت اور قبول کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جو لوگ زبان کے رموز و حکم سے واقف ہیں وہ خوب

جانتے ہیں کہ "سہی" قبول کے معنی میں مستعمل ہے۔ "اچھا تو یوں سہی" میں "سہی" قبول کا مترادف ہے۔ اس نظم میں، بند کے آخری دو مصرعوں میں زندگی کے تجربوں کی روح حلول کر دی گئی ہے اور چھٹا مصرعہ تو اتنا فلسفیانہ ہے کہ ضرب المثل بن کر رہ گیا ہے۔

وجد و حال ایک عارفانہ نظم ہے جس میں حقیقت آشنا شاعر نے خلقت و کائنات کے رموز و حکم پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں تصوف کے اسرار و مسائل کو موسیقی کی زبان میں نظم کیا ہے۔ نظم کی زبان، انداز بیان اور لب و لہجہ تلسی داس کی رامائن سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ بحر کا ترنم موضوع کی پُر رمزی سے پوری پوری مطابقت کرتا ہے۔ اس میں یہ راز آشکارا کیا ہے کہ ترک علائق کے بعد، انسان کے لئے فطرت کی حقیقی موسیقی سننے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ انسان اگر اپنے داخلی وجود کو نشو و نما دینا چاہے تو خارجی وجود سے قطع نظر کر لینا ضروری ہے۔ تصفیۂ نفس کے لئے تزکیۂ باطن پہلی شرط ہے۔ جسم و جسمانیات سے مبرّا ہونے کے بعد، دلِ آگاہ سے واسطہ پیدا ہوتا اور فطرت کے مستور حقائق کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے۔ مشرقی ریاضت و پرہیزگاری کا فلسفہ جس نے روح کی بقا کو جسم کی فنا پر منحصر کر کے، ایثار و ضبطِ نفس کا پرچار کیا ہے نظیر نے نہایت حسن و خوبی اور بڑی شرح و وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے مگر یونان کا نظریہ اس فلسفے کے خلاف ہے۔ اہل یونان کی تلقین یہ ہے کہ روح کی قوت جسم کے حسن و صحت پر منحصر ہے اس لئے جسم کی پرداخت بیش از بیش ضروری ہے۔ ورڈسورتھ جس کے کلام میں مشرقی تصوف و روحانیت کا بڑا عنصر موجود ہے، نظیر سے ہم آہنگ ہے۔ وہ کہتا ہے:-

"میں اس متبرک کیفیت نفس کا جویا ہوں۔ جس میں اس رمز کا بار، اس سارے ناقابل فہم عالم کا تھکا دینے والا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ وہ پر سکون اور متبرک کیفیت جس میں محبت بہ شفقت ہماری رہ نمائی کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اس جسمانی ڈھانچے کی سانس اور ہمارے بشری خون کی حرکت بھی قریب قریب معطل ہو جاتی ہے، ہم جسمانی طور پر سلا دیئے جاتے ہیں اور ایک پر حیات روح بن جاتے ہیں اور اس آنکھ سے جسے ہم آہنگی کے

زور اور انبساط کی راسخ قوت نے ساکت کر دیا ہے انہیں اشیار کی ماہیت نظر آنے لگتی ہے۔

انہی مفاہیم کو دوسری طرح نظیر نے وجد و حال کے دوسرے اور تیسرے بندوں میں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

کل باجے بج کر ٹوٹ گئے، آواز لگی جب لہرانے اور چھم چھم گھنگرو بند ہوئے اتب گت کا انت لگے پانے
سنگیت نہیں یہ سنگت ہے نٹوے بھی جب نٹ مانے یہ ناچ کوئی کیا پہچانے اس ناچ کو ناچے سو جانے
ہیں راگ انہیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
جو بے گت بے سُر تال ہوئے بن تال پکھاوج ناچے ہیں

جب ہاتھ کو دھویا ہاتھوں سے جب ہاتھ لگے تھرکانے کو اور پاؤں کو کھینچا پاؤں سے جب پاؤں لگے گت پانے کو
جب آنکھ اٹھائی ہستی سے جب نین لگے مٹکانے کو سب کاچھ کچھے سب ناچ بچے اس رسیا چھیل رجھانے کو
ہیں راگ انہیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
جو بے گت بے سُر تال ہوئے بن تال پکھاوج ناچے ہیں

شیب و شباب ایک مصورانہ نظم ہے جس میں بڑھاپے اور جوانی کے امتیازی خصوصیات کی محاکات نگاری کی گئی ہے۔ نظیر کی بہت سی نظمیں کائناتی قدروں کی حامل ہیں اور یہ اسی قسم کا ایک شہپارہ اور زندۂ جاوید کارنامہ ہے۔ انسانی زندگی کے یہ دو دور حیات کی دو ٹھوس حقیقتیں ہیں جن سے دنیا کے بیشتر انسانوں کو لازماً سابقہ پڑتا ہے۔ ان حقائق کے کیف و مزاج میں ازل سے آج تک کوئی تغیر واقع نہیں ہوا اور آج سے ابد تک بھی کسی تغیر کا امکان نہیں۔ بوڑھاپے اور جوانی کے لوازم ہر زمانے، ہر ملک ہر قوم پر یکساں صادق آتے ہیں۔ جوانی کا زمانہ گزر نے پر بوڑھاپے کی فراست شباب کی خامیوں کا جائزہ لیتی اور نوجوانوں کو حذر کی ہدایت کرتی نظر آتی ہے مگر ایسی بے شمار مساعی کے باوجود جوانی کی خامیاں اور بوڑھاپے کی اس نوبت کی ناکام کوششیں، جہاں سے شروع ہوئی تھیں، آج بھی وہیں ہیں۔ جوانی اور بوڑھاپا، اپنے

حدود کے دائرے میں محصور اپنی جبلت کے تقاضے پر ہنوز کاربند ہیں۔ اسی کا نام فطرت ہے۔ نظیر نے اسی واقعیت کی مصوری کی ہے۔ پوری نظم، اول سے آخر تک فطرت کا وسیع دغائر، مفصل و دقیقہ رس مطالعہ ہے۔ حُسن بالائے حُسن یہ ہے کہ، ہندوستان کی معاشرت کے لوکل کلر کی آمیزش سے، موضوع کے آب و رنگ کو ملکی مذاق کے مطابق بھی بنا دیا ہے۔ ماحول سے مطابقت نظیر کے بیان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اس نے بوڑھاپے اور جوانی کے منفرد تصورات کو ان کی مخصوص دہرنگ زبان اور اصطلاحوں کے جامے میں ملبوس کرکے پیش کیا ہے جس سے بیان کا کیف واثر دوبالا ہو گیا ہے۔ کردار نگاری پر نظیر کو یہ قدرت حاصل ہے کہ جب وہ اس فن کی طرف مائل ہوتا ہے تو زندگی کے جیتے جاگتے افراد بنا کر کھڑے کر دیتا ہے۔ اس نظم میں جوانی اور بڑھاپا، اپنے اصل رنگ روپ میں سامنے آجاتے ہیں۔ سیدھی سادھی، بے ریا اور بے تصنع واقعیت اس نظم کی دوسری اہم خصوصیت ہے۔ اس خوبی نے قوت کے ساتھ اثر بھی، اس نظم میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ موضوع کے جذباتی و رومانی پہلو سے قطع نظر کرکے، روزمرہ زندگی کا عملی و واقعاتی پہلو پیش کیا ہے جو اعلیٰ سے ادنیٰ تک ہر ذہنیت کے لئے دلچسپ اور قابل فہم ہے۔ اس کے بیان کی ایک ندرت یہ بھی ہے کہ بندوں کو مکالمے کے ڈھنگ پر مرتب کیا ہے۔ اس انداز نے نظم میں ایک ڈرامائی حسن بھی پیدا کر دیا ہے جو اسٹیج کے ماحول سے بھی پوری مطابقت کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ زبان کی سادگی اور صفائی بے مثال اور حسب حال محاوروں، ترکیبوں اور ضرب الامثال کا استعمال لاجواب ہے۔ پہلا بند خصوصیت کے ساتھ انسانی فطرت کی سچی مصوری ہے۔ پہلے دو مصرعوں میں زندگی کا ایک اہم مشاہدہ مرکوز ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

جہاں میں یارو خدا کی عجب خدائی ہے — کہ ہر کسی کو تکبر ہے خودنمائی ہے
ادھر جوانی، بوڑھاپے پہ چڑھ کے آئی ہے — اُدھر بوڑھاپے کی اُس پہ ہوئی چڑھائی ہے
عجب جوانی، بوڑھاپے کی اب لڑائی ہے

انسان اپنی نوع کے اعتبار سے مکمل مخلوق ہے مگر اکثر اس کا غرورِ کمال، تکبر کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔

مجھے اس سلسلے میں مشہور فرانسیسی مصنف پیسکل (۱۶۲۳-۱۶۶۲) کا ایک قول یاد آگیا جو حسب ذیل ہے:۔

"انسان ایک سرپتے کے سوا کچھ نہیں۔ فطرت کا سب سے ناتواں سرپتا، لیکن وہ مفکر سرپتا ہے۔ کیا ضرور ہے کہ ساری ہی کائنات اُسے پامال کرنے کو مسلح ہو جائے، ایک ابخرہ، پانی کا ایک قطرہ، اُسے فنا کرنے کو کافی ہے۔ لیکن جب کائنات اُسے پامال کر دیتی ہے تو انسان پھر بھی اُس چیز سے کہیں افضل رہتا ہے جس نے اُسے فنا کیا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں مر رہا ہوں اور یہ بھی جانتا ہے کہ کائنات مجھ سے کہیں زیادہ قوی ہے، کائنات کو اس سب کا کچھ حال نہیں معلوم ہوتا۔"

پیسکل کا مشاہدہ ایک دقیق فلسفیانہ حقیقت ہے اور انسان کی عظمت و برتری کی ایک اہم اور اٹل دلیل ہے۔ نظیر ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بتاتا ہے کہ انسان کا احساس عظمت، کبھی تکبر و خود نمائی کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔ نظیر نے اوپر کے بند میں اسی تکبر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دوسرے اور تیسرے بندوں میں جوانی اور بوڑھاپے کے مزاج کا تقابل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

جوانی اپنی جوانی میں ہو رہی سرشار — بوڑھاپا، اپنے بوڑھاپے کا ہو رہا دم مار
ہوئے ہیں دونوں جو لڑنے کے واسطے تیار — ادھر جوانی نے کھینچی ہے آ سپر تلوار
بوڑھاپے نے بھی ادھر لاٹھی ایک اٹھائی ہے

ادھر ہے تیر سا قامت ادھر ہے پشت کماں — ادھر ہے کبڑی کمر اور ادھر اکڑ کی شاں
جوانی کہتی ہے بڑھ کر سن لے بوڑھاپے میاں — تری ہے خیر اسی میں کہ جا سرک اب ہاں
وگرنہ تیری اجل، میرے ہاتھ آئی ہے

ان بندوں میں متقابل الفاظ اور جملے استعمال کئے گئے ہیں۔ جوانی سرشار ہے اور بوڑھاپا دم مارتا ہے، جوانی سپر تلوار کھینچتی ہے اور بوڑھاپا لاٹھی اٹھاتا ہے، جوانی کا قامت تیر کی طرح سیدھا ہے اور بوڑھاپے کی پیٹھ کمان کی طرح خم ہے، جوانی میں اکڑ کی شان ہے، بوڑھاپے کی کمر کبڑی ہے۔ ان اسالیب اور محاوروں

کے استعمال سے جوانی کے جوش و خروش اور بوڑھاپے کی متانت و سنجیدگی کی سچی مصوری کی ہے۔ چوتھے بند میں خالص جوانی کا کردار پیش کیا ہے اور چھٹے میں "کان مروڑنا" لکھ کر بوڑھاپے کی بزرگانہ اعتدال پسندی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ساتویں میں جوانی، بوڑھاپے کی ڈاڑھی پر طنز کرتی ہے اور آٹھویں میں بوڑھاپا، جوانی کو مونچھ اکھاڑنے کی دھمکی دیتا ہے۔ انیسویں صدی میں، مونچھ، جوانی اور آبرو کی علامت و طرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے بوڑھاپا، مجبور ہو کر، اسی خصوصیت پر حملہ کرتا ہے جس پر جوانی کو سب سے زیادہ ناز و غرور ہے۔ نویں بند میں، جوانی، بوڑھاپے کے جینے کو بے حیائی بتاتی ہے۔ دسویں میں بوڑھاپا اس کا جواب دیتا ہے اور اپنی دلیل کو ضرب الامثال سے قوی اور قابل قبول بنا کر پیش کرتا ہے۔ گیارھویں بند میں، بوڑھاپے نے، جوانی کے متعلق ایک نہایت دل شکن حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

تری جو پوچھو تو ہے چار دن کی سب کو چاہ　　جہاں تو ہو چکی، بس ہے گا تیرا حال تباہ
ہمیں ہیں وہ جو کریں ہیں تمام عمر نباہ　　تو ٹک تو دیکھ، گریبان میں ڈال کر منہ آہ
کہ اب ہے کس میں وفا، کس میں بے وفائی ہے

بارھواں بند لاجواب ہے۔ ملٹن نے اپنی مشہور نظم کومس میں، بدی کی طرف سے، جو دلائل، خود کومس کی زبان سے پیش کئے ہیں وہ بادی النظر میں، نیکی کے دلائل سے زیادہ قوی ہیں۔ ایسی ہی دلیل، نظیر نے، جوانی کی طرف سے، اس بند میں پیش کی ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

جوانی جب تو یہ بولی بوڑھاپے سے سن کر　　تیری وفا سے، مری بے وفائی ہے بہتر
میں جب تلک ہوں بہاریں مزیں ہیں سرتاسر　　جو سلطنت ہو گھڑی بھر تو وہ بھی ہے خوش تر
مزے تو لوٹ لئے گو کہ پھر گدائی ہے

جس طرح بارھویں بند کی بنیاد، ابیقورس کے فلسفے کے سطحی مفاہیم پر قائم ہے، اسی طرح تیرھواں بند، رواقیون کے نقطۂ نظر سے متاثر ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کہا بوڑھاپے نے سن کر وہ سلطنت ہے کیا　　کہ جس کے سات لگا ہو زوال کا دھڑکا
ہمیں ملی ہے بزرگی کی وہ سند اس جا　　کہ جب تلک ہے رہے گی ہمارے سات سدا
خدا نے ایسی ہی دولت ہمیں دلائی ہے

اٹھارویں بند میں بوڑھاپے کی خلقی فراست وزیر کی مصلحت اندیشی و تجربہ کاری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس مصرعے سے کہ:۔

ہم اپنی دھوکے کی ٹٹی میں کھیلتے ہیں شکار

سعدی کا یہ مشہور مصرعہ :۔

جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ

یاد آجاتا ہے۔ بیسویں اور اکیسویں بندوں میں ہندوستان کی بازاری لڑائی کا سماں کھینچا ہے۔ بائیسویں بند میں اس حجت و تکرار کا نتیجہ نکالا ہے۔ اس بند کا تصور خاص نظیر کے حصے کی بات ہے۔ وہ زندگی کی حقیقتوں اور عملی پہلوؤں سے بیحد متاثر ہے اور درمیانی راستے کو زندگی کی مشکلوں کا حل سمجھتا ہے۔ جس طرح دو عالموں کے درمیان برزخ اور بہشت و دوزخ کے مابین اعراف کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے، اسی طرح جوانی اور بوڑھاپے کے درمیان ادھیڑپن کا وجود مسلم ہے۔ نظیر نے خود اپنے آپ کو، ادھیڑپن کے روپ میں پیش کیا ہے، یہ جوانی کو روکتا اور بوڑھاپے کو سمجھاتا ہے اور معاملے کو رفع دفع کر دیتا ہے۔ اس کے صاف یہ معنی ہیں کہ جوانی اور بوڑھاپا، دونوں، اپنی اپنی جگہ زندگی کی اہم منزلیں ہیں اور ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں۔

بلدیوجی کا میلہ، ایک بیانیہ شاہکار ہے جس میں نظیر کی جاگیا نہ سلطنت، اپنی پوری قوت، سادگی اور تنوع کے ساتھ کارفرما ہے اور جس میں رسوم و رواج، کردار و خصائل، جذبات و تصورات اور مناظر و شواہد کی صورتگری ملکی و معاشرتی مواد سے کی گئی ہے۔ یہ نظم برنس کی بعض نظموں سے بہت مشابہ ہے۔ اس میں سچی ہندوستانی زندگی کی سادہ اور بے رنگ تصویریں، واقعاتی صحت اور شاعرانہ نزاکت و لطافت کے پس منظر میں نظر آتی ہیں۔

بلدیو، ایک قصبہ ہے جو متھرا کے قریب ہندوؤں کا ایک مشہور تیرتھ ہے۔ بلدیو، کرشن جی کے بڑے بھائی بلرام کا لقب ہے اور انہی کے نام پر اس قصبے کا یہ نام رکھا گیا ہے۔ میلے کے تنوعات کا ذہنی جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ چھوٹے پیمانے پر ایک دنیا تعمیر کرکے، زندگی کی کشمکش، گوناگونی، رواداری، نفسی نفسی اور "ہر کس بہ خیال خویش خبطے دارد" کے جیتے جاگتے مرقع پیش کیے گئے ہیں۔ میلے کی بھیڑ بھاڑ، ہجوم و انبوہ میں، ہر قسم ہر مذاق، ہر معاشرت کا انسان، اپنے رنگ میں رنگا، اپنے خیال میں گم اور اپنے حال میں مست نظر آتا ہے۔ حیات و مشاغل حیات سے شاعر کی محبت کا پورا ثبوت اس نظم میں موجود ہے۔ میلے کی چہل پہل اور وہاں کی آزادی و بشاشت زندگی کو مصورانہ کے علاوہ، فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بھی دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ صوفیانہ رموز کی وضاحت سے حقائق و معارف بھی بے نقاب کیے ہیں۔ سرسری نظر ڈالنے والے کو تعجب ہوسکتا ہے کہ ایک مسلمان شاعر، ہندو مذاق کے میلے کا حال ایسے شغف و انہماک، ایسی تفصیل و تشریح اور اتنی محبت و عقیدت سے کیونکر قلم بند کرسکا۔ لیکن یہ سمجھ لینے کے بعد کہ نظیر کا قلب صرف اسلامی قلب نہیں، انسانی قلب ہے اور اس کی ہمدردیاں مذہبی یا فرقہ وارانہ نہیں کائناتی ہیں، یہ تعجب بہت جلد دور ہوجاتا ہے۔ زبان کی سادگی و لطافت اور محاورے کی صحت و شیرینی، اس نظم میں عروج پر ہے۔ بعض لفظوں اور محاوروں کے استعمال پر نظیر کی انفرادیت کی مہر ثبت ہے۔ نظم کی بحر، مصرعوں کی بیساختگی اور بے تکلفی سے شیر و شکر ہوکر ایسی موسیقیت پیدا کردیتی ہے جس کا اثر داخلی اور دائمی ہے۔ پہلا بند صوفیانہ ہے اور کثرت میں وحدت کا جلوہ دکھاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کیا وہ دلبر کوئی نویلا ہے — ناتھ ہے اور کہیں وہ چیلا ہے
موتیا ہے، چنبیلی، بیلا ہے — بھیڑ، انبوہ ہے، اکیلا ہے
شہری، قصباتی اور گنویلا ہے — زر اشرفی ہے، پیسا، دھیلا ہے
ایک کیا کیا وہ کھیل کھیلا ہے — بھیڑ ہے خلقتوں کا ریلا ہے

رنگ ہے، روپ ہے، جھمیلا ہے
زور بلدیوجی کا میلا ہے

اناطول فرانس کے لئے کہا گیا ہے کہ وہ اہلِ علم کا مصنف ہے۔ اگر محض دیو مالا، روایات اور تلمیحات کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ خطاب نظیر پر بھی صادق آتا ہے لیکن نظیر نے اپنے نقطۂ نظر اور اپنی ہمہ دانی کو اس قدر سہل اور عام فہم بنا دیا ہے کہ وہ خواص کی جگہ عوام کا شاعر کہا جاتا ہے۔ اس کو ہندو دیو مالا سے پوری واقفیت اور بڑی محبت ہے۔ جس طرح اناطول فرانس کے افسانوں میں توریت و انجیل کے حوالوں اور مسیحی تلمیحات کی کثرت ہے، اسی طرح نظیر کے کلام میں ہندو دیو مالا کے حوالے جا بجا پائے جاتے ہیں۔ تیسرے بند میں بشن کے بارہ اوتاروں کا ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو:-

ہے کہیں رام اور کہیں لچھمن — کہیں کچھ، مچھ ہے اور کہیں راون
کہیں بارا، کہیں مدن موہن — کہیں بلدیو اور کہیں سیکشن
سب سروپوں میں ہیں اسی کے جتن — کہیں نرسنگھ ہے، وہ نارائن
کہیں نکلا ہے سیر کو بن بن — کہیں پھرتا پھرے ہے یوں بن بن

رنگ ہے، روپ ہے، جھمیلا ہے
زور بلدیوجی کا میلا ہے

اس نظم کا ہر بند اپنی جگہ مکمل اور زندگی کا سچا مرقع ہے۔ ہر بند سے ایک تصویر بنائی جا سکتی ہے، اور پوری نظم سے میلے کا ایک لاجواب فلم تیار ہو سکتا ہے۔ بارہویں بند کی حسین و پاکیزہ واقعیت رومان و شعر کی جان ہے۔ تیسرے شعر کا دوسرا مصرعہ خصوصیت کے ساتھ حسنِ بیان اور ندرتِ تشبیہ کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ بند ملاحظہ ہو:-

نازنیں ہیں وہ سانوری گوری — جن کی نازک ہر اک پری پوری
کرکے چتون، نگاہ کی ڈوری — دل کو کھینچے ہیں سب برا زوری

دھوم ناز و ادا، جھکا جھوری ۔۔۔ برج میں جیسے مچ رہی ہوری
گھونگھٹوں میں ہیں کر رہی چوری ۔۔۔ چوری کیسی کہ صاف سرزوری
رنگ ہے روپ ہے، جھمیلا ہے
زور، بلدیو جی کا میلا ہے

زمانے کے امتداد اور مغربی تمدن کے روز افزوں اثر سے ہندوستان کا قدیم تمدن دم توڑ رہا ہے۔ پرانی سماجی زندگی کے تفریحات و مشاغل کے مزے پھیکے پڑ گئے ہیں، تہواروں اور میلوں کی رنگینیاں ماند پڑ کر رہ گئی ہیں۔ نظیر نے اٹھارویں انیسویں صدیوں کی معاشرت کے بہت سے لطائف و کوائف کو زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ جب تک اس کا کلام زندہ ہے بلدیو جی کے میلے کی چہل پہل اور "برج کی ہوری" کی رنگ رلیاں زندہ ہیں۔ ہندوستان زندہ باد۔

پندرھویں بند میں دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں ایک لفظ "ساکے" استعمال ہوا ہے۔ یہ ساکا کی تصریفی صورت ہے مگر یہاں جمع کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

ناچ اور رنگ کے کھڑاکے ہیں ۔۔۔ گھنگرو اور تال کے جھناکے ہیں
نقلیں، قصے، کہانی، ساکے ہیں ۔۔۔ کھنڈ، دوہرے، کبت، کتھا کے ہیں
کہیں آغوش کے لپاکے ہیں ۔۔۔ کہیں بوسوں کے سوجھا کے ہیں
کھر کھری دانت پر کڑاکے ہیں ۔۔۔ تس پہ جاڑے کے سو جھڑاکے ہیں
رنگ ہے، روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

اس لفظ سے پڑھنے والے کا ذہن فوراً انگریزی لفظ "ساگا" کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ انگریزی زبان میں اس لفظ کے معنی، سویڈن، ناروے اور آئس لینڈ کی تاریخی داستان بالخصوص: وہ داستان ہیں جن میں برفستانی خاندانوں

یا شاہان نوردے کے کارنامے بیان ہوئے ہوں۔ مجازاً یہ لفظ رزمیہ داستان کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ہندی میں بھی یہ لفظ، بہادروں کے کارناموں کا مترادف ہے اور آلھا اودل کی لڑائی اور گنور بچے کے معرکوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ برج بھاشا کے یہ قصے داستان امیر حمزہ اور شاہنامے کی قسم کی تصانیف ہیں۔ اس بند کے قافیے نظیر کی زبان دانی کے معجزے ہیں۔

اکیسویں بند میں، ہندوستان کے اس طبقے کی معاشرت کا ایک منظر پیش کیا ہے جو عہد حاضر کی سیاسی زبان میں پرولتاریہ (پرولیٹیریٹ) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نظیر کو اس طبقے اور اس کی معاشرت سے خاص محبت ہے۔ اس کی زبان اور اس کی زندگی کا بھی وہ بڑا مبصر ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

لاکھوں بیٹھے بساطی اور منہار اپنا سب گرم کر رہے بازار
چوڑی، بنگڑی کی اک طرف جھنکار نوگرہی، پوتھ، انگوٹھی، چھلّے ہار
ڈٹے ڈٹے گنواری اور گنوار جس گنواری کو چلئے دھکّا مار
گر کے دے گالی یوں کہے ہے کیا "کیسو اٹھلا چلے ہے ڈاڑھی جار"

رنگ ہے، روپ ہے، جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

شاعری کی فضا میں پرواز خیال کا نام عظمت، جذبات کی مصوری کا نام تغزل اور مرئیات کی مرقع کشی کا نام محاکات ہے۔ خیال آرائی کے ساتھ نظیر کو جذبات نگاری اور واقعات کی مصوری میں بھی ید طولیٰ ہے۔ اس کا کلام ان سب اجزا سے مل کر صورت پذیر ہوتا ہے۔ جاذبیت و اثر، سرشاری و مدہوشی کی جو کیفیت اس کی غزلوں میں سموئی ہوئی ہے وہ تغزل گوئی کی انتہا ہے۔ غزل کے احاطے کے باہر نظموں میں بھی وہ کہیں کہیں یہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ وہ تہ میں ڈوب کر شعر کہتا ہے اور قلب میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے وجود پر ہمہ وقت ایک لذت و بیخودی، ایک سرمستی و سرخوشی طاری رہتی ہے اور یہی وجدانی عالم وہ

تغزل کی

پڑھنے والے پر بیہ درجۂ اولیٰ طاری کر دیتا ہے۔ اس کے کلام کی یہ لذت اردو زبان کی ایک لازوال و دائمی دولت ہے۔ جذبات کو برانگیختہ کر کے، رومانی سماں پیدا کرنے اور محویت کے عالم میں گم کر دینے میں بھی اس کو کمال حاصل ہے لیکن یہ پہلو اس کے کلام کا ایک آنی دوقتی کرشمہ ہے۔ اس کی اس نوع کی رومانیت کو اس کی واقعیت سے مخلوط نہ کر دینا چاہیئے۔

کہا جاتا ہے کہ نظیرؔ کے یہاں تغزل نہیں ہے۔ یہ الزام قطعی غلط اور مطالعے کی کمی پر مبنی ہے۔ نظیرؔ تھوک فروش تاجر کی قسم کا شاعر ہے اور غزل ایک قسم کی خردہ فروشی ہے۔ تھوک فروش کی دوکان میں وہ سارا مال بڑی مقدار میں میسر آتا ہے جو خردہ فروش تھوڑا تھوڑا کر کے بیچتا رہتا ہے۔ جو شاعر نظیرؔ کی طرح انسانی کے تمام و کمال نفسیات کا ماہر ہو، وہ اس نوع کے جزوی نفسیات سے کیونکر آشنا نہ ہو گا جو غزل میں باندھے جاتے ہیں۔ جو شاعر انسان کے قلب کی جملہ کیفیات کو کتاب کی طرح پڑھ سکتا ہے، وہ اس کیفیت کا بھی نبض شناس ضرور ہو گا جس کا نام محبت ہے اور اس نوع کی محبت کا بھی جو عاشق کو معشوق سے ہوتی ہے۔ جب وہ بیان کے جملہ اصناف پر قدرت رکھتا ہے تو زبان کے ان لطیف و نازک، اشاروں اور کنایوں سے بھی خوب واقف ہو گا جن سے "راز گفتن بہ معشوق" کا حق ادا کیا جاتا ہے۔ یونان قدیم کا وہ نامعلوم صناع جس نے وقار و تناسب کو اپنے لمس و نظر میں سمو کر، تلب مرمر سے مانلو وینس[۱] کا وہ ذی حیات پیکر تراشا جو آج بھی نسائی رعنائی کا معیار تسلیم کیا جاتا ہے اور پہلی مرتبہ جمال کی پرستش کا مرئی موضوع خلق کیا، حقیقت میں نوع انسان کا سچا شفیق تھا۔ اس کے چند الہامی لمحوں نے، اپنی بیتاب روح کی اس دقیق و مبہم آرزو کی صورت گری کر دی، جس کو متشکل و مجسم دیکھنے کے لیے نوع انسان کی آنکھیں یوم خلقت سے ترس رہی تھیں۔ اس نے انکشاف ذات کی ایسی سیدھی سچی راہ نکالی جو نفس انسان سے اب تک پوشیدہ تھی۔ اس نے

[۱] مانلو ایک یونانی جزیرے کا نام ہے۔ سنہ ۱۸۲۰ء میں اس جزیرے کے صدر مقام مانو کے کھنڈروں میں یونان کی مشہور دیوی وینس کا ایک مجسمہ برآمد ہوا ہے جو وینس کا بہترین مجسمہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ مجسمہ مانو وینس کہلاتا ہے اور اب پیرس میں ہے۔

جذبات پرستش کو خود اپنے وجود کے مطالبوں سے آگاہ کر دیا۔ اسی طرح وہ شاعر جو اپنے جذبات محبت کو صحت و رتغزل کا جامہ پہنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے بڑا اور سچا شاعر ہے۔ نظیر ایسا ہی شاعر ہے۔ اس کے تغزل میں صحت و خلوص کے ساتھ نقاشانہ نظر فریبی اور مصورانہ دلنوازی بھی ہے۔ جس وقت وہ مزے مزے کی لطیف باتیں کرتا ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ چنبیلی میں بسی ہوئی نسیم سحر کے ہلکے ہلکے جھونکے دماغ کو معطر اور روح کو مسرور کر رہے ہیں۔ اس کی غزلیں حسن و رنگ، مسرت و طرب، سرشاری و سرخوشی کی نوید ہیں جو ملول لمحوں کو مسرور بنا دیتی ہیں۔ اس نے مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں بھی ایسی ہی آسانی سے غزلیں کہی ہیں جیسی سادہ اور سہل ممتنع میں۔ بعض زمینیں اس نے خود پیدا کی ہیں۔ اس کی غزلوں میں بھی جگہ جگہ مکالے کا التزام نظر آتا ہے۔ شوخی، شرارت، چھیڑ چھاڑ اور معاملہ بندی جو بعض کے نزدیک غزل کی جان ہے اس کے یہاں کافی مقدار میں موجود ہے۔ بوسے سے نظیر کو خاص محبت تھی۔ اس کا ذکر جگہ جگہ اور بالکل صاف صاف ہے۔ اس کے تغزل کے چند پاکیزہ نمونے ملاحظہ ہوں :۔

بھلا ہوا جو نقاب تو نے اٹھایا چہرے سے ہے پری رو ۔۔۔ وگرنہ سینے سے دل تڑپ کر نگہ میں آکر مقام کرتا

ساقی نے سب کو بھر کے دئے جام بزم میں ۔۔۔ ساغر جو ہم نے مانگا تو شیشہ ہلا دیا

یہ غنچہ جو بے درد گلچیں نے توڑا ۔۔۔ خدا جانے کس کا یہ نقش دہن تھا

گلے کا ہار جو اس گل بدن کے ٹوٹ پڑا ۔۔۔ تو ڈر نظر کا دہیں اس کو ایک بار ہوا

نہ گل اپنا نہ خار اپنا نہ ظالم باغباں اپنا ۔۔۔ بنایا آہ کس گلشن میں ہم نے آشیاں اپنا

مقابل اس کے منہ کے گل کو تو کس منہ سے کرتا ہے ۔۔۔ کہاں گل اور کہاں وہ منہ تو دیکھ اے باغباں اپنا

اسی کی مہربانی سے سبھوں کی مہربانی ہے ۔۔۔ ہوا جب وہ نظیر اپنا تو پھر ہے سب جہاں اپنا

ان اشعار میں اردو شاعری کا اعلیٰ ترین تغزل موجود ہے۔ بعض شعر ایسے ہیں جو میر کے کلام سے برابر

کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آخر کے تین اشعار میں زبان اور محاورے کی بیش از بیش لطافتیں میسر آتی ہیں ۔ اور مثال ملاحظہ ہو :۔

چمک جا پھر خدا کے واسطے اے طور کے شعلے ۔۔۔ کہ مثل آتش افسردہ پھر کچھ دل چلا گھلا

اس غزل میں پھلا اور دہلا وغیرہ قافیے ہیں اور گھلا بھی ہے ۔ یہ لفظ اس وقت نیا نیا سا معلوم ہوتا ہے ۔ یہاں سرد یا افسردہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۔ اور مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

ہزاروں قافلے جس شوخ نے کئے غارت ۔۔۔ نظیر کو بھی اسی بے وفا نے لوٹ لیا

طور کو پھونک دیا اس نے تمہاری خاطر ۔۔۔ چشم کے واسطے جب سرمے کا سامان کیا

دل یار کی گلی میں کر آرام رہ گیا ۔۔۔ پایا جہاں فقیر نے بسرام رہ گیا

دیا دل ہم نے تم کو اور ثواب کیا کہیں لیکن ۔۔۔ یہ ویرانہ تمہارا ہے اسے معمور رکھے گا

یہ سارے اشعار تغزل کی نہایت پاکیزہ مثالیں ہیں لیکن آخر کے شعر میں محبت کا جذبہ انتہائی خلوص کے ساتھ کارفرما ہے ۔ اس کے علاوہ اس کے بیان کا لب ولہجہ اتنا سادہ اور بے ریا ہے کہ فوراً دل پر اثر کرتا ہے ۔ اور دلچسپ مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

آغوش تصور میں جب ہم نے اسے مسکا ۔۔۔ لب ہائے نزاکت سے اک شور تھا بس بس کا

سو بار حریر اس کا مسکا نگہ گل سے ۔۔۔ شبنم سے کب اے بلبل پیراہن گل مس کا

اس تن کو نہیں طاقت شبنم کے تلبس کی ۔۔۔ اے دست ہوس اس پر تو قصد نہ کر مس کا

ان اشعار میں میر تقی میر کا سا تغزل اور انیس کے کلام کی سی نزاکت و لطافت سموئی ہوئی ہے ۔ اور حسین مثالیں یہ ہیں :۔

لڑی منہ سے نہ بولی روٹھ بیٹھی جھڑکیاں دے لیں ۔۔۔ اسے سب کچھ بن آتا ہے مجھے کچھ بن نہیں آتا

تیشے کی کیا مجال تھی یہ جو تراشے بے ستوں ۔۔۔ تھا وہ تمام دل کا زور جس نے پہاڑ ڈھا دیا

کیا ہے کیا مہ کنعاں پہ حسن نے احساں — کہ اس کے دور میں تجھ کو نہ آشکار کیا
بہار دیکھ اسے رشک سے یہ کہتی ہے — کہ تھا یہ حسن تو پھر مجھ کو کیوں بہار کیا
نظیر آج تصدق کو کچھ نہ تھا ہم پاس — وہی جو باقی تھا اک جی، وہی نثار کیا

نہ جاؤں میں تو اس کے پاس نہیں کیا کروں یارو — یکایک کچھ جگر میں آ کے لگ جاتا ہے نشتر سا
نظیر اک دو گلے کرنے بہت ہوتے ہیں خوباں سے — چلو اب چپ رہو لب کھول بیٹھے تم تو دفتر سا

گر ہم نے دل صنم کو دیا پھر کسی کو کیا — اسلام چھوڑ کفر لیا پھر کسی کو کیا

اس مطلعے کا لب و لہجہ خسرو کے مقطعے سے بہت ملتا جلتا ہے جو یہ ہے :-

خلق میگوید کہ خسرو بت پرستی می کند — آرے آرے می کنم با خلق و عالم کار نیست

نظیر کے تغزل کی اور دل آویز مثالیں ملاحظہ ہوں :-

سبھوں کو سے ہیں خوناب دل پلاتا تھا — فلک مجھی پہ تجھے کیا یہ زہر کھانا تھا
شب فراق کی ادنیٰ سی اک یہ حالت ہے — کہ تھا جو گھر سو ہمارا وہ قید خانا تھا
غرض نہ سر کی خبر تھی نہ پا کا ہوش نظیر — سرہانا پائنتی اور پائنتی سرہانا تھا

میں عشق کا جلا ہوں مرا کچھ نہیں علاج — وہ پیڑ کیا ہرا ہو جو جڑ سے اکھٹ گیا

اکھٹ اب متروک ہے۔ یہ لفظ نظیر کے زمانے میں اور انیسویں صدی کے آخر تک، اکبر آباد اور مضافات میں اکھڑ کے معنی میں رائج تھا۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں :-

مر مر کے مجھے کہتا تھا سو مرتا ہوں میں یارو — اب لاؤ کہاں ہے وہ مرا کوسنے والا؟
لے لے کے بلائیں مجھے یہ کہتی ہیں آنکھیں — صدقے ترے پھر ایک نظر ہم کو دکھلا لا
شیریں کے دہاں پر یہ جو ہے شیرہ نہ جانو — فرہاد کے لوہو کا چھلکتا ہے پیالا
کیا جانئے کس حال میں ہو وے گا نظیر آہ — دل آج مرا اسلمہ اللہ تعالیٰ

نظیر کا مقطع عموماً قیامت ہوتا ہے۔ لیکن اس مقطعے کا تغزل بے پناہ ہے۔ اور اشعار ملاحظہ ہوں :۔

میں نے ہر چند یہ چاہا تھا کہ کل جاؤں گا — بے کلی آج بھی واں لے گئی مجھ کو تو نظیر

یہ خدنگ ناز تھا کس بے نشاں کی شست کا — بے صدا آ کر لگا اور ہو گیا سینے کے پار

یہ نشہ ایسا ہوا کس کی نگاہِ مست کا — بات کچھ کہتا ہے اور نکلے ہے کچھ مُنہ سے نظیر

ایک نظر گر تجھے دیکھیں تو شادی سے پھر — مہ کو لگیں چار چاند، مہر کو چار آفتاب

جیسے یہ ہیں مہر و مہ ایسے تو اس کے نظیر — چمکیں ہیں سو ماہتاب اور ہزار آفتاب

ان دو شعروں میں سے پہلے میں "چار چاند" کا محاورہ بڑے حسن سے نظم ہوا ہے لیکن حسن بالائے حسن یہ ہے کہ نظیر نے اس کے مقابل "چار آفتاب" دوسرا محاورہ وضع کیا ہے۔ اور مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

یہ کم نصیب ہوئے ہم کہ بعد مرگ نظیر — ہوئی مزار کو اپنے نہ ایک خشت نصیب

ساغر کے لب سے پوچھئے اب اس کی لذتیں — کس واسطے کہ خوب سمجھتا ہے لب کی لب

جس دل کو چاہتا ہوں اُسے بھی خبر نہ ہو — اپنے تو فہم میں ہے یہی راہ سب سے خوب

کیسا ہی وہ بُرا ہو تو لگ جائے جس سے دل — لگتا ہے دل کو پھر وہی واللہ سب سے خوب

ان دو شعروں میں سے پہلے میں محبت کی رازداری کا معیار اور دوسرے میں محبت کی انفرادیت کا فلسفہ پیش کیا ہے۔ دونوں شعر اپنی اپنی جگہ لاجواب ہیں۔ اور مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

جلد آ یار کہ اب ہم کو ستاتے ہیں بہت — گوش گفتار طلب، دیدۂ دیدار طلب

کس کے لئے سیجئے جامۂ دیبا طلب — دل تو کرے ہے مُدام دامنِ صحرا طلب

ایک تمنا ہو تو یار سے کہیے نظیر — دل ہے پُر از آرزو، کیجئے کیا کیا طلب

نظیر کے مقطعے سے، ذہن فوراً فارسی کے اس شعر کی طرف منتقل ہوتا ہے :۔

یک دل و خیل آرزو و دل بہ چہ مدعا برم — تن ہمہ ریش ریش شد پنبہ کجا کجا نہم

تغزل کی یہ مثالیں کیسی لاجواب ہیں۔ مطلع میں شوق کی دنیا پنہاں نظر آتی ہے ۔

ہے اب تو وہ ہمیں اس سرو سیم بر کی طلب — کہ طائران ہوا سے ہے بال و پر کی طلب

خراب کر جاتا ہے رم یک لخت آنکھوں سے نظیر — یاد آجاتی ہے جب ساقی کی چشم نیم خواب

جو کچھ ہے حسن میں ہر مہ لقا کو عیش و طرب — وہی ہے عشق میں ہر مبتلا کو عیش و طرب

اس مطلع میں معشوق و عاشق کے متباین قلبوں کی کیفیت کے تقابل سے ان کے مطمئن بالذات ہونے کا کیسا اچھا ثبوت دیا ہے۔ تغزل کی اور لاجواب مثالیں ملاحظہ ہوں:-

بہ قول حضرت صائب ہزار حیف نظیر — کہ در بہار ندارم بہ کف بہائے شراب

جو اپنے یار کے جور و جفا میں ہیں مسرور — انھیں پھر اور کے جور و جفا سے کیا مطلب

دل سا در یتیم بکا اک نگہ کے مول — کیا کہیے خیر یہ بھی خریدار کے نصیب

غش تھے معانقے کی تمنا میں ہم و لے — وہ بھی سنا کہ اب کے ہوا ہار کے نصیب

کوچے سے اس کے آتا ہوں یوں ہو کے نا امید — نوکر شکستہ حال کو جیسے ملا جواب

ہیں گو کہ یوں تو اور بھی محبوب خوب خوب — لیکن اسی کو کہتے ہیں سب خوب خوب خوب

نظیر بھی تمھیں اب دیکھ کر یہ کہتا ہے — الٰہی خلق ہو اور میں ہوں اور مرا محبوب

یاد آتا ہے ہمیں جب وطن اپنا تو نظیر — سر کو حسرت سے پٹک کہتے ہیں ہم ہائے نصیب

تمھارے ہاتھ سے کل ہم بھی رو لئے صاحب — جگر کے داغ جو دھونے تھے دھو لئے صاحب

نظیر محفل میں گل رخوں کی جو ہم نے دیکھا تو ان سبھوں میں
فدا ہوا ہے دل اپنا جس پر اسی کی ہم کو خوش آئی صورت

آگے ہی دل اپنا تو یہ سودائی ہے کم بخت — اور تس پہ سنا یہ کہ بہار آئی ہے کم بخت

یارو ہمیں تکلیف نہ دو سیر چمن کی
آنے دو بلا سے جو بہار آئی ہے کم بخت

ان اشعار میں دل کو دریتیم بتانا، معانقے کی تمنا میں غش ہونا، ذکر شکستہ حال کی ترکیب مشرقی شعرا کے مزاج کے خلاف وطن کی محبت کا جذبہ اور بہار کو کم بخت کہنا تغزل اور حسن بیان کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔ اور دلچسپ اشعار جن میں تغزل کوٹ کوٹ کر بھرا ہے ملاحظہ ہوں :۔

وہ دیکھ بھڑکتا ہے ہم کو کر غصہ ہر دم اور ہمیں
ہے چین اسی کے ملنے سے زنہار نہیں کل اور طرح

ہمارے آگے نہ لو نام گل کوئی ورنہ
وہ گل بدن ہمیں آوے گا گل کے نام سے یاد

مے پرستوں میں ہے یوں ساغر و مینا کا وقار
جیسے اسلام میں ہے محتسب و صدر کی قدر

جوشش کا سارا رندانہ کلام، اس ایک شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ تغزل کی اور مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

داغ مرنے کا وہی محروم جانے جس کو آہ
موت آپہونچی شتاب اور یار آیا دیر کر

آشنا ہوں جائے رحم جو کرتے ہیں وہ جفا
تو اس سے رو کے کہتے ہیں اغیار بس جی بس

ہوں نا امید وصل سے یوں جیسے وقت نزع
رو کر کہے طبیب سے بیمار بس جی بس

ابھی تازہ حلقۂ زلف میں جو پھنسا ہے طائر دل بھلا
اسے رنج پہونچے ہے اے صبا تو گھڑی گھڑی نہ ہلا قفس

لگا کے ٹھوکر ہمارے سر پر بلا تمھاری کرے تاسف
کہ ہم تو سمجھے ہیں اس کو دل سے تمھارے سر کی قسم نوازش

اٹھاویں نازان کے ہم نہ کیونکر نظیر دل سے کہ جن کے ہوویں
جفا، تلطف، عتاب، شفقت، غضب، توجہ، ستم، نوازش

چھد گیا دل زباں تلک آتے
ہم نے جب کی نگہ کے تیر کی عرض

آفریں ہے دل پروانہ کو جس نے جل کر
حسن کی گرمیٔ بازار میں مشہور کی شمع

مستی کے سواد دور میں اس چشم سیہ کے
کافر ہو جو ہو گردش ایام سے واقف

مر کر بھی نہ خاک نہ آسودہ ہوئے آہ
اے عشق نہ تھے ہم ترے انجام سے واقف

صیاد کی الفت میں پھنسے آن کے ورنہ
تھے کاہے کو ہم اس قفس و دام سے واقف

جب سے مُوا ہے کوہکن کرتے ہیں اس کا غم سدا کوہ سے کوہ، جُو سے جُو، سنگ سے سنگ، سل سے سل

آوے اگر بتاں کے تئیں رسم دلبری تو تو جہاں میں پھر کہیں ڈھونڈا نہ پائیے دل
شیدا ہوں میں تو لیلیٰ و مجنوں کی چاہ پر خالق نے کیا ہی خوب تھے ان کے بنائے دل
تھے اس کے پاس کے آبلے چھاتی پہ اس کی آہ کیا اچھا جسم تھا اور کیا صفائے دل
ہیں یہاں بڑے جو اہل دل اکثر یہ کہتے ہیں چھوٹا سا اک نظیر بھی سہے خاک پائے دل

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم بس ترستے ہی چلے افسوس پیمانے کو ہم
مے بھی ہے مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے ساقی نہیں دل میں آتا ہے لگا دیں آگ میخانے کو ہم
طاق ابرو میں صنم کے کیا خدائی رہ گئی اب تو پوجیں گے اسی کافر کے بت خانے کو ہم
کیا ہوئی تقصیر ہم سے تو بتا دے اے نظیر تا کہ شادی مرگ سمجھیں ایسے مر جانے کو ہم

ان اشعار میں جا بجا میر کا سا تغزل جھلکتا نظر آتا ہے۔ "ہم" کی ردیف والی غزل اس قدر مشہور ہوئی کہ اکبر آباد اور قرب و جوار میں آج بھی خلائق کے زبان زد ہے۔ ذیل کی پوری کی پوری غزل تغزل کا ایک بے مثل گنجینہ ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کبھو دیکھوں نہ سنبل باغ کو میں مجھے اس خم زلف دوتا کی قسم،
نہ نگہ کروں عارض گل کی طرف مجھے اس رخ مہر و وفا کی قسم

یوں پھرے ہے چمن کی فضا میں ہوا، وہ ہزار طرح سے ہو نافہ کشا
مرے دل کو نہ ہو کبھی اس کی ہوا مجھے کوئے صنم کی ہوا کی قسم

جونہی آیا ادھر کو وہ چشم سیہ، وہیں لے گیا دل کو بہ سیر نگہ
رہی عقل و خرد کو نہ جی میں جگہ مجھے اس بت ہوش ربا کی قسم

بدن اس کا ہے رو کش برگ سمن، مرے بر میں جو آوے وہ رشک چمن

کھلے غنچۂ دل مرا گل کے تمن مجھے اس کھلے بند قبا کی قسم

ترے عشق نے دل میں درد دیا، تو کچھ اس سے مزا میں ایسا لیا

نہ کروں نہ کروں نہ کروں میں دوا، میں نے کھائی ہے اب تو دوا کی قسم

لگی مہندی جو ہاتھوں میں اس کے میاں تو وہ سرخی کچھ ایسی ہے لالہ فشاں

وہ شفق سے ہے جو صبح کو ہووے عیاں، سو وہ کھاتی ہے اس کی حنا کی قسم

میں نے دیکھا نظیرؔ جو اس کے تئیں تو شرم حیا سے وہ سرو قریں

لیا نیچی نگاہوں سے جان دل و دیں میں کہوں کیا اب اس کی حیا کی قسم

یہاں ایک اور پوری غزل نقل کرنے کو جی چاہتا ہے جس کی ردیف "بیچتا ہوں" ہے۔ اس ردیف سے مجھے فارسی کی ایک ردیف "می فروشم" یاد آتی ہے جس میں خسرو یا حافظ کی غزل موجود ہے۔ نظیرؔ نے اپنی غزل غالباً یہ غزل دیکھ کر کہی ہے۔ اس لئے اس کا نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ملاحظہ ہو :-

به تیغ ادائے تو سر می فروشم — به نوکِ سنانت جگر می فروشم

اب نظیرؔ کی غزل ملاحظہ ہو :-

نہیں دل کو اب ہر مکاں بیچتا ہوں — کوئی خوب رو ہو تو ہاں بیچتا ہوں

وہ شے جس کو سب بیچتے ہیں چھپا کر — میں اس شے کو یارو عیاں بیچتا ہوں

یہ دل جس کو کہتے ہیں عرش الٰہی — سو اس دل کو یارو میں یہاں بیچتا ہوں

ق

ذرا میری ہمت تو دیکھو عزیزو — کہاں کی ہے جنس اور کہاں بیچتا ہوں

لئے ہاتھ پر دل کو پھرتا ہوں یارو — کوئی مول لیوے تو ہاں بیچتا ہوں

وہ کہتا ہے جی کوئی بیچے تو ہم لیں — تو کہتا ہوں لو ہاں میاں بیچتا ہوں

میں ایک اپنے یوسف کی خاطر عزیزو — یہ ہستی کا سب کارواں بیچتا ہوں

جو پورا خریدار پاؤں تو یارو — میں یہ سب زمین و زماں بیچتا ہوں
زمین آسماں عرش کرسی بھی کیا ہے — کوئی لے تو میں لامکاں بیچتا ہوں
جسے مول لینا ہو لے لے خوشی سے — میں اس وقت دونوں جہاں بیچتا ہوں
بکی جنس خالی دکاں رہ گئی ہے — سو اب اس دکاں کو بھی ہاں بیچتا ہوں
محبت کے بازار میں اے نظیر اب — میں عاجز غریب اپنی جاں بیچتا ہوں

اب جوش کی غزل ملاحظہ ہو، جو نظیر کے بعد لکھی گئی ہے :-

لئیموں میں داغِ جگر بیچتا ہوں — بہ نرخِ خزف تاجِ زر بیچتا ہوں
جہاں سنگ ریزوں پہ گرتے ہیں گاہک — وہاں جنسِ لعل و گہر بیچتا ہوں
جہاں قدرداں جمع ہیں تلخیوں کے — وہاں قند و شہد و شکر بیچتا ہوں
جہاں خار و خس کی خریداریاں ہیں — وہاں موجِ گلہائے تر بیچتا ہوں
پرستاریاں ہیں جہاں ظلمتوں کی — وہاں نورِ شمس و قمر بیچتا ہوں
جہاں دردِ دل کا مخالف ہے عالم — وہاں دردِ دل کا اثر بیچتا ہوں
جہاں جستجوئے سکون حضر ہے — وہاں آرزوئے سفر بیچتا ہوں
جہاں سات پردوں میں رہتی ہے جرأت — وہاں جذبۂ پردہ در بیچتا ہوں
جہاں پستیٔ بام و در ہے گوارا — وہاں رفعتِ بام و در بیچتا ہوں
جہاں ہر کبوتر ہے قانع قفس میں — وہاں دولتِ بال و پر بیچتا ہوں
جہاں برف و شبنم سے وابستگی ہے — وہاں ذوقِ برق و شرر بیچتا ہوں
جہاں سست و پاشل ہیں پسپائیوں سے — وہاں تیغِ فتح و ظفر بیچتا ہوں
جہاں ترک یک مو بھی ممکن نہیں ہے — وہاں خواہشِ ترکِ سر بیچتا ہوں

جہاں اُنس ہے تنگ دامانیوں سے وہاں وسعتِ بحر و بر بیچتا ہوں
چُھپا کر ردیف و قوافی کے اندر میں دل بیچتا ہوں جگر بیچتا ہوں
گدا ہوں مگر وہ گدائے غنی ہوں کہ تاج و کلاہ و کمر بیچتا ہوں
صدا دو کہ بازارِ نوعِ بشر میں تمنائے روحِ بشر بیچتا ہوں
نہ ہوگا کوئی مجھ سا بھی تیرہ قسمت کہ بازارِ شب میں سحر بیچتا ہوں
کوئی مشتری ہو تو آواز دیدے میں کم بخت جنسِ ہنر بیچتا ہوں

سخن کے ہیں یوں تو بہت جوشؔ تاجر
مگر میں بہ نوعِ دگر بیچتا ہوں

میں ان تینوں غزلوں کے مشترکات و مختلفات پر فیصلہ دے کر قارئین کو ایک نقطۂ نظر سے مرعوب کرنا نہیں چاہتا۔ فیصلہ ایک داخلی کیفیت ہے جس کا انفرادیت سے بیش از بیش تعلق ہے اور جو اگر بطونِ ذات و بطونِ موضوع کے تعاون سے پیدا نہ ہو تو ذہن کے صحت و رشد و نما میں معین نہیں ہوتا۔ اس لئے خارجی فیصلے سے متاثر کرنا مفاد و دیانت دونوں کے خلاف ہے چنانچہ میں سلامت ذوق پر اس کا حصر کرتا ہوں مگر اتنا ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ میری نظر میں نظیر کی غزل کے تیسرے، چوتھے، آٹھویں، نویں اور دسویں شعروں کے درجے کا شعر فارسی استاد اور جوشؔ دونوں کی غزلوں میں میسر نہیں آتا۔ تغزل کے اور اعلیٰ نمونے ملاحظہ ہوں:۔

چاہت کے اب افشا کن اسرار تو ہم ہیں کیوں دل سے جھگڑتے ہو گنہگار تو ہم ہیں

کہیں بیٹھے دیئے دل اب مجھے ہو جو اس ٹک میں بجا کروں نہیں تاب مجھ میں کہ جب تلک تو پھرے تو میں بھی پھرا کروں
جونہی بوسہ میں نے طلب کیا تو کہا تجھے تو نہیں ہے ڈر مجھے خوف ہے کہ مبادا اگر کوئی دیکھ لے تو میں کیا کروں
مجھے مدتوں سے ہے دردِ دل جو کہا کچھ اس کا علاج کر تو کہا کہ اس کی دوا یہ ہے تو کہا کرے میں سنا کروں

ان تین شعروں میں میر کا رنگ ہے۔ دوسرے میں عورت کی فطرت کی سچی مصوری ہے۔ اب تغزل میں خالص نظیر کے رنگ کے اشعار ملاحظہ ہوں :۔

عبث چمن میں نہیں گل عذار آتے ہیں — گلوں کو اپنی دکھانے بہار آتے ہیں
جو سادی وضع میں گل لے گئے تھے ہوش اپنے دل — سنا ہے آج وہ کر کر سنگھار آتے ہیں

قسم ہے چشم گلابی کی تیری اے گل رو — کہ یہاں کھنچے ہے پڑا نت گلاب آنکھوں میں
خدا کی بات جنھیں بات بھی نہ آتی تھی — وہ اب کریں ہیں سوال و جواب آنکھوں میں
قدرت کہاں جو اس سے کہوں میں یہ بات آہ — صاحب تم ہی تو ڈال گئے ہو عذاب میں

لطف جو چاہت کے ہیں سچ وہ جتانے نہیں — چاہ چھپی کیجئے تا کوئی جانے نہیں
قتل پر باندھ چکا وہ بت گمراہ میاں — دیکھیں اب کس کی طرف ہوتے ہیں اللہ میاں

جب سنتا ہے احوال مرا یوں کہتا ہے عیاری سے — ہے کون وہ اس سے ہم کو تو کچھ جان نہیں پہچان نہیں
دل پھنس کر اس کی زلفوں میں تدبیر رہائی کی مت کر — کب چھوٹے اس کے دام سے تو وہ دانا ہے نادان نہیں

تفرقہ ہوتا ہے ایسا بھی گل اندام کہیں — مے کہیں شیشہ کہیں، ساقی کہیں، جام کہیں
تلا نہ حسن تمھارا وگرنہ میزان نے — فلک کی شمس و قمر لاکھ بار تولے ہیں

عافیت کی گر ہوا خواہی تمھیں ہے تو نظیر — تم ہوا ہیں ہم سے بے دردوں کی مت برباد ہو

ڈر ہم کو بناوٹ کی اداؤں کا نہیں ہے — وہ آن غضب ہے جو خداداد کوئی ہو

الفت کا تار توڑ کے جوڑا تو کیا ہوا — خوبی تبھی تلک ہے کہ جب تک نہیں گرہ
ڈوری کی یہ گرہ نہیں جو لے تو اس کو کھول — ناصح ہے میرے اس کے تو اب ریشمیں گرہ

رفتار سے دلوں کو کچلتے ہیں وہ جو آہ — اپنا یہ بدچلن دل انہیں کا ہے خاک راہ
سچ پوچھئے تو اس میں خطا دل کی کچھ نہیں — خوباں کی شوخیاں ہی بڑھاتی ہیں دل کی چاہ

کُھنی کے التماس کا رہتا ہے جاں کو عزم　　ٹھوکر کے اشتیاق میں پھرتا ہے دل تباہ

ٹھوکر کا شعر میں ذکر ایک پُرانی بات ہے لیکن کُھنی کا ذکر نظیر کی ایجاد ہے۔ عرفی کی طرح نظیر کو متوازن الفاظ اور جملوں کا بڑا شوق ہے۔ پہلے مصرعے میں "کُھنی کا التماس" ہے تو دوسرے میں ٹھوکر کا اشتیاق موجود ہے۔ تغزل کی اور چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

ہیں جو وہ کشتۂ شمشیر نگاہِ قاتل　　جا کے ان گنج شہیداں سے کہو عشق اللہ

غم نہیں گر دلبری سے دل کو لے جاتا ہے وہ　　پاس میرے تب تو آتا ہے جو دل پاتا ہے وہ

پہلے شعر میں "عشق اللہ" نظیر کی ترکیب ہے اور دوسرے شعر میں "دل پانا" نہایت دلنشیں محاورہ ہے۔ تغزل کی اور اعلیٰ مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

کیوں نہ لالے کی طرح دل ہو ہمارا داغ دار　　کس مزے میں چھوڑ کر گلزار رخصت ہو چلے

آنے کی قسم کھا کر پھر منہ بھی نہ دکھلایا　　سادہ جنھیں سمجھے تھے سو ان میں یہ فن نکلے

اب رو ئیے الفت کو یا ٹھو نکئے قسمت کو　　جو قول کے پورے تھے، وہ عہد شکن نکلے

خدا کے واسطے گل کو نہ میرے ہاتھ سے لو　　مجھے بو آتی ہے اس میں کسی بدن کی سی

کہا جو ہم نے کہ منکا ڈھلا تو آؤں گا　　ہے بات کچھ نہ کچھ اس میں بھی مکر وفن کی سی

ہنسے روئے پھرے رُسوا ہوئے جاگے بندھے چھوٹے　　غرض ہم نے بھی کیا کیا کچھ محبت کے مزے لوٹے

تفاوت کچھ نہیں گل چیں میں اور بے درد خوباں میں　　جو اس کے ہاتھ گل ٹوٹے تو ان کے ہاتھ دل ٹوٹے

جو تم زور آوری کرتے ہو ہم سے دل لگانے میں　　کسی نے دل لگایا ہے کہیں لوگو زبردستی

نظیر اب تو ہمارے بس میں ہے کچھ کہہ نہیں سکتا　　کرو جو ہو سکے تم سے زبردستو! زبردستی

جو تم نے پوچھا تو حرف الفت بر آیا صاحب ہمارے لب سے ــــ سو اس کو سن کر ہوئے خفا تم نہ کہتے تھے ہم اسی سبب سے
جو ایک دلبر سے دل چھڑایا تو دوسرے سے وہیں لگایا ــــ نظیر ہم تو رہیں خوشی سے جو چین لینے دے عشق بازی

جلد آؤ اگر تم کو مری خواہش خون ہے ــــ کچھ دیر نہیں لگنے کی یہاں صید زبون ہے
عشاق سے ملنے کی عبث پوچھو ہو ساعت ــــ جب دل ادھر آجاوے وہی نیک شگون ہے

کاکل مشکیں کا تجھ کو شوق بیتابانہ ہے ــــ اے دل صد چاک سچ کہہ دل ہے تو یا شانہ ہے
حال دل ہم نے کہا جس دم تو بولا سچ کہو ــــ یہ کوئی قصہ نیا ہے یا کہن افسانہ ہے

ناگن ہے نئی زلف کی دل کیونکہ نہ ڈر جائے ــــ یہ کاٹ بھی کھاوے جو کسی کو تو مکر جائے
شکل و بدن و زیور و پوشاک سب اس کی ــــ اک عالم تصویر ہے جس جس پہ نظر جائے
ہے حسن پرستی بھی عجب چیز وفا کیش ــــ دل پیر بھی ہو جائے تو اس کا نہ اثر جائے

پہلے ہی ساغر میں تھے ہم تو بڑے لوٹتے ــــ اتنے میں ساقی نے دی اس سے کڑی اور بھی
عشق بھلا ہے تجھے زلف بتاں کی قسم ــــ ہجر کی شب سے کوئی شب ہے بڑی اور بھی

ان اشعار میں سے پانچویں شعر میں "منکا ڈھلا" بڑا حسین محاورہ ہے اور آخر شعر میں "بھلا" کا استعمال بڑا نادر اور نظیر کے حصے کی چیز ہے۔ نظیر کی غزلوں میں لگاوٹ، چوچلے اور چھیڑ چھاڑ کا مزہ بھی موجود ہے۔ معاملہ بندی میں بھی اسے پورا کمال حاصل ہے۔ راز و نیاز کا بھی وہ سچا مصور ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ یہ سارے جزئیات بلا کسی تصنع اور خارجی آمیزش کے فطری سادگی کے ساتھ غزل کے قالب میں ڈھلے ہوئے میسر آتے ہیں۔

"سوجھی" کی ردیف میں نظیر کی غزل کو جرأت اور انشا کی غزلوں پر کھلی ہوئی فوقیت ہے شہباز[۵] کے قول کے مطابق، جرأت خود اس زمین کا موجد ہے۔ اس سے پہلے ان قافیوں اور ردیف میں غالباً کسی استاد کی غزل موجود نہیں ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا بھی لطف سے خالی نہیں کہ جرأت

۵؎ زندگانی بے نظیر صفحہ ۲۹۲۔

آخر عمر میں نابینا ہو گیا تھا۔ مشہور ہے کہ ایک روز انشا سے ملاقات ہوئی تو جرأت نے کہا کہ سید صاحب، میں نے ایک مطلع کہا ہے، سنئے، ابھی وہ اتنا ہی پڑھنے پایا تھا کہ:-

اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی

کہ انشا نے جو بیحد ظریف اور طباع انسان تھا بیساختہ کہا:-

اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی

اس پر جرأت مارنے کو اٹھا اور مذاق یہیں ختم ہو کر رہ گیا۔ اس واقعے کے بعد غالباً انشا نے اس زمین میں طبع آزمائی کی ہو۔

انشا کی غزل ملاحظہ ہو:-

پھبتی ترے مکھڑے پہ مجھے حور کی سوجھی ۔۔۔ لا ہاتھ ادھر دے کہ بہت دور کی سوجھی
ٹک دیکھئے گا جبّہ و عمامۂ زاہد ۔۔۔ ہے اس پہ مجھے بلعم باعور کی سوجھی
کیوں میں دل پُر آبلہ پرتاک نہ باندھوں ۔۔۔ ہے اس پہ مجھے خوشۂ انگور کی سوجھی
ہے شیخ سیہ چہرہ جو مجلس میں پھُدکتا ۔۔۔ یاروں کو یہاں رومی کے لنگور کی سوجھی
واعظ جو پڑھا جن بختر ہے نہایت ۔۔۔ اس پر مجھے شیطان کے ہے پور کی سوجھی
ہاتھ اپنے سے جب چھٹ گئی اس ڈنڈ کی مچھلی ۔۔۔ تب اس کے تڑپنے پہ سقنقور کی سوجھی
ہاں اے شفق صبح تری دیکھ کے رنگت ۔۔۔ شنجرف کی سوجھی نہ مجھے کافور کی سوجھی

جب پھول جھڑے نور کے اس آہ سے میری
اس پر مجھے انشا شجر طور کی سوجھی

اب نظیر کی غزل ملاحظہ ہو:-

دیکھ عقد ثریا ہمیں انگور کی سوجھی / کیوں بادہ کشو، ہم کو بھی کیا دور کی سوجھی
موسیٰ کے تئیں گو شجر طور کی سوجھی / پر ختم رسالت کو بہت دور کی سوجھی
ہم نے تو اسے دیکھ کے جانا کہ پری ہے / پریوں نے جو دیکھا تو انھیں حور کی سوجھی
غش کھا کے گرا پہلے ہی شعلے کی جھلک سے / موسیٰ کو بھلا کہئے تو کیا دور کی سوجھی
دیکھا جو نہانے میں وہ گورا بدن اس کا / بلور کی چوکی پہ جھلک نور کی سوجھی
سر پاؤں سے جب پھنس گئے اس زلف سیہ میں / تب ہم کو سیاہی شب دیجور کی سوجھی
جنت کے لئے شیخ جو کرتا ہے عبادت / کی غور جو ظاہر میں تو مزدور کی سوجھی

مصنوع میں صانع نظر آوے تو نظیر آہ
نزدیک ہی کیا ہے کہ جہاں دور کی سوجھی

اتفاق سے دونوں غزلیں آٹھ آٹھ شعروں کی ہیں اور دونوں میں کئی کئی قافیے مشترک ہیں۔ دو استادوں کا تقابل، کچھ بہت زیادہ مفید اور خوش آیند بات نہیں ہے، لیکن یہاں فرق اس قدر نمایاں ہے کہ خود زبان حال سے اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔

انشا کی غزل اول سے آخر تک ذہنی ورزش کا ایک مثالی نمونہ ہے۔ الفاظ اور قوافی نہایت غیر شاعرانہ ہیں اور تغزل کا دور دور پتہ نہیں۔ آخر شعر کے دوسرے مصرعے اور مقطع میں قدرے قلیل تغزل ہے مگر وہ اتنا بھونڈا اور دور از کار ہے کہ قلب کو متاثر نہیں کرتا۔ ساری غزل کا لب و لہجہ نہایت عامیانہ ہے اور تعقید تو اتنی پیش پا افتادہ ہے کہ خاص توجہ دلانے کی بھی ضرورت نہیں۔ بلکہ باغور، لنگور، بور اور شفتلور کے قافیے والے شعر تو تغزل کیا معنی خود شعریت سے اتنے دور ہیں کہ صرف موزونیت کی بنا پر شعر کہے جا سکتے ہیں۔ اس غزل کو آورد و تصنع کی شاعری کی سچی مثال کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

نظیر کی غزل آمد و بے ساختگی، سلاست و روانی، تازگی و شگفتگی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کے

انداز بیان کو انشا کے بیان پر نمایاں فوقیت ہے۔ اس کے مصرعے، اتنے صاف اور سیدھے، ایسے بے تکان اور بے تصنع ہیں کہ صاف ظاہر ہے کہ ان کو گھڑنے یا موزوں کرنے میں کسی جد و جہد سے کام نہیں لیا گیا۔ ہر مصرع اتنا چست ہے کہ کانٹے کا تُلا معلوم ہوتا ہے۔ سادگی اور صفائی کا یہ عالم ہے کہ نثر کرنے کے لئے الفاظ کی نشست میں کوئی تغیر نہیں کرنا پڑتا۔ شاعری کا یہ انتہائی کمال ہے کہ شعر، نثر کی ترتیب میں کہا جاسکے۔ ان محاسن کے دوش بدوش، غزل میں، تغزل کٹ کٹ کر بھرا ہے۔ کوئی شعر اس سے خالی نہیں۔ لیکن یہ شعر:۔

دیکھا جو نہانے میں وہ گورا بدن اس کا   بلور کی جو کی یہ جھلک نور کی سوجھی

اپنے تخئیل کی ندرت، التشبیہ کی تکمیل، کیفیت کی لطافت، بیان کی شگفتگی اور مصوری کی قوت کے اعتبار سے، دنیا کے بہترین ادب کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ذیل کا شعر:۔

جنت کے لئے شیخ جو کرتا ہے عبادت   کی غور جو ظاہر میں تو مزدور کی سوجھی

بھی اپنی قسم کا لاجواب شعر ہے۔ ایسے اہم مسئلے کو اس مزے سے بیان کر دینا، نظیر ہی کا کام ہے۔ مقصدی زہد پر دوسرے شعرا نے بھی طنز کیا ہے مگر ایسا لطیف طنز بہ مشکل میسر آتا ہے۔ غالب کا یہ شعر:۔

کیوں زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی   پاداش عمل کی طمع خام بہت ہے

اور عمر خیام کی یہ رباعی:۔

من بندۂ عاصیم رضائے تو کجاست   تاریک دلم، نور صفائے تو کجاست

مارا تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی   ایں مزد بود، لطف و عطائے تو کجاست

اسی مسئلے سے متعلق ہیں لیکن بیان میں یہ سادگی اور طنز میں یہ لطافت نہیں ہے۔ ان حالات میں، اس کا سخت تعجب ہے کہ آزاد کو یہ غزل نظر نہ آئی۔ آب حیات میں جہاں جرأت، انشا اور مصحفی کے کلام کا تقابل کیا گیا ہے وہاں اس غزل کا بھی حوالہ دیا جاسکتا تھا۔ اگر تقابل کیا جاتا تو آزاد غالباً یہ دکھانے پر مجبور ہوتا کہ نظیر جس پر عمومیت و ابتذال کا الزام لگایا جاتا ہے، انشا جیسے مسلم الثبوت استاد کے مقابلے میں ان معائب سے کتنا بری ہے۔

نظیر کے تغزل کے اور نمونے ملاحظہ ہوں :-

ہے تو مختار جو کچھ چاہے سو کر ناز و غرور　　کشورِ دل میں پھری اب تو دہائی تیری
کل جو گلشن میں گیا میں کہ ذرا غم بھولے　　واں بھی ہر گل نے مجھے یاد دلائی تیری

ہے سب سے تو ایما و اشارات و لیکن　　رہتی ہے پھری ابروئے خم دار ہمیں سے
محفل میں جو دیکھا تو ادھر تم ہو خفا اور　　ساقی کو بھی ہے حجت و تکرار ہمیں سے
سمجھے گا جو رتبے کو نظیر اہلِ وفا کے　　تو ملنے لگے گا وہ طرح دار ہمیں سے

گو میں جفا سے مر گیا رُگ رُگ کے رو سیاہ　　پر شکر ہے وفا تو ہوئی سرخ رو مری
اس کی جبینِ پاک پر اس دم تک لے نسیم　　کافر ہوں گر پڑی ہو نظر بے وضو مری

نظیر کے کلام میں جا بجا بڑی شیریں زبان اور نہایت پاکیزہ محاورے میسر آتے ہیں۔ آخر سے پہلے کے شعر میں رُگ رُگ کے معنی آہستہ آہستہ اور رُگ رُگ کر مرنے کے معنی گھل گھل کر مرنے کے ہیں۔ نظیر پر مبتذل محبت کا اتہام لگایا جاتا ہے۔ آخر شعر میں جس محبت کا معیار سامنے ہے، وہ نفس انسان کی پاک سے پاک تر محبت پر فوقیت رکھتی ہے۔ ذیل کی غزل، غالب کا سہل ممتنع یاد دلاتی ہے ملاحظہ ہو:-

کیا ادا کیا ناز اور کیا آن ہے　　یہاں پری کا حُسن بھی حیران ہے
جو بھی دیکھے تو ہو جاوے فدا　　آج اس عالم کا یہ انسان ہے
اس کے سبزہ رنگ کی ہے چین میں دھوم　　کیوں نہ ہو آخر کو ہندوستان ہے
جان و دل ہم نذر کو لائے ہیں آج　　لیجئے یہ دل ہے اور یہ جان ہے
دل بھی دل سے ہے تصدق آپ پر　　جان بھی سو جان سے قربان ہے
دل کہاں پہلو میں جو ہم دیں تمھیں　　یہ تو گھر اک عمر سے ویران ہے
عقل و صبر و ہوش سب جاتے رہے　　ہاں میاں اک اد ھ موئی سی جان ہے

وہ اگر لینی ہو تو لے جائیے — خیر، یہ بھی آپ کا احسان ہے

آن کر لی لو، نظیر اپنے سے جان

اب وہ کوئی آن کا مہمان ہے

ان چند اشعار میں خاص نظیر کے تغزل کا لطف ہے۔ ملاحظہ ہوں:۔

سرشکِ چشم سے موتی بہت پروئے گئے — ولے یہ داغ جگر کے نہ ہم سے دھوئے گئے

نظیر کیا ہی مزا تھا کہ کل خوشی سے ہم — گئے تھے یار سے ملنے سو آپ کھوئے گئے

ہمیں اس غنچہ لب کی بات کیا دل سے لگی پیاری — کہ جس کو بے کلی لینی ہو وہ ہم سے کرے یاری

جو دل کے لینے والے ہیں وہ لے ہی جاتے ہیں آخر — دھری رہتی ہے سب اپنی نگہبانی و ہشیاری

غرض میں تو نظیر اس سے یہ سمجھا ہوں کہیں شاید — کسی کا نیل بگڑا ہے کہ یہ طوفان جوڑا ہے

نظیر کے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے۔ کسی میں زبان کی شیرینی ہے، کسی میں محاورے کا لطف ہے، کسی میں لفظی رعایت، کسی میں کوئی نہ کوئی اور نکتہ موجود ہے۔ آخری شعر میں "نیل بگڑنا" محاورہ نظم کیا ہے۔ یہ محاورہ ذوق کے ایک قصیدے میں نظم ہوا ہے اور پرستاران ذوق کی طرف سے اس پر بڑا فخر کیا جاتا ہے۔ اگر یہ کوئی فخر کی بات ہے تو نظیر اس کا بہ درجۂ اولیٰ مستحق ہے۔ ذیل کی غزل میں کھرے تغزل کے دوش بدوش زبان اور محاورے کی نزاکتوں اور لطافتوں نے بیان کو نہایت دلنشیں و پُراثر بنا دیا ہے۔

ملاحظہ ہو:۔

بنا کے منہ جو سراسر ہمیں بُرا کہئے — تمہارا ہم نے بگاڑا ہے کیا، بھلا کہئے

غرض تھی چاہ سے ہم کو سو ہم نے کی آ گے — گناہ اس کو سمجھ لیجئے خطا کہئے

دفا جو ہم میں ہے کم سینکڑوں میں نکلے گی — اگر ہزار طرح ہم کو بے وفا کہئے

صریح خوش تھے، ہمیں دیکھ کر ہوئے ناخوش — یہ اختلاط میں ہے کون سی ادا کہئے

جو چاہے آپ کو دل سے، اُسے خفا کیجئے — یہ ناروا ہے محبت میں، یا روا، کہئے
رہو خوشی سے تم اپنی، تو ہے مراد مری — تمہارے دل کا جو کچھ ہو وہ مدعا کہئے
ہم آ دیں جاویں بھلا کیا خوشی سے آپ کے پاس — نہ جا نکالئے لب سے کبھی نہ آ کہئے
جو لے کے دل کو کریں رات دن ستمگاری — تو منصفو انھیں پھر کچھ نہ کہئے کیا کہئے

گلے کی داد نزاکت سے دیتے ہم بھی نظیرؔ
پر اس صنم کا ہے نازک مزاج کیا کہئے

دوسری غزل کا گہرا تغزل ملاحظہ ہو:۔

جان بھی ہے جان سے ہجر میں اور دل فگار بھی — تر ہے مژہ بھی اشک سے جیب کا تار تار بھی
طرفہ فسوں سرشت ہے چشم کرشمہ سنج یار — لیتی ہے اک نگاہ میں صبر بھی اور قرار بھی
کوچے میں اس کے بیٹھنا، حسن کو اس کے دیکھنا — ہم تو اسی کو سمجھے ہیں باغ بھی اور بہار بھی
دیکھئے کیا ہو بے طرح دل کی لگے ہیں گھات میں — عشوۂ پُر فریب بھی غمزۂ سحر کار بھی
زلف کو بھی ہے دمبدم عزم کمند افگنی — دام لئے ہے مستعد طرۂ تابدار بھی

کہنے لگی وہ اپنے جب چاہنے والوں کو نظیرؔ
اٹھ کے یکایک اس گھڑی ہم نے کہا کہ یار بھی

تغزل کے اور چند اعلیٰ نمونے ملاحظہ ہوں:۔

نہ کر پہلو تہی اس کے جفا و جور سے اے دل — مزا کیا عشق کے آفات کا جب عافیت چاہی
بتوں کو دل دیا تھا تو نے اب دین کو بھی دے بیٹھا — ارے کچھ تو خدا سے ڈر نظیرؔ اتنی بھی گمراہی
جس منہ پہ جوشِ حسن سے تل بھر بھی جا نہ ہو — واں تل بھی آ پڑے تو یہ تل کا کمال ہے
شوقِ دیدار ہے یا جذبۂ الفت ہے غرض — کوئی تو ہے کہ جو کھینچے لئے جاتا ہے مجھے

یہ کس نے آج چمن میں قبا اُتاری ہے — کہ جس کی بو سے ہر ایک گل کو بیقراری ہے
نہ برق میں ہے نہ سیماب میں نہ شعلے میں — الٰہی دل کو کہاں کی یہ بے قراری ہے

کہہ کے اس قاتل نے آج ایک بات میرے سامنے — دل کے دو ٹکڑے کئے ہیہات میرے سامنے
میں تو اس غمّاز کو کیا کیا سزا دیتا مگر — کیا کروں منکر ہوا بد ذات میرے سامنے

گئی فلک تئیں پر اس کے دل میں راہ نہ کی — ہماری آہ نے پیدا یہ دستگاہ نہ کی
کہا میں یار سے اک دن کہ اے مہ تاباں — ق — ہماری شام کبھی تم نے صبح گاہ نہ کی
نہ ہم سے پیار نہ الفت نہ مہر نہ اخلاص — جو سرسری سی نگہ گاہ کی تو گاہ نہ کی
یہ سن کے مجھ سے کہا یہاں بھی کچھ اجارہ ہے — نہ کی تو چل بے نہ کی واہ خواہ مخواہ نہ کی

یہ شعر نظیر کی زبان دانی کا معجزہ ہے۔ اس کی زبان اور بیان ٹھیٹ کوٹھے سے متعلق ہے۔ عاشق جب اپنی محبوبہ سے توجہ نہ کرنے کی شکایت کرتا ہے تو وہ اس کو ڈانٹتی ہے۔ پہلے مصرعے میں، بڑے تیکھے پن اور منہ زوری سے یہ جتاتی ہے کہ مجھ پر کسی کا زور نہیں چلتا، میری خوشی ہے کہ توجہ کروں یا نہ کروں۔ پھر دوسرے مصرعے کے پہلے حصے میں، بے مروتی کو تلخ تر بناتی اور ڈھٹائی سے اعتراف کرتی ہے کہ ہاں نہ کی۔ لیکن دوسری سانس میں، اسی لب و لہجے میں بات بدلتی اور عاشق کو جھٹلاتی اور بناتی ہے۔ واہ اور خواہ مخواہ کا استعمال یہاں بڑا معنی خیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تو مجھے اختیار ہے کہ التفات کروں یا نہ کروں لیکن اس موقعے پر تو حماقت کر رہا ہے۔ میں نے ضرور تجھ پر توجہ کی نگہ کی مگر تو ہی اپنی حماقت سے نہ سمجھا۔ لفظوں کے الٹ پھیر اور لہجے کے تغیر تبدل سے، اس شعر میں، پورے مکالمے کا لطف آتا ہے۔ یہاں دریا کو کوزے میں بند کر کے نظیر نے اپنی زبان دانی کا کمال دکھایا ہے۔ اب تغزل کے چند اور نمونے ملاحظہ ہوں:۔

چھوڑ کے مجھ کو نیم جاں اب تو چلے ہو تم مگر — دیر نہ کیجیو مہرباں، پھر یو ذرا شتاب سے
نہ بولا منہ سے ہرگز دیکھ کر وہ خوش دلی میری — مگر کچھ کچھ، تبسم کی شکر لب سے لگا ملنے

بھم ہوا تھا جو کچھ یاں طواف کعبہ سے — کرشمے نے وہ بتوں کے تباہ کی گھڑی
اب تو ٹک منہ کو دکھا یار کہ نرگس بن کر — نکلے ہیں خاک چمن سے ترے حیران کئی
اس کے دامن سے لگوں پاؤں پڑوں ساتھ چلوں — خاک ہوں تو بھی مرے دل میں ہیں ارمان کئی
جان کر گور غریباں میں قیامت نہ مچا — ابھی سوتے ہیں ترے بے سر و سامان کئی
ہو حریب زباں سے نہ پری رویوں کی تسخیر — یہ لوگ جو ملتے ہیں تو دل کششوں سے
مدت میں نظیرؔ اس نے کیا دل کے تئیں قتل — صد شکر کہ ہم آج چھٹے سب خلشوں سے
ناز اٹھانے میں جفائیں تو اٹھائیں لیکن — لطف بھی ایسا اٹھایا ہے کہ جی جانے ہے
زخم اس تیغ نگہ کا مرے دل نے ہنس کر — اس مزے داری سے کھایا ہے کہ جی جانے ہے
ہم اشک غم ہیں اگر تھم رہے رہے نہ رہے — مژہ پہ آن کے ٹک جم رہے رہے نہ رہے
یہی ہے عزم کہ دل بھر کے آج رو لیجے — کہ کل یہ دیدۂ پُرنم رہے رہے نہ رہے
ہاتھ ٹوٹیں تیرے گل چیں تو نے کیوں توڑے وہ گل — حیف کیا گلشن ہوا برباد تیرے ہاتھ سے
ہیں سست و گریباں ہوں دم بازپسیں سے — ہمدم اُسے لانا ہے تو لا جلد کہیں سے
گئی گزری وہ اپنی مے کشی، لگی آگ جب سے فراق کی — یہ جلے ہے دل سو کباب ہے، یہ سرشک چشم شراب ہے

نظیرؔ کی غزلیہ شاعری میں مسلسل اور موضوعی غزل بھی میسر آتی ہے۔ اردو زبان میں نظیرؔ سے پہلے، مسلسل غزل کسی نے نہیں کہی۔ اس کے قدما اور معاصرین کی غزلوں میں قطعے میسر آتے ہیں جن کی صورت یہ ہے کہ چند درمیانی یا آخری اشعار مربوط کر دیئے جاتے ہیں۔ نظیرؔ کی اس نوع کی غزلوں میں قطعات کا بھی التزام ہے جو قدیم طرز بیان سے مطابقت کرتا ہے مگر اس کی مسلسل غزل بالکل دوسری چیز ہے۔ اس نے مطلع سے مقطعے تک تسلسل پیدا کر کے بالکل ایک نئی صنف اردو زبان میں پیدا کی ہے جس کا انداز بیان جداگانہ ہے، اور جو ہر نوع روایتی غزل سے متمیز کی جا سکتی ہے۔ اس صنف میں، اس نے قطعوں کے علاوہ، عشق

کی وارداتیں برملا پیش کی ہیں، معاملہ بندی کی ہے محبت کے چوچلوں کی تصویریں بنائی ہیں اور راز و نیاز کی حقیقی فطرت بے نقاب کی ہے۔ ان سب سے بالاتر یہ ہے کہ کردار اور سراپے نقش کئے ہیں۔ اکثر کوئی نہ کوئی ضرب المثل یا کہاوت بھی نظم کر دی ہے۔ ان غزلوں میں جگہ جگہ مکالمے اور ڈرامے کا لطف بھی موجود ہے۔ مسلسل غزل کے علاوہ، نظیر کے کلام میں موضوعی غزل بھی میسر آتی ہے۔ یہ اول سے آخر تک ایک موضوع پر ہوتی ہے۔ اس کا پیکر تمام و کمال غزل کا پیکر ہے اور غزل کے خلاف یہ ایک موضوع کی حامل ہوتی ہے۔ مسلسل غزل سے، اس صنف کو متمیز کرنے کے لئے، یہ نام وضع کیا گیا ہے۔

بیسویں صدی میں اقبال نے چند اور جوش نے بہت سی مسلسل اور موضوعی غزلیں کہی ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ جوش اس صنف کا موجد ہے لیکن یہ خیال تاریخ ادب کے بدیہات کے سراسر خلاف ہے۔ اردو میں مسلسل اور موضوعی غزل کا موجد نظیر ہے۔ یہ دونوں اصناف صحیح معنی میں فطری عاشقانہ شاعری ہیں۔ جذبات کی لطافت و سادگی اور خیالات کی تازگی و شگفتگی نے ان میں طرفہ جاذبیت و اثر پیدا کر دیا ہے۔ ان میں امید و رجائیت کا عنصر نمایاں طور پر غالب ہے۔ یاس و قنوطیت اتنی کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان دونوں قسم کی غزلوں میں داخلی و معنوی کے علاوہ، بہت سی خارجی و پیکری خوبیاں بھی ہیں۔ چنانچہ بلاغت کے بہت سے دقیق محاسن کے ساتھ، جن پر یہاں بحث نہیں کی جا سکتی، صنعت لف و نشر جابجا پائی جاتی ہے۔ ان غزلوں میں تشبیہیں اور استعارے بھی بڑے پُر کیف اور اکثر بالکل نئے ہیں۔ وہ مسی آلود لب کو نیلم سے تشبیہ دیتا ہے اور حقیقت سے کس قدر قریب ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کھلی رُخ پہ زلف پُرخم، مسی رشکِ رنگ نیلم   غرض اس طرح کا عالم کہ پری کہے اہا ہا

بعض مثالیں خالص تغزل کی لاجواب ہیں ملاحظہ ہوں:۔

ہزاروں گل، ہزاروں گل بدن تو نے بنا ڈالے   کوئی مٹی سے ایسے گل کھلا سکتا ہے کیا قدرت

پہلے جس آن تمہاری نے لیا دل ہم سے   اب تلک مانگتے ہیں، دل سے ہم اُس آن کی خیر

قصرِ نرگس سے گزر باغ و گلستاں سے نکل ہے وفا پیشہ تو مت کوچۂ جاناں سے نکل

مسلسل غزلوں کے سلسلے میں، دو غزلیں، نہایت دلچسپ ہیں۔ یہ دونوں مل کر، ایک مکالمہ بن جاتی ہیں اور ان کو پڑھتے وقت ایک ایسا سماں بندھ جاتا ہے جو بہترین قسم کے ڈرامائی منظر کا نعم البدل بن سکتا ہے۔ پہلی غزل جس کا مطلع یہ ہے:۔

ہر آن تمھارے چھپنے سے ایسا ہی اگر دکھ پائیں گے ہم تو ہار کے آخر اس کی بھی تدبیر کوئی ٹھہرائیں گے ہم

عاشق کی زبان سے کہی گئی ہے۔ دوسری غزل جس کا مطلع یہ ہے:۔

تدبیر ہمارے ملنے کی جس وقت کوئی ٹھہراؤ گے تم ہم اور چھپیں گے یہاں تک جی، جو خوب ہی پھر گھبراؤ گے تم

معشوق کا جواب ہے۔ ذیل میں دو اور غزلوں کے مطلعے درج کئے جاتے ہیں، ملاحظہ ہوں:۔

نہ لذتیں ہیں وہ ہنسنے میں اور نہ رونے میں جو کچھ مزا ہے ترے ساتھ مل کے سونے میں

گر کسی صورت سے، وہ صورت دکھا جاتے ہیں تو غم دردِ آج یہ صورت نہ دکھلاتے ہیں

ان غزلوں میں معاشرت اور کردار کی مصوری کے پہلو بہ پہلو، زبان کی شیرینی، محاورے کی قدرت اور حُسنِ بیان کے اعلیٰ نمونے نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور غزل کا مطلع ملاحظہ ہو:۔

کہا جو ہم نے "ہمیں در سے کیوں اٹھاتے ہو" کہا کہ "اس لئے تم یاں جو غُل مچاتے ہو"

یہ غزل بھی مکالمہ ہے۔ اس کا التزام یہ ہے کہ پہلے مصرعے میں عاشق کا سوال اور دوسرے میں معشوق کا جواب نظم کیا گیا ہے۔ ذیل کی غزل زبان کی سادگی اور محاورے کی لطافت کے اعتبار سے بے مثل ہے۔ مطلع ملاحظہ ہو:۔

انداز کچھ اور ناز و ادا اور ہی کچھ ہے جو بات ہے وہ نام خدا اور ہی کچھ ہے

تغزل کی ایک اور اعلیٰ مثال سامنے آتی ہے۔ پوری غزل ایک کیفیت کی تصویر ہے اور اول سے آخر تک رجائیت سے لبریز ہے۔ دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں "تو" کا استعمال توجہ طلب ہے۔ غزل

ملاحظہ ہو!-

پھڑکتی چشم ہے اور شوق بیتابی جتاتا ہے — خوشی سے جان بھی اور دل بھی نہیں پھولا سماتا ہے
نگہ بھی لحظہ لحظہ سوئے در آتی ہے سرعت سے — خیال گوش بھی ہر دم طرف کھٹکے کے جاتا ہے
تو چشم مضطرب ہو دوڑتا ہے دم بدم کہہ کر — چلیں دیکھیں کوئی تو حلقۂ در کھٹکھٹاتا ہے
نجومی خود بخود آ کہہ گیا خوش وقتیاں ہوں گی — اُدھر کچھ زاغ بھی پیہم صدا اپنی سناتا ہے
شگوں جتنے معین ہیں جہاں میں شاد ہونے کے — ہر ایک اُن سے بھی ہر ساعت بروئے کار آتا ہے
نگار خوش دلی کرتا ہے وا بند نقاب اپنا — طرب سے دست عشرت بھی تکدر کو مٹاتا ہے

نظیر ایسی تو باتوں سے عیاں یہ ہے کہ وہ گل رو
کوئی دم یا کوئی پل میں ابھی تشریف لاتا ہے

ایک اور حسین مطلع ملاحظہ ہو!-

وہ صنم جو جہر عذار ہے اُسے ہم سے ملنے میں عار ہے — دلے اپنا جو دل زار ہے وہ ہزار جان سے نثار ہے

نظیر ہندوستان کے آب و گل کا فرزند ہے۔ وہ یہاں کے مناظر قدرت کا والہ و شیدا ہے۔ دھانی کرتی اپنی محبوبہ کے گلے میں دیکھ کر اُس کو دھان کا کھیت یاد آجاتا ہے۔ اس کا ایک نام انگریزی بلاغت میں لوکل کلر بھی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

دیکھ کر کرتی گلے میں سبز دھانی آپ کی — دھان کے بھی کھیت نے اب آن مانی آپ کی

تغزل اور حسن بیان کی یہ مثالیں بھی لاجواب ہیں۔ ملاحظہ ہوں:-

ایام شباب اپنے بھی کیا عیش اثر تھے — کہتے ہیں جنھیں عیب وہ اس وقت ہنر تھے

کل دیکھ کے اس کے عالم کو ایک عالم کے اوسان گئے — واللہ عجب کچھ عالم تھا جو جان گئے سو جان گئے

موضوعی غزلوں میں بسنت، ہولی، برسات، پری، سمدھن، موتی، بے نظیر غزلیں ہیں۔ بسنت والی غزل تازگی اور شگفتگی میں لاجواب ہے۔ اس کا ہر ہر مصرع عاشق کے جذبات کی سچی تصویر اور لطافت و طراوت میں ڈوبا ہوا ہے۔ مطلع ملاحظہ ہو:۔

جوش نشاط و عیش ہے ہر جا بسنت کا ہے طرفہ روزگار، طرب زا بسنت کا

نظیر کی بعض تشبیہوں سے وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ "پری" کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

پشت گلبرگ، شکم سیم، کمر تار نگاہ شانِ بلور، گلاوٹ میں ہر ایک ران پری

ہندوستانی شاعری میں، کمر و بیٹں، سارے اعضائے جسم کی تشبیہ موجود ہے، لیکن پشت کی کمیاب ہے۔ اس تشبیہ میں نظیر کو اختراع کا شرف بھی حاصل ہے۔ پشت کو گلبرگ اور ران کو بلور سے تشبیہ دینا، نفاست پسندی اور نازک خیالی کی انتہا ہے۔ دونوں مثالوں میں، مشابہت ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ ایسی ہی تشبیہ کو تشبیہ تام کہا جاتا ہے۔ نظیر کا تغزل، نظیری، عرفی، بیدل، شیلی، کیٹس، ٹینی سن اور ٹیگور کے تغزل سے بہت مشابہ ہے۔ اس کے منتخب اشعار کا ان شعرا کے منتخب کلام سے، خوب مقابلہ ہو سکتا ہے۔

اس کی تضمینوں اور مستزادوں بھی اس کا "تغزل" پوری قوت کے ساتھ کارفرما ہے۔

زندگی کے واقعات و حوادث کے مطالعے کے دوران میں، نظیر پر ایسے لمحے بھی طاری ہو جاتے ہیں

فلسفیت | جب وہ شواہد سے کہر سے نتائج اخذ کرنے لگتا ہے۔ اس تگ و دو میں وہ حجابات کی تاریکی میں در آکر حقیقت کی کنہ تک پہونچتا ہے اور ایسی بنیادی بات ڈھونڈھ نکالتا ہے جو اعلیٰ فلسفی کی دور بین و دقیقہ رس نگاہوں سے ہی ممکن ہے۔ اس کے ضخیم کلام میں کوئی غزل یا نظم ایسی نہیں ملتی جو کوئی نہ کوئی دقیق فلسفیانہ نکتہ پیش نہ کرتی ہو۔ اس پر لطف یہ ہے کہ سارے نکات عام فہم انداز اور سادہ زبان میں پیش کئے گئے ہیں تاکہ عامۃ الناس کی سمجھ میں بھی آسکیں۔ جابجا اس نوع کے اشعار ملتے ہیں، جن میں شعری محاسن و لطائف کے ساتھ روزمرہ زندگی کا فلسفہ، بڑی قدرت و سہولت کے ساتھ سمو دیا گیا ہے۔ یہ کلام بیش از پیش

معلمانہ قدروں کا حامل ہے اور دنیا کے اعلیٰ ترین حقیقی و معیاری کلام کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعض اجزا یہ ہیں:-

گردوں نے ہم کو کیا نہ دیا اور کیا دیا　　سب کچھ دیا اگر دل بے مدعا دیا
خواب عدم میں ہم تو فراغت سے اے نظیرؔ　　سوتے تھے لیکن عشق نے آ کر جگا دیا

دل بے مدعا کی خواہش اس نفس میں پیدا ہو سکتی ہے جس نے زندگی کے سارے مراحل و منازل طے کر کے، سکون و طمانیت کی منزل میں قدم رکھ لیا ہو۔ مقطعے میں "فراغت" کی بلاغت و وسعت داد سے مستغنی ہے۔ شعور حیات کو عشق کا مترادف قرار دینا، بصیرت کی انتہا ہے۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے مفکرانہ اشعار ذہن کو اہم فلسفیانہ مسائل کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ مثلاً:-

تن مردہ کو کیا تکلف سے رکھنا　　گیا وہ تو جس کا مزین بدن تھا
نظیرؔ آ گئے ہم کو ہوس تھی کفن کی　　جو سوچا تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

یہ مقطع ایک مشہور فلسفی کا قصہ یاد دلا دیتا ہے۔ اس کے خیالات سے اس کا سماج نفرت کرتا تھا۔ ایک مرتبہ معاشری مقاطعے (سوشل بائیکوٹ) یعنی حقہ پانی بند کرنے کی دھمکی دی گئی۔ اس نے اس کی کبھی پرواہ نہ کی۔ آخر لوگوں نے پوچھا کہ جب مرو گے تو دفن کون کرے گا۔ اس نے جواب دیا کہ تم ہی لوگ کرو گے۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم سے یہ توقع نہ کرنا، ہم پاس بھی نہ کھڑے ہوں گے۔ اس نے ہنس کر کہا کہ جب مر کر سڑنے لگوں گا اور عفونت پھیلے گی تو وبا کے اندیشے سے تم ہی مجبوراً دفن کرو گے۔ اس نوع کے معارف کے علاوہ واجب الوجود اور ہمہ اوست کے مسائل پر بھی گہری نظر ڈالی ہے اور نتائج کو جگہ جگہ عام فہم انداز اور سلیس زبان میں پیش کیا ہے۔ شعر کی اصل غایت اور بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا پیغام زیادہ سے زیادہ ذہنوں تک پہونچ سکے۔ ملاحظہ ہو:-

یہ کچھ بہروپ پن دیکھو کہ بن کر شکل دانے کی　　بکھرنا، سبز ہونا، لہلہانا، پھر سمٹ جانا
یہ یکتائی یہ یک رنگی تس اوپر یہ قیامت ہے　　نہ کم ہونا نہ بڑھنا اور ہزاروں گھٹ میں بٹ جانا

نظیر ایسا جو چنچل دلربا بہروپیا ہووے　　　　تماشا ہے پھر ایسے شوخ سے سوتے کا پٹ جانا

اول کے دو شعروں کے کوزے میں مسائل و معانی کے سمندر بند کئے ہیں۔ ان سے وحدت الوجود، ہمہ اوست اور جزو کل کے قدیم مسائل پر جس طرح روشنی پڑتی ہے، اسی طرح ارتقا، انتخاب طبیعی، جہد للبقا اور خلافت الاوفق کے جدید مسائل کی بھی شرح و وضاحت ہوتی ہے۔ مقطعے کا بیان بہ ظاہر عامیانہ ہے لیکن اگر زندگی کے وسیع و طویل دوران، اس کی مشکلوں اور ان کے حل کا جائزہ لیا جائے تو اس شعر کی معنویت کے دفتر کھلنے لگتے ہیں۔ فلسفیت کی اور مثال ملاحظہ ہو:-

ابھی کہیں تو کسی کو نہ اعتبار آوے　　　　کہ ہم کو راہ میں ایک آشنا نے لوٹ لیا

اس شعر میں حیات کی ایک ایسی بالغ حقیقت اور زندگی کا ایک ایسا اٹل تجربہ بیان کیا ہے جس کی صداقت و اہمیت پوری زندگی بسر کر دینے کے بعد خود ہی واضح ہو جاتی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے مفکروں نے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ شیکسپیر نے اپنے مشہور ڈرامے ہینری پنجم میں لورڈ اسکروپ نامی ایک کردار پیش کیا ہے۔ بادشاہ کو اس پر بڑا اعتماد تھا مگر آخر میں اس نے غداری کی۔ بادشاہ اُسے مخاطب کر کے کہتا ہے:-

"لیکن آہ، میں اب تجھ سے کیا کہوں اے لورڈ اسکروپ، تجھ ظالم، احسان فراموش، خونخوار، غیر انسانی مخلوق سے، تو میرے سارے مشوروں کا رازداں تھا، تو میری روح کے سارے بھیدوں سے واقف تھا، میں تیرے لئے روؤں گا، کیونکہ تیری یہ بغاوت، میرے نزدیک انسان کی دوسری معصیت کے مماثل ہے۔"

سعدی نے اسی خیال کو اس طرح باندھا ہے:-

ہر کس از دست غیر نالہ کند　　　　سعدی از دست خویشتن فریاد

سعدی نے اپنی ذات کے علاوہ، خویشتن سے اقارب و آشنا کی ذات بھی مراد لی ہے۔ نظیر کے شعر کا خیال تو زندگی کا ایک پرانا تجربہ ہے لیکن اس کے انوکھے بیان نے شعر کو ایک ادبی نادرہ بنا دیا ہے۔ زندگی کے لئے راہ کا استعارہ بہت پر معنی ہے اور اس راہ میں، آشنا، جیسے محبوب و معتمد کا لوٹ لینا قیامت ہے لیکن مصیبت

بالائے مصیبت یہ ہے کہ کوئی اس حادثے کا یقین کرنے کو تیار نہیں۔ ایک اور مثال ملاحظہ ہو:۔

ٹھہرنا عشق کے آفات کے صدموں میں نظیر   کام مشکل تھا پر اللہ نے آسان کیا

عشق کو نظیر زندگی کا مترادف سمجھتا ہے۔ مشرقی شاعری میں عموماً زندگی کے مصائب کی بڑی بڑی شکائتیں کی جاتی ہیں مگر وہ اس انداز بیان کا خوگر نہیں ہے۔ وہ زندگی کو دشوار گزار ضرور سمجھتا ہے دوبھر نہیں سمجھتا۔ ساتھ ہی ساتھ اس پر اعتماد رکھتا ہے کہ اگر پامردی سے مقابلہ کیا جائے تو مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ اور نادر مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

کس کس نے اس کے عشق میں مارا نہ دم ولے   سب چل بسے مگر وہ دل آرام رہ گیا
جس کام کو جہان میں آیا تھا تو نظیر   خانہ خراب تجھ سے وہی کام رہ گیا

پہلے شعر میں حسن کی ازلیت و ابدیت اور دوسرے میں عشق کی ناتمامی و نارسائی کی طرف اشارہ ہے۔ صوری اعتبار سے پہلے میں "دم مارنا" اور "دل آرام" اور دوسرے میں "کام" اور "خانہ خراب" حسن بیان کی پاکیزہ مثالیں ہیں۔ ایک اور فلسفیانہ شعر ملاحظہ ہو:۔

میں ہوں پتنگ کاغذی ڈور ہے اس کے ہاتھ میں   چاہا ادھر گھٹا لیا' چاہا اُدھر بڑھا دیا

اس شعر میں جبر وقدر کے مسئلے کو کیسی سہولت سے اور کیسے دلنشین و عام فہم انداز میں بیان کر دیا ہے۔ لطف یہ ہے کہ زندگی کو ایک ایسی معروف چیز سے تشبیہ دی ہے جس سے ہر اعلیٰ و ادنیٰ واقف ہے اور تشبیہ کا حسن یہ ہے کہ تام ہو کر رہ گئی ہے۔ دوسرا شعر ملاحظہ ہو:۔

دیکھ لے اس چمن دہر کو دل بھر کے نظیر   پھر ترا کاہے کو اس باغ میں آنا ہوگا

اس شعر میں زندگی کو رجائیانہ نظر سے دیکھنے اور اُس سے پورا پورا استفادہ کرنے کی تلقین ہے۔ زندگی کو ایک عذاب الیم بنا کر اس پر رونا دھونا اور گریہ و بکا کرنا نہیں سکھایا گیا۔ یہ بتایا گیا ہے کہ زندگی ایک قلیل مدت کا نام ہے اور ایک کاروباری انسان کی طرح اس سے زیادہ سے زیادہ منفعت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ ایک نئی قسم کا شعر ملاحظہ ہو:۔

دیکھ لے اس چمن دہر کو دل بھر کے نظیرؔ ۔۔۔ پھر ترا کاہے کو اس باغ میں آنا ہوگا

اس شعر میں زندگی کو رجائیانہ نظر سے دیکھنے اور اُس سے پورا پورا استفادہ کرنے کی تلقین ہے۔ زندگی کو ایک عذاب الیم بنا کر اس پر رونا دھونا اور گریہ و بکا کرنا نہیں سکھایا گیا۔ یہ بتایا گیا ہے کہ زندگی ایک قلیل مدت کا نام ہے اور ایک کاروباری انسان کی طرح اس سے زیادہ سے زیادہ منفعت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ ایک نئی قسم کا شعر ملاحظہ ہو :-

آپ ہی کیا ہے اپنے گریبان کو ہم نے چاک ۔۔۔ آپ ہی سیا سیا نہ سیا پھر کسی کو کیا

نظیرؔ کے کلام میں محبت اور جنسی محبت ہی کی ہر جگہ بھرمار نہیں۔ نفس انسان کے دوسرے اہم جذبوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ اس شعر میں حریت اور خودداری کا بلند معیار نہایت سادہ اور دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ فلسفیانہ کلام کی اور چند مثالیں یہ ہیں :-

وصف اس کے حسن کا کس سے ہوا کُلی مگر ۔۔۔ جس کے جتنا فہم میں آیا کہا اچھا کہا

گزرے جو سوئے خانقاہ واں بھی بہ شکل جانماز ۔۔۔ اہلِ صلاح و زہد کو فرش کیا، بچھا دیا

کو تدبیر ہیں ہم لیک خدا ہی جانے ۔۔۔ کون سا گل ہے پسِ پردۂ تقدیر کھلا

سنگ دل محبوب کو کہنا غلط تھا پر نظیرؔ ۔۔۔ ہم نے جب جانا جب اس بے درد سے پالا پڑا

نیست رہتے ہم تو یہ سیر یں کہاں سے دیکھتے ۔۔۔ یہ فقط احسان ہے اس ذاتِ پاکِ ہست کا

ان اشعار میں بالترتیب فہم انسان کے عجز، عشق کی نیازمندی، تدبیر کی عظمت، عملی زندگی کی اہمیت اور حیات کے سرور و انبساط کی طرف اشارہ ہے۔ اور فلسفیانہ حقائق ملاحظہ ہوں :-

ساقی شراب ہے تو غنیمت ہے اب کی اب ۔۔۔ پھر بزم ہوگی جب تو سمجھ لیجو جب کی جب

اس شعر میں زندگی کے ہر عالم کو اہم سمجھنے' اس میں دلچسپی لینے اور "آج ہے سو راج ہے" کے زریں دیرپا منفعت اصول پر عمل کرنے کی ہدایت کی ہے۔ دوسرے مصرعے سے کنایتاً حیات بعد الممات کا یقین دلایا ہے اور اگر معنی کو زیادہ وسیع کیا جائے تو تناسخ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

بوسہ اس گل سے نہ کر لے دلِ افگار طلب　　یہ زیادہ طلبی ہے نہ ہو دشوار طلب

آرزو خوب ہے موقع سے اگر ہو ورنہ　　اپنے مقصود کو کم پہونچے ہیں بسیار طلب

ان اشعار میں جادۂ اعتدال پر قائم رہنے کی تلقین کی ہے۔ روزمرہ زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے کیسا سچا اور کتنا عملی طریقہ ہے۔

کس سے کہیں کیا کریں یہ ہے تماشے کی بات　　وہ تو ہے پردہ نشیں ہم ہیں تماشا طلب

غیر مفکر ذہن میں حقیقت کو بے نقاب دیکھنے کی خواہش اکثر پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان تعینات کے دائرے میں محصور ہے اور اس کے میلانات اسی دائرے میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ اس کی تشنگی اگر بجھ سکتی ہے تو حواس کے ذریعے بجھ سکتی ہے۔ چنانچہ غیر مفکر قسم کا انسان' خدا کو اپنے وجود پر قیاس کرتا ہے اور مجسم دیکھنا چاہتا ہے۔ یہاں یہ بتایا ہے کہ ذات حقیقی' جسم سے منزہ اور غیر مرئی ہے۔ اس کو مجسم دیکھنے کی خواہش حماقت ہے۔

کمالِ عشق بھی خالی نہیں تمنا سے　　جو ہے اِک آہ تو اس کو بھی ہے اثر کی طلب

یہ شعر نظیر کے معیاری اشعار میں سے ہے اور شاعر کے نفس کی طمانیت اور قلب کے سکون کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ نظیر کے نزدیک انسانیت کا کمال' عشق ہے اور عشق کا منتہیٰ یہ ہے کہ کوئی تمنا باقی نہ رہے۔ آہ میں اثر کی طلب دیکھ کر اس کو تعجب ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک عشق جب ہی کامل ہے جب آہ میں بھی اثر کی طلب باقی نہ رہے۔ یہ شعر طنز بالکنایہ کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔

ہو کس طرح نہ ہم کو ہر دم ہوائے مطلب　　دیکھا جو خوب ہم نے دنیا ہے جائے مطلب

جب حرف آبرو تک پہونچا نظیرؔ تو پھر
کیا کہئے ایسی جاگہ جز یہ کہ ہائے مطلب

ان دونوں شعروں میں مطلب کے فلسفے کا خوب تجزیہ کیا ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ دنیا کے سارے تعلقات کی بنیاد مطلب پر قائم ہے۔ مقطعے میں انسان کے نفس کی اس پستی پر ماتم کیا ہے کہ وہ مطلب برآری کے لئے بسا اوقات آبرو بھی قربان کر دیتا ہے۔ معیاریت کا دعویٰ یہ ہے کہ آبروئے انسان کی اہم ترین دولت ہو۔ اس کے بچانے کے لئے جان بھی قربان کر دینی چاہیئے۔ لیکن نظیرؔ حقیقت نگار شاعر ہے۔ وہ دنیا میں روزمرہ یہ ہوتے دیکھتا ہے کہ مطلب کے لئے آبرو کی بھی پرواہ نہیں کی جاتی۔ نظیرؔ کی بعض غزلیں پوری کی پوری فلسفیانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ یہ غزل ملاحظہ ہو:۔

بحرِ ہستی میں صحبتِ احباب
یوں ہے جیسے بہ روئے آب حباب

بادۂ ناب کیا ہے خونِ جگر
زردئی رنگ ہے شبِ مہتاب

جس کو رقص و سرود کہتے ہیں
وہ بھی ہے ایک ہوائے خانہ خراب

حسن اور عشق جن کو کہتے ہیں
خفقۂ برق و قطرۂ سیماب

گردشِ آسمان میں ہم کیا ہیں
پرکا ہے میانۂ گرداب

عمر کہتے ہیں جس کو وہ کیا ہے
مثلِ تحریرِ موج، نقش بر آب

جسم کیا، روح کی ہے جولاں گاہ
روح کیا ایک سوار پا بہ رکاب

زندگانی و مرگ بھی کیا ہیں
ایک مثلِ خیال و دیگر خواب

فرصتِ عمر، قطرۂ شبنم
وصلِ محبوب، گوہرِ نایاب

قفسِ غم ہے مسکنِ وادی
اشکِ حسرت بجائے دانۂ آب

سب کتابوں کے کھل گئے معنی
جب سے دیکھی نظیرؔ دل کی کتاب

یہ غزل، فارسی اور اُردو کے قدیم و جدید سرمائے کے بہترین فلسفیانہ کلام کے ساتھ پیش کی جا سکتی ہے اور نظیر کی غزلیہ شاعری کا ایک شاہکار ہے۔ جو شاعر رقص و سرود کو ہوائے خانہ خراب احسن کو خفظۂ برق، عشق کو قطرۂ سیماب، عمر کو تحریرِ موج، روح کو سوار پابہ رکاب، زندگی کو خیال، مرگ کو خواب اور فرصتِ عمر کو قطرۂ شبنم کہہ سکتا ہے وہ نہ صرف بہت بڑا شاعر ہے بلکہ دقیقہ رس فلسفی بھی ہے۔ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے کہ میکشی اور عبادت، ثروت اور عسرت، نظیر کی فلسفیانہ نظر میں ایک درجہ رکھتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

جو خانقاہ میں ہے پارسا کو عیش و طرب　　وہ میکدے میں حلاوت ہے رند میکش کو

جو شاہ کو ہے وہی ہے گدا کو عیش و طرب　　کمالِ قدرتِ حق ہے نظیر کیا کہیے

ذیل کے اشعار میں طمانیت نفس کے حقائق کو بے نقاب کیا ہے۔ نقطۂ نظر کی اہمیت اور انفرادیت کی قوت کی معجز نمائی کی طرف بے حد سادہ اور نہایت لطیف انداز میں توجہ دلائی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

جو تشنہ دوا ہے اُسے یوسف اقبال　　ہر چاہ میں ملتا ہے تری چاہ میں یا رب

وہ عیش نہیں خیمۂ خر گاہ میں یا رب　　جو خانہ بدوشی میں ہے طالب کو ترے عیش

ہر طور میں، ہر رسم میں، ہر راہ میں یا رب　　اپنا ہی طلبگار نظیر اپنے کو دیکھو

نظیر کے کلام میں کہیں کہیں معیاریت کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے۔ جمالِ مطلق کی پرستش کا معیار کیسے حسین الفاظ میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

انھیں کرشمہ و ناز و ادا سے کیا مطلب　　نقط جو ذات کے ہیں دل سے چاہنے والے

بے مدعا چاہنا غالباً انسانیت کے کمال کا منتہا ہے۔ نظیر نے جگہ جگہ نفس کی اس معیاری کیفیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ تصور خالص مشرقی ممالک کے لئے مخصوص ہے۔ اہلِ مغرب کے لئے اس فلسفے کا سمجھنا اور اس سے لطف اندوز ہونا، بہت دشوار ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

درخت خشک کو نشو و نما سے کیا مطلب　　نہال تازہ رہیں نامیہ کے منت کش

مشرقی شعرا اور فلسفیوں نے زندگی کو اکثر عالم خواب سے تشبیہ دی ہے، لیکن نظیر نے اس کو خواب در خواب کہہ کر نیا لطف اور بڑی جدت پیدا کی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

جہاں بھی خواب ہے اور ہم بھی خواب ہیں آ دل   عجب بہار کا دیکھا ہے ہم نے خواب میں خواب

زندگی کے حوادث کے جبر و تشدد اور حیات کی اٹل واقعیت کو کیسی دیانت، بے تلخی اور سادگی سے بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

الم میں یاں تک کہ اب ہماری بدل گئی ہے جو شکل ہمدم   کسی کو پھر یاد کیا رہے جب ہمیں نے اپنی بھلائی صورت

آنی و وقتی یاس و نا امیدی، نظیر کے رجائیانہ نفس میں بھی پیدا ہوتی ہے۔ خوشی اور رنج دونوں فطری جذبے ہیں۔ خوشی کی طرح، رنج بھی انسانی فطرت کا ایک خاصہ ہے لیکن اس کا خوگر ہو جانا اور اسے زندگی کا شعار بنا لینا قنوطیت اور غیر فطری ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

اس جام نگوں سے مئے راحت نہ طلب کر   یہاں بادہ نہیں بادیہ پیمائی ہے کم بخت
ٹوٹے ہیں بہت شیشۂ دل جس سے نظیر آہ   یہ چرخ وہی گنبد مینائی ہے کم بخت

فلسفیانہ اشعار کے اور چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

نہ ہووے دل کی تکل کٹ کے برباد   اگر ڈالے نہ وہ تار نظر پیچ

اس شعر کا انداز بیان خاص نظیر کے حصے کا ہے۔ تکل، اکبرآباد کی ایک خاص قسم کی پتنگ کا نام ہے۔ نظیر نے یہ لفظ کئی مرتبہ استعمال کیا ہے۔ مشرق کے مفکر، زندگی کے تنوعات کو خدا کی ذات سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ نقطۂ نظر اس قدر عام ہے اور ایسی جڑ پکڑ گیا ہے کہ مشرق کے تمدن کا جزو اعظم بن کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ تصوف اور شعر کی دنیا میں بھی اس کو پورا دخل ہے۔ نظیر نے بارہا اس طرف اشارہ کیا ہے۔ پھر ملاحظہ ہو:۔

ہے کتنے دنوں سے عشق نظیر اس یار کا ہم کو جس کے ہیں   صبح اور برنگ شام اور یکیں آج اور بروش کل اور طرح

بندے کے قلم ہاتھ میں ہوتا تو غضب تھا   صد شکر کہ ہے کاتب تقدیر کوئی اور

نظیر واقعیت کا شاعر ہے۔ وہ فطرت کے جمال و کمال کو جتنا محسوس کرتا ہے اتنا ہی اس کے جبر و قہر سے بھی متاثر ہے۔ وہ اس کے اٹل اور ناگزیر قانون پر محض واقعے کی حیثیت سے نظر ڈالتا ہے اس پر آہ و زاری نہیں کرتا۔ ملاحظہ ہو:۔

پڑی ہے خاک گورستاں میں کیا کیا قد موزوں پر
اُگی ہے گھاس کس کس گل بدن کے روئے گل گوں پر

اپنے وسیع مشاہدے کے دوران میں نظیر کو طرح طرح کے آدمیوں سے سابقہ پڑا ہے، قسم قسم کے مزاج والوں سے واسطہ رہا ہے۔ وہ نہ اچھائی کی تعریف کرتا ہے نہ بُرائی سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ نفس انسان کے تنوعات کی سچی تصویریں کھینچتا ہے۔ ملاحظہ ہوں :۔

نظیر حضرت دل کا نہ کچھ کھلا احوال
میں کس سے پوچھوں، یہ ندرت مآب، ہے کیا چیز

جو سخت ہووے تو ایسا کہ کوہ آہن کا
جو نرم ہووے تو برگِ گلاب ہے کیا چیز

گھڑی میں سنگ، گھڑی موم اور گھڑی فولاد
خدا ہی جانے، یہ عالی جناب ہے کیا چیز

نفس کے تنوعات کی اور چند مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

ہے تو کہنے کو ہر کہیں اخلاص
لیک مشکل ہے ہم نشیں اخلاص

اس کی باریکیاں وہی جانے
ہووے جس شخص کے تئیں اخلاص

اب تلک دھن سے ہے حسنِ دنداں کی
دیکھ اس پو پلے نظیر کی غرض

کیا تماشا ہے یارو کل تو نظیر
تھا بہت خانقاہ سے محفوظ

آج بیٹھا ہے میکدے کے بیچ
مغبچے کی نگاہ سے محفوظ

نظیر کی جمالیاتی حس، نہایت دقیقہ رس ہے۔ وہ حجابات میں در آتی ہے اور حسنِ مطلق کو بے نقاب دیکھتی ہے۔ اس کا حسن بیان بسا اوقات، شعر میں پر لگا دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

چشمِ بد دور، اسی رخ سے ہوئی تھی روشن
مشعل وادیٔ ایمن، شجرِ طور کی شمع

شرافت نفس کا اقتضا ہے کہ وہ انسان کو خود اپنے نفس کی عزت اور دوسرے سے اس کی توقع کرنا سکھاتی ہے۔

نظیر کو اپنی آبرو کا بڑا خیال ہے۔ وہ جناب امیر المومنین کی خدمت میں، صرف ایک التجا لے کر جاتا ہے۔ وہ یہ ہے:۔

آبرو رکھیو نظیر اپنے کی تم ۔۔۔ یا امیر المومنیں شاہ نجف

عشق کی ازلیت و ابدیت اور جبر محبت کو کیسے لطیف کنایے میں ظاہر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کوئی نہیں کرتا جو کیا تو نے نظیر آہ ۔۔۔ دل اس کو دیا جس کے نہیں نام سے واقف

انگریزی زبان میں ایک مشہور کہاوت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "کوئی بات کامیابی سے زیادہ کامیاب نہیں"۔ اردو میں بھی ایک مثل "چلتے کا نام گاڑی ہے" کم و بیش اس کی مترادف ہے۔ اس کہاوت کی روشنی میں، معاشرت کا جائزہ لیا جائے تو بہت سے مسائل لایعنی اور بہت سے عقائد بے بنیاد نظر آنے لگتے ہیں۔ اتفاقیہ کامیابی بعض اوقات، اس حد تک پہونچ جاتی ہے کہ معمولی آدمیوں کو حکیم حاذق، مرشد کامل، صاحب کشف و کرامت کا لقب دیدیتی ہے۔ نظیر کی دقیقہ رس نگاہیں اس نکتہ کی حقیقت تک پہونچی ہیں۔ کہتا ہے:۔

جب دوستی میں تول کے پورے ہوں دونوں شخص ۔۔۔ ہوتی ہیں پھر تو کیا ہی ملاقاتیں ٹھیک ٹھیک
جب بن پڑی تو شیخ جی، شیخی نہ ماریں کیا ۔۔۔ ہم سے بھی پھر تو ہو ویں کراماتیں ٹھیک ٹھیک
سچ ہے بہ قول حضرت سید نظیر آہ ۔۔۔ بن آتی ہے تو ہوتی ہیں سب باتیں ٹھیک ٹھیک

چند اور اشعار، جن میں فلسفیانہ جھلک ہے، ملاحظہ ہوں:۔

باغ میں لگتا نہیں، صحرا سے گھبراتا ہے دل ۔۔۔ اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم
دیوانگی میری کے تحیر سے شب و روز ۔۔۔ ہے حلقۂ زنجیر سے زنداں ہمہ تن چشم
یہ ناز ہے یا استغنا ہے یا طرز تغافل ہے یار د ۔۔۔ جو لاکھ کوئی تڑپے سسکے فریاد کرے کچھ دھیان نہیں

ذیل کے شعر میں محبت کی ازلیت کی طرف کیسا لطیف و عام فہم اشارہ ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

ہم تو اس کے چاہنے والے ہیں مدت سے نظیر ‏ ‏ اور نیا کہتا ہے، اب تک وہ صنم چنچل ہیں

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں "اب تک" خصوصیت سے توجہ کے قابل ہے۔ اس جملے کی معنویت و وسعت نے اس شعر کو بیحد بلیغ بنا دیا ہے۔

نظیر نے، زندگی کے فوائد و نعائم کی طرف متوجہ کر کے، بار بار زندگی کی اہمیت سمجھانے پر اصرار کیا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے کلام میں روایتی قنوطیت کے بھی کچھ اجزا موجود ہیں، لیکن یہ خال خال ہیں۔ اس کے کلام میں رجائیت کی روح سموئی ہوئی ہے اور وہ عام طور پر اُسی کا جلوہ دکھاتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

عیش کر خوباں میں اے دل شادمانی پھر کہاں ‏ ‏ شادمانی گر ہوئی تو زندگانی پھر کہاں
جس قدر پینا ہو پی لے پانی ان کے ہاتھ سے ‏ ‏ آبِ جنت تو بہت ہوگا، یہ پانی پھر کہاں
لذتیں جنت کے میوے کی بہت ہوں گی وہاں ‏ ‏ پر یہ میٹھی گالیاں خوباں کی کھانی پھر کہاں
واں تو ہاں حوروں کے گہنے کے بہت ہوں گے نشاں ‏ ‏ ان پریزادوں کے چھلّوں کی نشانی پھر کہاں
الفت و مہر و محبت سب ہیں جیتے جی کے ساتھ ‏ ‏ مہرباں ہی اٹھ گئے تو مہربانی پھر کہاں
واعظ و ناصح بکیں تو ان کے کہنے کو نہ مان ‏ ‏ دم غنیمت ہے میاں، یہ نوجوانی پھر کہاں

جا پڑے چپ ہو کے جب شہر خموشاں میں نظیر
یہ غزل، یہ ریختہ، یہ شعر خوانی پھر کہاں

اس غزل میں اس نے کھل کر بتا دیا ہے کہ زندگی کو شادمانی پر ترجیح ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ زندگی خود سب سے بڑی شادمانی ہے۔ اس کو جنت میں جانے کا یقین ہے لیکن اس کے نزدیک محبوب کے ہاتھ کا پانی، آبِ جنت سے، خوباں کی میٹھی گالی، جنت کے لذیذ میوے سے اور پریزاد کا چھلّا، حور کے گہنے سے کہیں بہتر ہے۔ وہ حاضر کو غائب پر اور حال کو مستقبل پر ترجیح دیتا ہے۔ زندگی کو جینے کے لئے سمجھتا ہے اور آیندہ کی

امید میں اس زندگی کو آزار نہیں بنانا چاہتا۔ اس غزل میں اس نے زندگی کی اہمیت اور حیاتِ بعد الممات پر زندگی کی فوقیت کا گیت گایا ہے۔ اب ایک اور فلسفیانہ غزل ملاحظہ ہو :-

لیتا ہے جان میری تو میں سر بہ دست ہوں — اے یار میں تو کشتۂ روزِ الست ہوں
اک دم کی زندگی کے لئے مت اٹھا مجھے — اے بے خبر میں نقشِ زمیں کی نشست ہوں
مت مست کر شراب سے اے گلبدن مجھے — ظالم میں تیری چشمِ گلابی سے مست ہوں
دور از طریق مجھ کو سمجھو نہ زاہدا — گر تو خدا پرست ہے میں بت پرست ہوں
ان سنگ دل بتوں کا گلہ کیا کروں نظیر — میں آپ اپنے شیشۂ دل کی شکست ہوں

اس غزل کا دوسرا شعر خصوصیت سے جلبِ توجہ کرتا ہے۔ بادی النظر میں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ زندگی کو آنی و عارضی بتایا ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نظیر زندگی کے دوام کا معترف ہے اور نقشِ زمین کی نشست کی طرح اُس کو محکم و اُستوار سمجھتا ہے۔ چند اور فلسفیانہ حقائق ملاحظہ ہوں :-

ہمارے قطرۂ اشک اُس کی سرد مہری سے — کسی زمانے میں موتی تھے اب تو اولے ہیں
منظور ہوا دام میں جب دل کو پھنسانا — پھر وسوسہ کیا چاہیے صیاد کوئی ہو
مر کر بھی اپنا عقدۂ مشکل نہ وا ہوا — سچ پوچھئے تو کہتے ہیں اس کے تئیں گرہ
تا ابد آزاد ہیں دام و قفس کے جور سے — بلبلِ تصویر و طاؤسِ خیالِ آئینہ
ہے اگر منظور سیرِ عالمِ حیرت نظیر — تو دل اپنا کر تو محبوسِ خیالِ آئینہ

ذیل کے اشعار میں زندگی کو ایک سیر اور محبوب کی ملاقات کو آنی خوش وقتی بتایا ہے۔ اندازِ بیان نہایت لطیف و دلکش ہے۔ ملاحظہ ہو :-

آ گئے تھے سیر کرتے تم کو دیکھا خوش ہوئے — اب خدا حافظ ہے تم سے یار رخصت ہو چلے
گل رُخوں کی بزم میں کیا بیٹھتے ہو اے نظیر — تم بھی رخصت ہو کہ اب سب یار رخصت ہو چلے

نظیر کی معاشرتی حس بہت قوی ہے۔ وہ بزم سے اس لئے رخصت ہونا چاہتا ہے کہ اس کے سب یار رخصت ہو گئے اور اب اس کے لئے بزم کے قیام میں کوئی لطف نہیں رہا۔ زندگی کی کوئی تھری حقیقت جب اس کے سامنے آجاتی ہے تو اس کو ناگزیر سمجھ کر وہ قبول کرلیتا ہے۔ مگر کوئی آہ وزاری، نالہ وبکا نہیں کرتا۔ نظیر کی واقعیت پسندی کی ایک اور فلسفیانہ مثال ملاحظہ ہو:۔

مر بھی جاویں گے تو جز پیرہن عریانی　　آپ سے ہم نہیں لینے کے کفن یاد رہے

محبت کی ازلیت وابدیت کی ایک اور مثال، جس میں حسن بیان نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

یہ کہتے ہیں کہ عاشق چھوٹ جاتا ہے اذیت سے　　جب اس کی عمر کو لشکر اجل کا آن کر لوٹے
ہماری روح تو پھرتی ہے معشوقوں کی گلیوں میں　　نظیر اب ہم تو مر کر بھی نہ اس جنجال سے چھوٹے

فراست اور دور بینی کی ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

دست صیاد سے چھوٹے تو اچھل پے درپے　　ورنہ کیا فائدہ اے آہوئے دل جستوں سے

زندگی، خوشی خوشی بسر کرنے کا کیا اچھا انداز ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

جام نہ رکھ ساقیا شب ہے پڑی اور بھی　　پھر جہاں کٹ گئے چار گھڑی اور بھی

چند اور اہم فلسفیانہ مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

حکمت کا الٹ پھیر نہیں جن کی نظر میں　　وہ کہتے ہیں غافل یہ فنا ہے یہ بقا ہے

یوں کارواں شباب کا گزرا کہ گوش زد　　آواز پا ہوئی نہ صدا سے درا ہوئی
جو شکل دور باش تھی روز نخست کی　　اب بھی جو ہم گئے تو وہی بر ملا ہوئی

آخری شعر میں، نظیر نے یہ بتایا ہے کہ حقائق، ازل سے تعینات کے حجاب میں پوشیدہ ہیں اور ازل تک پوشیدہ رہیں گے۔ اس لئے ان کے ڈھونڈھنے کی کوشش عبث ہے۔ حقائق سے یہاں مابعد الطبیعاتی

حقائق مراد ہیں، سائنٹفک حقائق مراد نہیں۔ چنانچہ زندگی کے واقعات سے دل لگانا اور زندگی کی جد وجہد کو مسرور و تابناک بنانا، رموز و حقائق کی تلاش سے بہتر و افضل ہے۔ چند اور فلسفیانہ مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

ہم اظہار تاسف سے نہ کرتے آج جاں کاہی   اگر پے درد کے طرزوں سے ہوتی کچھ بھی آگاہی
گل سے کوئی کہے کہ شگفتن سے باز آ   اس کو تو پھولنا ہے نہ پھولے تو کیا کرے
جونا قبول شے کے بنا یا قبول کو   پھر اس کو وہ بھلا نہ قبولے تو کیا کرے

ان دو شعروں میں، فطرت کی اٹل قوت کو، شاعر کی طرح نہیں بلکہ ایک ماہر طبیعیات کی طرح بیان کیا ہے۔ ان مقامات سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظیر کو حقیقت و واقعیت سے کتنا شغف تھا۔ ذیل کے شعر میں جبر حیات کی طرف اشارہ ہے :۔

جاگتا ہوں تو یہ کہتا ہے کہ جا سو بھی کہیں   اور جو سوتا ہوں تو ٹھوکر سے جگاتا ہے مجھے

ذیل کے پہلے شعر میں معاشرت کا ایک نکتہ بتایا ہے اور دوسرے میں کامرانوں کو ہدایت کی ہے کہ ناکاموں کو فراموش نہ کریں۔ ملاحظہ ہو :۔

جاتی ہے قدر اس میں کچھ اچھا نہیں نظیر   گھر میں کسی کے دوڑ کے جانا گھڑی گھڑی
جلد اتنا نہ چل او جلوہ دکھانے والے   ہیں نقاہت زدہ پیچھے ترے آنے والے

چند اور فلسفیانہ حقائق ملاحظہ ہوں :۔

کہتے ہیں جس کو زندگی دم کی ہوا ہے اے نظیر   ہم کو تو آج کھل گیا عقدہ یہ اک حباب سے
اتنا نہ ہنس دل اس سے ایسا نہ ہو کہ خنچل   لڑنے کو تجھ سے ہو وے تیار ہنستے ہنستے
کل شب وصل میں کیا جلد کٹی تھیں گھڑیاں   آج کیا مر گئے گھڑیال بجانے والے
ہے آج تو خوش پر نہیں بلبل کو یہ معلوم   کل سر کو پٹکنا ہے چمن کی روشوں سے
کوئی حجاب نہیں تجھ میں اور صنم میں نظیر   مگر تو آپ ہی پردہ ہے آپ ہی ٹٹی ہے

مسلسل اور موضوعی غزلوں میں فلسفیانہ اشعار کی گنجایش کم ہوتی ہے لیکن نظیر کی مسلسل غزلوں میں بھی کہیں کہیں فلسفیت کی جھلک موجود ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں :-

ہم پست نگاہوں کی نظر میں تو فلک ہے کرہ　　سب ارض و سما کی ہے گلستان تماشا

ذیل میں ایک غزل کا مطلع درج کیا جاتا ہے :-

وہ رشک نور جو وقت سحر بے نقاب تھا　　دیکھا اس کے رخ کو رو بہ زمیں آفتاب تھا

اس غزل کا بقیہ حصہ ایک قطعے پر مشتمل ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے :-

ایک دن دل اپنا عیش گزشتہ کو یاد کر　　رہ رہ کے ہم سے مانگتا اس کا جواب تھا

یہ پورا کا پورا قطعہ مشرقی فلسفیانہ شاعری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ چند اور نمونے پیش کیے جاتے ہیں :-

جدھر کو دیکھیے ادھر آپ ہی جھمکتا ہے　　مزا پڑے نہ اسے کیونکہ شیش محلوں کا

تو ہستی کی گرہ پر عقل کا ناخن نہ توڑ اے دل　　کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت این معمہ را

ذیل میں ایک مسلسل غزل کا مطلع درج کیا جاتا ہے :-

یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے با آب و تاب　　اہل صورت کا ہے دریا اہل معنی کا سراب

یہ ساری غزل بڑے حقائق و معارف کی حامل ہے اور پوری کی پوری فلسفیانہ رنگ میں ہے۔ ذیل کی غزل کا بھی یہی پرواز ہے۔ مطلع ملاحظہ ہو :-

کیا کاسۂ مے لیجیے اس بزم میں اے ہمنشیں　　دور فلک سے کیا خبر پہنچے گا لب تک یا نہیں

فلسفیانہ رنگ کی ایک اور مسلسل غزل کا مطلع ملاحظہ ہو :-

کیا کاسۂ مے لیجیے اس بزم میں اے ہمنشیں　　دور فلک سے کیا خبر پہنچے گا لب تک یا نہیں

شعر کے سلسلے میں جب فلسفے کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہ مراد ہرگز نہیں ہوتی کہ کوئی مربوط و منضبط نظریہ مدلل و مشرح

اندازِ بیان کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ اشعار جو حقائق و معارف کا جائزہ لیں، زندگی کی بنیاد پر نظر ڈالیں اور فکر کو بیدار کریں فلسفیانہ کہے جانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ چنانچہ نظیر کے بھی وہ اشعار جو فکر کے پہلو بہ پہلو، عبرت، غفلت، دور بینی، مآل اندیشی وغیرہ، نفس کے سنجیدہ جذبوں کو متاثر کرتے ہیں فلسفیانہ کہے گئے ہیں۔ ان میں کسی نوع کا مابعد الطبیعاتی فلسفہ تلاش کرنا بجا نہ ہوگا۔

فارسی ترکیب

فارسی ترکیب کی خلاقی کا فخر مومن اور غالب کی ذات سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن یہ خیال تاریخی غلطی ہے اور عدم واقفیت پر مبنی ہے۔ مرکبات بنانے اور انھیں مناسب موقعوں پر اردو شعر میں استعمال کرنے کا رواج نظیر نے پیدا کیا ہے۔ اس کے یہاں ترکیب کی وضع و قطع، اتنی خوش گوار اور دل پسند ہے کہ بار بار یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ خود ہی اس اندازِ بیان کا موجد ہے اور مومن و غالب نے اس کے کلام کے غائر مطالعے سے یہ فن حاصل کیا ہے۔ نظیر کی ساری فارسی ترکیبیں ایک جگہ جمع کی جائیں تو ان کا ذخیرہ مومن اور غالب کے مشترکہ سرمائے سے زیادہ ہوگا۔ لطف یہ ہے کہ ترکیبوں کا بیشتر التزام غزلوں میں پایا جاتا ہے۔ چند ترکیبوں اور ان کے استعمال کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:-

شورِ افگن جنوں ہے جس جا نگاہ کرنا ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ رکھتا ہے کام ہمدم واں ضبطِ آہ کرنا

شرمندۂ رفو نہیں عاشق کا چاک جیب ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ کس باغباں نے گل کا گریباں سلا دیا

ذیل کی غزل کے سارے قافیے فارسی ترکیب کے ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ نظیر کو اردو میں فارسی ترکیب کا پیوند لگانے کی کیسی قدرت ہے۔ ملاحظہ ہو:-

زیرِ فلک وہ خلق ہوئے ماہ پارہا ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ دیکھے ہے جن کو رشک سے چشمِ ستارہا

ہے تو وہ مہرِ حسن کہ ہر دم تری طرف ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ کل اختر سپہر ہیں گرمِ نظارہا

یوں سنگ ہجر توڑے ہے آئینہ ہائے دل ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ مینا کے ٹکڑے کرتے ہیں جوں سنگ خارہا

پوری غزل کا یہاں نقل کرنا طوالت ہے۔ دوسری غزل کے چند شعر جو اسی نوع کے قافیوں میں ہیں، نئی لذت کے حامل ہیں۔ ملاحظہ ہوں :۔

ہیں دم کے ساتھ عشرت و عسرت ہزار ہا ۔۔۔ وابستہ ایک تار نفس سے ہیں تار ہا
کچھ صید زخم خوردۂ جاناں ہمیں نہیں ۔۔۔ ہر صید گہ میں اس کی ہیں بسمل ہزار ہا
اس گل کے چاک جیب کی حسرت سے باغ میں ۔۔۔ ہر صبح چاک ہوتی ہیں جیب و کنار ہا
اس سوزن مژہ کے تصور میں شانہ ساں ۔۔۔ ٹوٹے ہیں ایک خلق کے پہلو میں خار ہا
کس کس کی دیکھیے چمن صنع میں بہار ۔۔۔ اپنی فقط دو چشم ہیں اور یہاں بہار ہا

ان اشعار کا فارسی مزاج اور ان ترکیبوں کا نادر استعمال آپ اپنی شرح ہے۔ لیکن "صید زخم خوردۂ جاناں" اور "بہار ہا" سے ثابت ہے کہ نظیر کو فارسی زبان اور محاوروں پر بھی کتنا عبور ہے۔ اور ترکیبیں ملاحظہ ہوں :۔

دل فدا تجھ پہ ہوا اے سرو گل اندام ہوا ۔۔۔ حلقۂ زلف بتاں پھر اسے کب دام ہوا
ہو گیا دیکھتے ہی مشرق خورشید خجل ۔۔۔ اس کف پا سے مشرف جو سر بام ہوا

اس ابروئے خم دار کی صورت سے عیاں ہے ۔۔۔ خنجر کی شباہت، دم شمشیر کا نقشا
کیا گردش ایام ہے اے آہ جگر سوز ۔۔۔ الٹا نظر آیا تری تاثیر کا نقشا

ذیل کے اشعار میں، ترکیبوں اور مرکب ترکیبوں کے علاوہ "دوسرے شعر میں "رہے" کا استعمال بڑا شیریں ہے :۔

عشق کا جو گل زخم دم شمشیر کھلا ۔۔۔ رہ گیا جسم پہ مثل گل تصویر کھلا
طفل اشک اے مژہ چاہے کہ رہے ٹک تو اسے ۔۔۔ پیار سے مہر سے الفت سے بہ تدبیر کھلا
محو تدبیر ہیں ہم لیک خدا ہی جانے ۔۔۔ کون سا گل ہے پس پردۂ تقدیر کھلا

ذیل کے اشعار کی بندش میں کس قدر فارسیت ہے :۔

اک پردۂ ہستی نہ رہا جوں نظر آیا   وہ پردہ برانداز ہمیں کیوں نظر آیا

جو وصفِ زلف کو پوچھا تو حلقے حلقے کو   تاب و مرجع دلہائے صد اسیر کہا

تو حسن میں وہ مہر سپہر جمال ہے   ہر روز جبہہ سا ہے ترے در پہ آفتاب
ہر لحظہ تیرے چہرۂ انور کے وصف میں   یہ بیت پڑھ رہا ہے فدا ہو کر آفتاب
از بہر دفع چشم بد از روئے خوب تو   سیارہا سپند شود، مجمر آفتاب

ذیل کی غزل پوری کی پوری فارسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہ غزل اگر ان حضرات میں سے کسی کے سامنے پڑھی جائے جنھیں نظیر سے سرسری واقفیت یا سوئے ظن ہے تو ہرگز نہیں بتا سکتے کہ یہ اس اعجوبہ روزگار شاعر کا کلام ہے جسے ہر طرح بات کہنے پر قدرت ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کچھ اسے شرم کچھ ہے ہم کو حجاب   ہے نئی چاہ میں یہ طرفہ عذاب
کیوں نہ عشرت دوچند ہو جو ملے   یار مہ چہرہ اور شب مہتاب
زور کیفیتیں دکھاتے ہیں   ساقیٔ گل عذار و بادۂ ناب
کرتے ہیں تار تار جیب الم   تار قانون و بین و چنگ و رباب
وقت خلوت یہ ہم نے اس سے کہا   اب تو ٹک منہ سے دور کیجئے نقاب
بولی ہم تو ابھی اٹھا دیں مگر   لائیں کب آپ دیکھنے کی تاب
اور جب آجائے غش تمھیں تو نظیر
پھر چھڑکنا پڑے گا ہم کو گلاب

یہ غزل اپنے لب و لہجے اور پیکر کے اعتبار سے اعلیٰ فارسی شاعری کے رنگ میں ڈوبی ہوئی اور معنوی اعتبار سے نظیر کی غزلیہ شاعری کا ایک شاہکار ہے۔ جو شاعر طرفہ عذاب، عشرت دو چند، یار مہ چہرہ، ساقیٔ گل عذار، جیب الم، تار قانون و بین و چنگ و رباب، جیسے جملے وضع کر سکتا ہے اس کی فارسی دانی میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنی ضرورتوں کے لئے فارسی جملے خود تراشے اور ترکیبیں خود وضع کی ہیں۔ بعض اور دلکش ترکیبیں ملاحظہ ہوں :-

پروانے سے عاشق کے تئیں شمع جلا کر　　　پھر آپ بھی روتی ہے کھڑی بخت جلی چپ

ہے جو اس محبوب کی انگشتری در دست چپ　　　رکھتی ہے کیا کیا نزاکت پروری در دست چپ
جس کماں کو کھینچتا ہے وہ بت ابرو کماں　　　اس کے قبضے میں ہے سو زینت وری در دست چپ

ہوگئی باغ میں عطریت سنبل برباد　　　نکہت اس زلف کی لے کر جو صبا آئی آج
جگر میں جوشش تپش اور بہ لب ہجوم فغاں　　　ہوئی ہے آج یہ کچھ اس کی اژدہام سے یاد
اس لطف سے جز موقلم مانیٔ تقدیر　　　کیا تاب جو کھینچے تری تصویر کوئی اور
اے شوخ ہر گھڑی نہ ہوس آشنا کو چھیڑ　　　ایسا ہی چھیڑنا ہے تو اہل وفا کو چھیڑ
کس قدر تنک صفا ہے کہ پائے نگاہ کا　　　ہلکا سا اک غبار ہے چہرے کے رنگ پر
نظیر حضرت دل کا نہ کچھ کھلا احوال　　　میں کس سے پوچھوں یہ ندرت مآب ہیں کیا چیز

ان اشعار میں بخت جلی، نزاکت پروری، بت ابرو کماں، زینت پروری، عطریت سنبل، بہ لب ہجوم فغاں، موقلم مانیٔ تقدیر، ہوس آشنا، تنک صفا، ندرت مآب، لاجواب ترکیبیں ہیں اور مومن و غالب کی بہت سی ترکیبیں انہی سانچوں میں ڈھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ فارسی ترکیب بنانے کا اسلوب غالب نے نظیر

سے سیکھا ہے۔ نظیر کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں :۔

گر وہ مژہ ہو مائل جنگ پر طاؤس — تو سہم کے سب پر ہو خدنگ پر طاؤس
یوں زلف معنبر کے خط سبز ہے نزدیک — گویا پر طوطی ہے بہ چنگ پر طاؤس
دیکھے جو ترے عاشق گل خوردہ کی تصویر — حیرت زدہ ہو دیدۂ تنگ پر طاؤس

نظیر کے اس نوع کے اشعار سے غالب کے وہ مغلق اشعار یاد آتے ہیں جو اس کا ابتدائی کلام بتائے جاتے ہیں :۔

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا — تماشائے بہ یک کف بردن صد دل پسند آیا
جراحت تحفہ، الماس ارمغاں داغ جگر ہدیہ — مبارکباد اسدؔ غمخوار جان درد مند آیا

یا

شبنم بہ گل لالہ نہ خالی ز ادا ہے — داغ دل بیدرد نظر گاہ حیا ہے
قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ — اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

یا

نقش نازبت طناز بہ آغوش رقیب — پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نظیر کا یہ کلام، اس وقت کی پیداوار ہے جب غالب، اس کے مکتب میں پڑھتا تھا اور اس کے ذہن پر اس نوع کے کلام کا نقش اول مرتسم ہوا۔ بچپن کے اثرات ہمیشہ قوی اور دیرپا ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب اس نے خود کہنا شروع کیا تو پہلے اسی انداز میں کہا اور پھر منجھتے منجھتے کلام نے وہ رنگ پکڑ لیا جو نظیر کے فارسی آمیز کلام میں پایا جاتا ہے۔ چند اور نادر ترکیبیں ملاحظہ ہوں :۔

اُٹھا دیں ناز اُن کے ہم نہ کیونکر نظیر دل سے کہ جن کے ہو دیں
جفا تلطف، عتاب شفقت، غضب توجہ، ستم نوازش

جب تو اس گل بدن شکر لب نے یوں کہا، سن کے اس حقیر کی عرض
قد کو ہے سرو سہی سے ہم قدی تن کو ہے نازک تری سے ارتباط
ناز کو شوخی سے ہے پیوستگی آن کو غارت گری سے ارتباط

نظیر کو مصرعوں میں توازن و تقابل کا بڑا شوق ہے۔ قد کو سرو سہی کا ہم قد بتانا اور ہم قدی کی ترکیب وضع کرنا کمال ہے لیکن ہم قدی کے مقابل تن کے لئے نازک تری وضع کرنا کمال بالائے کمال اور نظیر کا حصہ ہے۔ دوسرا شعر بھی اسی درجے کا ہے یہی وہ مقامات ہیں جو اسے بڑا لسانی مرتبہ بخشتے ہیں اور دنیا کے ہومر، کالیداس، شیکسپیئر، انیس اور ٹالسائے جیسے بڑے فن کاروں کی صحبت میں لا بٹھاتے ہیں۔ اور مثال ملاحظہ ہو:۔

آفریں ہے دل پروانہ کو جس نے جل کر حسن کی گرمیٔ بازار میں مشہور کی شمع

نظیر کی اس غزل کا لب و لہجہ، غالب کے بہت سے کلام میں پایا جاتا ہے۔ غزل یہ ہے:۔

اے صف مژگاں تکلف برطرف دیکھتی کیا ہے الٹ دے صف کی صف
دیکھ وہ گورا سا مکھڑا رشک سے پڑ گئے ہیں ماہ کے منہ پر کلف
آبرو رکھیو نظیر اپنے کی تم یا امیر المومنین شاہ نجف

حسین ترکیبوں کی اور چند مثالیں یہ ہیں:۔

جونہی آیا ادھر کو وہ چشم سیہ، وہیں لے گیا دل کو بہ سحر نگہ
رہی عقل و خرد کو نہ جی میں جگہ مجھے اس بت ہوش ربا کی قسم

میں نے دیکھا نظیر جو اس کے تئیں تو وہ شرم و حیا سے ہو سر بہ زمیں
لئے نیچی نگاہوں سے جان دل و دیں، میں کہوں کیا اب اس کی حیا کی قسم

کیا کبک کو دکھلاتے ہو انداز خرام آہ حسرت زدۂ شوخیٔ رفتار تو ہم ہیں

بوسہ لیجے جو ہو کے دست و کمر | اتنی ہم میں کہاں ہے تاب و تواں

جوش نے ایک جگہ کہا ہے:-

تجھے کیا فصلِ گل ہے یا زمانِ خار ہے ساقی | تو خود اپنی جگہ ایک دولتِ بیدار ہے ساقی

مرا خیال تھا کہ یہ ترکیب جوش کی خلقت ہے مگر نظیر نے اسی غزل میں پہلے "پُر دلی" کہا ہے اور پھر "دولتِ بیدار" استعمال کیا ہے:-

ہر زخم پر ہے آہ کے بدلے صدائے واہ | کیا پُر دلی ہے اس دلِ خانہ خراب میں
لگتے ہی آنکھ شب کو نظر آ گئی وہ شکل | پائی یہ ہم نے دولتِ بیدار خواب میں

یہیں نہیں نظیر نے ایک اور جگہ بھی یہ ترکیب استعمال کی ہے اس لیے یہ ترکیب انہی کی ملک ہے۔ ملاحظہ ہو:-

قاصد اس دولتِ بیدار سے کہیو کہ کبھی | دو گھڑی آ کے ہمارے بھی جگا جائے نصیب

بعض اور ترکیبیں یہ ہیں:-

وہ منتظر کہ آویں، ہم پُر تپش کہ جا دیں | اس ڈھب کی ہر دو جانب بے اختیاریاں تھیں
نہ ضبط ہے نگہ کا نہ رُک سکے نظارہ | کیا شوق ورزیاں تھیں کیا بیقراریاں تھیں

جب کہ اُلٹی ہم نے تکرارِ نظر پر آستیں | کھینچ لی اس نے رخِ رشکِ قمر پر آستیں
اس پری رو کے دوانے کی یہ ہے شکل لباس | تارِ دامن خار پر، شاخِ شجر پر آستیں

گر عار ہے کچھ اس میں تمہیں تو میاں نظیر | لے جاؤ اپنے اس دلِ عزت پناہ کو
دل میں چمن کے ہے تری حسرت کی گُھنڈی | باور نہیں تو دیکھ یہ غنچہ نہیں گرہ
بھر عمر میرے دل کا یہ غنچہ کھلا نہ آہ | ایسی فلک نے کس کے دی میرے تئیں گرہ

آئینہ کی ردیف میں نظیر نے مطلعے اور مقطعے سمیت سات شعر کی غزل کہی ہے۔ پوری غزل جا بجا فارسی ترکیبوں سے لبریز ہے، لیکن ہر شعر کا دوسرا مصرعہ خصوصیت کے ساتھ داد طلب ہے۔ غالب کے کلیات میں اس ردیف کا صرف ایک مطلع میسر آتا ہے۔ نظیر کی غزل یہ ہے :-

بس کہ دل اس کا ہے مانوسِ خیال آئینہ ۔۔۔ ہے وہ ملک حسن محروس خیال آئینہ
تھا وہ پشت بام پر عکس آرسی میں ہم نے بھی ۔۔۔ زور حکمت سے لیا، بوس خیال آئینہ
تا ابد آزاد ہیں دام و قفس کے جور سے ۔۔۔ بلبل تصویر و طاؤس خیال آئینہ
دل جفا سے اس کی آزردہ ہو سو ہوتا نہیں ۔۔۔ بے خطر ہے زنگ سے روس خیال آئینہ
کل اُسے آئینہ خانے میں جو تھی مشق خرام ۔۔۔ تھا دو صد جا ہم کو پابوسِ خیال آئینہ
صافیٔ دل کا لغت اس سے نہ پھر پنہاں رہے ۔۔۔ یک نظر دیکھے جو قاموسِ خیال آئینہ

ہے اگر منظور سیرِ عالم حیرت نظیر
تو دل اپنا کر تو محبوسِ خیال آئینہ

غالب کا مطلع ملاحظہ ہو :-

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ ۔۔۔ طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

اور مثالیں ملاحظہ ہوں :-

مقابل اس چشم کے ہوں کیونکر کہ دیتی فرصت نہیں ہے پل بھر
ادھر نگاہوں کی ترک تازی، ادھر کو مژگاں کی نیزہ بازی

بھولتی دل سے نہیں ہوش ربائی تیری ۔۔۔ دلبری عشوہ گری، جلوہ نمائی تیری

ذیل کی پوری غزل کا لب و لہجہ، مزاج اور رنگ فارسی سے ہے، مگر اس کے قطعے میں دو محاورے

ہلکا ہونا بہ معنی سبک ہونا اور بھاری ہونا بہ معنی دوبھر ہونا، تقابل کے طور پر بڑے حسن سے نظم ہوئے ہیں۔ ملاحظہ ہو

اظہار ہم بھی کرتے احوال دلفگاری
شرم وفا گر اک دم دیتی زباں کو یاری

جن میں فریب وفن کی سوختہ کاریاں ہیں
ہم ان کے مبتلا ہیں اے وائے خام کاری

شکوہ فراموشی کا کیا اُن سے کیجئے جن کو
صورت ہی بھول جاوے پھر کیسی یادگاری

یک بار ملتے جلتے رک جاؤ تم تو لے جاں
دل بستگاں کی پھر ہو کیونکر نہ اشک باری

وعدے پہ گل رخوں کے مت کھا فریب اے دل
ان کے قرار میں ہیں صد خار بے قراری

لیتی ہے ہم سے بدلہ اب صبح حشر اس کا
جو شام ہو میں ہم نے کی تھی سیاہ کاری

گر کر نظیر ہم اس محبوب کی نظر سے
ایسے ہوئے ہیں ہلکے جو زندگی ہے بھاری

اور مثالیں ملاحظہ ہوں :-

جس وقت خواب ناز سے وہ چشم وا ہوئی
صد خستۂ نہ خفتہ کی حاجت روا ہوئی

جو شکل دور باش تھی روز نخست کی
اب بھی جو ہم گئے تو وہی بر ملا ہوئی

یہ غزل بھی سرتاپا فارسی رنگ میں رنگی اور میر وغالب کے تغزل میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو!-

جان بھی بہ جان ہے ہجر میں اور دل فگار بھی
تر ہے مژہ بھی اشک سے جیب کا تار تار بھی

طرفہ فسوں سرشت ہے چشم کرشمہ سنج یار
لیتی ہے اک نگاہ میں صبر بھی اور قرار بھی

کوچے میں اس کے بیٹھنا حسن کو اس کے دیکھنا
ہم تو اسی کو سمجھے ہیں باغ بھی اور بہار بھی

دیکھئے کیا ہو بے طرح دل کی لگے ہیں گھات میں
عشوہ پُر فریب بھی، غمزۂ سحر کار بھی

زلف کو بھی ہے دم بہ دم عزم کمند افگنی
دام لئے ہے مستعد طرۂ تابدار بھی

گننے لگی وہ اپنے جب چاہنے والوں کو نظیر
اٹھ کے یکایک اس گھڑی ہم نے کہا کہ یار بھی

اس غزل کا مطلع میر کے رنگ کا، چوتھا شعر غالب کے رنگ کا اور مقطع ٹھیٹ نظیر کے رنگ کا ہے۔ فارسی ترکیبوں کی چند اور مثالیں یہ ہیں :-

خیالِ شوخیٔ چشم اس کا اپنے دیدۂ تر میں ۔۔۔ پھرے ہے یوں کہ جیسے ہو شناور بحر میں ماہی
اے مردمانِ چشمِ بتاں یہ وہ حال ہے ۔۔۔ تم سب کے آج خال کو یہاں جائے حال ہے
اب تو ہر لحظہ وہ بے دردستاتا ہے مجھے ۔۔۔ بے نہایت ستم و ظلم دکھاتا ہے مجھے
یک سر مو نہ پریشان ہو تو اے کاکلِ یار ۔۔۔ ہم ترے دام میں آکر نہیں جانے والے
نقطۂ حسن اس کے رخ کا ایک کتابِ حسن ہے ۔۔۔ ہو چکی اس کی بھی تحقیقات میرے سامنے
اس کی ابرو کی صفت میں ہر کماں ابرو نے رات ۔۔۔ بزم میں کیا کیا پڑھیں ابیات میرے سامنے
زیادہ اس سے اب اخفائے دردکیا ہوگا ۔۔۔ کہ جان آنکھوں میں آ آگئی پہ آہ نہ کی
غنچہ لب، مہر جبیں، عارض گلفام پری ۔۔۔ گلشنِ حسن ہے اب وہ گل اندام پری
زمینِ نظیر نہیں گرم، اس میں ہے کیا خاک ۔۔۔ مگر بہ زورِ طبیعت نباہ کی گھڑی

فارسیت اور فارسی ترکیبوں کا التزام، غزلوں کی طرح، مسلسل اور موضوعی غزلوں میں بھی بہ کثرت پایا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو :-

خدوخال خوبی آگیں لب لعل پان سے رنگیں ۔۔۔ نظر آفتِ دل و دیں مژہ صد مضرت افزا

اس شعر میں "صد مضرت افزا" خاص طور پر توجہ کے قابل ہے۔ اس کے علاوہ خط کی جگہ "خد" کے استعمال نے شعر کی دلکشی کس قدر بڑھادی ہے۔ ذیل میں ان مسلسل غزلوں کے مطلعے درج کیے جاتے ہیں جن میں یا تو فارسیت کی کثرت ہے یا جو اول سے آخر تک فارسی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ ملاحظہ ہوں :-

یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے با آب و تاب ۔۔۔ اہلِ صورت کا ہے دریا، اہلِ معنی کا سراب
درپے ہیں دل اپنے کے ادھر عشوہ گرے چند ۔۔۔ خواہندۂ یک جان ہیں ادھر موکمرے چند

سحر ہم نے چمن اندر عجب دیکھا کل اک دلبر — سہی قامت، پری پیکر، مقطع وضع، خوش منظر

دنیا ہے اک نگار فریبندہ جلوہ گر — الفت میں اس کی کچھ نہیں جز کلفت وضرر

کل نظر آیا چمن میں اک عجب رشک چمن — گل رخ و گلگوں قبا و گل عذار و گل بدن

کیا کاسۂ مے لیجئے اس بزم میں لے ہمنشیں — دور فلک سے کیا خبر، پہنچے گا لب تک یا نہیں

کیا دل لگا دیں دہر باں ہم حسن صورت سے کہیں — نہ وہاں ثبات اس سے بہم نہ یہاں قیام اپنے تئیں

گل رنگی و گل پیرہنی، گل بدنی ہے — وہ نام خدا، حسن میں سج دھج کی بنی ہے

موضوعی غزلوں میں فارسیت کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔ برسات کا مطلع ہے :-

ساقیا موسم برسات ہے کیا روح فزا — دیکھ ٹک تازگی صنعت بیچون وچرا

پری کا مطلع ملاحظہ ہو :-

رخ پری، چشم پری، زلف پری، آن پری — کیوں نہ اب نام خدا ہو ترے قربان پری

بسنت کا مطلع ملاحظہ ہو :-

مل کر صنم سے اپنے ہنگام دلکشائی — ہنس کر کہا یہ ہم نے اے جاں بسنت آئی

سمدھن کا مطلع ملاحظہ ہو :-

سراپا حسن سمدھن کا گویا گلشن کی کیاری ہے — پری بھی اب تو بازی حسن میں سمدھن سے ہاری ہے

دوسرا ملاحظہ ہو :-

کروں کس منہ سے اب یارو بیاں میں شان سمدھن کی — لگی ہے اب تو میرے دل کو پیاری آن سمدھن کی

موتی کا مطلع ملاحظہ ہو :-

پریزادوں میں ہے نام خدا جس شان پر موتی — کوئی ایسا نہیں موتی مگر موتی مگر موتی

ان ساری موضوعی غزلوں میں فارسیت کی ہلکی چاشنی موجود ہے۔

اُردو زبان میں غالب کا کلام اپنی نوع کی یکتائی اور اپنے رنگ کے اچھوتے پن کے لئے مشہور ہے۔

نظیر کا پرتو غالب پر

کسی دوسرے شاعر کے کلام پر غالب کا دھوکا نہیں ہو سکتا۔ نظیر کے کلام میں شعر کے شعر اور غزلیں کی غزلیں ایسی میسر آتی ہیں جنھیں شاعر کا نام بتائے بغیر پڑھا جائے تو اہلِ ذوق و نظر کو غالب کے کلام کا دھوکا ہو جائے۔ تاریخی اعتبار سے نظیر متقدم ہے۔ اس لئے کسی دوسری دلیل کے بغیر یہ ماننا پڑتا ہے کہ غالب پر نظیر کا گہرا پرتو پڑا۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اُس نے نظیر کے فلسفیانہ کلام سے بیش از بیش استفادہ کیا ہے۔ ایک معنوی توارد ملاحظہ ہو:۔

نظیر نے کہا ہے:۔

اس مہرِ پرانوار سے شبنم کی طرح ہم ۔۔۔ گم ہوتے گئے ہم کو وہ جوں جوں نظر آیا

غالب نے کہا ہے:۔

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم ۔۔۔ ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

غالب کا شعر نظیر کا چربہ ہے لیکن اگر غائر نظر ڈالی جائے تو نظیر کا شعر غالب سے بہ مراتب بلند ہے۔ غالب عنایت کی نظر کا محتاج ہے اور نظیر اپنی نظر پڑتے ہی جمالِ مطلق میں جذب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ "جوں جوں" لکھ کر نظیر نے تسلسل و تواتر کا جو تصور پیش کیا ہے وہ غالب کے شعر سے پیدا نہیں ہوتا۔

نظیر کے غزلیہ کلام کا، غالب کے رنگِ طبیعت پر گہرا اثر ہے۔ بعض مقامات نظیر کے کلام میں ایسے نظر آتے ہیں جنھیں بلاخوفِ تردید، غالب کے تصور کا ماخذ اور تخئیل کا سرچشمہ کہا جا سکتا ہے۔ نظیر نے کہا ہے:۔

تھے کل یہ خطِ عارضِ خوباں سبزہ رنگ ۔۔۔ کہتے ہیں آج خلق جنھیں سبزہ زار ہا

تھے کل یہ شاہدانِ سہی سرو و سیم تن ۔۔۔ شاہد ہیں آج مرگ کے جن کے مزار ہا

سب کو نظیر سونا ہے اک دن بہ زیرِ خاک ۔۔۔ سنگِ مزار اس کے ہیں آئینہ دار ہا

ان اشعار میں بندش کی چستی، تصور کی بلندی، فکر کی گہرائی، نقاد کی فکر و نظر کے لئے تحقیق و تفتیش کا

ایک وسیع میدان کھول دیتی ہے۔ ان میں اور فارسی ترکیبوں کے علاوہ 'سبزہ رنگ' 'سہی سرو' اور آئینہ دار اس کیف و مزاج کی ترکیبیں ہیں جن کی ایجاد و اختراع کا فخر غالب کی ذات سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ یہ ترکیبیں پہلے نظیر اور پھر غالب نے استعمال کی ہیں۔ اب پیکری مماثلت سے قطع نظر کر کے، معنی کی طرف توجہ کی جائے تو بار بار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ :۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں　　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

کا ماخذ نظیر کے مذکورہ بالا اشعار ہیں جن سے غالب نے اپنے مطلعے کے لئے خام مواد حاصل کیا ہے۔ نظیر کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو :۔

جہاں بھی خواب ہے اور ہم بھی خواب ہیں اے دل　　　عجب بہار کا دیکھا ہے ہم نے خواب میں خواب

غالب کا یہ شعر :۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود　　　ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

بہت مشہور ہے۔ یہ اس کے فلسفیانہ نوادر اور اردو کے اہم شعری سرمائے میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اس کا ماخذ دریافت ہونے سے بڑی حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ نظیر کا ایک مطلع ملاحظہ ہو :۔

ساقی شراب ہے تو غنیمت ہے اب کی اب　　　پھر بزم ہو گی جب تو سمجھ لیجیو جب کی جب

غالب نے بھی اسی معنی کا ایک مطلع کہا ہے جو یہ ہے :۔

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں　　　یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

دونوں کے تقابل سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ دوسرا پہلے سے ماخوذ ہے۔ "عربدہ جو" کی ترکیب عموماً غالب کی اختراع سمجھی جاتی ہے۔ فارسی سے اردو میں لانے کا شرف، کم سے کم اسی کے نامۂ اعمال میں لکھا گیا ہے۔ نظیر کہتا ہے :۔

ربط اس عربدہ جو سے ہمیں کس طور سے ہو　　　ہم تو ہیں صلح طلب اور وہ ہے پیکار طلب

نظیر کے بعد غالب نے کہا ہے :-

صد حیف وہ ناکام جو اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جو کی

دو بڑے شاعروں کے کلام میں ہم قافیہ غزلیں میسر آنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اور نہ محض اس اشتراک سے کوئی خاص نتیجہ نکل سکتا ہے لیکن جب بحر عامۃ الورود نہ ہو اور قافیے شاہراہ سے ہٹے ہوئے اور غیر مانوس ہوں، یہاں تک کہ خاص خاص استادوں کے کلام میں بھی نظر نہ آتے ہوں تو لا محالہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ متقدم کی تقلید کی گئی۔ اولیت کا فخر و شرف متقدم کو حاصل ہے اور متاخر نے استفادہ کیا ہے۔ نظیر کی غزل ملاحظہ ہو :-

ہوا جو ہم کو وہ کوچہ چمن سرشت نصیب
خدا نے ہم کو اسی جا کیا بہشت نصیب

جدا جو اس سے ہوئے ہم تو اپنی قسمت سے
ہے وہ تو خوب پر اپنے ہی کچھ ہیں زشت نصیب

لکھیں نہ حرف وفا کیا کریں کہ اول سے
ہوئی قلم کو ہمارے یہی نوشت نصیب

زمینِ دل میں گرایا ہے تخم تو لیکن
کریں گے دیکھیے سرسبز کب یہ کشت نصیب

یہ کم نصیب ہوئے ہم کہ بعدِ مرگ نظیر
ہوئی مزار کو اپنے نہ ایک خشت نصیب

اب ان ہی قافیوں میں مگر ردیف کے تغیر کے ساتھ غالب کی غزل ملاحظہ ہو :-

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبت اہلِ کنشت کو

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو

آئی اگر بلا تو جگہ سے نہیں ٹلی
ایرا ہی دے کے ہم نے بچایا ہے کشت کو

غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

نظیر کی غزل میں مطلع اور مقطع ملاکر پانچ شعر ہیں۔ غالب کو اس زمین میں مطلع میسر نہیں آیا۔ اس کے یہاں بھی مقطع سمیت پانچ شعر ہیں۔ نظیر نے چھ قافیے استعمال کیے ہیں اور غالب کے یہاں ایک قافیے کی تکرار کی وجہ سے صرف چار ہیں۔ ان چار میں تین، بہشت، نوشت اور کشت اس نے غالباً نظیر سے مستعار لئے ہیں۔ غالب کی غزل میں کنشت ایک نیا قافیہ ہے جس پر نظیر کی نظر نہیں پڑی۔

مضامین کے قرب و یک رنگی کی یہ دو مثالیں بہت دلچسپ ہیں۔ نظیر نے کہا ہے :-

حاضر جوابی دیکھو کہ لب سے مرے ہنوز نکلا نہیں سوال کہ وہاں ہو گیا جواب

غالب نے کہا ہے :-

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

نظیر نے کہا ہے :-

یار دیکھ اس کو لگے رکھنے عداوت مجھ سے دوست بھی ہو گئے دشمن مرے اے وائے نصیب

غالب نے کہا ہے :-

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ہو گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

ان دونوں مثالوں میں متقابل شعروں کا مطلب بالکل تو ایک نہیں ہے مگر بہت قریب ہے اور غالب کے اشعار نظیر کے شعروں کا اقتباس سمجھے جا سکتے ہیں۔ توارد کی ایک اور عمدہ اور صریح مثال ملاحظہ ہو۔ نظیر نے کہا ہے :-

آئینہ ایک دم نہیں رکھتا ہے ہاتھ سے ایسا وہ اپنے رُخ کا تماشا طلب ہے اب

غالب کا شعر ہے :-

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیش نظر ہے آئینہ ہر دم نقاب میں

نظیر کی غزل جس کا مطلع یہ ہے :-

بحرِ ہستی میں صحبت احباب	یوں ہے جیسے بہ روئے آب حباب

ایک اہم فلسفیانہ کارنامہ ہے۔ جب یہ غزل غالب کی اس مشہور غزل کے ساتھ مطالعہ کی جائے جس کا مطلع یہ ہے:۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے	آخر اس درد کی دوا کیا ہے

تو دونوں استادوں میں صوری اور معنوی اشتراک کے بہت سے پہلو نظر آنے لگتے ہیں۔ ان دونوں غزلوں کی بحر ایک ہے۔ اس کے علاوہ زبان و بندش، لب و لہجہ اور مغز و موضوع بھی بہت کچھ یکساں ہے۔

نظیر اکثر اپنی غزلوں کے بعض اشعار میں فعل حذف کر دیتا ہے یہ شعر کا ایک حسن ہے اور اس سے بیان میں ایک خاص لطف و لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ نظیر نے کہا ہے:۔

ناز کو شوخی سے ہے پیوستگی	آن کو غارت گری سے ارتباط

یہ اندازِ بیان غالب کے کلام کا ایک خاص حسن سمجھا جاتا ہے مگر یہ اس نے غالباً نظیر سے سیکھا ہے۔ نظیر کے کلام میں بہت سے وہ جملے بھی موجود ہیں جو غالب کی جدت سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً نظیر نے کہا:۔

اسے صف مژگاں تکلف برطرف	دیکھتی کیا ہے الٹ دے صف کی صف

تکلف برطرف کا استعمال نظیر کے بعد، غالب نے اس طرح کیا ہے:۔

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے	تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

ایک اور دلچسپ توارد ملاحظہ ہو۔ نظیر نے کہا ہے:۔

ان سنگ دل بتوں کا گلہ کیا کروں نظیر	میں آپ اپنے شیشۂ دل کی شکست ہوں

غالب نے کہا ہے:۔

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز	میں ہوں اپنی شکست کی آواز

ان اشعار کے دوسرے مصرعوں کی صوری و معنوی ہم آہنگی بڑے لطف کی بات ہے۔ نظیر کی بہت سی

زمینوں میں غالب نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ دو عمدہ مثالیں حسب ذیل ہیں۔ نظیر نے کہا ہے :۔

نہ ادا میں مزا نہ لذتِ ناز	آہ کا ہے کو خط ہوا آغاز

غالب نے کہا ہے :۔

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز	میں ہوں اپنی شکست کی آواز

نظیر نے کہا ہے :۔

وہ بے نشاں دہن رُخ خورشید تاب میں	ذرہ سما گیا ہے دل آفتاب میں

غالب نے کہا ہے :۔

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں	کافر ہوں گر نہ ملتی ہو لذت عذاب میں

ایک اور معنوی توارد ملاحظہ ہو۔ نظیر نے کہا ہے :۔

عشق بھلا ہے تجھے زلفِ بتاں کی قسم	ہجر کی شب سے کوئی شب ہے بڑی اور بھی

غالب نے کہا ہے :۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں	شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گا حساب میں

نظیر نے کہا ہے :۔

جلد آؤ اگر تم کو مری خواہشِ خوں ہے	کچھ دیر نہیں لگنے کی یاں صید زبوں ہے

غالب نے فرمایا ہے :۔

خیال مرگ کب تسکیں دل آزردہ کو بخشے	مرے دام تمنا میں ہے ایک صید زبوں وہ بھی

مسلسل غزلوں میں بھی توارد کی بعض مثالیں میسر آجاتی ہیں۔ ذیل کا شعر ملاحظہ ہو۔ نظیر نے کہا ہے :۔

ہم پست نگاہوں کی نظر میں تو نظیر آہ	سب ارض و سما گی ہے گلستاں تماشا

غالب نے کہا ہے :۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اب نظیر کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو:-

اک دن دل اپنا، عیش گزشتہ کو یاد کر
رہ رہ کے ہم سے مانگتا اس کا جواب تھا
یعنی وہ کیا زمانۂ عشرت تھا اے نظیر
جس میں ہزار عیش سے میں کامیاب تھا
اب زار و ناتوان و نحیف و ضعیف ہوں
نقش طلسم تھا وہ کوئی یا حباب تھا
اک جنبشِ مژہ میں وہ برہم ہوا طلسم
کیا کہیے اس کو اور، مگر یہ کہ خواب تھا
جب ہم نے دل سے بھر کے دمِ سرد یوں کہا
جس میں مئے طرب سے تو مستِ خراب تھا
ہیہات کیا بتائیں ہم اُس عصرِ خوش کا نام
اے غفلت انتہا وہی عہدِ شباب تھا
تھی باغِ زندگی کی اسی سے ہی آب و رنگ
دیوانِ عمر کا بھی وہی انتخاب تھا
اپنی تو فہم میں وہی ہنگام دل فروز
مجموعۂ حیات کا لب لباب تھا

اب غالب کا مشہور قطعہ ملاحظہ ہو:-

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

نظیر اور غالب دونوں کے قطعے پیش نظر ہیں۔ غائر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے قطعے کا لب و لہجہ، نظیر کے قطعے کے لب و لہجے سے کتنا ملتا جلتا ہے۔ بار بار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ متاخر کا کلام، متقدم کا چربہ ہے۔ لب و لہجے کے علاوہ، دونوں کا رنگ، خیال کا انداز، زبان کا پرداز، بندشیں، ترکیبیں، سب ایک ہی طرح کی ہیں۔ موضوع بھی کم و بیش ایک ہی ہے۔ نظیر کے قطعے میں جوانی کا ماتم ہے اور غالب نے عیش رفتہ پر نوحہ کیا ہے جو جوانی کے ماتم کا مترادف ہے۔ یہ یگانگت و ہم رنگی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ بظاہر یہ ہم طرحی، نہ صرف وطن کے اشتراک سے پیدا ہے بلکہ ہم ذوقی سے بھی ہے اور ہم ذوقی کی بنیاد تلمذ پر قائم ہو سکتی ہے۔ حکیم قطب الدین باطن نے، اپنی تصنیف گلستان بیخزاں میں غالب کو نظیر کا شاگرد بتایا ہے۔ اور شہباز سے مراسلت میں، حالی نے بھی دبی زبان سے، غالب کا نظیر کے مکتب میں پڑھنا تسلیم کیا ہے۔ بہر حال کلام کے رنگ کے اشتراک سے یہ بہت قرین قیاس ہے کہ غالب کے ذوق سخن نے نظیر کے ذوق سخن کی آغوش میں تربیت پائی، اس کا اتباع کیا اور وہ شاعری میں اس کا معنوی شاگرد ضرور ہے۔ نظیر کی طرح غالب بھی اکبر آباد کا سپوت، اردو کے گھر کا چشم و چراغ اور اس زبان کی شاعری کا مسلم الثبوت استاد اور امام ہے۔ نظیر کا شاگرد قرار پاکر نہ اس کی حرمت میں کوئی کمی ہو سکتی ہے، نہ نظیر کی عظمت میں کوئی زیادتی۔ بہرحال یہ مسئلہ خالص اکبر آبادی مسئلہ ہے اور اس پر محض ایک واقعے کی حیثیت سے نگاہ ڈالنی چاہیئے۔

ان چند نظموں اور غزلوں کے منتخب اشعار پر تبصرہ کرنے اور کلام کے چند بیش بہا افادہ محاسن نمایاں کرنے کے بعد نظیر پر تبصرے کا کام ختم نہیں ہو جاتا۔ نظیر کا کلام ایک بحر زخار ہے جس میں شناوری کے لئے کم سے کم ایک پوری حیات کی ایک طویل مدت درکار ہے۔ یہاں تبصرے کا جو نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ ایک سرسری اور سطحی کوشش ہے جس کو زیادہ وسیع کرنے اور غائر بنانے کی ضرورت ہے۔ یہاں نظیر کی زبان اور محاورے اور ان کے عالمگیر اثر، عروض اور بہت سے دوسرے اہم مسائل پر مفصل توجہ

نہیں کی گئی۔ اس مختصر صحیفے میں، فی الحقیقت، اتنی گنجایش نہ تھی کہ اس میں دقیق مسائل پر بحث کی جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں نظیر کی شاعرانہ فطنت کا بھی جائزہ نہیں لیا گیا۔ اس موضوع پر "نظیر نامے" کے نام سے ایک دوسری کتاب مرتب ہو چکی ہے جو انشاء اللہ جلد پیش کی جائے گی۔

روحِ نظیر کی پہلی اشاعت میں بعض نظموں کے بعض حصے حذف کر دیئے گئے تھے لیکن وہ حصے اس اشاعت میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔ بعض حضرات، ان حصوں کو فحش اور غیر مہذب بتائیں گے اور یہ اعتراض غلط نہ ہوگا لیکن شاعر کا کلام صرف اخلاق و عوائد ہی کی بنا پر نہیں جانچا جاتا اور نظیر کا کلام بالخصوص، اس معیار سے نہیں پرکھنا چاہیے۔ ایک واقعہ نگار شاعر کے کلام میں، اخلاق و عوائد کی بنا پر، جن کا معیار خود ہمیشہ بدلتا رہتا ہے، دخل اندازی کرنا نا انصافی ہے۔ ان مقامات کو جب خود نظیر نے لکھنا جائز سمجھا تو کسی دوسرے کو انھیں حذف کر دینے کا اختیار نہیں۔

رَحِمَ اللّٰہُ مَنْ هَدَا اِلَیَّ عُیُوْبِیْ

کلامِ نظیر

الباقی بسم اللہ

(۱) الٰھی نامہ

دنیا میں نہ خاص اور نہ کوئی عام رہے گا   نے صاحب مقدور نہ ناکام رہے گا
زردار نہ بے زر نہ بد انجام رہے گا   شادی نہ غم گردش ایام رہے گا
نے عیش نہ دکھ درد نہ آرام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

یہ چرخ جو کھاتا ہے بڑا گنبد ازرق   یہ چاند یہ سورج یہ ستارے ہیں معلق
لوح و قلم و عرش بریں ثابت و مطلق   سب ٹھاٹھ یہ اک آن میں ہو جاوے گا ہو حق
آغاز کسی شئے کا نہ انجام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

لے عالم ارواح سے تا عالم جنات   انسان و پری حور و ملک جن و خبیثات

کیا ابر و ہوا کوہ جنگل ارض و سماوات　　اِک پھونک میں اُڑجاویں گے جوں نقش طلسمات
ہُشیار نہ پختہ نہ کوئی خام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

گر علم و ہنر سے ہے کوئی خلق میں مشہور　　یا کشف و کرامات میں ہے صاحب مقدور
یا ایک کا ہے نام و نشاں خلق میں مشہور　　اک دم میں پلک مارتے ہوجاویں گے سب دور
مستور نہ مشہور نہ گمنام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

مختاری کے غرے سے جو کرتے ہیں سدا کام　　یا جبر سے مجبوری کے رکھتے ہیں کئی گام
جب آکے فنا ڈالے گی اک گردش ایام　　اِک آن میں اُڑجائے گا سب چیز کا الزام
مختار نہ مجبور نہ خود کام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

اب دل میں بڑے اپنے جو کہلاتے ہیں عیار　　سو مکر و دغا کرتے ہیں اک آن میں تیار
جب آکے فنا سر کے اوپر مارے گی اک وار　　اک وار کے لگتے ہی یہ ہوجاویں گے سب آر
نے مکر نہ حیلہ نہ کوئی دام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

کرتے ہیں جو اب دل سے ریاضات و عبادات　　یا عمر کو کھوتے ہیں بہ رندی و خرابات
جب آکے فنا پھاڑے گی شمشیر کا اک ہات　　پھر صاف ہیں دونوں کی گنہگاری و طاعات
نے رند نہ عابد نہ سے آشام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

جھگڑا نہ کرے ملت و مذہب کا کوئی یاں   جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آں
زنار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآں   عاشق تو قلندر رہیں نہ ہندو نہ مسلماں
کافر نہ کوئی صاحب اسلام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

جو شاہ کہاتے ہیں کوئی ان سے یہ پوچھو   دارا و سکندر وہ گئے آہ کدھر کو
مغرور نہ ہو شوکت و حشمت پہ وزیرو   اس دولت و اقبال پہ مت پھولو امیرو
نے ملک نہ دولت نہ سرانجام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

بیوپار جو کرتے ہیں ہر اک چیز کا زردار   آگے بھی دکانیں تھیں کئی اور کئی بازار
جس طور کا اب چاہئے کر لیجئے بیوپار   پھر جنس نہ دلال نہ مالک نہ خریدار
نے نقد نہ کچھ قرض نہ کچھ دام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

اب جتنی کھڑی دیکھو ہو عالم میں عمارات   یا جھونپڑے دو کوڑی کے یا لاکھ کے محلات
کیا پست مکاں کیا یہ ہوا دار مکانات   اک اینٹ بھی ڈھونڈے کہیں آنے کی نہیں ہاتھ
دالان نہ حجرہ نہ در و بام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

یہ باغ و چمن اب جو ہر اک جا ہیں رہے پھول   یہ شاخ یہ غنچہ یہ ہرے پات یہ پھل پھول
آجاوے گی جب باد خزاں ان کے اوپر بھول   ہر خار کی ہر پھول کی اڑ جاوے گی سب دھول
نے زرد نہ سرخ اور نہ سیہ فام رہے گا

آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

میخوار بھی کتنے ہوئے یاں مے کے ملاقی ساقی بھی کئی ہو گئے محبوب وثاقی
لا جام کوئی بھر کے جو ہو اور بھی باقی فرصت ہے غنیمت کوئی دم کو ارے ساقی
نے مے نہ صراحی نہ ترا جام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

یہ عاشق و معشوق جو کرتے ہیں بہم چاہ آگے بھی بہت عاشق و معشوق تھے واللہ
وہ شخص کہاں جاتے رہے ہائے مرے اللہ اس بات سے معلوم ہوا اب تو یہی آہ
نے عشق نہ عاشق نہ دلآرام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

جو حسن کے ہیں گلبدن اور چاند سے رخسار آگے بھی اسی طرح بہت گل تھے نمودار
کیا جانے کدھر جاتے رہے ہائے وہ گلزار یہ حسن یہ صورت بھی غنیمت ہے مرے یار
گل رنگ نہ گل رو نہ گل اندام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

ٹک غور کرو اب کہاں مجنوں کہاں فرہاد لیلیٰ کہاں شیریں کہاں وہ ناز وہ بیداد
جو پھول کھلے آہ وہ جب ہو گئے برباد ہم تم بھی غنیمت ہیں سنو یارو پری زاد
واں حسن نہ یاں عشق کا ہنگام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

محبوب بنا جس نے تمھیں حسن دیا ہے اُس نے ہی ہمیں عاشق جانباز کیا ہے
ملنا ہے تو مل لو یہی جینے کا مزا ہے سب ناز و نیاز آہ یہ اک دم کی ہوا ہے

پھر ہجر نہ کچھ وصل کا پیغام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

ملنے سے ہمارے جو تمھیں آتا ہے الزام — آنے دو پہ تم ہم سے ملے جاؤ سحر شام
پھر حسن کہاں اپنے رکھو کام سے تم کام — جھک مارتے ہیں وہ جو تمھیں کرتے ہیں بدنام
طوفان نہ بہتان نہ الزام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

یہ شعر و غزل اب جو بناتے ہیں زبانی — آگے بھی بہت چھوڑ گئے اپنی نشانی
دیوان بنایا کوئی قصہ کہ کہانی — کچھ باقی نظیر اب نہیں سب چیز ہے فانی
خمسہ نہ غزل فرد نہ ایہام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

(۲) برسات کی بہاریں

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں — سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاوٹ قطرات کی بہاریں — ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں — جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں — گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

مارے ہیں موج ڈابر دریا ڈونڈ رہے ہیں   مور و پپیہے کوئل کیا کیا رمنڈ رہے ہیں
جھڑ کر رہی ہیں جھڑیاں نالے امنڈ رہے ہیں   برسے ہے مینہ جھڑا جھڑ بادل گھمنڈ رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
جنگل سب اپنے تن پر ہریالی سج رہے ہیں   گل پھول جھاڑ بوٹے کر اپنی دھج رہے ہیں
بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہے ہیں   اللہ کے نقارے نوبت کے بج رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
بادل لگا ٹکوریں نوبت کی گت لگاویں   جھینگر جھنگار اپنی سرنائیاں بجاویں
کر شور مور بگلے جھڑیوں کا مینہ بلاویں   پی پی کریں پپیہے مینڈک ملار گاویں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
ہر جا بچھا رہا ہے سبزہ ہرے بچھونے   قدرت کے بچھ رہے ہیں ہر جا ہرے بچھونے
جنگلوں میں ہو رہے ہیں پیدا ہرے بچھونے   بچھوا دیے ہیں حق نے کیا کیا ہرے بچھونے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
۱ سبزوں کی لہلہاہٹ کچھ ابر کی سیاہی   اور چھا رہی گھٹائیں سرخ اور سفید کاہی
سب بھیگتے ہیں گھر گھر لے ماہ تا بہ ماہی   یہ رنگ کون رنگے تیرے سوا الٰہی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
کیا کیا رکھے ہے یارب سامان تیری قدرت   بدلے ہے رنگ کیا کیا ہر آن تیری قدرت
سب مست ہو رہے ہیں پہچان تیری قدرت   تیتر پکارتے ہیں سبحان تیری قدرت
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
کوئل کی کوک میں بھی تیرا ہی نام ہے گا   اور مور کی زٹل میں تیرا پیام ہے گا

یہ رنگ سو مزے کا جو صبح و شام ہے گا　　یہ اور کا نہیں ہے تیرا ہی کام ہے گا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

۴ بولیں بئے بٹیریں قمری پکارے کو کو　　پی پی کرے پپیہا بگلے پکاریں تو تو
کیا ہدہدوں کی حق حق کیا فاختوں کی ہو ہو　　سب رٹ رہے ہیں تجھ کو کیا پنکھ کیا پکھیرو

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو مست ہوں اُدھر کے کر شور ناچتے ہیں　　پیارے کا نام لیکر کیا زور ناچتے ہیں
بادل ہوا سے گھر گھر گھنگھور ناچتے ہیں　　مینڈک اُچھل رہے ہیں اور مور ناچتے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

پھولوں کی سیج اوپر سوتے ہیں کتنے بن بن　　سو ہیں گلابی جوڑے پھولوں کے ہار ابرن
کتنوں کے گھر ہے کھانا سونا لگے ہے آنگن　　کونے میں پڑ رہی ہے سر مُنہ لپیٹ سوگن

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

۳ جو خوش ہیں وہ خوشی میں کاٹے ہیں رات ساری　　جو غم میں ہیں انہوں پر گزرے ہے رات بھاری
سینوں سے لگ رہی ہیں جو ہیں پیا کی پیاری　　چھاتی پھٹے ہے اُن کی جو ہیں برہ کی ماری

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

۲ جو وصل میں ہیں اُن کے جوڑے مہک رہے ہیں　　جھولوں میں جھولتی ہیں گہنے جھمک رہے ہیں
جو دکھ میں ہیں سو اُن کے سینے پھڑک رہے ہیں　　آہیں نکل رہی ہیں آنسو ٹپک رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

۵ اب برہنوں کے اوپر ہے سخت بیقراری　　ہر بوند مارتی ہے سینہ اوپر کٹاری
بدلی کی دیکھ صورت کہتی ہیں باری باری　　ہے ہے نہ لی پیا نے اب کے بھی سدھ ہماری

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جب کوئل اپنی ان کو آواز ہے سُناتی   سُنتے ہی غم کے مارے چھاتی ہے اُمڈی آتی
پی پی کی دُھن کو سُن کر بیکل ہیں کہتی جاتی   مت بول اسے پپیہے پھٹتی ہے میری چھاتی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہے جن کی سیج سونی اور خالی چار پائی   رو رو انھوں نے ہر دم یہ بات ہے سنائی
پردیسی نے ہماری اب کے بھی سُدھ بھلائی   اب کے بھی چھاونی جا پردیس ہی میں چھائی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنوں نے اپنے غم سے اب ہے یہ گت بنائی   میلے کچیلے کپڑے آنکھیں بھی ڈبڈبائی
نے گھر میں جھولا ڈالا نے اوڑھنی رنگائی   پھوٹا پڑا ہے چولھا ٹوٹی پڑی کڑھائی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

گاتی ہے گیت کوئی جھولے پہ کر کے پھیرا   مارو جی آج کیجیے یاں رین کا بسیرا
ہے خوش کوئی کسی کو ہے درد و غم نے گھیرا   مُنہ زرد بال بکھرے اور آنکھوں میں اندھیرا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اور جن کو اب مُیسر حسنوں کی ڈھیریاں ہیں   سُرخ اور سنہرے کپڑے عشرت کی گھیریاں ہیں
محبوب دلبروں کی زلفیں بکھیریاں ہیں   جگنوں چمک رہے ہیں راتیں اندھیریاں ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے تو بھنگ پی پی کپڑے بھگو رہے ہیں   باہیں گلوں میں ڈالیں جھولوں میں سو رہے ہیں ۱۴
کتنے برہ کے مارے سدھ اپنی کھو رہے ہیں   جھولے کی دیکھ صورت ہر آن رو رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بیٹھے ہیں کتنے خوش ہوا دیتے چھوا کے بنگلے — پیتے ہیں مے کے پیالے اور دیکھتے ہیں جنگلے
کتنے پھرے ہیں باہر خوباں کو لے اپنے سنگ لے — سب شاد ہو رہے ہیں عمدہ غریب کنگلے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنوں کو محلوں اندر ہے عیش کا نظارا — یا سائبان ستھرا یا بانس کا اُسارا
کرتا ہے سیر کوئی کوٹھے کا لے سہارا — مفلس بھی کر رہا ہے پولے تلے گزارا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

چھت گرنے کا کسی جا غل شور ہو رہا ہے — دیوار کا بھی دھڑکا کچھ ہوش کھو رہا ہے
در و در حویلی والا ہر آن رو رہا ہے — مفلس تو جھونپڑے میں دلشاد سو رہا ہے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

مدت سے ہو رہا ہے جن کا مکان پرانا — اٹھ کے ہے ان کو مینہ میں ہر آن چھت پہ جانا
کوئی پکارتا ہے ٹک موری کھول آنا — کوئی کہے ہے چل بھی کیوں ہو گیا دوانا ۷
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئی پکارتا ہے لو یہ مکان ٹپکا — گرتی ہے چھت کی مٹی اور سائبان ٹپکا
چھلنی ہوئی اٹاری کوٹھا ندان ٹپکا — باقی تھا اک اُسارا سو وہ بھی آن ٹپکا ۸
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اونچا مکان جس کا ہے تیج کھنا سوایا — اوپر کا کھن ٹپک کر جب پانی نیچے آیا
اس نے تو اپنے گھر میں ہے شور غل مچایا — مفلس پکارتے ہیں جانے ہمارا .....
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

سبزوں پہ بیر بہوٹی ٹیلوں اوپر بھتورے — پسو سے مچھروں سے روئے کوئی بسورے

بچھو کسی کو کاٹے کیڑا کسی کو گھورے — آنگن میں کنسلائی کونوں میں کنکھجورے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

پھنسی کسی کے تن میں سر پر کسی کے پھوڑے — چھاتی پہ گرمی دانے اور پیٹھ میں ددوڑے

کھا پوریاں کسی کو ہیں لگ رہے مروڑے — آتے ہیں دست جیسے دوڑیں عراقی گھوڑے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

پتلی جہاں کسی نے دال اور کڑھی پکائی — کھی نے وہیں بولی آ اونٹ کی بلائی

کوئی پکارتا ہے کیوں خیر تو ہے بھائی — ایسے جو کھا سنتے ہو کیا کالی مرچ کھائی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جس گلبدن کے تن میں پوشاک سوسنی ہے — سو وہ پری تو خاصی کالی گھٹا بنی ہے

اور جس پہ سرخ جوڑا یا اودی اوڑھنی ہے — اس پر تو سب گھلاوٹ برسات کی چھنی ہے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بدنوں میں کھب رہے ہیں خوبوں کے لال جوڑے — جھمکیں دکھا رہے ہیں پریوں کے لال جوڑے

لہریں بنا رہے ہیں لڑکوں کے لال جوڑے — آنکھوں میں چبھ رہے ہیں پیاروں کے لال جوڑے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اور جس صنم کے تن میں جوڑا ہے زعفرانی — گلنار یا گلابی یا زرد سرخ دھانی

کچھ حسن کی چڑھائی اور کچھ نئی جوانی — جھولوں میں جھولتی ہیں اوپر پڑے ہے پانی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئی تو جھولتی ہے جھولے کی ڈور چھوڑے — یا ساتھنوں ہی اپنی پاؤں سے پاؤں جوڑے

بادل کھڑے ہیں سر پر برسے ہیں تھوڑے تھوڑے — بوندوں سے بھیگتے ہیں لال اور گلابی جوڑے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنوں کو ہو رہی ہے اس عیش کی نشانی سوتے ہیں ساتھ جس کے کہتی ہے وہ سیانی
اس وقت تم نہ جاؤ اے میرے یار جانی دیکھو تو کس مزے سے برسے ہے آج پانی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے شراب پی کر ہو مست جھک رہے ہیں مے کی گلابی آگے پیالے چھلک رہے ہیں
ہوتا ہے ناچ گھر گھر گھنگرو جھنک رہے ہیں پڑتا ہے مینہ جھڑا جھڑ طبلے کھڑک رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہیں جن کے تن ملائم میدے کی جیسے لوئی وہ اس ہوا میں خاصی اوڑھے پھرے ہیں لوئی
اور جن کی مفلسی نے شرم و حیا ہے کھوئی ہے ان کے سر پہ سرکی یا بورئے کی کھوئی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے پھرے ہیں اوڑھے پانی میں سرخ پٹو جو دیکھ سرخ بدلی ہوتی ہے ان پہ لٹو
کتنوں کی گاڑی رتھ ہیں کتنوں کے گھوڑے ٹٹو جس پاس کچھ نہیں ہے وہ ہم سا ہے نکھٹو

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو اس ہوا میں یارو دولت میں کچھ بڑے ہیں ہے ان کے سر پہ چھتری ہاتھی اوپر چڑھے ہیں
ہم سے غریب غربا کیچڑ میں گر پڑے ہیں ہاتھوں میں جوتیاں ہیں اور پائینچے چڑھے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہے جن کنے مہیا پکا پکایا کھانا ان کو پلنگ پہ بیٹھے جھڑیوں کا حظ اڑانا
ہے جن کو اپنے گھر میں یاں نون تیل لانا ہے سر پہ ان کے پنکھا یا چھاج ہے پرانا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے خوشی سے بیٹھے کھاتے ہیں خوش محل میں | کتنے چلے ہیں لینے بنئے سے قرض بل میں
کاندھے پہ دال آٹا ہلدی گرہ لے پل میں | ہاتھوں میں گھر کی پیالی اور لکڑیاں بغل میں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو کسبیاں جوانیں حسنوں میں پرتیاں ہیں | سینوں میں لال انگیا اور لال کرتیاں ہیں
نظریں بھی بدلیاں ہیں دل میں بھی سرتیاں ہیں | اک اک نگہ میں کافر بجلی کی پھرتیاں ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو نوجواں ہیں ان کی تیاریاں بڑی ہیں | ہاتھوں میں لال چھڑیاں کوٹھوں اوپر کھڑی ہیں
اور وہ جو آشنا سے جھگڑی ہیں یا لڑی ہیں | منہ کو چھپا پلنگ پر مچلی ہوئی پڑی ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئی اپنے آشنا سے کر ناز کا جھپیٹا | کہتی ہے ہنس کے کافر چٹکی لے یا تُنہٹا
تم سے تو دل ہمارا اب ہو گیا ہے کھٹا | تم آج بھی نہ لائے رنگوا مرا ڈوپٹا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کہتی ہے کوئی مجھ کو جوڑا سوہا بنا دو | یا ناٹ بانی جوتا یا کفش سرخ لا دو
کوئی کہے ہے میری کرتی ابھی رنگا دو | یا گرم سے اندرسے ایک سیر بھر منگا دو
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو اُن سے کے مبتلا ہیں سب چیز لا رہے ہیں | کرتی بنا رہے ہیں انگیا رنگا رہے ہیں
جو جو ہیں ان کی باتیں سب کچھ اٹھا رہے ہیں | باہیں گلے میں ڈالے عشرت منا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

زردار کی تو ان میں سے بچھ رہی پلنگڑی | دلبر پری سی بیٹھی جھمکائے جوڑی بنگڑی

مفلس کو ٹوٹی پٹی یا ٹاٹ کی جھلنگڑی   رنڈی ملی تو کالی، یا گنجی، لولی، لنگڑی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو بیگمی ہیں گھر میں آرام کر رہی ہیں   پردوں میں دوستوں سے پیغام کر رہی ہیں
چتون لگاوٹوں سے سو دام کر رہی ہیں   چپکے ہی چپکے اپنا سب کام کر رہی ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کہتا ہے کوئی اپنے محبوب سیمبر سے   اس مینہ میں نہ جاؤ پیارے ہمارے بر سے
کوئی کہے ہے اپنے دلدار خوش نظر سے   ہاتھوں سے میرے جانی کھاؤ یہ دو اندر سے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کہتا ہے کوئی پیاری جو کچھ کہو سو لا دیں   زردوزی ٹاٹ بافی جوتہ کہو پنھا دیں
پیڑا جلیبی لڈو جو کھاؤ سو منگا دیں   چیرا ڈوپٹہ جامہ جیسا کہو رنگا دیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جن دلبروں کے تن پر ہیں گرمی دانے آلے   کہتے ہیں ان کو عاشق یوں پیار سے بلا لے
کیا مینہ برس رہا ہے پیارے ذرا نہا لے   چھاتی نہیں تو پیارے ٹک پیٹھ ہی ملا لے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اس رت میں ہیں جہاں تک گلزار بھیگتے ہیں   شہر و دیار کوچہ بازار بھیگتے ہیں
صحرا و جھاڑ بوٹے کہسار بھیگتے ہیں   عاشق نہا رہے ہیں دلدار بھیگتے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے تو دلبروں کی دہلی پہ بھیگتے ہیں   کتنے پری رخوں کی پولی پہ بھیگتے ہیں
اور کتنے ..... کی ڈیوڑھی پہ بھیگتے ہیں   کتنے طوائفوں کی موری پہ بھیگتے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کہتی ہے جب وہ سن کر یہ بات بھیگ احمق — ماروں گی تیرے آکر اک لات بھیگ احمق
مجھ کو بھی ضد چڑھی ہے دن رات بھیگ احمق — یونہی تو اب کے ساری برسات بھیگ احمق

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

زردار کی تو سن کر آواز وہ پری رو — کہتی ہے لونڈیوں سے جلدی کواڑ کھولو
مفلس کوئی پکارے تو اس سے کہتی ہے یہ — ہرگز کوئی نہ بولو احمق کو بھیگنے دو

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

یہ سن کے گر وہ مفلس کچھ شور و غل مچاوے — بیٹھک میں اینٹ پھینکے یا کنڈی کھڑکھڑاوے
کھڑکی میں ڈال سر کو جب نائکہ سناوے — کیا غل مچا رہا ہے سن پیچھے مال زادے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئی یار سے کہے ہے اے دلستان آؤ — بدلی بڑی اٹھی ہے، کہنے کو مان آؤ
کیا مینہ برس رہا ہے ہر اک مکان آؤ — راتیں اندھیریاں ہیں اے میری جان آؤ

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئی رات کو پکارے پیارے میں بھیگتی ہوں — کیا تیری الفتوں کے مارے میں بھیگتی ہوں
آئی ہوں تیری خاطر آرے میں بھیگتی ہوں — کچھ تو ترس تو میرا کھا رے میں بھیگتی ہوں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئی پکارتی ہے دل سخت بھیگتی ہوں — کانپے ہے میری چھاتی یک لخت بھیگتی ہوں
کپڑے بھی تر بتر ہیں اور سخت بھیگتی ہوں — جلدی بلالے مجھ کو کم بخت، بھیگتی ہوں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

شیشہ کہیں گلابی بوتل جھمک رہی ہے　　رابیل موتیا کی خوشبو مہک رہی ہے
چھاتی سے چھاتی لگ کر عشرت چھلک رہی ہے　　پائے کھٹک رہے ہیں پٹی چٹک رہی ہے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئی پکارتی ہے کیا کیا سب مجھے بھگویا　　کوئی پکارتی ہے کیسا مجھے بھگویا
ناحق قرار کر کے جھوٹا مجھے بھگویا　　یوں دور سے بلا کر اچھا مجھے بھگویا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جن دلبروں کی خاطر بھیگے ہیں جن کے جوڑے　　وہ دیکھ ان کی الفت ہوتے ہیں تھوڑے تھوڑے
لے ان کے بھیگے کپڑے ہاتھوں میں ہر نچوڑے　　چیرا کوئی سکھاوے جامہ کوئی نچوڑے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کیچڑ سے ہو رہی ہے جس جا زمیں پھسلنی　　مشکل ہوئی ہے واں سے ہر اک کو راہ چلنی
پھسلا جو پاؤں پگڑی مشکل ہے پھر سنبھلنی　　جوتی گری تو واں سے کیا تاب پھر نکلنی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے تو کیچڑوں کی دلدل میں پھنس رہے ہیں　　کپڑے تمام گندی دلدل میں بس رہے ہیں
کتنے اٹھے ہیں مر مر کتنے اکس رہے ہیں　　وہ دکھ میں پھنس رہے ہیں اور لوگ ہنس رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کہتا ہے کوئی گر کر یہ اے خدا سے لیجو　　کوئی ڈگمگا کے ہر دم کہتا ہے وائے لیجو
کوئی ہاتھ اٹھا پکارے مجھ کو بھی ہائے لیجو　　کوئی شور کر پکارے گرنے نہ پائے لیجو

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اکثر جو مرد عورت پھسلے ہیں ناگہانی　　تو ان کی یہ ہوئی ہے گرنے کی واں نشانی

یا اس کا ہاتھ اُن کے پاجامے کی میانی — یا ان کا منہ ہوا ہے اور اس کی وہ میانی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

گر کر کسی کے کپڑے دلدل میں ہیں معطر — پھسلا کوئی کسی کا کیچڑ میں مُنہ گیا بھر
اک دو نہیں پھسلتے کچھ اس میں آن اکثر — ہوتے ہیں سینکڑوں کے سر نیچے پاؤں اوپر
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

یہ رت وہ ہے کہ جس میں خورد و کبیر خوش ہیں — ادنیٰ غریب مفلس شاہ و وزیر خوش ہیں
معشوق شاد و خرم عاشق اسیر خوش ہیں — جتنے ہیں اب جہاں میں سب اے نظیرؔ خوش ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بنجارہ نامہ (۳)

B.A.(H) III Sem.
UR-12

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا — قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گونیں پلا سر بھارا — کیا گیہوں چانول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں کیا انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

گر تو ہے لکھی بنجارہ اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے — اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا اک اور بڑا بیوپاری ہے
کیا شکر، مصری، قند، گری، کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے — کیا داکھ، منقا، سونٹھ، مرچ، کیا کیسر لونگ سپاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

تو بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھم جاوے گا — یا سود بڑھا کر لاوے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا — دھن، دولت، ناتی، پوتا کیا اک کنبہ کام نہ آوے گا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر منزل میں اب ساتھ ترے یہ جتنا ڈیرا ڈانڈا ہے زر دام درم کا بھانڈا ہے بندوق سپر اور کھانڈا ہے
جب نایک تن کا نکل گیا جو ملکوں ملکوں ہانڈا ہے پھر ہانڈا ہے نہ بھانڈا ہے نہ حلوا ہے نہ مانڈا ہے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری ڈھل جاوے گی اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے پاوے گی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاوے گی دھی پوت جنوائی بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آوے گی

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ کھیپ بھرے جو جاتا ہے یہ کھیپ میاں مت گن اپنی اب کوئی گھڑی پل ساعت میں یہ کھیپ بدن کی ہے کفنی
کیا تھال کٹورے چاندی کے کیا پیتل کی ڈبیا ڈھکنی کیا برتن سونے روپے کے کیا مٹی کی ہنڈیا چپنی

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ دھوم دھڑکا ساتھ لیے کیوں پھرتا ہے جنگل جنگل اک تنکا ساتھ نہ جاوے گا موقوف ہوا جب ان اور جل
گھر بار اٹاری چوپاری کیا خاصہ نن سکھ اور ململ کیا چلمن پردے فرش نئے کیا لال پلنگ اور رنگ محل

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کچھ کام نہ آوے گا تیرے یہ لعل زمرد سیم و زر جب پونجی باٹ میں بکھرے گی پھر آن بنے گی جان اوپر
نوبت نقارے بان نشان دولت حشمت فوجیں لشکر کیا مسند تکیہ ملک مکاں کیا چوکی کرسی تخت چھپر

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کیوں جی پر بوجھ اٹھاتا ہے ان گونوں بھاری بھاری کے جب موت لٹیرا آن پڑا پھر دونے ہیں بیوپاری کے
کیا ساز جڑاؤ زر زیور کیا گوٹے تھان کناری کے کیا گھوڑے زین سنہری کے کیا ہاتھی لال عماری کے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

مغرور نہ ہو تلواروں پر مت پھول بھروسے ڈھالوں کے ۔۔۔ سب پٹا توڑ کے بھاگیں گے مُنہ دیکھ اجل کے بھالوں کے
کیا ڈبے موتی ہیروں کے کیا ڈھیر خزانے مالوں کے ۔۔۔ کیا بُقچے تاش تمامی کے کیا تختے شال دوشالوں کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کیا سخت مکان بنواتا ہے کھم تیرے تن کا ہے پولا ۔۔۔ تو اونچے کوٹ اُٹھاتا ہے واں گور گڑھے نے مُنہ کھولا
کیا رینی خندق رند بڑے کیا بُرج کنگورا انمولا ۔۔۔ گڑھ کوٹ رہکلہ توپ قلعہ کیا شیشہ دارو اور گولا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر آن نفع اور ٹوٹے میں کیوں مرتا پھرتا ہے بن بن ۔۔۔ ٹک غافل دل میں سوچ ذرا ہے ساتھ لگا تیرے دشمن
کیا لونڈی باندی دائی دوا کیا بندا چیلا نیک چلن ۔۔۔ کیا مندر مسجد تال کنواں کیا کھیتی باڑی پھول چمن
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب مرگ پھرا کر چابک کو یہ بیل بدن کا ہانکے گا ۔۔۔ کوئی ناج سمیٹے گا تیرا کوئی گون سیے اور ٹانکے گا
ہو ڈھیر اکیلا جنگل میں تو خاک لحد کی پھانکے گا ۔۔۔ اس جنگل میں پھر آہ نظیر اک بھنگا آن نہ جھانکے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۴) عاشق نامہ

تنہا نہ اُسے اپنے دلِ تنگ میں پہچان ۔۔۔ ہر باغ میں ہر دشت میں ہر سنگ میں پہچان
بے رنگ میں با رنگ میں نیرنگ میں پہچان ۔۔۔ منزل میں مقامات میں فرسنگ میں پہچان
نت روم میں اور ہند میں اور زنگ میں پہچان ۔۔۔ ہر راہ میں ہر ساتھ میں ہر سنگ میں پہچان
ہر عزم ارادے میں ہر آہنگ میں پہچان ۔۔۔ ہر دھوم میں ہر صلح میں ہر جنگ میں پہچان

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اِک رنگ میں پہچان

پھل پات کہیں شاخ کہیں پھول کہیں بیل　　نرگس کہیں سوسن کہیں بیلا کہیں رابیل
آزاد کوئی سب سے کسی کا ہے کہیں میل　　ملتا ہے کوئی راکھ، چنبیلی کا کوئی تیل
کرتا ہے کوئی ظلم کو لیتا ہے کوئی جھیل　　باندھے کہیں تلوار اُٹھاتا ہے کہیں سیل
ادنیٰ کوئی اعلیٰ کوئی سوکھا کوئی ڈنڈ پیل　　جب غور سے دیکھا تو اُسی کے ہیں یہ سب کھیل

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اِک رنگ میں پہچان

گاتا ہے کوئی شوق میں کرتا ہے کوئی حال　　پھانکے ہے کوئی خاک اُڑاتا ہے کوئی مال
ہنستا ہے کوئی شاد کسی کا ہے بُرا حال　　روتا ہے کوئی ہو کے غم و درد میں پامال
ناچے ہے کوئی شوخ بجاتا ہے کوئی تال　　پہنے ہے کوئی چیتھڑے اوڑھے ہے کوئی شال
کرتا ہے کوئی ناز دکھاتا ہے کوئی بال　　جب غور سے دیکھا تو اُسی کی ہے یہ سب چال

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اِک رنگ میں پہچان

جاتا ہے حرم میں کوئی قرآن بغل مار　　کہتا ہے کوئی دیر میں پوتھی کے سماچار
پہنچا ہے کوئی پار بھٹکتا ہے کوئی وار　　بیٹھا ہے کوئی عیش میں پھرتا ہے کوئی خوار
عاجز کوئی بیکس کوئی ظالم کوئی لٹھ مار　　مفلس، کوئی ناچار، تونگر، کوئی زردار
زخمی، کوئی ماندہ، کوئی اچھا، کوئی بدکار　　جب غور سے دیکھا تو اُسی کے ہیں سب اسرار

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان

عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

ہے کوئی ولی دوست کوئی جان کا دشمن — بیٹھا ہے پہاڑوں میں کوئی پھرتا ہے بن بن
مالا کوئی جپتا ہے کوئی شوق میں سُمرن — چھوڑے ہے کوئی مال سمیٹے ہے کوئی دھن
نکلے ہے جو اہر کی کوئی پہن کے ابرن — لوٹے ہے کوئی خاک میں رو رو کے مِلا تن
جوگی کوئی بھوگی کوئی سوگی کوئی سوگن — جب غور سے دیکھا تو اُسی کے ہیں یہ سب فن

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

سردی کہیں گرمی کہیں جاڑا کہیں برسات — دوزخ کہیں بیکنٹھ کہیں ارض و سماوات
حوریں کہیں غلماں کہیں پریاں کہیں جنات — اوجھڑ کہیں بستی کہیں جنگل کہیں دیوات
سختی کہیں راحت کہیں گردش کہیں سکنات — شادی کہیں ماتم کہیں نور اور کہیں ظلمات
تارے کہیں سورج کہیں بُرج اور کہیں دن رات — جب غور سے دیکھا تو اُسی کے ہیں طلسمات

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

بیچے ہے جواہر کوئی زر سیم طلا رانگ — مارے ہے کوئی پارے کو بناوے کوئی مرگانگ
دیتا ہے کوئی ہاتھ سے لیتا ہے کوئی مانگ — محتاج کوئی قوت کا رکھتا ہے کوئی دانگ
ٹھیرا ہے کوئی چور لگاتا ہے کوئی تھانگ — ملتا ہے کوئی پوست کو چھانے ہے کوئی بھانگ
گھنٹا ہے کہیں جھانجھ کہیں سنکھ کہیں بانگ — جب غور سے دیکھا تو اُسی کے ہیں یہ سب سوانگ

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

ناری کوئی بادی کوئی خاکی کوئی آبی　　صوفی کوئی زاہد کوئی بدمست شرابی
باتیں کوئی بیٹھا ہوا کرتا ہے کتابی　　پیتا ہے کوئی کیف کوئی مے کی گلابی
مارے ہے زٹل کوئی کہیں جیب ہے دابی　　سچا کوئی جھوٹا ہے کوئی رند خرابی
کالا کوئی گورا کوئی پیلا کوئی آبی　　ہیں اس کی ہی قدرت کے یہ سب لعل گلابی

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

کیا حسن کہیں پایا ہے اللہ ہی اللہ　　کیا عشق کہیں چھپایا ہے اللہ ہی اللہ
کیا رنگ یہ رنگوایا ہے اللہ ہی اللہ　　کیا نور یہ جھمکایا ہے اللہ ہی اللہ
کیا دھوپ ہے کیا سایہ ہے اللہ ہی اللہ　　کیا مہر ہے کیا مایا ہے اللہ ہی اللہ
کیا ٹھاٹھ یہ ٹھہرایا ہے اللہ ہی اللہ　　کیا بھید نظیر آیا ہے اللہ ہی اللہ

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

۵ آدمی نامہ

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی　　اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی　　نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ابدال و قطب و غوث و ولی آدمی ہوئے　　منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے

کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے کئے   حتیٰ کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا   شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا   یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور   یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور   شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں   بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قراں اور نمازیاں   اور آدمی ہی اُن کی چراتے ہیں جوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی   اور آدمی ہی تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اُتارے ہے آدمی   چلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سُن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ناچے ہے آدمی ہی، بجا تالیوں کو یار   اور آدمی ہی ڈالے ہے اپنی ازار اُتار
ننگا کھڑا اُچھلتا ہے ہو کر ذلیل و خوار   سب آدمی ہی ہنستے ہیں دیکھ اس کو بار بار
اور وہ جو مسخرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہو لے کے مال   اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی صید ہے اور آدمی ہی جال   سچا بھی آدمی ہی نکلتا ہے میرے لال

اور جھوٹ کا بھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی شادی ہے اور آدمی بیاہ — قاضی وکیل آدمی اور آدمی گواہ
تاشے بجاتے آدمی چلتے ہیں خواہ مخواہ — دوڑے ہیں آدمی ہی مشعالیں جلا کے واہ
اور بیاہنے چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی نقیب ہو بولے ہے بار بار — اور آدمی ہی پیادے ہیں اور آدمی سوار
حقہ صراحی جوتیاں، دوڑیں بغل میں مار — کاندھے پہ رکھ کے پالکی ہیں آدمی کہار
اور اس پہ جو چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں لگا لگا — اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا
کہتا ہے کوئی لو کوئی کہتا ہے لا رے لا — کس کس طرح سے بیچے ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی قہر سے لڑتے ہیں گھور گھور — اور آدمی ہی دیکھ انہیں بھاگتے ہیں دور
چاکر غلام آدمی اور آدمی مزدور — یاں تک کہ آدمی ہی اُٹھاتے ہیں جا ضرور
اور جس نے وہ پھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

طبلے مجیرے دائرے سارنگیاں بجا — گاتے ہیں آدمی ہی ہر اک طرح جا بہ جا
رنڈی بھی آدمی ہی نچاتے ہیں گت لگا — وہ آدمی ہی ناچیں ہیں اور دیکھو یہ مزا
جو ناچ دیکھتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی لعل جواہر ہیں بے بہا — اور آدمی ہی خاک سے بدتر ہے ہو گیا
کالا بھی آدمی ہے کہ اُلٹا ہے جوں توا — گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا سا چاند کا
بدشکل و بدنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اِک آدمی ہیں جن کی یہ کچھ زرق برق ہیں — روپے کے اُن کے پاؤں ہیں سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں — کمخواب تاش شال دوشالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اک ایسے ہیں کہ جن کے بچھے ہیں سنہرے پلنگ — پھولوں کی سیج ان پہ جھمکتی ہے تازہ رنگ
سوتے ہیں لپٹے چھاتی سے معشوق شوخ و شنگ — سو سو طرح سے عیش کے کرتے ہیں رنگ ڈھنگ
اور خاک میں پڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

حیران ہوں یارو دیکھو تو کیا یہ سوانگ ہے — آپ آدمی ہی چور ہے اور آپ تھانگ ہے
ہے چھینا جھپٹی اور کہیں مانگ تانگ ہے — دیکھا تو آدمی ہی یہاں مثل رانگ ہے
فولاد سے گڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار — نہلا دُھلا اُٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زار زار — سب آدمی ہی کرتے ہیں مردے کا کاروبار
اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر — ہیں آدمی ہی صاحب عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مُرید ہیں اور آدمی ہی پیر — اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو بُرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ہنس نامہ (۶)

دنیا کی جو الفت کا ہوا مجھ کو سہارا — اور اس نے خوشی کو مری خاطر میں اتارا

دیکھی جو یہ غفلت تو مرا دل یہ پکارا — آیا تھا کسی شہر سے اک ہنس بچارا
اک پیڑ پہ جنگل کے ہوا اس کا گزارا

چنڈول اگن ابلقے جھپیاں بستے ڈھیر — مینا و بئے ککلے بگلے بھی سمنبر
طوطے بھی کئی طور کے لٹیاں کوئی لہبر — رہتے تھے بہت جانور اس پیڑ کے اوپر
اس نے بھی کسی شاخ پہ گھر اپنا سنوارا

بلبل نے کیا اس کی محبت میں خوش آہنگ — اور کوکلے کویل نے بھی الفت کو لیا سنگ
کھنجن ہیں گلنکوں میں بھی چاہت کے بجے چنگ — دیکھا جو طیوروں نے اسے حسن میں خوش رنگ
وہ ہنس لگا سب کی نگاہوں میں پیارا

سیمرغ بھی سو دل سے ہوئے ملنے کے شائق — گدھ پنکھ بھی پنکھوں کے ہوئے جھلنے کے لائق
سارس بھی حواصل بھی ہوئے اس کے موافق — باز و لگڑ و جرہ و شاہیں ہوئے عاشق
شکروں نے بھی شکر سے کیا اس کا مدارا

کچھ سبزک و پڑنگے، وکچھ منٹن و بزے — پنڈخی سے لگا لوٹڑ و قمری و ہرلوے
غوغائی بگیری و لٹورے و پپیہے — کچھ لال چڑے پودنے پدے ہی نہ غش تھے
پدڑی بھی سمجھتی تھی اسے آنکھ کا تارا

چاہت کے گرفتار بٹیریں ہوئے تیتر — کبکوں کے تدروں کے بھی چاہت میں بندھے پر
ہدہد بھی ہوئے ہٹ کے بڑھیا ادھر ادھر — زاغ و زغن و طوطی و طاؤس کبوتر
سب کرنے لگے اس کی محبت کا اشارا

شکل اس کی وہیں جی میں کھبی شام چڑھی کے — دی بیاہ جتا پھر انھیں جھانپو نے بھی چھپا سے
ہرل بھی ہوئے اس کی ہری چاہنے والے — جتنے غرض اس پیڑ پہ رہتے تھے پرندے

اس ہنس پہ اُن سب نے دل و جان کو وارا

خواہش یہ ہوئی سب کی کہ ہر دم اُسے دیکھیں — اور اس کی محبت سے ذرا منہ کو نہ پھیریں
دن رات اسے خوش رکھیں نت سکھ اسے دیویں — صحبت جو ہوئی ہنس کی اُن جانوروں میں
یک چند رہا خوب محبت کا گزارا

سب ہو کے خوش اس کی مئے الفت لگے پینے — اور ہیت سے ہر ایک نے واں بھر لئے سینے
ہر آن جتانے لگے چاہت کے قرینے — اس ہنس کو جب ہو گئے دو چار مہینے
اک روز وہ یاروں کی طرف دیکھ پکارا

یاں لطف و کرم تم نے کئے ہم پہ ہیں جو جو — تم سب کی یہ خوبی ہے کہاں ہم سے بیاں ہو
تقصیر کوئی ہم سے ہوئی ہو وے تو بخشو — لو یارو اب ہم جاویں گے کل اپنے وطن کو
اب تم کو مبارک رہے یہ پیڑ تمہارا

اب تک تو بہت ہم رہے فرحت سے ہم آغوش — اب یاد وطن دل کی ہمارے سے ہوئی ہمدوش
جب حرف جدائی کا پرندوں نے کیا گوش — اس بات کے سنتے ہی جو ہر اک کے اُڑے ہوش
سب بولے یہ فرقت تو نہیں ہم کو گوارا

بن دیکھے تمہارے ہمیں کب چین پڑیں گے — اک آن نہ دیکھیں گے تو دل غم سے بھریں گے
گر تم نے یہ ٹھیرائی تو کیا سکھ سے رہیں گے — ہم جتنے ہیں سب ساتھ تمہارے ہی چلیں گے
یہ درد تو اب ہم سے نہ جاوے گا سہارا

پھر ہنس نے یہ بات کہی ان سے کئی بار — کچھ بس نہیں اب چلنے کی ساعت سے ہیں ناچار
آنکھیں ہوئیں اشکوں سے پرندوں کی گہربار — اس میں جو شب کو تھی کی ہوئی صبح نمودار
پر اپنا ہوا پر وہیں اس ہنس نے مارا

وہ ہنس جب اس پیڑ سے واں کو چلا ناگاہ　　منہ پھیر کے ادھر سے وطن کی جو ہیں لی راہ
دیکھا جو اسے جاتے ہوئے واں سے تو کر آہ　　سب ساتھ چلے اس کے وہ ہمراز ہواخواہ
ہر ایک نے اڑنے کے لئے پنکھ پسارا

اور ہنس کی واں سب کو رفاقت ہوئی غالب　　جب واں سے چلا وہ تو ہوئی بے لبسی غالب
کلفت تھی جو فرقت کی وہ سب پر ہوئی غالب　　دو کوس اڑے تھے جو ہوئی ماندگی غالب
پھر پر میں کسی کے نہ رہا قوت و یارا

پر اُن کے ہوئے تر جو ہیں دوری کی پڑی اوس　　روئے کہ رفاقت کی کریں کیونکہ قدم بوس
تھک تھک کے لگے گرنے تو کرنے لگے افسوس　　کوئی تین کوئی چار کوئی پانچ اڑا کوس
کوئی آٹھ کوئی نو کوئی دس کوس میں ہارا

کچھ بن نہ سکے اُن سے رفیقی کے جو واں کار　　اور اتنے اڑے ساتھ کہ کچھ ہووے نہ اظہار
جب دیکھی وہ مشکل تو پھر آخر کے تئیں ہار　　کوئی یاں رہا کوئی واں رہا کوئی ہو گیا ناچار
کوئی اور اُڑا آگے جو تھا سب میں کرارا

تھی اس کی محبت کی جو ہر ایک نے پی مے　　سمجھے تھے بہت دل میں وہ الفت کو بڑی شے
جب ہو گئے بے بس تو پھر آخر یہ ہوئی رے　　چیلیں رہیں کوے گرے اور باز بھی تھک کے
اس پہلی ہی منزل میں کیا سب نے کنارا

دنیا کی جو الفت ہے تو اُس کی ہے یہ کچھ راہ　　جب شکل یہ ہووے تو بھلا کیونکہ ہو نرباہ
ناچاری ہو جس جائیں تو واں کیجئے کیا چاہ　　سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیر آہ
آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

(۷) روضۂ تاج گنج

یارو یہ تاج گنج جو یاں آشکار ہے — مشہور اس کا نام بہ شہر و دیار ہے
خوبی میں سب طرح کا اسے اعتبار ہے — روضہ جو اس مکان میں دریا کنار ہے
نقشہ میں اپنے یہ بھی عجب خوش نگار ہے

روئے زمیں پہ یوں تو مکاں خوب ہیں میاں — پر اس مکاں کی خوبیاں کیا کیا کروں بیاں
سنگِ سفید سے جو بنا ہے قمر نشاں — ایسا چمک رہا ہے تجلی سے یہ مکاں
جس سے بلور کی بھی چمک شرمسار ہے

گنبد ہے اس کا زور بلندی سے بہرہ مند — گرد اس کے گمزیاں بھی چمکتی ہوئی ہیں چند
اور وہ کلس جو ہے سر گنبد سے سر بلند — ایسا ہلال اس پہ سنہرا ہے دل پسند
ہر ماہ جس کے خم پہ مہ نو نثار ہے

گنبد کے نیچے اور مکاں ہیں جو آس پاس — وہ بھی برنگ سیم چمکتے ہیں خوش اساس
برسوں تک اس میں رہیے تو ہووے نہ جی اداس — آتی ہے ہر طرف سے گل یاسمن کی باس
ہوتا ہے شاد اس میں جو کرتا گزار ہے

ہیں بیچ میں مکان کے وہ دو مرقدیں جو یاں — گرد اُن کے جالی اور مُحجر سے ہے درفشاں
سنگین گل جو اس میں بنائے ہیں تہ نشاں — پتے کلی سہاگ، رگ و رنگ ہے عیاں
جو نقش اس میں ہے وہ جواہر نگار ہے

دیواروں پہ ہیں سنگ میں نازک عجب نگار — آئینے بھی لگے ہیں مجلّی و تابدار

دروازے پر لکھا خطِ طغرا ہے طرفہ کار — ہر گوشے پر کھڑے ہیں جو مینار اس کے چار
چاروں سے طرفہ اوج کی خوبی دوچار ہے

پہلو میں ایک برج بسی کہتے ہیں اُسے — آتے نظر ہیں اُس سے مکاں دور دور کے
مسجد ہے ایسی جس کی صفت کس سے ہو سکے — پھر اور بھی مکان ہیں ادھر اور اُدھر کھڑے
دروازۂ کلاں بھی بلند استوار ہے

جو صحن باغ کا ہے وہ ایسا ہے دلکشا — آتی ہے جس میں گلشنِ فردوس کی ہوا
ہر سو نسیم چلتی ہے اور ہر طرف ہوا — ہلتی ہیں ڈالیاں سبھی، ہر گل ہے جھومتا
کیا کیا روِش روِش پہ ہجومِ بہار ہے

سرو سہی کھڑے ہیں قرینے سے نسترن — کوکو کریں ہیں قمریاں ہو کر شکر شکن
رابیل سیوتی سے بھرے ہیں چمن چمن — گلنار لالہ و گل و نسرین و نسترن
فوّارے چھوٹ رہے ہیں رواں جوئبار ہے

وہ تاجدارِ شاہجہاں صاحبِ سریر — بنوایا ہے انھوں نے لگا سیم و زر کثیر
جو دیکھتا ہے اس کے یہ ہوتا ہے دلپذیر — تعریف اس مکان کی میں کیا کیا کروں نظیرؔ
اس کی صفت تو مشتہرِ روزگار ہے

(۸) تندرستی نامہ

ہیں مرد اب وہی کہ جنھوں کا ہے فن درست — حرمت انھوں کے واسطے جن کا چلن درست
رہتا نہیں کسی کا سدا مال دھن درست — دولت رہی کسی کی نہ باغ و چمن درست

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

دنیا میں اب انھوں کے تئیں کہیئے بادشاہ   جن کے بدن درست ہیں دن رات سال و ماہ
جس پاس تندرستی و حرمت کی ہو سپاہ   ایسی پھر اور کون سی دولت ہے واہ واہ
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

جو گھر میں اپنے میری حشمت پناہی ہے   بن تندرستی سب وہ خرابی تباہی ہے
یہ تندرستی یارو بڑی بادشاہی ہے   سچ پوچھئے تو عین یہ فضل الٰہی ہے
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

گر دولتوں سے اس کا بھرا ہے تمام گھر   بیمار ہے تو خاک سے بدتر ہے سب وہ زر
ہو تندرست گرچہ یہ مفلس ہے سر بسر   پھر نے کسی کا خوف نہ ہرگز کسی کا ڈر
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

عاجز ہو یا حقیر ہو پر تندرست ہو   بے زر ہو یا امیر ہو پر تندرست ہو
قیدی ہو یا اسیر ہو پر تندرست ہو   مفلس ہو یا فقیر ہو پر تندرست ہو
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

اس میں تمام ختم ہیں عالم کی خوبیاں   ہو تندرستی اور ملے حرمت سے آب و ناں

قسمت سے جب یہ دونوں میسر ہوں پھر تو ہاں — پھر ایسی اور کونسی نعمت ہے میری جاں

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

پرواہ نہیں اگرچہ لکھا یا پڑھا نہ ہو — محتاج حق سوا یہ کسی اور کا نہ ہو
حسن و جمال و علم و ہنر گو ملا نہ ہو — اک تندرستی چاہیئے کچھ ہووے یا نہ ہو

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

بیمار گرچہ لاکھ طرح سے ہو بادشاہ — تو اس کو جانیئے یہ گدا سے بھی ہے تباہ
ہم تو اُسی کو شاہ کہیں اور جہاں پناہ — اب جس کا تن درست ہو حرمت سے ہو نباہ

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

ہوں گرچہ لاکھ دولتیں بیمار کے کنے — اور نعمتوں کے ڈھیر لگے ہوں بنے ٹھنے
بہتر ہیں مفلسی کے میاں چابنے چنے — جو تندرست ہیں وہی دولھا ہیں اور بنے

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

جب تندرستیوں کی رہیں دل میں بستیاں — پھر سو طرح کے عیش ہیں اور مے پرستیاں
کھانے کو نعمتیں ہوں کہ ہوں فاقہ مستیاں — سب عیش اور مزے ہیں جو ہوں تندرستیاں

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

چاہا جو دل نشہ کو تو وُوہیں منگا لیا   محبوب دلبروں کو گلے سے لگا لیا
آیا جو عیش دل میں خوشی سے اڑا لیا   جو مل گیا سو پی لیا چاہا سو کھا لیا
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

آیا جو دل میں سیر چمن کو سپ چلے گئے   بازار چوک سیر تماشے میں خوش ہوئے
بیٹھے اُٹھے خوشی سے ہر اک جا پہ چلے پھرے   جاگے مزے میں رات کو یا خوش ہو سو رہے
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

قدرت سے یہ جو تن کی بنی ہے ہر ایک کل   جب تک یہ کل بنی ہے جبھی تک پڑے ہے کل
گر ہو خدا نخواستہ ایک کل بھی چل بہ چل   پھر نے خوشی نہ عیش نہ کچھ زندگی کا پھل
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

ادنیٰ ہو یا غریب تونگر ہو یا فقیر   یا بادشاہ شہر کا یا ملک کا وزیر
ہے سب کو تندرستی و حرمت ہی دلپذیر   جو تو نے اب کہا سو یہی سچ ہے اے نظیر
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

(۹) چڑیوں کی تسبیح

وقت سحر کی روحیں کیا کیا ہوں ہوں ہوں ہوں کرتی ہیں　　ہوں ہوں ہوں ہوں کر کر ذکر کن اور فیکوں کرتی ہیں
مرغے بولے ککڑوں کوں اور مرغیاں کوں کوں کرتی ہیں　　طوطیاں بھی سب یاد میں اُس کی بھتوں بھتوں کرتی ہیں

ساںجھ سویرے چڑیاں مل کر چونچوں چونچوں کرتی ہیں
چونچوں چونچوں چونچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

پنکھ بڑھا گر بنگھ اسی کے غم کی تپ میں تپتے ہیں　　عنقا اور سیمرغ اسی کی فرقت بیچ تڑپتے ہیں
سارس، گدھ، حواصل، بٹیرے، بگلے، پنکھ کلپتے ہیں　　پنکھ پکھیرو جتنے ہیں سب نام اسی کا جپتے ہیں

ساںجھ سویرے چڑیاں مل کر چونچوں چونچوں کرتی ہیں
چونچوں، چونچوں، چونچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

قمری بولے حق سرّہ بلبل بولے بسم اللہ　　کبک، ٹٹیری، چاروں قل اور تیتر بھی سبحان اللہ
دادر، مور، پپیہے، کویل، کوک رہے اللہ اللہ　　فاختہ کوکو، تیہو ہو ہو، طوطے بولیں حق اللہ

ساںجھ سویرے چڑیاں مل کر چونچوں چونچوں کرتی ہیں
چونچوں، چونچوں، چونچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

شکرا چیخ اور لگھڑ، باشے اور ترمتی باز کوئی　　کونج، کبوتر، سبزک، جھانیو، کلکل، سارو، مارچوئی
لعل پڑھے ہے صُمٌ بکم، جب پہنے پوشاک سوئی　　بدڑی، بدی، پودنے، شکر خورے، بولیں تو تی تو تی

ساںجھ سویرے چڑیاں مل کر چونچوں چونچوں کرتی ہیں
چونچوں، چونچوں، چونچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

چیل کہے السجل سکہے ہے چلوں چلوں مت جان میاں — کوّے قاں قاں کرتے ہیں الاآن کما کان میاں
مرمر بولے مرغابی کلّ من علیہا فان میاں — جتنے پنکھ پکھیرو ہیں سب پڑھتے ہیں قرآن میاں

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چونچوں چونچوں کرتی ہیں
چونچوں چونچوں چونچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

ہنس ہما سرخاب تدروین بولیں یا رحمان میاں — سارو ہریل اور لٹورسے دھیڑ یا حنان میاں
ققنس، تیتر، چکوہ، چکوی، بولیں یا منان میاں — ہدہد بولیں احد احد کچھ تو بھی تو کر دھیان میاں

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چونچوں چونچوں کرتی ہیں
چونچوں چونچوں چونچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

بوم چنڈ اور سبزک ابابیل اور چکوریں شام چڑی — کھنجن چھتیاں لوسے کلنگ اور غوغائی کی دھوم پڑی
تتلی ٹڈی ڈانس بھنبھیری کتری بھونری اور بڑی — مکھی جھینگر بسو بھنگے بول رہے سب گھڑی گھڑی

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چونچوں چونچوں کرتی ہیں
چونچوں چونچوں چونچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

تن تن اور بلم ڈھیک مولا حق حق تار پروتے ہیں — اگن سبے چنڈول ابلقے یاد میں اس کی روتے ہیں
طائر تو سب تخم محبت اس کا دل میں بوتے ہیں — پنچھی اس کی یاد کریں ہم پاؤں پسارے سوتے ہیں

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چونچوں چونچوں کرتی ہیں
چونچوں چونچوں چونچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

کس کس کا لوں نام غرض ہیں جتنے طائر خورد و کبیر — کوئی کہے یا حیّ توانا کوئی کہے یا رب قدیر
پنکھی تو سب یاد کریں اور ہم غفلت میں رہیں اسیر — ہم سا غافل دنیا میں اب کوئی نہ ہوگا آہ نظیر

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چونچوں چونچوں کرتی ہیں

چوں چوں چوں چوں چوں کیا سب بچوں بچوں کرتی ہیں

(۱۰) فنا نامہ

گر شاہ سر پر رکھکر افسر ہوا تو پھر کیا ... اور بحر سلطنت کا گوہر ہوا تو پھر کیا
ماہی علم مراتب پُر زر ہوا تو پھر کیا ... نوبت نشان نقارہ در پر ہوا تو پھر کیا
سب ملک سب جہاں کا سرور ہوا تو پھر کیا

یا رکھ کے فوج و لشکر کی سلطنت پناہی ... پھیری دُہائی اپنی لے ماہ تا بہ ماہی
جب آن کر فنا کی سر پر پڑی تباہی ... پھر سر رہا نہ لشکر نے تاج بادشاہی
دارا و جم سکندر اکبر ہوا تو پھر کیا

یا ذات میں کہائے نامی اصیل ذاتی ... جمشید فر کے پوتے نوشیرواں کے ناتی
تھے آپ مثل دولھا اور فوج تھی براتی ... جب چل بسے تو کوئی پھر سنگ تھا نہ ساتی
ملک و مکاں خزانہ لشکر ہوا تو پھر کیا

یا راجہ بنسی ہو کر دنیا میں راج پایا ... چھوڑ گڈھ ستارا کا لنجر آ بنایا
جب توپ نے اجل کی آ مورچہ لگایا ... سب اُڑ گئے ہوا پر کوئی نہ کام آیا
گڈھ کوٹ توپ گولہ ستگر ہوا تو پھر کیا

کتنے دنوں یہ غل تھا نواب ہیں یہ خاں ہیں ... یہ ابن پنجہزاری یہ عالی خانداں ہیں
جاگیر و مال و منصب سب کچھ ان کے ہاں ہیں ... دیکھا تو اک گھڑی میں نے نام نے نشاں ہیں
دو دن کا شور چرچا گھر گھر ہوا تو پھر کیا

کہتا تھا کوئی دیکھو یہ ہیں امیر خاں جی　　اور یہ ہیں خانخاناں اور یہ شمشیر خاں جی
پنجہ اُٹھا قضا کا جب آئے شیر خاں جی　　پھر کس کے میر خاں جی کس کے وزیر خاں جی
عمدہ غنی تونگر بازر ہوا تو پھر کیا

کہتا تھا کوئی گھوڑا ہے نامدار خاں کا　　یہ پالکی یہ ہاتھی ہے ذوالفقار خاں کا
آیا قدم اجل کے جب تیس مار خاں کا　　خر بھی کہیں نہ دیکھا پھر شہسوار خاں کا
چھپاں میگ ڈنبر در پہ ہوا تو پھر کیا

کہتا تھا کوئی یہ ڈیوڑھی ہے خاں مہرباں کی　　یہ باغ یہ حویلی ہے محلدار خاں کی
جب راج نے قضا کے کرنی بسولی ٹانگی　　اک اینٹ بھی نہ پائی ہرگز کسی مکاں کی
رنگیں محل سنہرا گھر در ہوا تو پھر کیا

کتنوں نے بادشاہی کیا کیا خطاب پایا　　مہریں بڑی کھدائیں سکہ بڑا بنایا
جب آن کر فنا نے نام و نشاں مٹایا　　وہ نام اور وہ سکہ ڈھونڈھا کہیں نہ پایا
دو دن کا مُہر چھاپا در پہ ہوا تو پھر کیا

جاگیر میں کسی نے زرریز ملک پایا　　کر بندوبست اپنا نظم و نسق بٹھایا
لیکر سند اجل کا جب فوجدار آیا　　اک دن میں حکم حاصل سب ہو گیا پرایا
ہانسی حصار ٹھٹھا بھکر ہوا تو پھر کیا

کہتا تھا کوئی یہ لشکر ہے طرہ باز خاں کا　　یہ خیمہ شامیانہ ہے شہنواز خاں کا
آیا کٹک اجل کے جب یکہ تاز خاں کا　　سر بھی کہیں نہ پایا پھر سرفراز خاں کا
سردار میر بخشی بڑھ کر ہوا تو پھر کیا

ہاتھی پہ چڑھ کے نکلے یا خاصے گھوڑے اوپر　　یا نالکی سنبھالی یا پالکی کی جھالر

یالے صراحی حقہ دوڑے جلیب اندر — جب آ اجل پکاری صاحب رہا نہ نوکر
آقا ہوا تو پھر کیا نوکر ہوا تو پھر کیا

یالے کے اک قلمداں اور رکھ قلم کو سر پر — جوڑے حساب لاکھوں چھرے لکھے سراسر
جب عمر کی پھری جھانکی قضا نے آکر — پھر آپ نے قلمداں کاغذ رہا نہ دفتر
منشی وکیل دیواں مرمر ہوا تو پھر کیا

یالے قضا کی خدمت ہو بیٹھے آپ قاضی — محضر قبالہ لکھے قضیئے چکائے شرعی
اعلام لے قضا کا جب آ قضا پکاری — پھر محکمہ نہ جھگڑا قاضی رہا نہ مفتی
کوڑا، لبیدہ دُرّہ در پہ ہوا تو پھر کیا

کُتوال بن کے بیٹھا یا صدر ہو مقرر — فاسق ڈرے ہزاروں اور چور کانپے تھر تھر
آیا قضا کا مردہا جس دم چھڑی اُٹھا کر — کُتوالی اور صدارت سب ہو گئی برابر
دو دن کا خوف خطرہ در در ہوا تو پھر کیا

کہتے تھے کتنے ہم تو ہیں ذات میں کلاں جی — ہم شیخ ہم مغل ہیں ہم ہیں پٹھان ہاں جی
جس دم قضا پکاری اب اُٹھ چلو میاں جی — پھر شیخ جی نہ سید مرزا رہے نہ خاں جی
ذات وحسب نسب کا جوہر ہوا تو پھر کیا

یالے کے زر جہاں میں کرنے لگے تجارت — یا سیٹھ بن کے بیٹھے خاصی بنا عمارت
کھولیں قضا نے بہیاں جب کرکے اک اشارت — سب کوٹھی اور دُکانیں کر ڈالیں دم میں غارت
مال اور مکاں جواہر اور زر ہوا تو پھر کیا

یا ہو سپاہی بانکا ترچھا، بڑا اکھایا — بلدار باندھ چیرا طرّے کو جگمگایا
کھیتوں میں جا کے کُودا لاکھوں کے تئیں بھگایا — جب مُنہ اجل کا دیکھا پھر کچھ بھی بن نہ آیا

یکتا شجاع بہادر صفدر رہا تو پھر کیا

گھوڑا اُٹھا کے ڈوبا فوجوں میں ہو دلاور　　مارے طمنچے بھالے کھائے کٹار جدھر
مارا قضا نے بھالا جس دم فنا کا آ کر　　پھر مردمی شجاعت سب ہو گئی برابر

خُود و سلاح چلتہ بکتر ہوا تو پھر کیا

یا خانہ جنگی لڑ کر کھایا بدن میں ٹانکا　　مونچھوں کو تاؤ دے کر سو دُوت دات ہانکا
جب گھور کر قضا کے بانکے نے آ کے جھانکا　　ٹیڑھا رہا نہ ترچھا گنڈا رہا نہ بانکا

تیغا سپر قرابیں جمدھر ہوا تو پھر کیا

یا ہو حکیم حاذق کرنے لگے طبابت　　مُردوں کے تئیں جِلایا عیسیٰ کی کی کرامت
کھوئے مرض ہزاروں کھوئی ہر اک کی زحمت　　جب سر پہ آئی اپنے پھر کچھ چلی نہ حکمت

لقمان یا فلاطوں آ کر ہوا تو پھر کیا

یا ہو نجومی کامل تاروں کو چھان ڈالا　　سورج گہن بچارے چندر گہن نکالا
برج دستارے باندھے احکام کو سنبھالا　　جب وقت اپنا آیا اُس وقت کو نہ ٹالا

جوتش نجوم پنڈت پڑھ کر ہوا تو پھر کیا

یا پڑھ کے دو کتابیں اور کر کے علم حاصل　　یا بھوت جن اُتارے مشہور ہو کے کامل
جب دیو کا اجل کے سایہ ہوا مقابل　　مُلّا رہا نہ سیانا عالم رہا نہ فاضل

تعویذ فال جادو منتر ہوا تو پھر کیا

ماتھے پہ کھینچ ٹیکا یا ہاتھ لے کے مالا　　پوتھی بغل میں دابی زُنّار کو سنبھالا
پوجا کتھا بکھانی کیا کیا سبد نکالا　　کچھ بن سکا نہ آیا جب جان لینے والا

دید و پُران پڑھ کر مقسر ہوا تو پھر کیا

یا زہد بندگی میں سوکھا ہو کوئی عابد — بیٹھا مصلوں او پہ ہو مسجدوں میں ساجد
حاضر ہوا قضا کا جب آن کر مجاہد — پھر بوریا نہ بدھنا عابد رہا نہ زاہد
روزہ نماز چلہ اکثر ہوا تو پھر کیا

یا پی کے مے کسی نے کی عیش کامیابی — لوٹا نشے میں ہر جا کر دل سے بے حجابی
جس دم قضا نے اپنی جھمکائی اک گلابی — پھر مے رہی نہ مینا نے مست نے شرابی
اک دم لبوں پہ مے کا ساغر ہوا تو پھر کیا

حسن و جمال پا کر یا خوبرو کہایا — یا عشق میں کسی نے جی جان کو گھٹایا
آ کر پڑا سروں پر جس دم اجل کا سایا — دونوں میں پھر کسی کو ڈھونڈھا کہیں نہ پایا
عاشق ہوا تو پھر کیا دلبر ہوا تو پھر کیا

یا ہو کے پیرزادے کرنے لگے فقیری — کر کر مرید کتنے کی اُن کی دستگیری
جب پیرہن کی کفنی آ کر اجل نے چیری — سب اُڑ گئی ہوا پر دم میں مریدی پیری
مرشد فقیر ہادی رہبر ہوا تو پھر کیا

یا سر منڈا کے بیٹھے آزاد ہو نویلے — یا خود منڈے کہا کر سو روپ رنگ کھیلے
میلے کئے ہزاروں مونڈے فقیر چیلے — جب آ قضا پکاری جا سو رہے اکیلے
تکیہ ہوا تو پھر کیا بستر ہوا تو پھر کیا

جوگی اتیت جنگم یا سیوڑا کہایا — یا کھول کر جٹا کو یا گھونٹ سر منڈایا
ترسول لے قضا کا جب وقت سر پہ آیا — نے بالکے کو تھانبا نے آپ کو بچایا
نانک کبیر پنتھی بھر کتھر ہوا تو پھر کیا

یا نیک بن کے بیٹھے اچھے لگے کہانے — یا ہو کے بد ہر اک کے دل کو لگے ستانے

آکر بجے اجل کے جب سر پہ شادیانے تھے نیک و بد جہاں تک سب لگ گئے ٹھکانے
بہتر ہوا تو پھر کیا بدتر ہوا تو پھر کیا

کیا ہندو اور مسلماں کیا رند و گبر و کافر نقاش کیا مصور کیا خوشنویس شاعر
جتنے نظیرؔ ہیں یاں اک دم کے ہیں مسافر رہنا نہیں کسی کو چلنا ہے سب کو آخر
دو چار دن کی خاطر یاں گھر ہوا تو پھر کیا

(۱۱) طفلی نامہ

کیا دن تھے یار وہ بھی تھے جب کہ بھولے بھالے نکلے تھی دائی لے کر پھرتی کبھی دوا لے
چوٹی کوئی رکھا لے بدھی کوئی پہنا لے ہنسلی گلے میں ڈالے منت کوئی بڑھا لے
موٹے ہوں یا کہ دبلے گورے ہوں یا کہ کالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

دل میں کسی کے ہرگز نے شرم نے حیا ہے آگا بھی کھل رہا ہے پیچھا بھی کھل رہا ہے
پہنے پھرے تو کیا ہے ننگے پھرے تو کیا ہے یاں یوں بھی واہ وا ہے اور وُوں بھی واہ وا ہے
کچھ کھا لے اس طرح سے کچھ اس طرح سے کھا لے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

مر جائے کوئی تو بھی کچھ ان کا غم نہ کرنا نے جانے کچھ بگڑنا نے جانے کچھ سنورنا
ان کی بلا سے گھر میں ہو قید یا کہ گھرنا جس بات پر یہ مچلے پھر وہ ہی کر گزرنا
ماں اوڑھنی کو، بابا پگڑی کو بیچ ڈالے

کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

جو کوئی چیز دیوے نت ہاتھ اوڑتے ہیں گڑ بیر مولی گاجر لے منہ میں گھونٹتے ہیں
بابا کی مونچھ ماں کی چوٹی کھسوٹتے ہیں گردوں میں اٹ رہے ہیں خاکوں میں لوٹتے ہیں
کچھ مل گیا سو پی لے کچھ بن گیا سو کھا لے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

جو ان کو دو سو کھالیں پھیکا ہو یا سلونا ہیں بادشہ سے بہتر جب مل گیا کھلونا
جس جا پہ نیند آئی پھر واں ہے ان کو سونا پروا نہ کچھ پلنگ کی نے چاہیے بچھونا
بھونپو کوئی بجا لے پھرکی کوئی نچا لے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

یہ بالے پن کا یارو عالم عجب بنا ہے یہ عمر وہ ہے اس میں جو ہے سو بادشا ہے
اور سچ اگر یہ پوچھو تو بادشہ بھی کیا ہے اب تو نظیرؔ میری سب کو یہی دعا ہے
جیتے رہیں سبھوں کے آس مراد والے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

۱۲ جوانی

کیا عیش کے رکھتی ہے سب آہنگ جوانی کرتی ہے بہاروں کے تئیں دنگ جوانی
ہر آن پلاتی ہے مے اور بھنگ جوانی کرتی ہے کہیں صلح کہیں جنگ جوانی
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی

عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

اللہ نے جوانی کا وہ عالم ہے بنایا　　جو ہر کہیں عاشق کہیں رسوا کہیں شیدا
پھندے میں کہیں جی ہے کہیں دل ہے تڑپتا　　مرتے ہیں سسکتے ہیں بلکتے ہیں اہا ہا
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

نے مے کا نہ معجون کے منگوانے کا کچھ غم　　نے دل کے لگانے کا نہ گل کھانے کا کچھ غم
گالی کا نہ آنکھوں کے لڑا آنے کا کچھ غم　　ہنسنے کا نہ چھاتی سے لپٹ جانے کا کچھ غم
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

لڑتی ہے کہیں آنکھ کہیں دست کہیں سین　　چھوٹا ہے کہیں پیار کسی سے ہیں لگے نین
وعدہ کہیں اقرار کہیں سین کہیں نین　　نے جی کو فراغت ہے نہ آنکھوں کے تئیں چین
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

الفت ہے کہیں مہر و محبت ہے کہیں چاہ　　کرتا ہے کوئی چاہ کوئی دیکھ رہا راہ
ساقی ہے صراحی ہے پریزاد ہیں ہمراہ　　کیا عیش ہیں کیا عیش ہیں کیا عیش ہیں واللہ
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

چہرے پہ جوانی کا جو آکے ہے چڑھا نور　　رہ جاتی ہیں پریاں بھی غرض اس کے تئیں گھور
چھاتی سے لپٹتی ہے کوئی حسن کی مغرور　　گودی میں پڑی لوٹے ہے چنچل سی کوئی حور

اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

گر رات کسی پاس رہے عیش میں غلطاں　　اور واں سے کسی اور کے ملنے کا ہوا دھیاں
گھبرا کے اُٹھے جب تو گری پاؤں پہ ہر آں　　کہتی ہے ہمیں چھوڑ کے جاتے ہو کدھر جاں
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

رستے میں نکلتے ہیں تو ہوتی ہیں یہ چاہیں　　وہ شوخ کہ ہوں بند جھپیں دیکھ کے راہیں
کھانسے ہے کوئی ہنس کے کوئی بھرتی ہے آہیں　　پڑتی ہیں ہر اک جا سے نگاہوں پہ نگاہیں
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

تنتے ہیں اگر اینٹھ کے چلتے ہیں عجب چال　　جو پاؤں کہیں راہ کہیں سیف کہیں ڈھال
کھینچے ہیں کہیں بال کہیں توڑ لیا گال　　چڑھ بیٹھے کہیں ہاتھ کہیں منہ پہ دیا ڈال
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

جاتے ہیں طوائف میں تو واں ہوتے ہیں یہ چاؤ　　کہتی ہے کوئی ان کے لئے پان بنا لاؤ
کوئی کہتی ہے یاں بیٹھو کوئی کہتی ہے یاں آؤ　　ناچے ہے کوئی شوخ بتاتی ہے کوئی بھاؤ
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

ہنس ہنس کے کوئی حسن کی چھل بل ہے دکھاتی　　مستی کوئی سرمہ کوئی کاجل ہے دکھاتی

چتون کی لگاوٹ کوئی چنچل سے ہے دکھاتی   کرتی کوئی انگیا کوئی آنچل سے ہے دکھاتی
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

کہتی ہے کوئی رات مرے پاس نہ آئے   کہتی ہے کوئی ہم کو بھی خاطر میں نہ لائے
کہتی ہے کوئی کس نے تمھیں پان کھلائے   کہتی ہے کوئی گھر کو جو جائے ہمیں کھائے
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

گر دل کو کسی شوخ پری کی ہوئی ٹک چاہ   اور ناز میں کرنے لگی اُس وقت وہ اکراہ
جوں باز کہ چڑیا کو کہیں داب لے ناگاہ   مچوادی لپیٹ کر وہیں ہڈی سے اُوئی آہ
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

آیا جو کوئی حسن کا بوٹا یا کوئی جھاڑ   جا شوخ سے جھپ لپٹے پہ پہنچوں کے تئیں جھاڑ
انگیا کے تئیں چیر کے کرتی کو لیا پھاڑ   اخلاص کہیں پیار کہیں مار کہیں دھاڑ
اِس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

کیا تجھ سے نظیر اب میں جوانی کی کہوں بات   اس پن میں گزرتی ہے عجب عیش سے اوقات
محبوب پری زاد چلے آتے ہیں دن رات   سیریں ہیں بہاریں ہیں تواضع ہے مدارات
اِس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

(۱۳) بڑھاپا

کیا قہر ہے یارو جسے آجائے بڑھاپا
اور عیش جوانی کے تئیں کھائے بڑھاپا
عشرت کو ملا خاک میں غم لائے بڑھاپا
ہر کام کو ہر بات کو ترسائے بڑھاپا

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

جو لوگ خوشامد سے بٹھاتے تھے گھڑی پہر
چھاتی سے لپٹتے تھے محبت کی جتا لہر
اب آکے بڑھاپے نے کیا ہائے یہ کچھ قہر
اب جن کنے جاتے ہیں لگتے ہیں انھیں زہر

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

آگے تو پری زاد یہ رکھتے تھے ہمیں گھیر
آتے تھے چلے آپ جو لگتی تھی ذرا دیر
سو آکے بڑھاپے نے کیا ہائے یہ اندھیر
جو دوڑ کے ملتے تھے سو اب لیتے ہیں منہ پھیر

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

تھے جب تلک ایام جوانی کے ہرے رکھ
محبوب وہ ملتے تھے نہ ہو دیکھ جنہیں بھوکھ
بیٹھے تھے پرند آن کے جب تک تھا ہرا رکھ
اب کیا ہے جو پت جھڑ ہوا اور جڑ بھی گئی سوکھ

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

آگے تھے جہاں گل بدن و یوسف ثانی دیتے تھے ہمیں پیار سے چھلّوں کی نشانی
مرجائیں تو اب مُنہ میں نہ ڈالے کوئی پانی کس دُکھ میں ہمیں چھوڑ گئی ہائے جوانی

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

یاد آتے ہیں ہم کو جو جوانی کے وہ ہنگام اور جام دلارام مزے عیش اور آرام
ان سب میں جو دیکھو تو نہیں ایک کا اب نام کیا ہم پہ ستم کر گئی یہ گردش ایام

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

مجلس میں جوانوں کی تو ساغر ہیں چھلکتے چہلیں ہیں بہاریں ہیں پر یہ وہیں جھکتے
ہم ان کے تئیں دور سے ہیں رشک سے تکتے وہ عیش و طرب کرتے ہیں ہم سر ہیں پٹکتے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

اب پاؤں پڑیں ان کے تو ہرگز نہ بلاویں جا بیٹھیں تو اک دم میں خفا ہو کے اٹھا دیں
اتنا تو کہاں اب جو کوئی جام پلا دیں گر جان نکلتی ہو تو پانی نہ چوا دیں

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

جب عیش کے مہمان تھے اب غم کے ہوئے ضیف اب خون جگر کھاتے ہیں جب پیتے تھے سو کیف
جب اینٹھ کے چلتے تھے سر باندھ اٹھا سیف اب ٹیک کے لاٹھی کے تئیں چلتے ہیں حیف

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا

عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

تھے ہم بھی جوانی میں بہت عشق کے پورے　　وہ کون سے گل رو تھے جو ہم نے نہیں گھورے
اب آ کے بڑھاپے نے کئے ایسے ادھورے　　پر جھڑ گئے دُم اُڑ گئی پھرتے ہیں لنڈورے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

کیا یار اُلٹ ہم سے گیا ہائے زمانا　　جو شوخ کہ تھے اپنی نگاہوں کا نشانا
چھیڑے ہے کوئی ڈال کے دادا کا بہانا　　ہنس کر کوئی کہتا ہے کہاں جاتے ہو نانا

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

پوچھیں جسے کہتا ہے وہ کیا پوچھے ہے بڈھے　　آویں تو یہ غل ہو کہ کہاں آوے ہے بڈھے
بیٹھیں تو ہو یہ دھوم کہاں بیٹھے ہے بڈھے　　دیکھیں جسے کہتا ہے وہ کیا دیکھے ہے بڈھے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

کیا یارو کہیں گو کہ بڑھاپا ہے ہمارا　　پر بوڑھے کہانے کا نہیں تو بھی سہارا
جب بوڑھا ہمیں ہائے جہاں کہہ کے پکارا　　کافر نے کلیجے میں گویا تیر سا مارا

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

خوباں میں اگر جاویں تو ہوتی ہے یہ پھکڑی　　کھینچے ہے کوئی ہاتھ کوئی پکڑے ہے لکڑی
پٹے کہیں اور مونچھیں کہیں جاتی ہیں پکڑی　　ڈاڑھی کو پکڑ کھینچ کوئی جھاڑے ہے مکڑی

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

کہتا ہے کوئی چھین لو اس بوڑھے کی لاٹھی   کہتا ہے کوئی شوخ کہ ہاں کھینچ لو ڈاڑھی
اتنی کسی کافر کو سمجھ اب نہیں آتی   کیا بوڑھے جو ہوتے ہیں تو کیا ان کے نہیں جی

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

اک وقت وہ تھا ہم بھی مزے کرتے تھے گن گن   محبوب، پریزاد نہ رہتے تھے سلے بن
اک وقت یہ ہے ہائے جو سب کرتے ہیں اب گھن   یا ایک وہ ایام تھے یا ایک یہ ہیں دن

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

بوڑھوں میں اگر جاویں تو لگتا نہیں واں دل   واں کیونکہ لگے دل تو ہے محبوبوں کا مائل
محبوبوں میں جاویں تو وہ سب چھیڑے ہیں پل پل   کیا سخت مصیبت کی پڑی آن کے مشکل

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

نگھٹ کو ہماری اگر اسواری گئی ہے   تو واں بھی لگی ساتھ یہی خواری گئی ہے
سنتے ہیں کہ کہتی ہوئی بھٹیاری گئی ہے   لو دیکھو بڑھاپے میں یہ مت ماری گئی ہے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

پگڑی ہو اگر لال گلابی تو یہ آفت   کہتا ہے ہر ایک دیکھ کے کیا خوب ہے رنگت

ٹھٹھے سے کوئی کہتا ہے گر شکل پہ رحمت   لاحول ولا، دیکھئے بوڑھے کی حماقت

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گر بیاہ میں جاویں تو یہ ذلت ہے اٹھانا   چھٹتے ہی سنے باپ نکاحی کا نشانا
رنڈیوں میں اگر جاویں تو مشکل ہے پھر آنا   افسوس کسی جا نہیں بوڑھے کا ٹھکانا

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

ہے بھانولی تالی کا زنانوں میں جو چرچا   گر ان میں کبھی جاویں تو ہے یہ ستم آتا
ڈاڑھی کی جگت بولے کوئی آنکھ کو مٹکا   ٹھٹھے سے کوئی کہتا ہے آ مرے دادا

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

دریا کے تماشے کو اگر جائیں تو یارو   کہتا ہے ہر اک دیکھ کے جاتے ہو کہاں کو
اور ہنس کے شرارت سے کوئی پوچھے ہے بدخو   کیوں خیر ہے کیا خضر سے ملنے کو چلے ہو

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گر آج کو ہوتے وہ جوانی کے زمانے   قدرت تھی جو یوں چھیڑتے پھرتے یہ زنانے
مشکل ابھی پڑ جاتی انہیں پیچھے چھڑانے   اک دم میں ابھی لگتے اوئی ہائے مچانے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گر ناچ میں جاویں تو یہ حسرت سے ہے ستاتی ٭ جو ناچے ہے کافر وہ نہیں دھیان میں لاتی
اور دل کی طرف جاوے تو آنکھیں ہے لڑاتی ٭ پر ہم کو تو کافر وہ انگوٹھا ہے دکھاتی

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گر نا کہ ان میں کوئی بُوڑھی ہے کہاتی ٭ البتہ بڑھاپے پہ ڈھنک رحم سے ہے کھاتی
پھیکی سی پُرانی سی لگاوٹ سے ہے جتاتی ٭ پر قہر ہے وہ ہم کو ذرا خوش نہیں آتی

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

چکلے کے جو اندر کی وہ کہلاتی ہے کسبی ٭ گر ان میں کبھی جاویں تو ہوتی ہے خرابی
منہ دیکھتے ہی کہتی ہیں سب آؤ بڑے جی ٭ کیا آئے ہو یہاں کرنے کو پیری و مریدی

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گر جاویں طوائف میں تو لگتی ہیں ستانے ٭ کیا آئے ہو حضرت ہمیں قرآن پڑھانے
ہنس ہنس کوئی پوچھے ہے نمازوں کے دوگانے ٭ ٹھٹھے سے کوئی پھینکے ہے تسبیح کے دانے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گو جھک کے کمر پاؤں سے سر آن لگا ہے ٭ پر دل میں تو خوباں کا وہی دھیان لگا ہے
کہتے ہیں جسے ہم کو یہ ارمان لگا ہے ٭ کہتا ہے وہ کیا بوڑھے کو شیطان لگا ہے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا

عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

نقلیں کوئی اِن پوپلے ہونٹوں کی بناوے   چل کر کوئی کبڑے کی طرح قد کو جھکاوے
ڈاڑھی کے کنے انگلی کو لا لا کے نچاوے   یہ خواری تو اللہ کسی کو نہ دکھاوے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

تھے جیسے جوانی میں کئے دھوم دھڑکّے   ویسے ہی بڑھاپے میں چھٹے آن کے چھکّے
سب اڑ گئے کافور وہ نظارے وہ جھمکّے   اب عیش جوانوں کو ہیں اور بوڑھوں کو دھکّے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گر حرص سے ڈاڑھی کو خضاب اپنی لگاویں   جھریاں جو پڑی مُنہ پہ اسے کیونکہ مٹا دیں
گو مکر سے ہنسنے کے تئیں دانت بندھاویں   گردن تو پڑی ہلتی ہے کیا خاک چھپاویں

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

بوڑھے ہوئے پر حُسن کی چاہت نہیں چھٹتی   آنکھوں سے یہ دیدار کی لذت نہیں چھٹتی
اور دل سے بھی محبوب کی الفت نہیں چھٹتی   سب چھٹ گیا پر دید کی یہ لت نہیں چھٹتی

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

سنتے ہو جوانو یہ سخن کہتے ہیں تم سے   کرنے ہیں جو کر لو وہ مزے عیش و طرب کے
جاوے گی جوانی تو پھر افسوس کرو گے   تم جیسے ہو ویسے تو کبھی ہم بھی جواں تھے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

اب جتنے ہو معشوق یہ سب یاد رکھو بات — جو ہو سو کرو چاہنے والوں کی مدارات
محبوبو غنیمت ہے جوانی کی یہ اوقات — جب بوڑھے ہوئے پھر تو ہوئے ڈھاک کے دو پات

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

اب جس سے رہیں صاف تو ہوتا ہے وہ گدلا — اللہ نہ دکھلائے کسی کو یہ ملدلا
اس چرخ ستمگار نے سینے میں حسد لا — کیا ہم سے جوانی کا لیا آہ یہ بدلا

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

تھے جیسے جوانی میں پیئے جام سبو کے — ویسے ہی بڑھاپے میں پیئے گھونٹ لہو کے
جب آکے گلے لگتے تھے محبوب بھبو کے — اب کہیئے تو بڑھیا بھی کوئی مُنہ پہ نہ تھوکے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

یہ ہونٹ جواب پوپلے یار وہیں ہمارے — ان ہونٹوں نے بوسوں کے بڑے رنگ ہیں مارے
ہوتے تھے جوانی میں تو پریوں سے گزارے — اور اب تو چڑیل آن کے اک لات نہ مارے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

تھے جیسے جوانی کے چڑھے زور میں، سرشیخ — ویسے ہی بڑھاپے کی پڑی آن کے اب تیغ

نکلا ہوا تن سوکھ، روئی بال، رگیں رخ — حلوا ہوئے، چرخا ہوئے، ایسی ہوئے چرخ
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

محفل میں وہ مستی سے بگڑنا نہیں بھولے — ساقی سے پیالوں پہ جھگڑنا نہیں بھولے
ہنس ہنس کے پریزادوں سے اڑنا نہیں بھولے — وہ گالیاں وہ بوسوں پہ اڑنا نہیں بھولے
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

کیا دَور تھا سر دیکھنے کا ہوتا تھا صد افسوس — ہر غنچہ دہن دیکھ کے کرتا تھا صد افسوس
اب مر بھی اگر جائیں تو ہوتا ہے کہ افسوس — افسوس صد افسوس صد افسوس صد افسوس
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

جب جان کے بوڑھا ہمیں چھیڑیں ہیں یہ کجواہ — اور چھیڑ کے مجلس سے اٹھاتے ہیں بہ اکراہ
اس وقت تو ہم یارو دمِ سرد سے بھر آہ — رو رو کے یہی کہتے ہیں اب کیوں مرے اللہ
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گر ہوتی جوانی تو ابھی دھوم یہ مچتی — چھاتی سے لپٹ دم میں کڑک ڈالتے پسلی
جب کرتی وا انگیا کی ارڑا ڈالتے دھجی — پر کیا کریں یارو کہ بڑھاپے نے بُری کی
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

وہ جوش نہیں جس کے کوئی خوف سے دہلے   وہ زعم نہیں جس سے کوئی بات کو سہ لے
جب پھوس ہوئے ہاتھ تھکے پاؤں بھی پھیلے   پھر جس کے جو کچھ شوق میں آوے وہی کہہ لے
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

کہتے تھے جوانی میں تو سب آپ سے آجاہ   اور حسن دکھاتے تھے وہ سب آن کے دل خواہ
یہ قہر بڑھاپے نے کیا آہ نظیر آہ   اب کوئی نہیں پوچھتا اللہ ہے اللہ
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

(۱۴) فقیروں کی صدا

ہشتا مار اجل کا آپہونچا ٹک اس کو دیکھ ڈرو بابا   اب اشک بہاؤ آنکھوں سے اور آہیں سرد بھرو بابا
دل ہاتھ اُٹھا اس جینے سے لے بس من مار مرو بابا   جب باپ کی خاطر روتے تھے اب اپنی خاطر رو بابا
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

اب جینے کو تم رخصت دو اور مرنے کو مہمان کرو   خیرات کرو احسان کرو یا پُن کرو یا دان کرو
یا پوری لڈو بٹواؤ یا خاصہ حلوا نان کرو   کچھ لطف نہیں اب جینے کا اب چلنے کا سامان کرو
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

دل کو ٹوٹا اپنا جینے سے اب اور گلے کو مت کاٹو | اب چاٹ فنا کی ٹک چکھو اور خون کسی کا مت چاٹو
دُھن چھوڑو حصے بخرے کی اور بھاجی اپنی تم باٹو | تاکہ نہ بکھیڑے کو دیکھے اب اور دولتی مت چھانٹو
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یہ اسپ بہت کودا اچھلا اب کوڑا مارو زیر کرو | جب مال اکٹھا کرتے تھے اب تن کا اپنے ڈھیر کرو
گڑھ ٹوٹا لشکر بھاگ چکا اب میان میں تم شمشیر کرو | تم صاف لڑائی ہار چکے اب بھاگنے میں مت دیر کرو
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

سر کانپا چاندی بال ہوئے منہ پھیلا پلکیں آن جھکیں | قد ٹیڑھا کان ہوئے بہرے اور آنکھیں بھی چندھیا گئیں
سکھ نیند گئی اور بھوک گھٹی دل سست ہوا آواز نہیں | جو ہونی تھی سو ہو گزری اب چلنے میں کچھ دیر نہیں
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یوں پاؤں گھسٹ کر چلنے سے مت رستے کو حیران کرو | اور پوپلے منہ سے روٹی کو مت مل مل کر ہلکان کرو
اب آپ ہوئے تم پانی سے مت پانی کا نقصان کرو | کچھ لابھ نہیں ہے جینے میں اب مرنے سے پہچان کرو
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

گر اچھی کرنی نیک عمل تم دنیا سے لے جاؤ گے | تو گھر بھی اچھا پاؤ گے اور بیٹھ کے سکھ سے کھاؤ گے
اور ایسی دولت چھوڑ کے تم جو خالی ہاتھوں جاؤ گے | کچھ بات نہیں بن آنے کی گھبراؤ گے پچھتاؤ گے
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا

اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یہ عمر جسے تم سمجھے ہو یہ ہر دم تن کو چنتی ہے
جس لکڑی کے بل بیٹھے ہو دن رات یہ لکڑی گھنتی ہے
تم گٹھڑی باندھو کپڑے کی اور دیکھ اجل سر دھنتی ہے
اب موت کفن کے کپڑے کا یاں تانا بانا بنتی ہے

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

گھر بار روپے اور پیسے میں مت دل کو تم خرسند کرو
یا گور بناؤ جنگل میں یا جمنا پر آنند کرو
موت آن لتاڑے گی آخر کچھ مکر کرو کچھ فند کرو
بس خوب تماشا دیکھ چکے اب آنکھیں اپنی بند کرو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

بیوپار تو یاں کا بہت کیا اب واں کا بھی کچھ سودا لو
جو کھیپ ادھر کو چڑھتی ہے اس کھیپ کو یاں سے لدوا لو
اس راہ میں جو کچھ کھاتے ہو اس کھانے کو بھی منگوا لو
سب ساتھی پہنچے منزل پر اب تم بھی اپنا رستہ لو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

دو چار گھڑی یا دو دن میں اب تن سے جان نکلنی ہے
یہ ہڈی پسلی جتنی ہے یا گلنی ہے یا جلنی ہے
ہے رات جو باقی تھوڑی سی کوئی دم میں یہ بھی ڈھلنی ہے
اٹھ باندھ کمر سویرے سے تم کو بھی منزل چلنی ہے

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یہ دولت کام نہ آوے گی مت اس کو تم زنجیر کرو
یہ خاک بدن کی پارا ہے مت مار اسے اکسیر کرو
جو پار اتارے دریا سے ان باتوں کو گو سیر کرو
اب ناؤ کنارے آ پہنچی اب چڑھنے میں مت دیر کرو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

کچھ دیر نہیں اب چلنے میں، کیا آج چلو یا کل نکلو
کچھ کپڑا لتا لینا ہو سو جلدی باندھ سنبھل نکلو
اب شام نہیں، اب صبح ہوئی، جوں موم پگھل کر ڈھل نکلو
کیوں ناحق دھوپ چڑھاتے ہو بس ٹھنڈے ٹھنڈے چل نکلو
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یہ اونٹ کرایہ کا یارو صندوق جنازہ رکھتی ہے
جب اس پہ ہوا اسوار چلے پھر گھوڑا ہے نہ ہستی ہے
کس نیند پڑے تم سوتے ہو یہ بوجھ تمہارا بھاری ہے
کچھ دیر نہیں اب آہ نظیرؔ تیار کھڑی اسواری ہے
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

(۱۵) خُوشامَد

دل خوشامد سے ہر اک شخص کا کیا راضی ہے
آدمی جن و پری بھوت بلا راضی ہے
بھائی فرزند بھی خوش باپ چچا راضی ہے
شاہ مسرور، غنی شاد، گدا راضی ہے
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

اپنا مطلب ہو تو مطلب کی خوشامد کیجئے
اور نہ ہو کام تو اس ڈھب کی خوشامد کیجئے
اولیا انبیا اور رب کی خوشامد کیجئے
اپنے مقدور غرض سب کی خوشامد کیجئے

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

چار دن جس کو خوشامد سے کیا جھک کے سلام — وہ بھی خوش ہو گیا اپنا بھی ہوا کام میں کام
بڑے عاقل بڑے دانا نے نکالا ہے یہ دام — خوب دیکھا تو خوشامد ہی کی آمد ہے تمام

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

مفلس ادنیٰ و غنی کی بھی خوشامد کیجیے — بد بخیل اور سخی کی بھی خوشامد کیجیے
دیو و شیطان و پری کی بھی خوشامد کیجیے — گر ولی ہو تو ولی کی بھی خوشامد کیجیے

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

پیار سے جوڑ دیے ہاتھ طرف جس کے آہ — وہیں خوش ہو گیا کرتے ہی وہ ہاتھوں پہ نگاہ
غور سے ہم نے جو اس بات کو دیکھا واللہ — کچھ خوشامد ہی بڑی چیز ہے اللہ اللہ

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

عیش کرتے ہیں وہی جن کا خوشامد کا مزاج — جو نہیں کرتے وہ رہتے ہیں ہمیشہ محتاج
ہاتھ آتا ہے خوشامد سے مکاں ملک اور راج — کیا ہی تاثیر کی اس نسخے نے پائی ہے رواج

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

گر بھلا ہو تو بھلے کی بھی خوشامد کیجیے — اور برا ہو تو برے کی بھی خوشامد کیجیے

پاک ناپاک سڑے کی بھی خوشامد کیجئے
کتے بلی و گدھے کی بھی خوشامد کیجئے
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

خوب دیکھا تو خوشامد کی بڑی کھیتی ہے
غیر کیا اپنے ہی گھر بیچ یہ سُکھ دیتی ہے
ماں خوشامد کے سبب چھاتی لگا سیتی ہے
نانی دادی بھی خوشامد سے دعا دیتی ہے
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

بی بی کہتی ہے میاں آ ترے صدقے جاؤں
ساس بولے کہیں مت جا ترے صدقے جاؤں
خالا کہتی ہے کہ کچھ کھا ترے صدقے جاؤں
سالی کہتی ہے کہ بھیا ترے صدقے جاؤں
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

آ پڑا ہے جو خوشامد سے سرو کار اُسے
ڈھونڈتے پھرتے ہیں اُلفت کے خریدار اُسے
آشنا ملتے ہیں اور چاہے ہیں سب یار اُسے
اپنے بیگانے غرض کرتے ہیں سب پیار اُسے
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

روکھی اور روغنی آبی کی خوشامد کیجئے
نان بائی و کبابی کی خوشامد کیجئے
ساقی و جام شرابی کی خوشامد کیجئے
پارسا رند خرابی کی خوشامد کیجئے
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

جو کہ کرتے ہیں خوشامد وہ بڑے ہیں انسان　　جو نہیں کرتے وہ رہتے ہیں ہمیشہ حیران
ہاتھ آتے ہیں خوشامد سے ہزاروں سامان　　جس نے یہ بات نکالی ہے میں اس کے قربان
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

کوڑی پیسے و ٹکے زر کی خوشامد کیجے　　لعل و نیلم دُر و گوہر کی خوشامد کیجے
اور جو پتھر ہو تو پتھر کی خوشامد کیجے　　نیک و بد جتنے ہیں یکسر کی خوشامد کیجے
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

ہم نے ہر دل میں خوشامد کی محبت دیکھی　　پیار و اخلاص و کرم مہر و محبت دیکھی
دلبروں میں بھی خوشامد ہی کی الفت دیکھی　　عاشقوں میں بھی خوشامد ہی کی چاہت دیکھی
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

پارسا پیر ہے زاہد ہے مناجاتی ہے　　جو ریا چور دغا باز خراباتی ہے
ماہ سے ماہی تلک چیونٹی ہے یا ہاتھی ہے　　یہ خوشامد تو میاں سب کے تئیں بھاتی ہے
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

گر نہ میٹھی ہو تو کڑوی بھی خوشامد کیجے　　کچھ نہ ہو پاس تو خالی بھی خوشامد کیجے
جانی دشمن ہو تو اس کی بھی خوشامد کیجے　　سچ اگر پوچھو تو جھوٹی بھی خوشامد کیجے
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے

حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

مرد و زن طفل و جواں خرد و کلاں پیر و فقیر　　جتنے عالم میں ہیں محتاج و گدا شاہ و وزیر
سب کے دل ہوتے ہیں پھندے میں خوشامد کے اسیر　　تو بھی واللہ بڑی بات یہ کہتا ہے نظیرؔ
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

(۱۶) کلجگ

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی سات لے　　نیکی کا بدلا نیک ہے بد سے بدی کی بات لے
میوہ کھلا میوہ ملے پھل پھول دے پھل پات لے　　آرام دے آرام لے دکھ درد دے آفات لے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

کانٹا کسی کے مت لگا گر مثل گل پھولا ہے تو　　وہ تیرے حق میں زہر ہے کس بات پر پھولا ہے تو
مت آگ میں ڈال اور کو پھر گھاس کا پولا ہے تو　　سُن رکھ یہ نکتہ بے خبر کس بات پر پھولا ہے تو
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

شوخی شرارت مکر و فن سب کا بسیکھا ہے یہاں　　جو جو دکھایا اور کو وہ آپ دیکھا ہے یہاں
کھوٹی کھری جو کچھ کہی تِس کا پریکھا ہے یہاں　　جو جو پڑا تُلتا ہے دل تِل تِل کا لیکھا ہے یہاں
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

جو اَور کی بستی رکھے اس کا بھی بستا ہے پُرا　　جو اور کے مارے چھُری اس کے بھی لگتا ہے چھُرا
جو اور کی توڑے گھڑی اس کا بھی ٹوٹے ہے گھڑا　　جو اور کی چیتے بدی اس کا بھی ہوتا ہے بُرا
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

جو اور کو پھل دیوے گا وہ بھی سدا پھل پاوے گا　　گیہوں سے گیہوں جَو سے جَو چانوَل سے چانوَل پاوے گا
جو آج دیوے گا یہاں ویسا ہی وہ کل پاوے گا　　کل دیوے گا کل پاوے گا کل پاوے گا کل پاوے گا
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

جو چاہے لے چل اس گھڑی سب جنس یاں تیار ہے　　آرام میں آرام ہے آزار میں آزار ہے
دنیا نہ جان اس کو میاں دریا کی یہ منجدھار ہے　　اوروں کا بیڑا پار کر تیرا بھی بیڑا پار ہے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

تو اور کی تعریف کر تجھ کو ثنا خوانی ملے　　کر مشکل آساں اور کی تجھ کو بھی آسانی ملے
تو اور کو مہمان کر تجھ کو بھی مہمانی ملے　　روٹی کھلا روٹی ملے پانی پلا پانی ملے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

جو گل کھلاوے اور کا اس کا ہی گل کھلتا بھی ہے　　جو اور کا کیلے ہے مُنہ اس کا ہی مُنہ کِلتا بھی ہے
جو اَور کا چھیلے جگر اس کا جگر چھِلتا بھی ہے　　جو اور کو دیوے کپٹ اس کو کپٹ ملتا بھی ہے

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

کرچک جو کچھ کرنا ہو یاں یہ دم تو کوئی آن ہے   نقصان میں نقصان ہے احسان میں احسان ہے
تہمت میں یاں تہمت لگے طوفان میں طوفان ہے   رحمان کو رحمان ہے شیطان کو شیطان ہے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

یاں زہر دے تو زہر لے شکر میں شکر دیکھ لے   نیکوں کو نیکی کا مزہ موذی کو ٹکر دیکھ لے
موتی جو دے موتی ملیں پتھر میں پتھر دیکھ لے   گر تجھ کو یہ باور نہیں تو تو بھی کر کر دیکھ لے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

اپنے نفع کے واسطے مت اور کا نقصان کر   تیرا بھی نقصاں ہووے گا اس بات پر تو دھیان کر
کھانا جو کھا تو دیکھ کر پانی پیئے تو چھان کر   یاں پاؤں کو رکھ پھونک کر اور خوف سے گزران کر
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

غفلت کی یہ جا گہ نہیں یاں صاحب ادراک رہ   دلشاد رکھ دلشاد رہ غمناک رکھ غمناک رہ
ہر حال میں تو بھی نظیر اب ہر قدم کی خاک رہ   یہ وہ مکاں ہے او میاں یاں پاک رکھ بیباک رہ
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

(۱۷) مُفلِسی

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی — کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی — بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دُکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

کہیئے تو اب حکیم کی سب سے بڑی ہے شاں — تعظیم جس کی کرتے ہیں نواب اور خاں
مفلس ہوئے تو حضرت لقماں کیا ہیں یاں — عیسیٰ بھی ہو تو کوئی نہیں پوچھتا میاں
حکمت حکیم کی بھی ڈباتی ہے مفلسی

جو اہل فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں — مفلس ہوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی الف تو اسے بے بتاتے ہیں — وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

مفلس کرے جو آن کے مجلس کے بیچ حال — سب جانیں روٹیوں کا یہ ڈالا ہے اس نے جال
گر گر پڑے تو کوئی نہ لیوے اُسے سنبھال — مفلس میں ہو دیں لاکھ اگر علم اور کمال
سب خاک بیچ آ کے ملاتی ہے مفلسی

جب روٹیوں کے بٹنے کا آ کر پڑے شمار — مفلس کو دیویں ایک تو نگر کو چار چار
گر اور مانگے وہ تو اُسے جھڑکیں بار بار — اِس مفلسی کا آہ بیاں کیا کروں میں یار
مفلس کو اس جگہ بھی چباتی ہے مفلسی

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر — دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر

ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر ۔۔۔ جس طرح کتے لڑتے ہیں ایک استخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی

کرتا نہیں حیا سے جو کوئی وہ کام آہ ۔۔۔ مفلس کرے ہے اس کے تئیں انصرام آہ
سمجھے نہ کچھ حلال نہ جانے حرام آہ ۔۔۔ کہتے ہیں جس کو شرم و حیا ننگ و نام آہ
وہ سب حیا و شرم اُٹھاتی ہے مفلسی

یہ مفلسی وہ شے ہے کہ جس گھر میں بھر گئی ۔۔۔ پھر جتنی گھر میں ست تھی اسی گھر کے در گئی
زن بچے روتے ہیں گویا نانی گزر گئی ۔۔۔ ہمسائے پوچھتے ہیں کہ کیا دادی مر گئی
بن مردے گھر میں شور مچاتی ہے مفلسی

لازم ہے گر غمی میں کوئی شور غل مچائے ۔۔۔ مفلس بغیر غم کے ہی کرتا ہے ہائے ہائے
مر جاوے گر کوئی تو کہاں سے اسے اُٹھائے ۔۔۔ اِس مفلسی کی خواریاں کیا کیا کہوں میں ہائے
مردے کو بن کفن کے گڑاتی ہے مفلسی

کیا کیا میں مفلسی کی کہوں خواری پھکڑیاں ۔۔۔ جھاڑو بغیر گھر میں بکھرتی ہیں جھکڑیاں
کونوں میں جالے لپٹے ہیں چھپر میں مکڑیاں ۔۔۔ پیدا نہ ہو دیں جن کے جلانے کو لکڑیاں
دریا میں اُن کے مردے بہاتی ہے مفلسی

بی بی کی نتھ نہ لڑکوں کے ہاتھوں کڑے رہے ۔۔۔ کپڑے میاں کے بنئے کے گھر میں پڑے رہے
جب کڑیاں بک گئیں تو کھنڈر میں اڑے رہے ۔۔۔ زنجیر نے کواڑ نہ پتھر گڑے رہے
آخر کو اینٹ اینٹ کھداتی ہے مفلسی

نقاش پر بھی زور جب آ مفلسی کرے ۔۔۔ سب رنگ دم میں کر دے مصور کے کرکرے
صورت بھی اس کی دیکھ کے منہ کھنچ رہے پرے ۔۔۔ تصویر اور نقش میں کیا رنگ وہ بھرے

اس کے تو منہ کا رنگ اڑاتی ہے مفلسی

عاشق کے حال پر بھی جب آ مفلسی پڑے　　معشوق اپنے پاس نہ دے اس کو بیٹھنے
آوے جو رات کو تو نکالے وہیں اسے　　اس ڈر سے یعنی رات کو اینڈا کہیں دے
تہمت یہ عاشقوں پہ لگاتی ہے مفلسی

کیسی ہی دھوم دھام کی رنڈی ہو خوش جمال　　جب مفلسی کا آن پڑے اس کے سر پہ جال
دیتے ہیں اس کے ناچ کو ٹھٹھے کے بیچ ڈال　　ناچے ہے وہ تو فرش کے اوپر قدم سنبھال
اور اس کو انگلیوں پہ نچاتی ہے مفلسی

اس کا تو دل ٹھکانے نہیں بھاؤ کیا بتائے　　جب ہو پھٹا دوپٹا تو کاہے سے منہ چھپائے
وہ شام سے لے صبح تلک گو کہ ناچے گائے　　اوروں کو آٹھ سات تو وہ دو ٹکے ہی پائے
اس لاج سے اسے بھی لجاتی ہے مفلسی

جب مفلسی ہووے کلاونت کا دل اداس　　پھرتا ہے لے طنبورے کو ہر گھر کے آس پاس
اک پاؤ سیر آٹے کی دل میں لگا کے آس　　گوری کا وقت ہووے تو گاتا ہے وہ بھیاس
یاں تک حواس اس کے اڑاتی ہے مفلسی

مفلس جو بیاہ بیٹی کا کرتا ہے بول بول　　پیسا کہاں جو جا کے وہ لاوے جہیز مول
جورو کا وہ گلا ہے کہ پھوٹا ہو جیسے ڈھول　　گھر کی حلال خوری تلک کرتی ہے ٹھٹھول
ہیبت تمام اس کی اٹھاتی ہے مفلسی

بیٹے کا بیاہ ہو تو نہ بھائی نہ ساتھی ہے　　نے روشنی نہ باجے کی آواز آتی ہے
ماں پیچھے ایک میلی چدر اوڑھے جاتی ہے　　بیٹا بنا ہے دولہا تو باوا براتی ہے
مفلس کی یہ برات چڑھاتی ہے مفلسی

گر بیاہ کر چلا ہے سحر کو تو یہ بلا شہدا، زنانہ، ہیجڑا اور بھاٹ منڈچرا
گھیرے ہوئے اسے چلے جاتے ہیں جا بہ جا وہ آگے آگے لڑتا ہوا جاتا ہے چلا
اور پیچھے تھپڑیوں کو بجاتی ہے مفلسی

دروازے پر زنانے بجاتے ہیں تالیاں اور گھر میں بیٹھی ڈومنی دیتی ہے گالیاں
مالن گلے کا ہار ہو دوڑے لے ڈالیاں سقا کھڑا سناتا ہے باتیں رذالیاں
یہ خواری یہ خرابی دکھاتی ہے مفلسی

کوئی شوم بے حیا، کوئی بولا نکھٹو ہے بیٹے نے جانا باپ تو میرا نکھٹو ہے
بیٹی پکارتی ہے کہ بابا نکھٹو ہے بی بی یہ دل میں کہتی ہے بھڑوا نکھٹو ہے
آخر نکھٹو نام دھراتی ہے مفلسی

مفلس کا درد دل میں کوئی ٹھانتا نہیں مفلس کی بات کو بھی کوئی مانتا نہیں
ذات اور حسب نسب کو کوئی جانتا نہیں صورت بھی اس کی پھر کوئی پہچانتا نہیں
یاں تک نظر سے اس کو گراتی ہے مفلسی

جس وقت مفلسی سے یہ آکر ہوا تباہ پھر کوئی اس کے حال پہ کرتا نہیں نگاہ
دالیدری کہے، کوئی ٹھہراوے روسیاہ جو باتیں عمر بھر نہ سنی ہوویں اس نے آہ
وہ باتیں اس کو آکے سناتی ہے مفلسی

چولھے توا نہ پانی کے مٹکے میں آبی ہے پینے کو کچھ نہ کھانے کو اور نے رکابی ہے
مفلس کے ساتھ سب کے تئیں بے حجابی ہے مفلس کی جورو سچ ہے کہ یاں سب کی بھابی ہے
عزت سب اس کے دل کی گنواتی ہے مفلسی

کیسا ہی آدمی ہو پر افلاس کے طفیل کوئی گدھا کہے اسے ٹھہراوے کوئی بیل

کپڑے پھٹے تمام بڑھے بال پھیل پھیل
منہ خشک دانت زرد بدن پر جما ہے میل
سب شکل قیدیوں کی بناتی ہے مفلسی

ہر آن دوستوں کی محبت گھٹاتی ہے
جو آشنا ہیں ان کی تو الفت گھٹاتی ہے
اپنوں کی مہر غیر کی چاہت گھٹاتی ہے
شرم و حیا و عزت و حرمت گھٹاتی ہے
ہاں ناخن اور بال بڑھاتی ہے مفلسی

جب مفلسی ہوئی تو شرافت کہاں رہی
وہ قدر ذات کی وہ نجابت کہاں رہی
کپڑے پھٹے تو لوگوں میں عزت کہاں رہی
تعظیم اور تواضع کی بابت کہاں رہی
مجلس کی جوتیوں پہ بٹھاتی ہے مفلسی

مفلس کسی کا لڑکا جو لے پیار سے اٹھا
باپ اس کا دیکھے ہاتھ کا اور پاؤں کا کڑا
کہتا ہے کوئی جوتی نہ لیوے کہیں چرا
نٹ کھٹ اچکا چور دغا باز گٹھ کٹا
سو سو طرح کے عیب لگاتی ہے مفلسی

رکھتی نہیں کسی کی یہ غیرت کی آن کو
سب خاک میں ملاتی ہے حرمت کی شان کو
سو محنتوں میں اس کی کھپاتی ہے جان کو
چوری پہ آکے ڈالے ہے مفلس کے دھیان کو
آخر ندان بھیک منگاتی ہے مفلسی

دنیا میں لیکے شاہ سے اے یار تا فقیر
خالق نہ مفلسی میں کسی کو کرے اسیر
اشراف کو بناتی ہے اک آن میں حقیر
کیا کیا میں مفلسی کی خرابی کہوں نظیر
وہ جانے جس کے دل کو جلاتی ہے مفلسی

(۱۸) معجزۂ حضرت علی علیہ السلام

سنتے ہو اے علیؑ کے محبانِ دوستدار
اک معجزہ میں کہتا ہوں اُس شہ کا آشکار
ہے تازہ واردات یہ از نقلِ روزگار
تھا کوئی شخص دولت و حشمت میں نامدار
اک روز وہ گیا تھا کہیں کھیلنے شکار

جس دشت میں شکار کو گزرا تھا وہ غنی
واں ایک شیر رہتا تھا اور اس کی شیرنی
تھا ایک چشمہ پانی کا اور سبز تھی بنی
دو بچے اس بنی میں تھی وہ شیرنی جنی
دس بیس روز کے تھے ابھی طفل شیرخوار

بچوں کو اپنی چھاتی پہ رکھے وہ بے زباں
دونوں کو بیٹھی دودھ پلاتی تھی شادماں
بندوق کی جو آئی صدا اس میں ناگہاں
نر مادہ دونوں بھاگ گئے ہو کے نیم جاں
بچے اکیلے رہ گئے جنگل میں بیقرار

القصہ جب شکار سے فارغ ہوا وہ شاہ
ناگاہ دونوں بچوں پہ اس کی پڑی نگاہ
رکھوا کے ان کو اونٹ پہ جلدی سے خواہ مخواہ
لی اس شکارگاہ سے پھر اپنے گھر کی راہ
محلوں میں اپنے آن کے اس نے لیا قرار

جب آئے شیر و شیرنی باحالت تباہ
اور دونوں بچے گھر میں نہ آئے انہیں نگاہ
وہ شیر کھا کے غش گرا اک بار کر کے آہ
اور شیرنی نے لی نجف اشرف کی وہیں راہ
سر پیٹتی چلی وہ بیاباں سے سوگوار

القصہ کتنے روز میں وہ شیرنی غریب
بھوکی پیاسی پھیرتی ہونٹوں پہ خشک جیب

شوہر سے چھوٹی اور ہوئی بچوں سے بےنصیب　　آ پہنچی یک بیک نجف اشرف کے عنقریب
پنجوں سے اپنے سر پہ اُڑاتی ہوئی غبار

بازار میں نجف کے جب آئی وہ نیم جاں　　ہر اک دوکاں سے اس کی اُٹھا شور اور فغاں
کوئی پکارا دوڑیو کوئی پکارا ہاں　　ہیبت سے اس کی چھپنے لگے پیر اور جواں
چاروں طرف سے دھوم مچی آکے ایک بار

وہ تو کسی طرف کو نہ گھر کی بتاتی تھی　　نے منہ کو موڑتی تھی نہ پنجہ اُٹھاتی تھی
آنکھوں سے اُس ہجوم میں آنسو بہاتی تھی　　شاہ نجف کے روضے پہ فریادی جاتی تھی
لوگ اُس پر اپنے خوف سے کرتے تھے مار مار

جس دم وہ پہنچی حیدر صفدر کے در تلک　　دربان اس کے خوف سے یکسر گئے سرک
داخل ہوئی وہ روضۂ انور میں یک بیک　　رونے لگی وہ سامنے سر کو پٹک پٹک
آنسو کی دونوں آنکھوں سے بہنے لگی قطار

آنکھوں سے اس کے آنسو کی ندی جو بہتی تھی　　بچوں کا داغ اپنے کلیجے پہ سہتی تھی
کچھ منہ سے شور کرتی تھی کچھ دیکھ رہتی تھی　　گویا وہ شہ سے اپنی زباں میں یہ کہتی تھی
بچے مرے دلائیے یا شیر کردگار

روتی تھی یوں وہ شیرنی آنسو بہا بہا　　مظلوم جیسے روتے ہے عادل کے پاس آ
اور کچھ زباں سے اپنی سناتی تھی ببغا　　نکلے تھی آغا آغا کی منہ اس کے سے صدا
کہ آغا آغا درد سے روتی تھی زار زار

فریادی بن کے ساقی کوثر کے سامنے　　محتاج بن کے صاحب قنبر کے سامنے
یوں دیکھتی تھی روضۂ انور کے سامنے　　مظلوم جیسے آن کے داور کے سامنے

کرتا ہے اس کے حکم کا رہ رہ کے انتظار

لوگوں کے دل سے جب تو ہوا خوف اس کا کم — سب اس کے پاس آن کے دیکھیں تھے اس کا غم
ہر آن اپنے سر کو پٹک کر بہ چشم نم — پنجوں کو اس طرح وہ اٹھاتی تھی دمبدم
فریادی داد مانگے ہے جوں ہاتھ کو پسار

فریاد وہ تو مانگے تھی آنما سے جھوم جھوم — یعنی فلک نے مجھ کو دکھایا یہ روز شوم
اس بات سے تمام نجف میں پڑی یہ دھوم — گرد اس کے مرد و زن کا ہوا آن کر ہجوم
حیرت میں تھے تمام چہ ناداں چہ ہوشیار

کوئی پانی اس کے واسطے کوئی کھانا لاتا تھا — لیکن اسے تو رونے سوا کچھ نہ بھاتا تھا
بچوں کا داغ ہوش سب اس کے اڑاتا تھا — جو اس کو دیکھتا تھا اسے رونا آتا تھا
ایسی طرح سے سر کو پٹکتی تھی بار بار

جب تین دن وہ شیرنی بھوکی پڑی رہی — ناچار ان شریفوں نے دیکھ اس کی بے کلی
جس طرح واں قدیم سے کہنے کی راہ تھی — اس طرح سے جناب مقدس میں عرض کی
با سینۂ الم کش و با چشم اشکبار

آئی ندا یہ شیرنی دیتی دہائی ہے — اک شخص کے یہ ظلم و ستم کی ستائی ہے
بچوں نے اس کے قید کی آفت جو پائی ہے — سو اب ہمارے روضے پہ فریادی آئی ہے
کل اس کا بھید ہووے گا تم سب پہ آشکار

یاں تو شریف کو یہ عنایت ہوا جواب — واں جا پلنگ الٹ دیا اس کا بہ عین خواب
فرمایا وہ جو شیر کے بچے ہیں دل کباب — بھجوا دے ان کو شہر نجف میں تو کل شتاب
ورنہ تو اس گنہ سے بہت ہوگا شرمسار

ماں ان کی اُن کے واسطے آنسو بہاتی ہے — اور تین دن ہوئے ہیں نہ پیتی نہ کھاتی ہے
زیادی ہو کے روتی ہے اور غل مچاتی ہے — غش ہو ہو کے رونے میں جی کو کھپاتی ہے
جلدی سے ان کو بھیج دے کر اونٹ پر سوار

وہ تھرتھرا کے کانپ اُٹھا ہو کے عذر خواہ — جانا یہ اس نے یہ ہیں شہنشاہ دیں پناہ
بولا نجف تو پندرہ دن کی ہے یاں سے راہ — بھجوا دوں کس طرح سے انھیں کل میں پُر گناہ
اتنا تو اس غلام میں کب ہے گا اختیار

جب حکم یہ ہوا اسے جس وقت ہو سحر — جلدی سے دونوں بچوں کو رکھوا کے اونٹ پر
بھجوا دے اپنے شہر کی آبادی سے اُدھر — جب پہونچیں گے یہ شہر کے دروازے کے اوپر
واں پیدا ہوگا غیب سے اِک ناقہ سوار

ہوتے ہی صبح اس نے منگا کر وہ دو بچے — رکھوا کے ایک اونٹ پہ جلدی رواں کیے
جب لوگ آئے شہر کے دروازے کے تلے — کیا دیکھیں ایک شخص کو واں آدھی رات سے
ہے منتظر وہ اونٹ کی پکڑے ہوئے مہار

جاتے ہی دونوں بچے انھوں نے اُسے دیئے — با احتیاط سونپ کے پھر شہر کو پھرے
وہ اُن بچوں کو لے کے چلا اس شتاب سے — آ پہونچا اس مکان میں اک پہر دن چڑھے
یک بار اس کا شہر نجف میں ہوا گزار

بچوں کے آنے آنے کے جب غل ہوئے کروڑ — وہ شیرنی بھی تکنے لگی اپنے منہ کو موڑ
جب لا کے اس کے سامنے بچے دیئے وہ چھوڑ — یوں خوش ہو چاٹنے لگی الفت کی کر جھنجھوڑ
انسان جیسے کرتا ہے بچوں کو اپنے پیار

بچے بھی دوڑ ماں کے گلے سے لپٹ گئے — یوں جیسے کوئی دور کا بچھڑا ہوا ملے

چھاتی پہ لوٹ لوٹ کے جا دودھ سے لگے   اُس شیرنی کے جیسے کلیجے میں داغ تھے
ویسی ہی اس کے منہ پہ خوشی کی ہوئی بہار

جب اس نے بچے پائے تو ہو کر وہ شادماں   بچوں سمیت اُٹھ کے وہ حیوان بے زباں
روضے کے سات بار تصدق ہوئی وہاں   پھر آستانہ چوم ہوئی واں سے وہ رواں
جا پہنچی اپنے دشت میں خوش ہوتی بار بار

شیرِ خدا کے عدل کی یہ دیکھ رسم و راہ   خلقت تمام واں کی پکاری کہ واہ واہ
انصاف ایسا چاہیئے اے شاہِ دیں پناہ   حامی و منصف اور نہیں کوئی تم سا شاہ
ہے ختم تم پہ عدل و حمایت کا کاروبار

حیواں تمہارے لطف سے جس وقت ہوویں شاد   انساں پھر اس مکاں سے رہیں کیونکہ نامراد
جیسے تمہارے در سے ملی شیرنی کی داد   احسان ایسے ایسے بہت اے کرم نہاد
ہیں گے تمہارے صفحۂ عالم میں یادگار

اے شاہ یہ نظیرؔ تمہارا غلام ہے   رکھتا سوا تمہارے کسی سے نہ کام ہے
عاصی ہے پر گناہ ہے اور ناتمام ہے   دن رات اُس کا آپ سے اب یہ کلام ہے
رکھیو میری آبرو یا شیرِ کردگار

(۱۹) دوالی

ہر اک مکاں میں جلا پھر دیا دوالی کا   ہر اک طرف کو اُجالا ہوا دوالی کا
سبھی کے دل میں سماں بھا گیا دوالی کا   کسی کے دل کو مزا خوش لگا دوالی کا

عجب بہار کا ہے دن بنا دوالی کا

جہاں میں یارو عجب طرح کا ہے یہ تیوہار　　کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے اُدھار
کھلونے، کھیلوں، بتاسوں کا گرم ہے بازار　　ہر اک دکاں میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار
سبھوں کو فکر ہے اب جا بجا دوالی کا

مٹھائیوں کی دُکانیں لگا کے حلوائی　　پُکارتے ہیں کہ لالہ دوالی ہے آئی
بتاسے لے کوئی، برفی کسی نے تُلوائی　　کھلونے والوں کی اِن سے زیادہ بن آئی
گویا انھوں کے واں راج آ گیا دوالی کا

صرف حرام کی کوڑی کا جن کا ہے بیوپار　　انھوں نے کھایا ہے اِس دن کے واسطے ہی اُدھار
کہے ہیں ہنس کے قرضخواہ سے ہر اک اک بار　　دوالی آئی ہے سب دے چلائیں گے لے یار
خدا کے فضل سے ہے آسرا دوالی کا

مکان لیپ کے ٹھلیا جو کوری رکھوائی　　جلا چراغ کو کوڑی وہ جلد جھنکائی
اصل جواری تھے ان میں تو جان سی آئی　　خوشی سے کود اُچھل کر پُکارے او بھائی
شگون پہلے کرو تم ذرا دوالی کا

شگن کی بازی لگے پہلے یار گنڈے کی　　پھر اس سے بڑھ کے لگی تین چار گنڈے کی
پھری جو ایسی طرح بار بار گنڈے کی　　تو آگے لگنے لگی پھر ہزار گنڈے کی
کمال نرخ لگا پھر تو آ دوالی کا

کسی نے گھر کی حویلی گرو رکھا ہاری　　جو کچھ تھی جنس میسر بنا بنا ہاری
کسی نے چیز کسی کی چُرا چھپا ہاری　　کسی نے گٹھری پڑوسن کی اپنی لا ہاری
یہ ہار جیت کا چرچا پڑا دوالی کا

کسی کو داؤ پہ لانکّی موٹھ نے مارا　　کسی کے گھر پہ دھرا سوختہ نے انگارا
کسی کو نرد نے چوپڑ کے کر دیا زارا　　لنگوٹی باندھ کے بیٹھا ازار تک ہارا
یہ شور آ کے مچا جابجا دوالی کا

کسی کی جورو کہے ہے پکار اے بھڑوے　　بہو کی نوگری بیٹے کے ہاتھ کے کڑے
جو گھر میں آوے تو سب مل کہے ہیں سو گھڑ دوے　　نکل تو یاں سے ترا کام یاں نہیں بھڑوے
خدا نے تجھ کو تو شہدا کیا دوالی کا

وہ اس کے جھونٹے پکڑ کر کہے ہے ماروں گا　　ترا جو گہنا ہے سب تار تار اتاروں گا
حویلی اپنی تو اک داؤ پر میں ہاروں گا　　یہ سب تو ہارا ہوں خندی تجھے بھی ہاروں گا
چڑھا ہے مجھ کو بھی اب تو نشا دوالی کا

تجھے خبر نہیں خندی یہ لت وہ پیاری ہے　　کسی زمانے میں آگے ہوا جو جواری ہے
تو اس نے جورو کی نتھ اور ازار اتاری ہے　　ازار کیا ہے کہ جورو تلک بھی ہاری ہے
سنا یہ تو نے نہیں ماجرا دوالی کا

جہاں میں یہ جو دوالی کی سیر ہوتی ہے　　تو زر سے ہوتی ہے اور زر بغیر ہوتی ہے
جو ہارے ان پہ خرابی کی فیر ہوتی ہے　　اور ان میں آن کے جن جن کی خیر ہوتی ہے
تو آڑے آتا ہے ان کے دیا دوالی کا

یہ باتیں سچ ہیں نہ جھوٹ ان کو جانیو یارو　　نصیحتیں ہیں انہیں دل میں ٹھانیو یارو
جہاں کو جاؤ یہ قصہ بکھانیو یارو　　جو جواری ہو نہ برا اس کا مانیو یارو
نظیر آپ بھی ہے جواریا دوالی کا

(۲۰) حضرت سلیم چشتی

ہیں دو جہاں کے سلطاں حضرت سلیم چشتی — عالم کے دین و ایماں حضرت سلیم چشتی
سر دفترِ مسلماں حضرت سلیم چشتی — مقبول خاص یزداں حضرت سلیم چشتی
سردار ملک عرفاں حضرت سلیم چشتی

برجِ اسد کی رونق عرشِ بریں کے تارے — گلزارِ دیں کے گلبن اللہ کے سنوارے
یہ بات جان و دل سے کہتے ہیں سب پکارے — تم وہ ولی ہو برحق جو فیض سے تمہارے
عالم ہے باغ و بستاں حضرت سلیم چشتی

شاہوں کے بادشہ ہو با تاج با لوا ہو — اور قبلۂ صفا ہو اور کعبۂ ضیا ہو
خلقت کے رہنما ہو دنیا کے مقتدا ہو — تم صاحبِ سخا ہو محبوبِ کبریا ہو
ہے تم سے زیبِ امکاں حضرت سلیم چشتی

شاہ و گدا ہیں تابع سب تیری مملکت کے — لائق تم ہی ہو شاہا اس قدر و منزلت کے
پروردہ ہیں تمہارے سب خوانِ مکرمت کے — شاہا شرف تو بخشے خالق کی سلطنت کے
اور تم ہو میر ساماں حضرت سلیم چشتی

ہے نام پاک تیرا مشہور شہر و بن میں — کرتی ہیں یاد تم کو یہ جانیں ہیں جو تن میں
ہے خُلق کی تمہارے خوشبو گل و سمن میں — خدمت میں ہیں تمہاری فردوس کے چمن میں
جنت کے حور و غلماں حضرت سلیم چشتی

کعبہ سمجھ کے اپنا مشتاق تیرے در کو — کرتے ہیں آ زیارت دل سے جھکا کے سر کو

اوصاف تیرے ہر دم لیتے ہیں سیم و زر کو
پڑھتے ہیں مدح تیری گلشن میں ہر سحر کو
ہو بلبل خوش الحان حضرت سلیم چشتی

ہے سلطنت جہاں کی سب تیرے زیرِ فرماں
چاکر ہیں تیرے در کے فغفور اور خاقاں
خوانِ کرم پہ تیرے ہے خلق ساری مہماں
ہیں حکم میں تمہارے جن و پری و انساں
ہو وقت کے سلیماں حضرت سلیم چشتی

تم سب سے ہو معظم اور سب سے ہو مکرم
خلقت ہوئی تمہارے سب نور سے مجسم
اور خوبیاں جہاں کی تم پر ہوئیں مسلّم
ابرِ کرم سے تیرے دائم ہے سبز و خرم
عالم کا سب گلستاں حضرت سلیم چشتی

پشت و پناہ ہو تم ہر اک گدا و شہ کے
محتاج ہیں تمہاری اک لطف کی نگہ کے
منزل پہ آکے پہونچے سالک تمہاری رہ کے
خاکِ قدم تمہاری اور چشم مہر و مہ کے
ہو روشنی کے ساماں حضرت سلیم چشتی

چشم و چراغ ہو تم اب جملہ مومنیں کے
روشن ہیں تم سے پردے سب آسمان زمیں کے
بیشک ضیائے دل ہو ہر صاحبِ یقیں کے
ذرہ نہیں تفاوت تم آسماں ہو دیں کے
ہو آفتابِ رخشاں حضرت سلیم چشتی

عالم ہے سب معطر تیرے کرم کی بو سے
حرمت ہے دوستوں کی حضرت تمہارے رو سے
یہ چاہتا ہوں اب میں سو دل کی آرزو سے
رکھیو نظیر کو تم دو جگ میں آبرو سے
اے موجبِ ہر احساں حضرت سلیم چشتی

(۲۱) ہولی کی بہار

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی   اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی   خم شیشے جام چھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں چھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

ہو ناچ رنگیلی پریوں کا بیٹھے ہوں گلرو رنگ بھرے   کچھ بھیگی تانیں ہولی کی کچھ ناز و ادا کے ڈھنگ بھرے
دل بھولے دیکھ بہاروں کو اور کانوں میں آہنگ بھرے   کچھ طبلے کھڑکیں رنگ بھرے کچھ عیش کے دم منہ چنگ بھرے
کچھ گھنگرو تال جھنکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

سامان جہاں تک ہوتا ہے اس عشرت کے مطلوبوں کا   وہ سب سامان مہیا ہو اور باغ کھلا ہو خوبوں کا
ہر آن شرابیں ڈھلتی ہوں اور ٹھٹھ ہو رنگ کے ڈوبوں کا   اس عیش مزے کے عالم میں اک غول کھڑا محبوبوں کا
کپڑوں پر رنگ چھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

گلزار کھلے ہوں پریوں کے اور مجلس کی طیاری ہو   کپڑوں پر رنگ کے چھینٹوں سے خوش رنگ عجب گلکاری ہو
منہ لال گلابی آنکھیں ہوں اور ہاتھوں میں پچکاری ہو   اس رنگ بھری پچکاری کو انگیا پر تک کر ماری ہو
سینوں سے رنگ ڈھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اس رنگ رنگیلی مجلس میں وہ رنڈی ناچنے والی ہو   منہ جس کا چاند کا ٹکڑا ہو اور آنکھ بھی مے کی پیالی ہو
بدمست بڑی متوالی ہو ہر آن بجاتی تالی ہو   مے نوشی ہو بیہوشی ہو بھڑوے کے منہ میں گالی ہو
بھڑوے بھی بھڑوا بکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اور ایک طرف دل لینے کو محبوب بھویوں کے لڑکے   ہر آن گھڑی گت بھرتے ہوں کچھ گھٹ گھٹ کے کچھ بڑھ بڑھ کے

کچھ ناز جتا دیں لڑ لڑ کے کچھ ہولی گا دیں اڑ اڑ کے
کچھ لچکے شوخ کمر پتلی، کچھ ہاتھ چلے کچھ تن پھڑکے
کچھ کافر نین مٹکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

یہ دھوم مچی ہو ہولی کی اور عیش مزے کا جھکڑ ہو
اس کھینچا کھینچ گھسیٹی پر بھڑوے رنڈی کا پھکڑ ہو
معجون شرابیں، ناچ مزا اور ٹکیا سلفا، لکڑ ہو
لڑ بھڑ کے نظیر بھی نکلا ہو کیچڑ میں لتھڑ پتھڑ ہو
جب ایسے عیش مہکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

(۲۲) نانک شاہ گرو

ہیں کہتے نانک شاہ جنھیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو
وہ کامل رہبر ہیں جگ میں یوں روشن جیسے ماہ گرو
مقصود، مراد، امید، سبھی بر لاتے ہیں دلخواہ گرو
نت لطف و کرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرباہ گرو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

ہر آن دلوں بیچ یاں اپنے جو دھیان گرو کا لاتے ہیں
اور سیوک ہو کر ان کے ہی ہر صورت بیچ کہاتے ہیں
گر اپنی لطف و عنایت سے سکھ چین انھیں دکھلاتے ہیں
خوش رکھتے ہیں ہر حال انھیں سب من کا کاج بناتے ہیں
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

جو آپ گرو نے بخشش سے اس خوبی کا ارشاد کیا
ہر بات وہ ہے اس خوبی کی تاثیر نے جس پر صاد کیا
یاں جس جس نے ان باتوں کو ہے دھیان لگا کر یاد کیا
ہر آن گرو نے دل اس کا خوش وقت کیا اور شاد کیا
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو

سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

دن رات جنھوں نے یاں دل بیچ ہے یاد گرو سے کام لیا / سب من کے مقصد بھر پائے خوش وقتی کا ہنگام لیا
دکھ درد میں اپنے دھیان لگا جس وقت گرو کا نام لیا / پل بیچ گرو نے آن انھیں خوش حال کیا اور تھام لیا
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

یاں جو جو دل کی خواہش کی کچھ بات گرو سے کہتے ہیں / وہ اپنی لطف و شفقت سے نت ہاتھ انھوں کے گہتے ہیں
الطاف سے اُن کے خوش ہو کر سب خوبی سے یہ سکتے ہیں / دکھ درد انھوں کے کھوتے ہیں سو سکھ سے جگ میں رہتے ہیں
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

جو ہر دم اُن سے دھیان لگا امید کرم کی دھرتے ہیں / وہ اُن پر لطف و عنایت سے ہر آن توجہ کرتے ہیں
اسباب خوشی اور خوبی کے گھر بیچ انھوں کے بھرتے ہیں / آنند عنایت کرتے ہیں سب من کی چنتا ہرتے ہیں
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

جو لطف و عنایت ان میں ہیں کب وصف کسی سے اُن کا ہو / وہ لطف و کرم جو کرتے ہیں ہر چار طرف ہیں ظاہر وُو
الطاف جنھوں پر ہیں اُن کے سو خوبی حاصل ہے اُن کو / ہر آن نظیر اب یاں تم بھی تو بابا نانک شاہ کہو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

۲۳ جنم کنہیا جی

ہے ریت جنم کی یوں ہوتی جس گھر میں بالا ہوتا ہے — اُس منڈل میں ہر من بھیتر سکھ چین دوبالا ہوتا ہے
سب بات بدھائی کی جھومے ہے جب بھولا بھالا ہوتا ہے — آنند منڈیلے باجت ہیں نت بھون اُجالا ہوتا ہے

یوں نیک نچھتر لیتے ہیں اس دنیا میں سنسار جنم
پر اُن کے اور ہی لچھن ہیں جب لیتے ہیں اوتار جنم

سبھ ساعت سے یوں دُنیا میں اوتار گربھ میں آتے ہیں — جو نارد منی ہے دہیان بھلی سب ان کا بھید بتاتے ہیں
وہ نیک مہورت سے جس دم اس سرشٹ میں جنمے جاتے ہیں — جو لیلا رچنی ہوتی ہے وہ روپ یہ جا دکھلاتے ہیں

یوں دیکھنے میں اور کہنے میں وہ روپ تو بالے ہوتے ہیں
پر بالے ہی پن میں اُن کے اُپکار نرالے ہوتے ہیں

یہ بات کہی جو میں نے اب یوں اس کو تو اب دہیان لگا — ہے پنڈت پستک بیچ لکھا تھا کنس جو راجا متھرا کا
دھن ڈھیر بہت بل بیچ نپٹ سامان انیک اور ٹھاٹھ بڑا — گج اور ترنگ اچھے نیکے انباری ہودے زین سجا

جن بن ٹھن اونچے ہستی پر وہ باہر آن نکلتا تھا
سب ساز جھلا جھل کرتا تھا اور سنگ کٹک دل چلتا تھا

اک روز جو اپنے بھُج بل پر وہ کنس بہت مغرور ہوا — اور ہنس کر بولا دنیا میں ہے دوجا کون بلی مجھ سا
اک بان لگا کر پربت کو چاہوں تو دوں اک پل میں گرا — اس دنیا میں کے بڑھ بل جتنے ہیں ہے کون جو مجھ سے ہووے سوا

جو دُشٹ کوئی آ جُدھ کرے کب مول پروا کا تو رہے چلے
وہ سامنے میرے ایسا ہو جوں چیونٹی ہاتھی پاؤں تلے

وہ ایسے ایسے کتنے ہی جو بول گربھ کے کہتا تھا سب لوگ سبھا کے سنتے تھے کیا تاب جو بولے کوئی ذرا
تھا ایک پرکھ وہ یوں بولا "تو بھولا اپنے بل پر کیا جو تیرا مارن ہارا ہے سو وہ بھی جنم اب لیوے گا
تو اپنے بل پر ہائے مورکھ اس آن عبث بنکار لیا
وہ تجھ کو مار گراوے گا یوں جیسے جھنگا مار لیا"

یہ بات سنی جب کنس نے واں تب سن کر اس کے ہوش اُڑے جھومن کے بھیتر آن بھرا اور بول گربھ سگرے بسرے
یوں پوچھا "وہ کس دیس میں ہے، اور کون ہنوں آ کر جنمے کون اُس کے مات پتا ہووَیں جو پالیں اُس کو چاہت سے"
وہ بولا "متھرا نگری میں اک روز جنم وہ پاوے گا
جب سیانا ہوگا تب تجھ کو اک پل میں مار گراوے گا"

یہ بات سنائی کنس کو پھر اور آٹھ لکیریں واں کھینچیں بسدیو پتا کا ناؤں کہا اور دیوکی ماتا ٹھہرائیں
اُن آٹھ لکیروں کی باتیں پھر کنس کو اس نے سمجھائیں سب چھوڑا چھوری دیوکی کے ہیں جگ میں ہوتے آٹھ یہ ہیں
بل تیج کرب میں تو نے تو سب کا رچ گیان بسارا ہے
جو ان میں تیرا رکھا آٹھواں ہے وہ تیرا مارن ہارا ہے

اس بات کو سن کر کنس بہت تب من میں اپنے گھبرایا جب نارد من اُس پاس گئے تب اُن سے اس نے بھید کہا
تب نارد من نے اس کو بھی کچھ اور طرح سے سمجھایا پھر کنس کو واں اس بات سوا کچھ اور نہ مارگ بن آیا
جو اپنی جان بچانے کا کر سوچ یہ اُس نے پسند کیا
بلوا بسدیو اور دیوکی کو اک مندر بھیتر بند کیا

جب قید کیا ان دونوں کو تب چوکیدار دیئے تھلا اک آن نہ نکسن پاویں یہ پھر اُن سب کو یہ حکم دیا
سامان رسوئی کا جو تھا سب اُن کے پاس دیا رکھوا اور دوار دیئے اُس مندر کے تب بھاری تالے بھی جڑوا
ہشیار لگے یوں رہنے واں نت چوکی کے دینے ہارے

کیا تاب جو کوٹھے چھجے پر اک آن پرندہ پر مارے

بھو بیٹھا تھا جو کنس کے من وہ بھر کر نیند نہ سوتا تھا   کچھ بات سہاتی نا اس کو نت اپنی پلک بھگوتا تھا
اس مندر میں اُن دونوں کے جب کوئی بالک ہوتا تھا   کنس آن اُسے چھپ مارے تھا من مات پتا کا روتا تھا

اک مدت تک ان دونوں کا اس مندر میں یہ حال رہا
جو بالک ان کے گھر جنما سو مارتا وہ چنڈال رہا

پھر آیا واں اک وقت ایسا جو آئے گرب میں منموہن   گوپال، منوہر، مرلیدھر، سیکشن، کشورن، کنول نین
گھنشام، مراری، بنواری، گردھاری، سندر، شیام برن   پربھوناتھ بہاری کان للا سکھدائی جگ کے دکھ بھنجن

جب ساعت پرگھٹ ہونے کی واں آئی مکٹ دھریا کی
اب آگے بات جنم کی ہے جے بولو کشن کنھیا کی

تھا نیک مہینہ بھادوں کا اور دن بدھ، گنتی آٹھن کی   پھر آدھی رات ہوئی جس دم اور ہوا نچھتر روہنی کا
سبھ ساعت نیک مہورت سے واں جنمے آ کرشن جبھی   اس مندر کی اندھیاری میں جو اور اجالی آن بھر

بسدیو سے بولیں دیوکی جی "مت ڈر بھو من میں دھیر کرو
اس بالک کو تم گوکل میں لے پہنچو اور مت دیر کرو"

جو تم اس کے لے جانے میں یاں تک بھی دیر لگاؤ گے   وہ دُشٹ اسے بھی مارے گا پچھتاتے ہی رہ جاؤ گے
اس آن سنبھل کر تم اس کو جو گوکل میں پہنچاؤ گے   اس بات میں یہ پھل پاؤ گے جو اس کی جان بچاؤ گے

واں گوکل باسی جو اس کو لے اپنی گود سنبھالے گا
کچھ نام وہ اس کا رکھ لے گا اور مہر دیا سے پالے گا

جو حال یہ واں جا پہنچے گا تو اس کا جی بچ جاوے گا   جو کرم لکھی ہے تو پھر بھی کچھ ہم کو آن دکھاوے گا
جس گھر کے بیچ پلے گا یہ وہ گھر ہم کو بتلا دے گا   ہم اس سے ملنے جاویں گے یہ ہم سے ملنے آوے گا

نے کام ہمیں کچھ دعوے سے نے جھگڑا اور بکھیڑے سے
جب دیکھیں کو من بھٹکے گا سکھ پاویں گے اس کے دیکھے سے

ہے آدھی رات ابھی تو یاں سے جاؤ اسے تم چال اُدھر — لپٹا لو اپنی چھاتی سے دے آؤ جا کے اور کے گھر
من بیچ انھوں کے تھا ڈر یہ دن ہو دے گا تو کنس آکر — اک آن میں اس کو مارے گا رہ جاویں گے ہم آنسو بھر
یہ بات نہ تھی معلوم انھیں یہ بالک جگ نستارے گا
کب مار سکے گا کنس اسے یہ کنس کو آپ ہی مارے گا

جب دیوکی نے بسدیو جی سے واں رو رو کر یہ بات کہی — وہ بولے "کیونکر لے جاؤں سے باہر تو چوکی بیٹھی
اور دوار لگے ہیں تالے کل کچھ بات نہیں ہے بس کی" — نت دیوکی بولی "لے جاؤ من ایشر کی رکھ آس ابھی"
وہ بالک کو جب لے نکلے سب سانکر پٹ پٹ چھوٹ گئے
تھے تالے جتنے دوار لگے اس آن جھڑا جھڑ ٹوٹ گئے

جب آئے چوکیداروں میں تب واں بھی یہ صورت دیکھی — سب سوتے پائے اس ساعت ہر آن جو دیتے تھے چوکی
جب سوتا دیکھا اُن سب کو ہو نربھو نکلے واں سے بھی — پھر آئے جمنا پہ جو ہیں پھر جمنا دیکھی بہت چڑھی
یہ سوچ ہوا من بیچ انھیں پر اس جل میں کیسے دھریے
ہے رین اندھیری بالک سنگ اس بپتا میں اب کیا کریے

یوں من میں ٹھرا پھر چلیے پھر آپ ہی من مضبوط ہوا — بھگوان دیا پر آس لگا واں جمنا جی پر دھیان دھرا
یہ جوں جوں پاؤں بڑھاتے تھے وہ پانی چڑھتا آتا تھا — یہ بات لگی جب ہونے واں بسدیو گئے من میں گھبرا
تب پاؤں بڑھائے بالک نے جو آپ سے اور بھیگے جل میں
جب جمنا نے پگ چوم لیے جا پہنچے پار وہ اک پل میں

جب آن براجے گوکل میں سب پھاٹک ان کو پائے کھلے — تب واں سے چلتے چلتے وہ پھر نند کے دوارے آ پہنچے

واں نند محل کے دوارے بھی سب دیکھے پٹ پٹ دور کھڑے   جو چوکی والے سوتے تھے اب کون انہیں روکے ٹوکے
جب بیچ محل کے جا پہونچے سب سوتے واں گھر والے تھے
ہر چار طرف اجیالی تھی جوں سانجھ میں دیوے بالے تھے
اک اور اچنبھا یہ دیکھو جو رات جنم سی کشن کی تھی   اس رات جسودا کے گھر میں تھی جنمی یارو اک لڑکی
واں سوتے دیکھ جسودا کو اور بدلی کر اس بالک کی   اس لڑکی کو وہ آپ اٹھا لے نکلے آئے متھرا جی
جب لڑکی لائے مندر میں سب تالے مندر لاگ اٹھے
جو چوکی دینے والے تھے پھر وہ بھی اس دم جاگ اٹھے
جب بھور ہوئی تب گھبرا کر سدھ کنس نے لی اس منڈل کی   جب تالے کھلوا بیچ گیا تب لڑکی جنمی اک دیکھی
لے ہاتھ پھرایا چکر دے، تو پٹکے وہ بن پٹکے ہی   یوں جیسے بجلی کوندے ہے جب چھوٹ ہوا پر جا پہونچی
یہ کہتی نکلی "اے مورکھ کیا تو نے سوچ بچارا ہے
وہ جیتا اب تو سیس مکٹ، جو تیرا مارن ہارا ہے"
جب کنس نے واں یہ بات سنی من بیچ بہت سا لجیایا   جو کارج ہونے والا ہے وہ ٹالے سے کب ہے ٹلتا
سو فکر کرو سو پیچ کرو سو بات سناؤ حاصل کیا   ہر آن وہی یاں ہونا ہے جو ماتھے کے ہے بیچ لکھا
ہیں کہتے بدھ جسے اب یاں، وہ سوچ بڑے ٹھہراتی ہے
تقدیر کے آگے پر یارو تدبیر نہیں کام آتی ہے
اب نند کے گھر کی بات سنو واں ایک اچنبھا یہ ٹھہرا   جو رات کو جنمی تھی لڑکی اور بھور کو دیکھا تو لڑکا
گھڑ نالیں چھوٹیں، ناچ ہوا اور نوبت کا غل شور مچا   پھر کشن گرگ نے نام رکھا سب کنبے کے مل بیٹھے
نندا اور جسودا اور گوات کرنے واں ہیرا پھیر لگے
پکوان مٹھائی میوے کے ہر ناری آگے ڈھیر لگے

سب ناری آئیں گوکل کی اور پاس پڑوسن آ بیٹھیں　　کچھ ڈھول مجیرے لاتی تھیں کچھ گیت بچا کے گاتی تھیں
کچھ ہردم مُکھ اس بالک کا بلہاری ہوکر دیکھ رہیں　　کچھ تھال پنجیری کے رکھتیں کچھ سونٹھ سٹھورا کرتی تھیں
کچھ کہتی تھیں "ہم بیٹھے ہیں نیگ آج کے دن کا لینے کو"
کچھ کہتیں "ہم تو آئے ہیں آنند بدھاوا دینے کو"
کوئی گھٹی بیٹھی گرم کرے کوئی ڈالے اسپند اور بھوسی　　کوئی لاتی ہنسلی اور کڑوے کوئی کرتہ ٹوپی میوہ گھی
کوئی دیکھے روپ اس بالک کا کوئی ماتھا چومے مہر بھری　　کوئی بھنوؤں کی تعریف کرے کوئی آنکھوں کی کوئی پلکوں کی
کوئی کہتی عمر بڑی ہووے اسے بیر تمہارے بالے کی
کوئی کہتی بیاہ بھولاؤ اس آس مرادوں والے کی
کوئی کہتی "بالک خوب ہوا اے بھینا تیری نیک رتی　　یہ بالے اُن کو ملتے ہیں جو دنیا میں ہیں بڑھ بھاگی
اس کنبے کی بھی شان بڑھی اور بھاگ بڑھے اس گھر کے بھی　　یہ باتیں سب کی سُن سُن کر یہ بات جسودا کہتی تھی
"لے بیر یہ بالک جو ایسا اب میرے گھر میں جنما ہے
کچھ اور کہوں میں کیا تم سے بھگوان کی مو پر کرپا ہے"
تھی کونے کونے خوش وقتی اور طبلے تال کھٹکتے تھے　　کوئی ناچ رہی کوئی کود رہی کوئی ہنس ہنس کے کچھ روپ سجے
ہر چار طرف آنندیں تھیں واں گھر میں نند جسودا کے　　کچھ آنگن بیچ براجے تھیں کوئی بیٹھی کوٹھے اور چھجے
سو خوبی اور خوش حالی سے دکھلاتی تھی سامان کھڑی
سچ بات ہے بالک ہونے کی ہے دنیا میں آنند بڑی
پھر اور خوشی کی بات ہوئی جب رِیت ہوئی دُودھ کاندوں کی　　رکھوائی دودھ کی مٹکی بھر اور ڈالی ہلدی بُہتیری
یہ اس پر چھینٹے بھر بھر کر وہ اس پر ڈالے گڑ کھڑی　　کوئی پوچھے مُکھ اور باہن کو کوئی سگری بھیگی اور نتھری
اس دودھ کی بھی رنگ رلیوں میں روپ اور ہوا ہر ناری کا

اور تن کے ابرن یوں بھیگے، جوں رنگ ہو کیسر کیاری کا

سکھ منڈل میں یہ دھوم مچی اور باہر سنگی جوگی بھی　　کچھ ناچیں بھانڈ بھگتیے بھی کچھ ہیجڑے پاویں بیل بری
آنند بدھاوے باج رہے نرسنگھے سُرتا اور ترئی　　رنگین سنہرے پالنے بھی نے ہاتھ کڑے کتنے برتی
ہر آن اٹھاتے تھے مانگ کیا گنتی سونے روپے کی
نند اور جسودا نے ایسی کی شادی بالک ہونے کی

جو نیگی جوگی تھے ان کو اس آن نپٹ خوش حال کیا　　پھر آئے باگے ریشم کے اور زر بھی بخشا بہتیرا
اور جتنے ناچنے والے تھے اسباب انھیں بھی خوب دیا　　مہمان جو گھر میں آئے تھے سب ان کا بھی ارمان رکھا
دن رات چھٹی کے ہونے تک من خوش کیا لوگ لگائی کا
بھر تھال روپے اور مُہریں دیں جب نیگ چکایا دائی کا

نند اور جسودا بالک کو واں ہاتھوں چھاؤں میں رکھتے تھے　　نت پیار کریں تن من واریں ستھری ابرن گہنے بنگے
جی بہلاتے من پرچاتے اور خوب کھلونے منگواتے　　ہر آن جھلاتے پلنے میں وہ ادھر اور ادھر سب بیٹھے
کر یاد نظیر اب ہر ساعت اس پالنے اور اس جھولے کی
آنند سے بیٹھو چین کرو سبے بولو کانھ جھنڈولے کی

(۲۴) بانسری

جب مرلی دھر نے مرلی کو اپنی ادھر دھری　　کیا کیا پریم پریت بھری اس میں دُھن بھری
لَے اس میں رادھے رادھے کی ہر دم بھری کھری　　لہرائی دُھن جو اس کی ادھر اور ادھر ذری
سب سننے والے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری

ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

کتنے تو اس کے سننے سے دُھن ہو گئے دھنی   کتنوں کی سدھ بسر گئی جس دم وہ دُھن سُنی
کتنوں کے من سے کل گئی اور بیاکلی چُھنی   کیا نر سے لے کے ناریاں کیا کوڑھ کیا گنی
سب سُننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

جس آن کانہہ جی کو وہ بنسی بجاونی   جس کان میں وہ آونی واں سدھ بھلاونی
ہر من کی ہو کے موہنی اور چت لبھاونی   نکلی جہاں دُھن اس کی وہ میٹھی سُہاونی
سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

جس دن سے اپنی بنسی وہ سیکشن نے سجی   اس سانورے بدن پہ نپٹ آن کر سجی
مرلی بھلایا آپ کو ناری نے سُدھ تجی   ان کی اُدھر سے آ کے وہ بنسی جدھر بجی
سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

گوالوں میں نند لال بجاتے وہ جس گھڑی   گوپیں دُھن اس کی سننے کو رہ جاتیں سب کھڑی
گلیوں میں جب بجاتے تو وہ اس کی دُھن کڑی   لے لے کے اپنی لہر جہاں کان میں پڑی
سب سُننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

بنسی کو مرلی دھر جی بجاتے گئے جدھر   پھیلی وہ دھن اُس کی زور ہر اک دل میں کر اثر
سنتے ہی اس کی دُھن کی حلاوت ادھر اُدھر   منہ چنگ اور نے کی دھنیں دل سے بھول کر

سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

بن میں اگر بجاتے تو واں بھی یہ اُس کی چاہ — کرتی دُھن اُس کی پنچھی بڑہی کے دل میں راہ
بستی میں جو بجاتے تو کیا شام کیا پگاہ — پڑتے ہی دھن وہ کان میں بلہاری ہو گئے واہ

سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

کتنے تو اس کی دھن کے لئے رہتے بیقرار — کتنے لگائے کان اُدھر رکھتے بار بار
کتنے کھڑے ہو راہ میں کر رہتے انتظار — آئے جدھر بجاتے ہوئے شیام جی مُرار

سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

موہن کی بانسری کے میں کیا کیا کہوں جتن — لے اس کی من کی موہنی دُھن اس کی چت ہرن
اس بانسری کا آن کے جس جا ہوا بجن — کیا چل پرن نظیرؔ پکھیرو و کیا ہرن

سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

(۲۵) آگرہ کی تیراکی

جب پیرنے کی رُت میں دلدار پیرتے ہیں — عاشق بھی ساتھ ان کے غمخوار پیرتے ہیں
بھولے سیانے ناداں ہشیار پیرتے ہیں — پیر و جوان و لڑکے عیار پیرتے ہیں

ادنیٰ غریب مفلس زردار پیرتے ہیں
اِس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

جھرلے سے لیکے یاروجبّا کا تا پیالہ ‎ چھتری سے برج خونی دارا کا چونترا کیا
مہتاب باغ اسید، تیلی، قلعہ و روضہ ‎ غل شور کی بہاریں انبوہ سیر چرچا
ہر اک مکاں میں ہو کر ہشیار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

باغ حکیم اور جو شیوداس کا چمن ہے ‎ اُن میں جگہ جگہ پر مجلس ہے انجمن ہے
میوہ مٹھائی کھانے اور ناچ دل لگن ہے ‎ کچھ پیرنے کی دھومیں کچھ عیش کا چلن ہے
ہر اک مکاں میں ہو کر ہشیار پیرتے ہیں
اِس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

برسات میں جو آکر چڑھتا ہے خوب دریا ‎ ہر جا گھڑی دچادر، بند اور ناند چکوا
بینڈا، بھنور، اچھالن، چکر، سمیٹ، مالا ‎ بینڈا، گھمیر، تخت، کتے، پچھاڑ، سرا
واں بھی ہنر سے اپنے ہشیار پیرتے ہیں
اِس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

تربینی میں اہا ہا ہوتی ہیں کیا بہاریں ‎ خلقت کے ٹھٹھ ہزاروں ہر اک کی قطاریں
پیریں نہادیں اُچھلیں کودیں لڑیں پکاریں ‎ لیتے وہ چھینٹ غوطے کھا کھا کے ہاتھ ماریں
کیا کیا تماشے کر کر اظہار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

جمنا کا پاٹ گویا صحن چمن سبز بارے ‎ ہر اک اس میں پیریں جیسے کہ چاند تارے

مُنہ چاند کے سے ٹکڑے تن گورے پیارے پیارے   پریوں سے بھر رہے ہیں منجدھار اور کنارے
کچھ وار پیرتے ہیں کچھ پار پیرتے ہیں
اِس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

کتنے کھڑے ہی پیریں اپنا دکھا کے سینہ   سینہ چمک رہا ہے ہیرے کا جوں نگینہ
آدھے بدن پہ پانی آدھے پہ ہے پسینہ   سروؤں کا بہ چلا ہے گویا کہ اک قرینہ
دامن کمر پہ باندھے دستار پیرتے ہیں
اِس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

جاتے ہیں ان میں کتنے پانی پہ صاف سوتے   کتنوں کے ہاتھ پنجرے کتنوں کے سر پہ طوطے
کتنے پتنگ اُڑاتے کتنے سوئی پروتے   حقوں کا دم لگاتے ہنس ہنس کے شاد ہوتے
سو سو طرح کا کر کر بستار پیرتے ہیں
اِس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

کچھ ناچ کی بہاریں پانی کے کچھ لتاڑے   دریا میں بیچ رہے اندر کے سو اکھاڑے
لب ریز گلرخوں سے دونوں طرف کرارے   بجرے و ناؤ، چپو، ڈونگے بجنے، نواڑے
اِن جمگھٹوں سے ہو کر سرشار پیرتے ہیں
اِس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

ناؤں میں وہ جو گلرو ناچوں میں جھک رہے ہیں   جوڑے بدن میں رنگیں گہنے جھمک رہے ہیں
تانیں ہوا میں اُڑتیں طبلے کھڑک رہے ہیں   عیش و طرب کی دھومیں پانی چھپک رہے ہیں
سو ساٹھ کے بنا کر اطوار پیرتے ہیں
اِس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

ہر آن بولتے ہیں سید کبیر کی جے   پھر اس کے بعد اپنے اُستاد پیر کی جے
مورو مکٹ کنہیا، جمنا کے تیر کی جے   پھر غول کے سب اپنے خورد و کبیر کی جے
ہر دم یہ کر خوشی کی گفتار پیرتے ہیں
اِس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

کیا کیا نظیر یاں کے ہیں پیرنے کے بانی   ہے جن کے پیرنے کی ملکوں میں آن مانی
اُستاد اور خلیفہ شاگرد یار جانی   سب خوش رہیں ہے جب تک جمنا کے بیچ پانی
کیا کیا ہنسی خوشی سے ہر بار پیرتے ہیں
اِس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

(۲۶) موسمِ زمستان

جب ماہ اگھن کا ڈھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی   اور ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
دن جلدی جلدی چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی   پالا بھی برف پگھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
چلا غم ٹھونک اُچھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

دل ٹھوکر مار پچھاڑا ہو اور دل سے ہوتی ہو کشتی سی   تھر تھر کا زور اکھاڑا ہو، بجتی ہو سب کی بتیسی
ہو شور پھپو پھو، ہو ہو کا اور دھوم ہو سی سی ہا ہا کی   کٹکے پر کٹکا لگ کر چلتی ہو منہ میں چکی سی
ہر دانت چنے سے دلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ہر ایک مکاں میں سردی نے آ باندھ دیا ہو یہ چکر   جو ہر دم کپ کپ ہوتی ہو ہر آن کڑا کڑ اور تھر تھر
بیٹھی ہو سردی رگ رگ میں اور برف پگھلتا ہو پتھر   جھڑ باندھ مہاوٹ پڑتی ہو اور تس پر لہریں لے لے کر

سنّاٹا باؤ کا چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ہر چار طرف سے سردی ہو اور صحن کھلا ہو کوٹھے کا   اور تن میں نیمہ شبنم کا ہو جس میں خس کا عطر لگا
چھڑکاؤ ہوا ہو پانی کا اور خوب پلنگ بھی ہو بھیگا   ہاتھوں میں پیالہ شربت کا ہو آگے اک فرّاش کھڑا
فرّاش بھی پنکھا جھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

جب ایسی سردی ہو اے دل تب زور مزے کی گھاتیں ہو   کچھ نرم بچھونے مخمل کے کچھ عیش کی لمبی راتیں ہوں
محبوب گلے سے لپٹا ہو اور کہنی چٹکی لاتیں ہوں   کچھ بوسے ملتے جاتے ہوں کچھ میٹھی میٹھی باتیں ہوں
دل عیش و طرب میں پلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ہو فرش بچھا غالیچوں کا اور پردے چھوٹے ہوں آ کر   اک گرم انگیٹھی جلتی ہو اور شمع ہو روشن اور تس پر
وہ دلبر شوخ پری چنچل ہے دھوم مچی جس کی گھر گھر   ریشم کی نرم نہالی پر سو ناز و ادا سے ہنس ہنس کر
پہلو کے بیچ مچلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ترکیب بنی ہو مجلس کی اور کافر ناچنے والے ہوں   منہ ان کے چاند کے ٹکڑے ہوں تن ان کے روئی کے گالے ہوں
پوشاکیں نازک رنگوں کی اور اوڑھے شال دوشالے ہوں   کچھ ناچ اور رنگ کی دھومیں ہوں کچھ عیش میں ہم متوالے ہوں
پیالے پر پیالہ چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ہر ایک مکاں ہو خلوت کا اور عیش کی سب تیاری ہو   وہ جان کہ جس سے جی غش ہو سو ناز سے آ جھنکاری ہو
دل دیکھ نظیرؔ اِس کی چھب کو ہر آن ادا پر واری ہو   سب عیش مہیا ہو آ کر جس جس ارمان کی باری ہو
جب سب ارمان نکلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

(۲۷) اُومس

کیا ابر کی گرمی میں گھڑی پہر ہے اُومس　　گرمی کے بڑھانے کی عجب لہر ہے اُومس
پانی سے پسینوں کی بڑی نہر ہے اُومس　　ہر باغ میں ہر دشت میں ہر شہر ہے اُومس
برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُومس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُومس

کتنے تو اس اُومس کے تئیں کہتے ہیں گرماؤ　　یعنی کہ گھرا ابر ہو اور آکے رکے باؤ
اس وقت تو پڑتا ہے غضب جان میں گھبراؤ　　دل سینہ میں بیکل ہو یہی کہتا ہے کھاتا ؤ
برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُومس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُومس

بدلی کے گھر آنے سے ہوتی ہے ہوا بند　　پھر بند سی گرمی وہ غضب پڑتی ہے یک چند
پھینکے کوئی پگڑی کوئی کھولے ہے کھڑا بند　　دم رُک کے گھٹا جاتا ہے گرمی سے ہر اک بند
برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُومس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُومس

ایدھر تو پسینوں سے بڑی بھیگے ہیں کھاٹیں　　گرمی سے اُدھر میل کی کچھ چیونٹیاں کاٹیں
کپڑا جو پہنئے تو پسینے اُسے آٹیں　　ننگا جو بدن رکھئے تو پھر مکھیاں چاٹیں
برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُومس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُومس

رُکنے سے ہوا کے جو بُرا ہوتا ہے احوال — پنکھا کوئی آنچل کوئی دامن کوئی، رومال
دم دھونکنے لگتا ہے لُہاروں کی گویا کھال — کچھ روح کو بےتابیاں کچھ جان کو جنجال

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُمس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُمس

گھبرا کے کبھی آتا ہے دم جاتا ہے بھولا — آرام جو دل کا ہے سبھی جاتا ہے بھولا
آتا ہے کبھی ہوش کبھی جاتا ہے بھولا — کپڑے بھی بُرے لگتے ہیں جی جاتا ہے بھولا

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُمس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُمس

ہوتی ہے اُمس جو کبھی اک رات کو آکر — کر ڈالتی ہے پھر تو قیامت ہی مقرر
ایدھر تو ہوا بند اُدھر پسّو و مچھر — پانی کوئی پیوے تو ادھن سے بھی وہ بدتر

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُمس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُمس

جس وقت ہوا بند ہو اور آکے گھٹا چھائے — پھر کیسے دل اس گرمی میں کس طرح نہ گھبرائے
اوڑھو تو پسینہ جو نہ اوڑھو تو غضب آئے — پسّو کبھی مچھر کبھی کھٹمل ہی لپٹ جائے

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُمس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُمس

گر اس میں ہوا کھل گئی اور پانی بھی لائی — تو جی میں جی اور جان میں کچھ جان سی آئی
اور اس میں جو پھر ہو گئی اُمس کی چڑھائی — تو پھر وہی رونا وہی غل شور دہائی

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُمس

سب چیز تو اچھی ہے پر اک تھر ہے اُدمس

اُدمس میں تو لازم ہے کہ پنکھا نہ ہوا ہو — اک کوٹھڑی ہو جس میں دھواں آکے بھرا ہو
اور مکھیوں کے واسطے گڑ تن سے ملا ہو — اس وقت مزا دیکھئے اُدمس کا کہ کیا ہو

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُدمس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک تھر ہے اُدمس

اس رُت میں تو واللہ عجب عیش ہے دلخواہ — مینہ برسے ہے اور سرد ہوا آتی ہے ہر گاہ
جنگل بھی ہرے گل بھی کھلے سبز چراگاہ — اُدمس ہی مگر دل کو ستاتی ہے نظیرؔ آہ

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُدمس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک تھر ہے اُدمس

(۲۸) کورا برتن

کورے برتن ہیں کیاری گلشن کی — جس سے کھلتی ہے ہر کلی تن کی
بوند پانی کی اُن میں جب کھنکی — کیا وہ پیاری صدا ہے سَن سَن کی

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

پانی کی آپ اب بڑی ہے ذات — قطرہ قطرہ ہے جس کا آبِ حیات
کورے برتن میں جبکہ آیا بات — پھر تو آبِ حیات کبھی ہے مات

تازگی جی کی اور تری تن کی

واہ کیا بات کورے برتن کی

وہ جو پانی کی کوری گولی ہے   وہی آنسو کے مول کولی ہے
کیا ہی ٹھنڈی دوا کی گولی ہے   کیا کہوں گولی گولی گولی ہے

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

یہ جو گولی کی بولیاں باندھیں   ہم نے پانی کی گولیاں باندھیں
سوندھی سوندھی ٹھٹولیاں باندھیں   دل نے پھولوں کی جھولیاں باندھیں

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

کورا کمہاری کا جو ہے مٹکا   اس کا جوبن کچھ اور ہی مٹکا
لے گیا جان پاؤں کا کھٹکا   دل گھڑے کی طرح سے دے پٹکا

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

کوری ٹھلیا یہ دیکھ کر لوٹا   دل لگا ہونے کچھ کھرا کھوٹا
گرچہ لوٹا وہ قد کا ہے چھوٹا   جس نے دیکھا اسی کا دل لوٹا

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

کورے کوزوں کو دیکھ لو سالم ہیں   کوزے مصری کے بھر گئے غم میں
یوں وہ رستے ہیں آب کے نم میں   جیسے ڈوبے ہوں پھول شبنم میں

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

وہ جو کورا سفید جھجر ہے   جس کی جا کیسر ملک جھجر ہے
بیل بوٹے سے اس جھجھک پر ہے   تاشش کواب یا شجر ہے
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

جس صراحی میں سرد پانی ہے   موتی کی آب پانی پانی ہے
زندگی کی یہی نشانی ہے   دوستو یہ بھی بات پانی ہے
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

جتنے نذر و نیاز کرتے ہیں   اور جو پیروں سے اپنے ڈرتے ہیں
جب کہ لا پھول پان دھرتے ہیں   وہ بھی کوری ہی ٹھلیاں بھرتے ہیں
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

خاک سے جب کہ ان کو گڑھتے ہیں   بندگی سے یہ اپنی بڑھتے ہیں
کوروں پر پھول ہار چڑھتے ہیں   حور و غلمان درود پڑھتے ہیں
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

کوروں پہ جو تقلیر بنا ہوا ہے   جو چھپے میں کہاں وہ کھلی کھوج ہے

جس گھڑونچی پہ کورا باسن ہے　　وہ گھڑونچی نہیں ہے گلشن ہے
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

(۲۹) کوا اور ہرن کا بچہ

اک دشت میں سُنا ہے کہ اک خوب تھا ہرن　　بچہ ہی تھا ابھی نہ ہوا تھا بڑا ہرن
پھرتا تھا چوکڑی کا دکھاتا مزا ہرن　　دیکھا جو ایک کوے نے وہ خوشنما ہرن
دل کو نہایت اس کے وہ اچھا لگا ہرن

دو باتیں کرکے کوے نے اس کو لگا لیا　　دم میں ہرن بھی کوے کی الفت میں آگیا
کوے ہرن میں ٹھیری جو گہری محبت آ　　کوا جدھر جدھر کو خوشی ہو کے جاتا تھا
پھرتا تھا اس کے ساتھ لگا جا بجا ہرن

اِک گیدڑ اس ہرن کے کہنے آکے نابکار　　بولا ہزار جان سے میں تم پہ ہوں نثار
مجھ کو بھی اپنا جان غلام اور دوستدار　　اور دل میں یہ کہ کیجئے کس طور سے شکار
اس کے دغا و مکر سے واقف نہ تھا ہرن

گیدڑ یہ کہہ کے مکر سے جس دم گیا اُدھر　　کوا ہرن سے کہنے لگا کرکے شور و شر
یہ سخت مکر باز ہے کر اس سے تو حذر　　اک دن دغا سے تجھ کو یہ پکڑے گا فتنہ گر
سن کر یہ بات کوے کی چپ ہو رہا ہرن

دن دوسرے ہرن کنے گیدڑ پھر آگیا　　کوے کو سوتا دیکھ یہ بولا وہ پُر دغا

میں آج دیکھ آیا ہوں اک کھیت کیا ہرا　　تم کھاؤ اس کو چل کے تو ہو شاد دل مرا
سنتے ہی اس کے ساتھ اچھلتا چلا ہرن

جس کھیت پر یہ لے کے گیا اس کو بدسگال　　واں پہلے دیکھ آیا تھا وہ اک ہرن کا جال
لے پہنچا جب ہرن کے تئیں کھیت پر شغال　　جاتے ہی واں ہرن نے دیا منہ کو اس میں ڈال
منہ ڈالتے ہی جال میں واں پھنس گیا ہرن

واں پھڑپھڑاتا آ گیا کوا بھی ناگہاں　　گیدڑ کو دے کے گالی ہرن سے کہا کہ ہاں
تڑپے مت اس میں ورنہ تو ہو دے گا ناتواں　　کوے کی بات سنتے ہی ہمت کو باندھ واں
جیسے کہ گر پڑا تھا وہیں پھر اٹھا ہرن

گیدڑ لگا جب آنے ہرن کی طرف جھپٹ　　کوا پکارا مار تو سینگ اک جو جا دے ہٹ
یا اک کھری تو ایسی لگا پاؤں کی لپٹ　　جا دے جو اس کے لگتے ہی گیدڑ کا پیٹ پلٹ
سنتے ہی یہ تو سینگ ہلانے لگا ہرن

گیدڑ نے خوب کوے کو دیں جل کے گالیاں　　صیاد واں ہوا تھا کسی کام کو رواں
اس میں شکاری آ کے ہوا دور سے عیاں　　کوا پکارا لیٹ جا دم بند کر کے ہاں
دم بند کر کے اپنا وہیں گر پڑا ہرن

گیدڑ نے اس کو دیکھ کے اک جا لے جھاڑی لی　　صیاد اس ہرن کو پڑا دیکھ اس گھڑی
افسوس کر کے دام کی رسی وہ کھول دی　　کوا پکارا بھاگ ارے وقت ہے یہی
سنتے ہی واں سے چوکڑی بھر کر اڑا ہرن

صیاد نے جو دیکھا ہرن اٹھ چلا جھپاک　　جلدی سے دوڑا پیچھے ہرن کے وہ سینہ چاک
سونٹے کو پھینک مارا جو پھرتی سے اس نے تاک　　بھاگا ہرن لگا وہیں گیدڑ کے آ کھٹاک

سر اُس کا پھوٹا اور وہ سلامت گیا ہرن

گیدڑ نے اس ہرن کا جو چیتا تھا واں بُرا
پائی اسی نے اپنی بدی کی وہیں سزا
تھا یہ تو نثر میں سنے اسے نظم میں کیا
پہونچا نظیر جب وہ خوشی ہو کے اپنی جا
کوّے کے ساتھ پھر وہ بہت خوش رہا ہرن

(۳۰) خواب کا طلسم

یارو ذرا سنو یہ عجب سیر ہے بڑی
صحنِ چمن میں ابر کی آکر لگی جھڑی
پی کر شراب عیش کی ہر دم کڑی کڑی
کل بے خبر ہو رات کو سویا میں جس گھڑی
اُس خواب میں مجھے اک عمارت نظر پڑی

آئی نظر جو مجھ کو وہ نادر محلسرا
دل میں پری کے باغ کا مجھ کو یقیں ہوا
جب اس مکان کے پاس میں ڈرتا ہوا گیا
دیکھوں تو اس کا ہے درِ دولت سرا کھلا
آیا یہ دل میں دیکھئے چل کر کوئی گھڑی

پہونچا یونہیں میں اُس چمن زر فشان میں
جھمکے مکان جو اس کے مری آن آن میں
عالم سنہرے پردوں میں اور سائبان میں
کیا دیکھتا ہوں جا کے میں ہر اک مکان میں
سونے کی کھان ہے کہ کہیں پھرتی ہے پڑی

گلشن کہیں چمن کہیں شیشہ صراحی جام
فرشِ طلا بچھا کہیں کیسر جڑت کا کام
تھی نقرئی زمین تو سنہرے تمام بام
طاق و رواق اُس کے جھمکتے تھے یوں مدام
گویا کہ اینٹ اینٹ جواہر کی ہے جڑی

دیکھی پھر اس میں ایک ستم ایجاد مہ لقا　　اور پر نظر گئی جو مری سر سے تا بپا
صورت وہ قہر چاند کا ٹکڑا سا بے بہا　　اور حسن کا بیان تو جاتا نہیں کہا
نقشہ وہ جس کے پاؤں پہ لوٹے پری پڑی

خونریز ابرو جان کی قاتل ہر اک نگاہ　　مژگاں وہ برچھیوں کو لئے تُل رہی سیاہ
مہندی سے انگلیوں نے کئے خوں بے گناہ　　آنکھوں میں کھنچ رہا تھا وہ کاجل غضب سیاہ
پڑ جائے جس سے دل میں فرشتوں کے ہڑبڑی

زلفیں وہ مشک ناب سی چہرہ وہ چاند سا　　جگنو رہا گلے میں ستارہ سا جگمگا
گہنے کا وصف یا کہ بدن کی کہوں صفا　　جاتا تھا سرخ جوڑے میں تن یوں جھمک دکھا
گویا شفق میں آن کے بجلی چمک پڑی

رکھتی تھی اس گھڑی تو یہ عالم وہ مہ جبیں　　شاید کہ اس طرح کی نہ ہوگی پری کہیں
حسرت سے آن کر مری آنکھوں نے وہ جو ہیں　　دیکھی جو اُس بہار کی کافر وہ نازنیں
دل لوٹ پوٹ ہو گیا جاں غش میں جا پڑی

کیا کیا کہوں میں شوخ کے عالم بناؤ کا　　تصویر بن رہی تھی لگا سر سے تا بہ پا
اس دم بندھی تھی اس کی غضب آن کر ہوا　　کافر کھڑی ہوئی تھی عجب ڈھب سے بن بنا
اک ہاتھ میں لے آئینہ اک ہاتھ میں چھڑی

دیکھی جو میں نے واں یہ طلسمات کی ہوا　　عالم جواہرات کا ہر جا چمک رہا
اس کی چمک جھمک کی بہاریں کہوں میں کیا　　چمکا جو وہ مکاں مری آنکھوں میں نور سا
حیرت سے عقل آن کے چکر میں جا پڑی

ایسا مکاں تو میں نے نہ دیکھا تھا نہ سُنا　　دیوانہ ہو میں چار دں طرف دیکھنے لگا

چاہا کہ دیکھوں کوٹھے کے اوپر نظر اُٹھا   اتنے میں اک طرف سے جو پردہ سا اٹھ گیا
بجلی سی کچھ چمک گئی آنکھوں میں اُس گھڑی

آ کر کھڑی ہوئی تھی جو واں ناگہاں وہ شوخ   لیتی تھی ہر نگاہ میں عاشق کی جاں وہ شوخ
کچھ چلبلی نگاہ تھی کچھ انکھڑیاں وہ شوخ   کرتی تھی سیر چاروں طرف کی جو واں وہ شوخ
اتنے میں پھرتی اُس کی نظر مجھ پہ آپڑی

اُس کی نگہ کے آنے کا میں کیا کروں بیان   بجلی تھی یا کہ تیر تھی گولی تھی یا سناں
میری طرف کو دوڑ کے آتی تھی ناگہاں   میری نظر بھی دوڑ کے اُس کی نظر سے واں
ایسی لڑی کہ خُوب لڑی، خوب ہی لڑی

بارے نظر کے لڑتے ہی کچھ کم ہوا حجاب   الفت کی آ کے دونوں طرف سے کھنچی طناب
اتنے میں دیکھ دیکھ کے وہ رشک ماہتاب   اک بار کھلکھلا کے ہنسی اور از شتاب
کافر وہ میرے پاس ہی آ کر ہوئی کھڑی

کہنے لگی کہ تو نے بلایا ہے کیوں مجھے   دے خواب کو دعا کہ نہ پاتا تو یوں مجھے
چاہت میں اپنی ڈوبا ہوا دیکھا جوں مجھے   ہنس کر لپٹ گلے سے لگی کہنے یوں مجھے
آ اس محل میں چل کے کریں عیش دو گھڑی

اس گلبدن سے جب کہ ملی آ کے مجھ کو داد   مارے خوشی کے کچھ نہ رہی تن بدن کی یاد
کیونکر بھلا نہ عیش و طرب دل کو ہو زیاد   میری تو اس پری سے یہی تھی مراد
سنتے ہی دل کی کھل گئی ہر ایک پھلجڑی

پالا پڑا جو مجھ کو اس آب حیات سے   جاں آ گئی بدن میں مرے اس کی بات سے
آخر کو لے چڑھی مجھے کوٹھے پہ گھات سے   دو چار جام مجھ کو پلا اپنے ہات سے

سو ناز سے پلنگ پہ مرے پاس آ پڑی

آنے سے اُس کے دل کا مرے کھل گیا چمن
عیش و طرب کے ابر کی پڑنے لگی بھرن
نازک کمر وہ صاف شکم اور وہ نرم تن
گل سا ملا جو مجھ کو نہیا گد گدا بدن
رگ رگ میں میری چھٹ گئی عشرت کی پھلجھڑی

لے کر بغل میں اس کو لگایا جو ہیں گلے
سو عشرتوں کے دل پہ مرے کھل گئے ورے
حاضر ہوئے جب آن کے سب عیش اور مزے
سینے سے سینہ مل گیا اور لب سے لب ملے
لٹنے لگی بہار مزوں کی دھڑی دھڑی

ایدھر تو جوش عشق ادھر حسن اور جنوں
ناز و ادا کی ہونے لگی آ کے دھوپ دھوں
ان عشرتوں میں آہ نصیبوں کو کیا کہوں
چاہا ہیں اس پری سے جو کچھ اور کچھ کہوں
اتنے میں ہائے یار مری آنکھ کھل پڑی

یہ حادثہ جو مجھ پہ پڑا آ کے یک بیک
آنکھوں سے میری اس گھڑی آنسو پڑے ٹپک
نیند اُڑ گئی قرار گیا، جل گئی پلک
جاگا کیا نظیر میں پھر آہ صبح تک
مل مل کے ہاتھ رات کی کاٹی گھڑی گھڑی

(۳۱) ریچھ کا بچہ

کل راہ میں جاتے جو ملا ریچھ کا بچہ
لے آئے وہیں ہم بھی اُٹھا ریچھ کا بچہ
سو نعمتیں کھا کھا کے پلا ریچھ کا بچہ
جس وقت بڑھا ریچھ ہوا ریچھ کا بچہ
جب ہم بھی چلے ساتھ چلا ریچھ کا بچہ

تھا ہاتھ میں اک اپنے سوا من کا جو سونٹا — لوہے کی کڑی جس پہ کھڑکتی تھی سراپا
کاندھے پہ چڑھا جھولنا، اور ہاتھ میں پیالا — بازار میں لے آئے دکھانے کو تماشا
آگے تو ہم اور پیچھے وہ تھا ریچھ کا بچّہ

تھا ریچھ کے بچے پہ وہ گہنا جو سراسر — ہاتھوں میں کڑے سونے کے بجتے تھے جھمک کر
کانوں میں دُر اور گھنگرو پڑے پاؤں کے اندر — وہ ڈور بھی ریشم کی بنائی تھی جو پُر زر
جس ڈور سے یارو تھا بندھا ریچھ کا بچّہ

جھمکے وہ جھمکتے تھے پڑے جن پہ کرن پھول — مقیش کی لڑیوں کی پڑی پیٹھ اوپر جھول
اور ان کے سوا کتنے بٹھائے تھے جو گُل پھول — یوں لوگ گرے پڑتے تھے سر پاؤں کی سُد بھول
گویا وہ پری تھا کہ نہ تھا ریچھ کا بچّہ

اک طرف کو تھیں سیکڑوں لڑکوں کی پکاریں — اک طرف کو تھیں پیر و جوانوں کی قطاریں
کچھ ہاتھیوں کی قیق اور اونٹوں کی ڈکاریں — غل شور مزے بھیڑ ٹھٹھ انبوہ بہاریں
جب ہم نے کیا لا کے کھڑا ریچھ کا بچّہ

کہتا تھا کوئی ہم سے میاں آؤ قلندر — وہ کیا ہوئے اگلے جو تمہارے تھے وہ بندر
ہم ان سے یہ کہتے تھے یہ پیشہ ہے قلندر — ہاں چھوڑ دیا بابا انھیں جنگلے کے اندر
جس دن سے خدا نے یہ دیا ریچھ کا بچہ

مدت میں اب اس بچے کو ہم نے ہے سدھایا — لڑنے کے سوا ناچ بھی اس کو ہے سکھایا
یہ کہہ کے جو ڈھپلی کے تئیں گت پہ بجایا — اس ڈھب سے اُسے چوک کے جمگھٹ میں نچایا
جو سب کی نگاہوں میں کھبا ریچھ کا بچّہ

پھر ناچ کے، وہ راگ بھی گایا تو وہاں واہ — پھر کھر وانا چاہا تو ہر اک بولی زباں واہ

ہر چار طرف سے نے کہیں پیر و جواں واہ سب ہنس کے یہ کہتے تھے میاں واہ میاں واہ
کیا تم نے دیا خوب نچا ریچھ کا بچہ

اس ریچھ کے بچے میں تھا اس ناچ کا ایجاد کرتا تھا کوئی قدرت خالق کے تئیں یاد
ہر کوئی یہ کہتا تھا خدا تم کو رکھے شاد اور کوئی یہ کہتا تھا ارے واہ رے اُستاد
تو بھی جئے اور تیرا سدا ریچھ کا بچہ

جب ہم نے اٹھا ہاتھ کڑوں کو جو ہلایا خم ٹھونک پہلواں کی طرح سامنے آیا
لپٹا تو یہ کشتی کا ہنر آن دکھایا جو چھوٹے بڑے جتنے تھے ان سب کو رجھایا
ہم بھی نہ تھکے اور نہ تھکا ریچھ کا بچہ

جب کشتی کی ٹھہری تو وہیں سر کو جو جھاڑا للکارتے ہی اس نے ہمیں آن لتاڑا
گہ ہم نے پچھاڑا اُسے گہ اس نے پچھاڑا اک ڈیڑھ پہر ہو گیا کشتی کا اکھاڑا
گو ہم بھی ہارے نہ ہٹا ریچھ کا بچہ

یہ داؤ میں پیچوں میں جو کشتی میں ہوئی دیر یوں برسے روپے پیسے کہ آندھی میں گویا بیر
سب نقد ہوئے آ کے سوا لاکھ روپے ڈھیر جو کہتا تھا ہر ایک سے اس طرح سے منہ پھیر
یارو تو لڑا دیکھو ذرا ریچھ کا بچہ

کہتا تھا کھڑا کوئی جو کر آہ اہاہا اس کے تم ہی استاد ہو واللہ اہاہا
یہ سحر کیا تم نے تو ناگاہ اہاہا کیا کہیے غرض آخرش لے واہ اہاہا
ایسا تو نہ دیکھا نہ سنا ریچھ کا بچہ

جس دن سے نظیر اپنے تو دلشاد یہی ہیں جاتے ہیں جدھر کو اُدھر ارشاد یہی ہیں
سب کہتے ہیں وہ صاحب ایجاد یہی ہیں کیا دیکھتے ہو تم کھڑے اُستاد یہی ہیں

کل چوک میں تھا جن کا لڑا ریچھ کا بچہ

(۳۲) راکھی

چلی آتی ہے اب تو ہر کہیں بازار کی راکھی ‏ ‏ سنہری سبز ریشم زرد اور گلنار کی راکھی
بنی ہے گو کہ نادر خوب ہر سردار کی راکھی ‏ ‏ سلونوں میں عجب رنگین ہے اس دلدار کی راکھی
نہ پہنچے ایک گل کو یار جس گلزار کی راکھی

عیاں ہے اب تو راکھی بھی چمن بھی گل بھی شبنم بھی ‏ ‏ جھمک جاتا ہے موتی اور جھلک جاتا ہے ریشم بھی
تماشا ہے اہا ہا ہا غنیمت ہے یہ عالم بھی ‏ ‏ اٹھانا ہاتھ پیارے واہ وا ٹک دیکھ لیں ہم بھی
تمہاری موتیوں کی اور زری کے تار کی راکھی

مچی ہے ہر طرف کیا کیا سلونوں کی بہار اب تو ‏ ‏ ہر اک گلرو پھرے ہے راکھی باندھے ہاتھ میں خوش ہو
ہوس جو دل میں گزرے ہے کہوں کیا آہ میں تم کو ‏ ‏ یہی آتا ہے جی میں بن کے باہمن آج تو یارو
میں اپنے ہاتھ سے پیارے کے باندھوں پیار کی راکھی

ہوئی ہے زیب و زینت اور خوباں کو تو راکھی سے ‏ ‏ ولیکن تم سے اے جان اور کچھ راکھی کے گل پھولے
دوانی بلبلیں ہوں دیکھ گل چننے لگے تنکے ‏ ‏ تمہارے ہاتھ نے مہندی نے انگشتوں نے ناخن نے
گلستاں کی چمن کی باغ کی گلزار کی راکھی

ادا سے ہاتھ اٹھنے میں گل راکھی جو ہلتے ہیں ‏ ‏ کلیجے دیکھنے والوں کے کیا کیا آہ چھلتے ہیں
کہاں نازک یہ پہونچے اور کہاں یہ رنگ ملتے ہیں ‏ ‏ چمن میں شاخ پر کب اس طرح کے پھول کھلتے ہیں
جو کچھ خوبی میں ہے اس شوخ گل رخسار کی راکھی

پھرتی ہیں راکھیاں باندھے جو ہر دم حسن کے تارے
تو اُن کی راکھیوں کو دیکھ اے جاں چاؤ کے مارے
پہن زنار اور قشقہ لگا ماتھے اُپر بارے
نظیرؔ آیا ہے باہمن بن کے راکھی باندھنے پیارے
بندھا لو اس سے تم ہنس کر اب اس تیوہار کی راکھی

(۳۳) سخاوت و عشرت

زردار ہے تو ہرگز مت مار اپنے من کو
تن زیب مین سکھوں سے ترسا نہ اپنے تن کو
جو زر چلن چلیں ہیں چل تو بھی اُس چلن کو
مرشد کا ہے یہ نکتہ رکھ یاد اس سخن کو
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

جا بیٹھ میکدوں میں سب درد غم سے ہٹ کر
جھمکا گلابی مے کی پیالے اُلٹ پلٹ کر
محبوب دلبروں سے خوش ہو لپٹ لپٹ کر
پی دودھ اور بتاشے میوہ مٹھائی چٹ کر
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

کمخواب کیا دوشالہ کیا ریشمی دوسوتی
کرشال کا لنگوٹا مت رکھ قبا اچھوتی
بولے جو شوم بھڑوا مار اس کے سر پہ جوتی
دو دن تو دوستوں میں بلوا لے اپنی ظوطی
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

یہ نعمتیں ہیں جتنی جو کچھ ملے سو کھا جا
تاشش اور بادلے میں اک بار جگمگا جا

پاپی بخیل مت بن داتا سخی کہا جا — اک دم تو اپنا ڈنکا من مانتا بجا جا
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

یاں کا یہی مزا ہے، کھانا دیا کھلانا — بھوکے کو دال روٹی، ننگے کو کچھ اڑھانا
سب اس گھڑی اُڑا لے جو تجھ کو ہو اڑانا — غافل پھر اس گلی میں تجھ کو نہیں ہے آنا
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

جو گل بدن ہیں روٹھے، زر دے انھیں منالے — بوسہ انھوں کا لے کر سینے سے پھر لگا لے
ہنس لے، ہنسا لے ہر دم، دے لے، دلا لے، کھا لے — جو بن سکے سو اپنے جی کے مزے اڑا لے
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

جو پاس ہے ذخیرہ مت رکھ وہ کونے اندر — مسجد، کنویں بنا دے تالاب، باغ، مندر
دریا کہیں بہا دے بن جا کہیں سمندر — سب کچھ اڑا، لٹا کر، ہو رہ سدا قلندر
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

باغوں کی دیکھ سیریں بھر جام کے چھلکے — اور چھان میلے ٹھیلے کر دھوم اور دھڑکے
آوے جو شوم بھڑوا کاڑھ اس کو دے کے دھکے — تو شوق سے اُڑا لے عیش و مزے بے کھٹکے
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

صندوق میں جو زر ہے اُس کو بھی لے گنوا دے مے کے بہا کے نالے طبلوں کو کھڑکھڑا دے
کوٹھے مکاں حویلی سب کھود کر کھلا دے کڑیاں تلک جلا دے اینٹیں تلک اڑا دے
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

ہو جو بخیل کتنا زر چھوڑ کر مرے گا یا کھائے گا جنوائی یا خالصہ لگے گا
تیرا وہی ہے جو کچھ راہ خدا میں دے گا کھاتا کھلاتا ہنستا تو بھی سدا رہے گا
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

گر آ پڑے گا تجھ پر کچھ حادثہ خلل کا مالک پھر اور کوئی ٹھیرے گا تیرے ڈل کا
آگے سے دے دلا کے ہو رہ تو اس سے ہل کا کر سوچ اپنے دل میں کچھ آج کا نہ کل کا
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

زر جوڑ جوڑ اپنے تو پاس گر رکھے گا یا چھین لے گا حاکم یا چور لے مرے گا
تیرا وہی ہے جو کچھ اب عیش کر چکے گا جب وقت آ پکارا تب کچھ نہ بن سکے گا
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

جس نے یہ زر دیا ہے پھر وہ ہی دھن بھی دیوے گا مال و مکاں حویلی باغ و چمن بھی دے گا
جیتا رہے گا جب تک کھانے کو ان بھی دیوے گا مر جاوے گا تو وہ ہی تجھ کو کفن بھی دے گا
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو

گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

جتنے گڑے دبے ہیں سب کھالے اور کھلا لے
رکھ دھن اسی کی دل میں اب کھالے اور کھلا لے

اپنا سمجھ اسی کو جب کھالے اور کھلا لے
اب تو نظیر تو بھی سب کھالے اور کھلا لے

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

(۳۴) چاندنی رات

صحن چمن میں واہ وا زور مچی تھی چاندنی
چاند ہو رہیں لیٹا تھا اور کھلی تھی چاندنی

آیا تھا یار گلبدن پہن کے بادلہ زری
چھلکے تھی تار تار میں مہ کی جھلک ذری ذری

بوس و کنار جام و مے عیش و طرب ہنسی خوشی
اس میں کہیں سے یک بیک مرغ سحر نے بانگ دی

صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

کیا ہی مزوں سے عیش کی رات تھیں کامیابیاں
چھوٹے تھیں ماہتاب کی نہروں میں ماہتابیاں

آگے چنی تھیں صف بہ صف مے کی کئی گلابیاں
ہم کو نشے کی مستیاں یار کو نیم خوابیاں

سینوں میں اضطرابیاں آنکھوں میں بے حجابیاں
اس میں فلک نے رشک سے ڈالیں یہ کچھ خرابیاں

صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

شب کو دلوں میں واہ وا زور مزوں سے تھے بھرے
ہم سے دو چار یار تھا یار سے ہم دو چار تھے

دونوں دلوں میں پیار تھا دونوں گلے میں ہار تھے　　　وصل کے بیقرار تھے عیش کے کاروبار تھے
سینے میں آسمان کے تیر حسد کے پار تھے　　　ایک پلک میں ناگہاں سب وہ مزے شرار تھے

صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

چاندنی واہ چاندنی کرتی تھی کیا جھلک جھلک　　　چہک رہی تھیں بلبلیں باغ رہا تھا سب مہک
جام کے لب سے ہر گھڑی نکلے تھی مے چھلک چھلک　　　یار بغل میں غنچہ لب بوسوں کی سولپک جھپک
عیش و طرب کی لذتیں ہونے لگیں جو یک بیک　　　ایسے مزے میں عیش میں آہ کہیں سے یک نہ دھک

صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

ایک طرف تو نور میں ماہ رہا تھا جگمگا　　　ایک طرف وہ رشک مہ میری بغل میں تھا پڑا
دونوں دلوں میں لذتیں دونوں جیوں میں عیش تھا　　　مے کی گلابی ہاتھ میں آنکھوں میں چھا رہا نشا
ہونٹوں سے ہونٹ لگ رہے سینے سے سینہ مل رہا　　　اتنے میں آہ یک بیک کیا ہی غضب یہ ہو گیا

صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

واہ ہوئیں تھیں رات کیا چاندنی کی اجالیاں　　　جھوم رہی تھیں باغ میں سنبل و گل کی ڈالیاں
شوخ بغل میں ناز سے کھولے تھا زلفیں کالیاں　　　خوش ہو گلے لپٹ لپٹ دیتا تھا میٹھی گالیاں
ہم بھی نشے میں مست تھے ساقی کی پی کے پیالیاں　　　جل کے فلک نے اس میں ہائے آفتیں لا کے ڈالیاں

صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

کیا ہی چمن میں شب کو واہ برسے تھی نور کی جھڑی ۔۔۔ تار نشوں کے تھے بندھے لوٹے تھی چاندنی پڑی
غنچہ دہن تھا بے خبر پی تھی جو مے کڑی کڑی ۔۔۔ دیتا تھا بوسے پیار کے سینہ سے مل گھڑی گھڑی
چشم سے چشم لب سے لب چھاتی سے چھاتی جب لڑی ۔۔۔ کیا ہی گھڑی تھی عیش کی اس میں بلا یہ آ پڑی

صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اُٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

باغ تھا یا کہ خلد وہ یا کہ بہشت یا ارم ۔۔۔ یار تھا یا کہ حور تھا یا کہ پری وہ یا صنم
چاندنی تھی وہ چاندنی چاندی کا رنگ جس سے کم ۔۔۔ پیتے تھے مے گھڑی گھڑی لیتے تھے بوسے دمبدم
دونوں نشوں میں مست ہو سوئے پلنگ پہ جب کہ ہم ۔۔۔ عین مزہ تھا وصل کا اس میں نظیر ہے ستم

صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اُٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

(۳۵) ہولی

آ جھمکے عیش و طرب کیا کیا جب حُسن دکھایا ہولی نے ۔۔۔ ہر آن خوشی کی دھوم ہوئی یوں لطف جتایا ہولی نے
ہر خاطر کو خورسند کیا ہر دل کو لبھایا ہولی نے ۔۔۔ دف رنگین نقش سنہری کا جس وقت بجایا ہولی نے

بازار گلی اور کوچوں میں غل شور مچایا ہولی نے

یا سوانگ کہوں یا رنگ کہوں یا حسن بتاؤں ہولی کا ۔۔۔ سب ابرن تن پر جھمک رہا اور کیسر کا ماتھے ٹیکا
ہنس دینا ہر دم ناز بھرا دکھلانا سج دھج شوخی کا ۔۔۔ ہر گالی مصری قند بھری ہر ایک قدم اٹکھیلی کا

دل شاد کیا اور موہ لیا یہ جوبن پایا ہولی نے

کچھ طبلے کھٹکے تال بجے کچھ ڈھولک اور مردنگ بجی کچھ جھڑپیں بین ربابوں کی، کچھ سارنگی اور چنگ بجی
کچھ تار طنبوروں کے جھنکے کچھ ڈھمڈھمی اور منہ چنگ بجی کچھ گھنگرو کھٹکے جھم جھم جھم کچھ گت گت پر آہنگ بجی
ہے ہر دم ناچنے گانے کا یہ تار بندھایا ہولی نے

ہر جا گہ تھال گلالوں سے خوش رنگت کی گلکاری ہے اور ڈھیر عبیروں کے لاگے سو عشرت کی تیاری ہے
ہیں راگ بہاریں دکھلاتے اور رنگ بھری پچکاری ہے منہ سرخی سے گلنار ہوئے تن کیسر کی سی کیاری ہے
یہ روپ جھمکتا دکھلایا یہ رنگ دکھایا ہولی نے

پوشاکیں چھڑکیں رنگوں کی اور ہر دم رنگ فشانی ہے ہر وقت خوشی کی جھمکیں ہیں پچکاری کی زرافشانی ہے
کہیں ہوتی ہے دھینگا مشتی کہیں ٹھیری کھینچا تانی ہے کہیں لٹیاں جھمکیں رنگ بھری کہیں جوتا کیچڑ پانی ہے
ہر چار طرف خوش حالی کا یہ جوش بڑھایا ہولی نے

ہر آن خوشی سے آپس میں سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں رخسار گلالوں سے گلگوں کپڑوں سے رنگ ٹپکتے ہیں
کچھ راگ اور رنگ جھمکتے ہیں کچھ مے کے جام چھلکتے ہیں کچھ کودیں ہیں کچھ اچھلیں ہیں کچھ ہنستے ہیں کچھ بکتے ہیں
یہ طور یہ نقشہ عشرت کا ہر آن بنایا ہولی نے

محبوب پری رو پیاروں کی ہر جانب نو کا جھونکی ہے کچھ آن رنگیلی چلتی ہے کچھ بان ادھر سے روکی ہے
کچھ سینیں ترچھی سحر بھری کچھ گھات لگاوٹ خو کی ہے کچھ شور اہاہا کا کچھ دھوم اہو ہو ہو کی ہے
یہ عیش یہ حظ یہ کام یہ ڈھب ہر آن جتایا ہولی نے

معجونوں سے رنگ لال ہوئے کہیں چلتی مے کی پیالی ہے کہیں ساز طرب کے بجتے ہیں دل شاداں منہ پر لالی ہے
سو کثرت عیش مسرت کی خوش وقتی اور خوش حالی ہے کچھ بولی ٹھولی پیار بھری کچھ گالی ہے کچھ تالی ہے
ان چرچوں کا ان چہلوں کا یہ تار لگایا ہولی نے

ہیں کیا کیا سر میں رنگ بھرے اور سوانگ بھی کیا کیا آتے ہیں کر باتیں ہر دم چہل بھری خوش ہنستے اور ہنساتے ہیں

کچھ جوگی چیلے بیٹھے ہیں کچھ کافیوں کی گاتے ہیں   کچھ اور طرح کے سوانگ بنیں کچھ ناچتے ہیں کچھ گاتے ہیں
ہر آن نظیرؔ اس فرحت کا سامان دکھایا ہولی نے

(۳۶) جوگی نامہ

صفحۂ رُخ پہ ترے خوبیٔ خط کی ہے پھبن   ہے سویدا ترے عاشق کا ترا خال ذقن
رشکِ گل دست حنائی کو کیے دیکھ چمن   ہو رقم کس قلم شوق سے اے غنچہ دہن
اشتیاقے کہ بہ دیدار تو دارد دلِ من

اب جو مل جائے کہیں وہ تو یہ ہم اس سے کہیں   کب تلک درد جدائی کو بھلا تیرے سہیں
اتنا بھی بس نہیں اے یار کہ ہم مر ہی رہیں   دور جس دن سے ہوا تجھ چمنِ حسن سے ہیں
نہ مجھے باغ خوش آتا ہے نہ گلشن نہ چمن

بید مجنوں ہیں کہ ہیں تاک پریشاں خاطر   یا ہیں خاکستر خاشاک پریشاں خاطر
ہم غرض ایسے ہیں غمناک پریشاں خاطر   چشم نمناک جگر چاک پریشاں خاطر
چاک بر چاک گریباں سے لگا تا دامن

جور اور ظلم سے اس کے نہ کبھی گھبرانا   نہ کبھی شکوۂ بیداد زباں پر لانا
کام ہرگز نہ کسی سے نہیں آنا جانا   کوئی کچھ پوچھے تو منہ دیکھ کے چپ رہ جانا
نہ تکلم نہ اشارت نہ حکایت نہ سخن

یاد اس شوخ کی کیا کیا ہی ستم لاتی ہے   جان بے چینی سے تن میں مرے گھبراتی ہے
آہ کرتا ہوں تو بجلی سی نکل آتی ہے   جب میں روتا ہوں تو آنکھوں سے برس جاتی ہے

کبھی ساون کی جھڑی اور کبھی بھادوں کی بھرن

دشت اور کوہ میں وحشی سا پڑا پھرتا ہوں　　برق کی طرح سے بے تاب سدا پھرتا ہوں
میں غرض تجھ سے صنم جب سے جدا پھرتا ہوں　　رات دن ہجر میں جوگی سا بنا پھرتا ہوں
بے قراری سے ترے نام کی جپتا سُمرن

جور اور ظلم مرے دل نے ہزاروں ہی سہے　　شکوۂ جور بھلا تیرا کہاں تک نہ کرے
اب تو یہ حال ہوا ہجر میں اے یار مرے　　دوش پر بار الم کانوں میں غم کے مُندرے
اشکوں کے تار گلے میں پڑے سیلی کے کمن

عشق میں جوگی ہوئے جب سے ہمیں بھائی بھبوت　　بیٹھے در پر ترے اور گرد ہے پھیلائی بھبوت
دیکھ ٹک آن کے کس روپ میں رنگ لائی بھبوت　　پیرہن گیروا اور تن کے اُپر چھائی بھبوت
سر سے لے پاؤں تلک خاک ملی سو سو من

گہ در کعبہ پہ پیشانی کو اپنی گھسنا　　گاہ مسجد میں میاں مانگنا جا جا کے دعا
انکساری سے کبھی دیر میں ہر دم جانا　　دم بہ دم آہ کی پونگی سے بجانا یہ صدا
دیکھیے کون سے دن ہم ہمیں دیں گے درشن

دیکھا میرے تئیں جو تن کے اُپر گل کھائے　　اور کپڑے بھی رنگے گیروے تن پر پائے
دیکھ یہ حال تعجب سے بشر گھبرائے　　کوئی کہتا ہے کہ جوگی جی کدھر کو آئے
سچ کہو کون سی نگری میں تمھارا ہے وطن

یاد کرتے ہو اُسے نام اُسی کا لے لے　　اور زیبا ہیں بہت آپ کے تن پر سیلے
واہ جوگی بھی بنے خوب ہو تم البیلے　　کون سے پنتھ میں ہو کون گرو کے چیلے
کون سے روپ میں ہو کون سا رکھتے ہو برن

ہم کو جوگی جی بتا دیجئے یہ حال اپنا　　تم جو بیراگی بنے اس میں نفع کیا ہے بھلا
اور مرشد سے تمھارے ہے تمھیں کیا پہنچا　　نام کیا جوگ میں ہے تم کو گرو نے بخشا
دھیان کیا رکھتے ہو کس گیان کا رکھتے ہو چلن

دُر شہوار جلا کر جو بنائی ہے بھبوت　　اور کیوں تم کو بتاؤ یہ خوش آئی ہے بھبوت
عشق میں کس کے یہ اب تن پہ رمائی ہے بھبوت　　کس لئے مُنہ کے اُپر تم نے لگائی ہے بھبوت
کس کی اُلفت میں یہ بیراگ کا پہنا ابرن

کس لئے جوگ لیا اور رنگا کپڑوں کو　　کس پہ عاشق ہو دیا رنج یہ کس نے تم کو
کیونکر اوقات بسر ہوتی ہے یہ ہم سے کہو　　کیا الم کھاتے ہو اور کس کی طلب رکھتے ہو
دھونی جل پان بھی یا یونہی کروگے لنگھن

نام پیغمبروں کے کفنی پہ لکھے سارے　　اور گریبان میں ہیں نام خدا کے لکھے
تم تو کامل سے نظر آتے ہو اپنے لیکھے　　ہم نے جوگی تو بہت یوں ہیں ہزاروں دیکھے
پر تمھارا تو زمانہ سے نرالا ہے چلن

ہم نے دنیا میں اجی سیکڑوں دیکھے جوگی　　دیکھے ہر رنگ کے ہر ایک برن کے جوگی
پر غرض تم سے نہیں دیکھے ہیں ہم نے جوگی　　تم تو آتے ہو نظر ہم کو نئے سے جوگی
سچ کہو جوگ لیا تم نے یہ کس کے کارن

کیا ہوا جوگی جی تم کو بھلا ہم سے تو کہو　　کیوں خجل خوار پڑے پھرتے ہو منہ سے بولو
کس لئے وحشی سے پھرتے ہو بتاؤ ہم کو　　کس کی ہے یاد تمھیں کس کے لئے پھرتے ہو
اب کہیں بیٹھوگے یا یوں ہی پھروگے بن بن

کس لئے گھر سے تم آئے ہو بھلا اپنے نکل　　پھرتے مانند صبا کیوں ہو بدشت و جنگل

تم سے اک بات کہوں اس پہ اگر کیجے عمل — گر کرو حکم تو بنوا دیں تمہارا استھل
شہر میں باغ میں یا برلبِ دریائے جمن

یا کہیں اور بتاؤ کہ جہاں آپ رہیں — یا تو جنگل میں اگر دل لگے یہ آپ کہیں
یا کہ استھل کے بنا دینے کی تجویز کریں — یا کہ متھرا جو پسند آوے تو واں جا کے لیں
یا کہ دربن میں ہو یا مات مہابندرابن

اور اگر یوں ہی پھرو گے تو یہ ہے مشکل سخت — استھل اک ہم جو بنا دیں تو زہے اپنے بخت
اس میں اچھا سا بچھا دیویں تمہارے لئے تخت — خاصے پھولوں کے لگا دیویں اس استھل میں درخت
جس سے آنکھوں کو طراوت رہے اور دل ہو مگن

اب تو جوگی جی کہا مان لو یہ تم میرا — ایک جا بیٹھ رہو اور کرو ہم پہ دیا
مت پھرو یوں بجنگل دنخوار بدشت و صحرا — جب تو سن سن کے یہ ہم نے کہا اس سے بابا
تجھ کو کیا کام فقیروں سے، یہ کرنا آن بن

کیا غرض تجھ کو جو پوچھے ہے تو احوال مرا — جوگ کی پوچھے تو بس عشق میں یہ جوگ لیا
اور اس کی ہی جدائی میں پھرے ہیں ہر جا — اور وطن پوچھے ہمارا تو یہ سن رکھ بابا
یا گلی دوست کی، یا یار کے گھر کا آنگن

مثل صرصر اسی کوچے میں پھرا کرتے ہیں — دیکھ دروازے کو بس شاد ہوا کرتے ہیں
خونِ دل جائے مئے ناب پیا کرتے ہیں — اس کے کوچے میں سدا مست رہا کرتے ہیں
وہی بستی، وہی نگری، وہی جنگل، وہی بن

گاتے پھرتے ہیں سدا بین لئے کاندھے پہ گیت — جو اتیتوں کی ہے مدت سے وہی اپنی ریت
محو بیٹھے ہیں جب سے کہ لگی اس کی پیت — پنتھ کی پوچھے تو جوگی، نہ جنم سکے، نہ اتیت

عشق کے میل میں ہم پریم کا رکھتے ہیں برن

آبلے دل میں جو الفت کے تھے سو پھوٹ گئے　　جتنا تھا مال مراتب اُسے لے لُوٹ گئے
اقربا دوست تھے جتنے وہ سبھی چھوٹ گئے　　جب سے اُس شوخ کے پھندے میں پھنسے ٹوٹ گئے

جتنے تھے مذہب و ملت کے جہاں میں بندھن

عشق میں چھوڑ کے ہم دنیا و دیں بیٹھے ہیں　　خاطر آشفتہ و دلگیر و حزیں بیٹھے ہیں
چھوڑ سب عیش جہاں گوشہ گزیں بیٹھے ہیں　　اس کے ہم در پہ منڈا سر کے تئیں بیٹھے ہیں

رات دن پیتے ہیں دھو دھو کے اسی گرُ کے چرن

خنجر عشق سے بس اپنا کلیجا ہے شق　　یہ تو ظاہر ہے نشاں، مُنہ کا بھی جو رنگ ہے فق
خون میں آلودہ ہیں زخمی ہیں کہ جوں رنگِ شفق　　نام کو پوچھے تو ہے نام ہمارا عاشق

سب سے آزاد ہوئے یار کا لے کر دامن

حال بے باکی کا کیا اپنی بھلا تجھ سے کہیں　　گر رہیں بھوکے تو ہرگز بھی کبھی غم نہ کریں
اور کھانے کو ملے تو بھی نہ کچھ شاد رہیں　　گر رہیں جیتے تو جینے کی نہیں فکر ہمیں

اور مر جائیں تو ہرگز نہیں پروائے کفن

دیکھ نیرنگی زمانے کی ہوئے گل در گل　　اور مل تن کو بھبوت اپنے گئے خاک میں مِل
کپڑے رنگنے کو تو آسان نہ جان او غافل　　رنگ وہ رنگتے ہیں جس رنگ کا رنگنا مشکل

روپ وہ بھرتے ہیں جس روپ کا بھرنا ہے کٹھن

چھوڑا جنت کو جو آدم نے اُسی کی خاطر　　اور ہر ایک کے کی، دم نے، اسی کی خاطر
جی میں کی اپنے خوشی، غم نے، اسی کی خاطر　　جوگ بیراگ لیا ہم نے اسی کی خاطر

سب کے تئیں چھوڑ، اسی کی ہے محبت کی لگن

رنگے کپڑوں سے نہ کر ہم پہ تو جوگی کا گمان　　ہم نے کیا جانے کیا کس لئے ایسا سامان
گر تو عاقل ہے تو پھر دل ہی ہیں اپنے پہچان　　ہم میں اور جوگی کی صورت میں بڑا فرق ہے جان
کہاں جوگی کی ادا اور کہاں عاشق کی پھبن

آتشِ غم سے جلا جب سے جلایا دل و جان　　تب یہ اکسیر ملی ہم کو تو شک اس میں نہ جان
تو تو عاقل ہے بس اب عقل سے اپنی پہچان　　خاک ہے یار کے کوچے کی بھبوت اب ہر آن
ہم نے بھی راکھ بنالی ہے جلا کر تن من

سرخ آنکھوں کا جو پوچھے ہے کہ باعث ہے کیا　　شوق مے کا نہیں کچھ ذوق نہیں افیوں کا
قلیچ بنگ سے نے عشق کبھی ہم کو ہوا　　ہے محبت کے دھتورے کا جو آنکھوں میں نشا
اس کی گرمی ہی سے رہتے ہیں سدا سرخ نین

کوئی مونس ہے نہ غم خوار نہ ہے سنگ نہ سات　　رہتا ہوں رنج میں مشغول سدا دن اور رات
اب خدا جانے کہ کس طرح سے کٹے گی اوقات　　اور استھل کے بنانے کی کہی تو نے جو بات
یہ بکھیڑا وہ کرے جس کے کئے ہو کچھ دھن

عشق جب سے کہ ہوا ہے ہمیں اس اچپل سے　　جب سے بے تاب پھرا کرتے ہیں اور بے کل سے
ہم سے بے کل بھی کہیں بیٹھے ہیں اک جا کل سے　　ہم فقیروں کو بھلا کام ہے کیا استھل سے
وہی استھل ہے جہاں یار سے بیٹھے آسن

خواہش زر نہ کریں اور نہ کسی سے مانگیں　　تخت اور چتر کی بھی کچھ نہیں پروا ہے ہمیں
گوکل اور متھرا کے رہنے کی نہیں حرص کریں　　جا پڑیں یاد میں اُس شوخ کی جس بستی میں
وہی گوکل ہے ہمیں اور وہی ہے بندرابن

جب سے جوگی ہوئے دی اُس کو متاعِ دل و جان　　چھوڑ بیٹھے سبھی آرام کا جو تھا سامان

حاجتِ تکیہ ہے نے خواہش بستر نہ مکان　　جا پڑے خاک پہ رکھ سر کے تلے ہاتھ جہاں
ہے وہی فرش وہی تخت وہی سنگھاسن

ہے خیال اس گلِ رخسار کا ہر شام و پگاہ　　باغ باغیچہ کی ہرگز ہے نہیں ہم کو چاہ
چاہ ہے چاہ ذقن کی نہیں درکار ہے چاہ　　پھول پھلواری کی بھی جب سے نہیں کچھ پرواہ
جب سے گل کھا کے محبت میں جلایا ہے بدن

رہتا ہوں مضطر و مغموم میں ہر دم ہر آن　　ہوش گم کردہ پھرا کرتا ہوں اور بے سامان
باز آ ظلم سے اور جور سے تو حق کو مان　　اب تو اس حال کو پہنچا ہوں ترے ہجر میں جان
اے گلِ باغِ وفا دل کے چمن کے گلشن

کہیں کہتا ہے جو احوال مرا کوئی ذرا　　سر کو دھنتا ہے ہر اک پیر و جوان اور لڑکا
گھر میں رہتا ہوں تو روتا ہے ہر اک خویش اپنا　　گھر سے باہر جو نکلتا ہوں تو منہ دیکھ مرا
مرے احوال پہ بھی روتے ہیں جنگل میں ہرن

خاطر آشفتہ میں پھرتا ہوں حزین و دلگیر　　عشق میں اس کے سبھی کھو چکا عزّ و توقیر
پھرتا ہوں گلیوں میں دیوانہ سا ہر روز صغیر　　کیا کہوں اب تو گزرتی ہے جو کچھ مجھ پہ نظیر
دل من داند و من دانم و داند دل من

(۳۷) جوگن نامہ

ہائے اُس الفت ظالم کا بُرا ہے یہ چلن　　چھوٹتی ہی نہیں لگ جاتی ہے جس وقت لگن
چار و ناچار اٹھانے ہی پڑے رنج و محن　　در فراقِ رُخِ پُر نور تو اے غنچہ دہن

دیدہ باید کہ چگونہ شود احوال من

ہجر نے اب تو نہایت کیا بے دم مجھ کو — پھرتی ہوں شکل بگولے کے میں ویراں ہر سو
اے مرے ماہ جبیں اے مرے ہمدم گل رو — کون سے شہر میں ہے کون سی جا پر ہے تو

اے مرے ہمدم جاں اے مرے جان و تن من

دل صد چاک مرا چاک گریباں میرا — مثل دریا کے رواں دیدۂ گریاں میرا
برق کی طرح تپاں ہے یہ دل سوزاں میرا — دیکھ ٹک آن کے یہ حال پریشاں میرا

کر ترے ہجر میں کیا کیا نہ سہا رنج و محن

میری جیسی ہے کرے حق نہ کسی کی اوقات — جو سنی بھی نہ تھی گاہے وہ وہ دیکھی آفات
ہائے افسوس صد افسوس ہے حسرت ہیہات — زار زار اب تو پڑا ہجر میں رونا دن رات

زندگی ہو گئی دو بھر سے مجھے اور جان کٹھن

خانماں و طرب و عیش و زر و مال و خوشی — اک تجھے یاد رکھا سب کے تئیں بھول گئی
ہائے جس وقت لگی آنکھ وہ کیسی تھی گھڑی — شہر بھی چھوڑ دیا دیس سے پردیس ہوئی

ہجر نے کر دیا آخر ترے مجھ کو جوگن

سرخ آنکھیں ہوئیں الفت کے نشے سے رنگین — پہن کر حلقہ بگوشی کے بھی مندرے دو تین
تو نہ گر دستِ دعا کا پڑی پھرتی ہوں حزین — پیرہن گیروا رنگے ہوئے کاندھے پر بین

تن کے منکوں کی بنا ہات میں پہنی سُمرن

کھوئے پھرتی ہوں سب آرام کو ہرجائی میں — ڈھونڈھتی ہوں تجھے گل فام کو ہرجائی میں
گاتی پھرتی ہوں اسی کام کو ہرجائی میں — جپتی پھرتی ہوں ترے نام کو ہرجائی میں

آٹھ آٹھ آنسوؤں سے روتی ہوں اور ترپتے نین

ناتواں ہوگئی اور جسم میں باقی نہیں دم　　　رکھو ٹک آکے کبھی اس دل مضطر پہ قدم
ہوگئیں خشک رگیں سیلیوں سے میں نہیں کم　　　گیروا ساری ہے اور جائے بھبوت اے ہمدم
خاک اُڑ اُڑ کے پڑی تن کے اوپر سو سو من

یہی دل ہے کہ ہوا تھا نہ کبھی بھی غمناک　　　وہی دل ہے کہ ہوا تیغ جفا سے صد چاک
آگ لگ جائیو اس ہیت میں جلوہ یہ تپاک　　　سیس کے بال تھے سنبل سے جمی جس میں خاک
خاک میں مل گیا تھا یہ جو چندرماں سا بدن

پھوڑ کر پتھروں سے کر دئیے سر کے ٹکڑے　　　ہائے تو ہے کہاں اے میرے قمر کے ٹکڑے
آ ادھر دیکھ مری ٹوٹی کمر کے ٹکڑے　　　جیب کے بدلے میں کرتی ہوں جگر کے ٹکڑے
نہ تو بستی ہی خوش آتی ہے، نہ کہسار، نہ بن

میں نے کیا کیا نہ سہا آہ تری الفت میں　　　ایک دیوانی پڑی پھرتی ہوں میں ذلت میں
ناگہاں آگئی اک مفت کی میں آفت میں　　　سیس کے بال کھسوٹوں ہوں کھڑی فرقت میں
خاک اُڑاتے پڑی پھرتی ہوں بہ صد رنج و محن

ساری پت میری گئی اے مرے ساجن تجھ پر　　　مال و زر وار دیا اور تن و من تجھ پر
ایک حیران پڑی پھرتی ہوں برہ گن تجھ پر　　　چھوڑ کر ماتا پتا کو، ہوئی جوگن تجھ پر
لیک تو ہی نہ ملا اے مرے جوگی ساجن

اپنے بیگانوں نے کر ڈالا ہے مجھ کو پامال　　　اور ادھر تیری جدائی میں ہوئی جان وبال
خاک کا بھی نہیں وہ حال جو ہے میرا حال　　　اقربا کی بھی نظر سے گری اشکوں کی مثال
باپ اور ماں کا ترے واسطے چھوڑا دامن

نہ تو کچھ دیں کی خبر اور نہ دنیا سے ہے کام　　　سارے کاموں کے تئیں بھول گئی اے گلفام

دل گیا جان گئی اور گیا عیش و آرام — گھر گیا، دیس گیا، ہو گئی جگ میں بدنام
اک سہیلی ہے مری آہ بس اور سب دشمن

یاد میں بیٹھ گئی جس جگہ میں آسن مار — دل کی کھونٹی کو مرے توڑا تری جانب کو سدھار
نالۂ موزوں سے کے بس کر کے سروں کو طیار — جگر و تن کی بنا تو نبی بس اور آہ کے تار
بین کو غم میں بجاتی پھری تن تن تن تن

کون سی بات تھی جو واسطے تیرے نہ کری — چلے بھی باندھے بہت پوجا بھی درگاہ میں کی
دیس پردیس پھری چرنوں میں لوگوں کے پڑی — پوچھا ایک ایک سے تجھ کو میں بہ صد حیرانی
لیک تیرے ہی کسی طرح نہ پائے درشن

جا کے متھرا میں رہی اور بڑا پوجا تجھ کو — کاشی میں بیٹھ رہی لیک نہ پایا تجھ کو
گنگا اور جمنا کے تیرتھ پہ بھی مانگا تجھ کو — کون سی جا تھی کہ جس جا پہ نہ ڈھونڈا تجھ کو
پورب اور پچھم و اُتر سے لگا تا بہ دکن

اب تو ناچار ہوئی اور بڑی بے چین ہوئی — ہجر کے درد و الم میں جلا جاتا ہے جی
تا کہ اب ڈھونڈھنے سے کوئی بھی جا گہ نہ رہی — اب فقط ملک عدم مجھ کو رہا ہے باقی
سو بھی کچھ دور نہیں اور نہیں راہ کٹھن

ہو گئی جان کی یوا تری الفت بیری — مرگ کے کرتی ہے سامان محبت یہ بھی
کوئی دن میں تو یہ سن لیجو نکل جاوے گا جی — رحم کر مجھ پہ کہاں تک سہوں فرقت تیری
دیکھ اس جان پہ کیا کیا سہا تیرے کارن

روح ہونٹوں تلک آ جاتی ہے گھبراتی ہے — لیک امید ملاقات میں پھر آتی ہے
غم پہ پھٹتی مرے ہر ایک کی اب چھاتی ہے — آہ کے ساتھ مری جان جلی جاتی ہے

اب اُٹھا سکتا نہیں بارِ مصیبت یہ بدن

یاد کر کرکے تجھے دیدہ تو رُو دیتا ہے   جو تجھے دیکھتا ہے روتا ہُوا رو دیتا ہے

دیکھ ہر ایک مری سمت کو رو دیتا ہے   جو مرے حال کو دیکھے ہے سو رو دیتا ہے

ہوش لوگوں کے اُڑے جاتے ہیں سن میرا سخن

سر کو کہسار سے ٹکراتی ہے بادِ صرصر   جانور دیکھیں ہیں حیرانی سے بادیدۂ تر

در و دیوار مرے حال تبر پر ششدر   سر کو دھنتا ہے مرے حال پہ ہر ایک شجر

میری بے چینی سے بے چین ہیں شیر اور ہرن

جب کہ تجھ بن یہ ہوا میرے اُپر رنج و تعب   ہر کوئی کہنے لگا ہائے غضب ہائے غضب

اُڑتے اُڑتے مری خبروں کا فسانہ ہوا جب   اِک دل آباد ہے بستی تو ہیں جانے ہیں سب

اس میں اِک راجا مہاراجہ کا ہے سنگھاسن

نامی و نامور اور خلق میں عزت والا   جس کے تابع ہیں ہر اک شاہ سے لے تا بہ گدا

ہے حقیقت میں جہاں مرضی پہ اُس کی سارا   عقل کل نام کہا کرتے ہیں اس کا راجا

دیکھ کر تجھ کو وہ کرنے لگا اس طرح سخن

واہ وا بھاگ مرے میں نے جو دیکھا تم کو   تم سے الفت ہے ہمیشہ سے ہمارے دل کو

میں تو یہ چاہتا ہی تھا کہ کہیں تجھ سے ملو   آؤ جی بیٹھو مرے گھر میں قدم رنجہ کرو

کرو روشن مرے کاشانے کو ٹک رکھ کے چرن

ہم تمھیں جانتے ہیں اور بزرگوں کو سب   سب بزرگ آپ کے رکھتے ہیں ہماری ہی طلب

ہم کو بھی لوگوں سے ہے ربط محبت کے سبب   ہم کو معلوم ہوا آپ کا سب حسب و نسب

عشق نے تم کو بنایا ہے بہ شکل جوگن

ہے عزیز آپ کی خاطر بڑی ہم کو دل میں　　اس سے سمجھاتے ہیں اب مت رکھو غم کو دل میں
کیوں اُٹھا رکھا ہے اس جور و ستم کو دل میں　　جانے دو راہ نہ دو رنج و الم کو دل میں
باغ کی سیر کرو اور رہو محو گلشن

محفل عیش بنا کر رہو آنکھوں کے حضور　　باغ دنیا کی کرو سیر جو ہو دل کو سرور
کیسے کیسے ہیں گل اندامون کا دیکھو تو ظہور　　یاد کو اُس رُخ تاباں کی کرو دل سے دور
کون سی بات کی کمتی ہے تمھیں صاحبِ من

تم بھی سردار ہو ذی ہوش ہو ٹک غور کرو　　ایک ہی شخص پہ مر جاتے نہیں جان کو کھو
سیکڑوں ماہ جبیناں ہیں ہزاروں خوش خو　　تن سے بس گیروی کفنی کے تئیں دور کرو
پہنو پوشاک شہانہ رکھو خوش دل اور من

شانہ لو ہاتھ میں اور اپنے یہ سلجھاؤ بال　　سرمہ دو آنکھوں میں اور دیکھو یہ قدرت کا خیال
دل کو بہلا کے بھلا دو یہ سبھی رنج و ملال　　تم پہ اس طرح کا ہے نام خدا حسن و جمال
کہ ہیں خلق کے دلبر سبھی دھو دھو کے چرن

دل کو مسرور رکھو اور رہو شاد اور خوش　　شیریں باتیں کرو اور شکل بناؤ دل کش
کہ ہر ایک شخص کو آجائے تمھیں دیکھ کے غش　　نہ کہ تم اور رولیں یہ اس طرح پھرو وحشی وش
جانے دو دور کرو دل سے یہ الفت کی لگن

آدمی رنج سہا کرتا ہے ان باتوں میں　　جان کو کھوتا پھرا کرتا ہے ان باتوں میں
سب کی نظروں سے گرا کرتا ہے ان باتوں میں　　نام بدنام ہوا کرتا ہے ان باتوں میں
خوب ہم دیکھ چکے ہیں کہ برا ہے یہ فن

خوب سُن سن کے میں حیران رہی مُنہ کو تک　　اور مایوسی و مظلومی سے دیکھا بہ فلک

گفتگو حد سے زیادہ ہوئی بس اور یک بیک　　تب تو وہ حال ہوا جیسے جراحت پہ نمک
وعظ کے تیروں سے پہلو ہوا چھلنی چھن چھن

سب کو روشن ہے بُری ہوتی ہے یہ بیت لگی　　میں بھی کہنے ہی سے آخر کے تئیں رہ نہ سکی
دل میں غصہ تو بہت آیا و لے روک گئی　　زار زار آنکھوں سے رونے لگی اور کہنے لگی
ہے بعید ایسے خرد مندوں سے یعنی یہ سخن

آپ تو جانتے ہیں بیت بلا ہوتی ہے　　خوب معلوم ہے تم کو کہ یہ کیا ہوتی ہے
رہے خاموش طبیعت یہ خفا ہوتی ہے　　واہ جی یوں بھی لگی دل سے جدا ہوتی ہے
عشق ہیں کس کے تئیں بھاتی ہے سیر گلشن

عیش کرنے بھاتا ہے جب تک کہ نہ ہو یار حضور　　گل رخسار بجز باغ سے کب ہو وے سرور
اس سوا کون ہے بہتر کہ وہ میں دیکھوں ظہور　　اپنے کیا بس میں ہے جو دل سے کروں رنج کو دور
اپنے قابو میں ہے جو دور کروں رنج و محن

ہاں خاص اس لئے ہیں مجھ کو یہ منظور نظر　　کہ بہار یں کبھی راہ اس کی جو وہ آئے ادھر
یہ تمنا ہے یہ آنکھیں گریں اُن قدموں پر　　بات کے کرنے سے ہے آہ کا کرنا بہتر
جلیو یہ تن جو خوش آئے اسے خوش پیراہن

میرا وہ رشک قمر کون ملا دے مجھ سے　　میرا وہ تیر نظر کون ملا دے مجھ سے
میرا متوالا مگر کون ملا دے مجھ سے　　یا خدا، میرا جگر کون ملا دے مجھ سے
کون جا کر کہے میں پھرتی ہوں سپے شہر و وطن

خوش ہوں اِس غم سے کہ یہ یار کے باعث ہوا　　ننگ و ناموس بھی سب اُس پہ سے وار دیا
سر ہتھیلی پہ دھرا عشق میں جب پاؤں رکھا　　جان کا بھی نہیں جب پاس تو پھر پاس ہے کیا

جو کہ سمجھائے مجھے اس کا ہے دیوانہ پن

نام پر تیرے میں اس جان کے تئیں کھوتی ہوں　　تیری صورت پہ میں قربان کھڑی ہوتی ہوں
خون دل روتی ہوں عارض کے تئیں دھوتی ہوں　　تھام تھام اپنے کلیجے کے تئیں روتی ہوں

دیکھ رہتی ہوں ہر اک شخص کو حیراں بن بن

جو نہ سہنا تھا سہا رنج بہت کھایا ہائے　　لیک ارمان رہا دل کو بہت سارا ہائے
یعنی تو نے ہی نہ دیکھا یہ مرا جلنا ہائے　　اب تو بے تابی سے گھبرا گیا دل میرا ہائے

ڈوب کر مر ہی رہوں برلب گنگ اور جمن

کس کو دکھلاؤں جو گزرے ہے تری الفت میں　　کچھ مرے بس کی نہیں پھنس گئی اک دقت میں
نام بدنام ہوا فرق پڑا عزت میں　　ایک دیوانی سی پھرتی ہوں تری فرقت میں

عرش سے فرش تلک حال ہے میرا روشن

کس سے جا کے کہوں کون سی جا ہے تیری　　کبھی بے تابی سے بیٹھوں کبھی ہوتی ہوں کھڑی
کبھی ہو محوِ تصور یہی کہتی ہوں، آجی　　سیس کے پاؤں سے میں راہ بہاروں تیری

جو قدم رنجہ کرو اور مجھے دو درشن

کبھی رو دیتی ہوں آنکھوں سے بہ شکل دریا　　کبھی گاتی ہوں ترے نام کو لے لے کے پیا
کبھی منہ پیٹ لیا جیب کبھی چاک کیا　　آرزو ہے کہ میں سو جان سے ہوں تجھ پہ فدا

دیکھے ٹک آن کے تو بھی تو مرا جوگن پن

تو کہیں اور میں کہیں اس سے تو مر ہی جاؤں　　اے مرے ماہ جبیں اس سے تو مر ہی جاؤں
تجھ کو بھی ہو وے یقیں اس سے تو مر ہی جاؤں　　تاب جینے کی نہیں اس سے تو مر ہی جاؤں

ہے جدائی کی نپٹ مجھ پہ مصیبت یہ کٹھن

یا الٰہی کوئی مجھ سا بھی نہ ہووے دلگیر　　خجل و خوار پریشان و ذلیل اور حقیر
طور بے طور نظر آتے ہیں ہوں بس کہ نظیر　　حسرتا آہ چہ بے غم بہ غم یار اسیر
من حزیں در غم او خلق حزیں در غم من

(۳۸) موتی

رہے ہیں اب تو پاس اس شوخ کے شام و سحر موتی　　جبیں پر موتی اور سینہ میں موتی مانگ پر موتی
ادھر جگنو ادھر کچھ بالیوں میں جلوہ گر موتی　　بھرے ہیں اس پری میں اب تو یارو سر بسر موتی
گلے میں کان میں نتھ میں جدھر دیکھو ادھر موتی

کوئی اس چاند سے ماتھے کے ٹیکے میں اچھلتا ہے　　کوئی بندوں سے بل کر کان کی نرموں میں ملتا ہے
لپٹ کر دھگدگی میں کوئی سینے پر مچلتا ہے　　کوئی جھمکوں میں جھولے ہے کوئی بالی میں ہلتا ہے
یہ کچھ لذت ہے جب اپنا چھدا تے ہیں جگر موتی

کبھی وہ نازنیں ہنس کر جو کچھ باتیں بناتی ہے　　تو اک اک بات میں موتی کو پانی میں بہاتی ہے
ادا و ناز میں چنچل عجب عالم دکھاتی ہے　　وہ سمرن موتیوں کی انگلیوں میں جب پھراتی ہے
تو صدقے اس کے ہوتے ہیں پڑے ہر پور پر موتی

غلط ہے اس لب رنگیں کو برگ گل سے کیا نسبت　　کہ جن کی ہے عقیق اور پنے اور یاقوت کو حسرت
اداہٹ کچھ مسی کی اور کچھ اس پر پان کی رنگت　　وہ ہنستی ہے تو کھلتا ہے جواہر خانۂ قدرت
ادھر لعل اور ادھر نیلم ادھر مرجاں ادھر موتی

کبھی جو بال بال اپنے میں وہ موتی پروتی ہے　　نزاکت سے عرق کی بوند بھی ٹکڑے کو دھوتی ہے

بدن بھی موتی، سر تا پاؤں سے پہنے بھی موتی ہے   سراپا موتیوں کا پھر تو اک گچھا وہ ہوتی ہے
کہ کچھ وہ خشک موتی کچھ پسینے کے وہ تر موتی

گلے میں اس کے جس دم موتیوں کے ہار ہوتے ہیں   چمن کے گل سب اس کے وصف میں موتی پروتے ہیں
نہ تنہا رشک سے قطرات شبنم دل میں روتے ہیں   فلک پر دیکھ کر تارے بھی اپنا ہوش کھوتے ہیں
پہن کر جس گھڑی بیٹھے ہے وہ رشکِ قمر موتی

وہ زیور موتیوں کا واہ اور کچھ تن وہ موتی سا   پھر اس پر موتیا کے ہار بازو بند اور گجرا
سراپا زیب و زینت میں وہ عالم دیکھ کر اس کا   جو کہتا ہوں ارے ظالم ٹک اپنا نام تو بتلا
تو ہنس کر مجھ سے یوں کہتی ہے وہ جادو نظر، موتی

کڑے پازیب توڑے جس گھڑی آپس میں لڑتے ہیں   تو ہر جھنکار میں کس کس طرح باہم جھگڑتے ہیں
کسی دل سے بگڑتے ہیں کسی کے جی پہ اڑتے ہیں   کڑے سونے کے کیا موتی بھی اس کے پاؤں پڑتے ہیں
اگر باور نہیں، دیکھو، ہیں اس کی کفش پر موتی

خفا ہو ان دنوں کچھ روٹھ بیٹھی ہے جو ہم سے وہ   تو اس کے غم میں جو ہم پر گزرتا ہے سو مت پوچھو
چلے آتے ہیں آنسو دل پڑا ہے بستر میں غش ہو   وہ دریا موتیوں کا ہم سے روٹھا ہو تو پھر یارو
بھلا کیونکر نہ برساوے ہماری چشم تر موتی

شفق میں اتفاقاً جیسے سورج ڈوب کر نکلے   ویا ابرِ گلابی میں کہیں بجلی چمک جاوے
بیاں ہو کس طرح سے آہ، اس عالم کو کیا کہیے   تبسم کی جھلک میں یوں جھمک جاتے ہیں دانت اس کے
کسی کے یک بیک جس طور جاتے ہیں بکھر موتی

ہمیں کیونکر پریزادوں سے بوسوں کے نہ ہوں لینے   جڑاؤ موتیوں کے اس غزل پہ وار دیئے گہنے
سخن کی کچھ جو اس کے دل میں ہے الفت لگی رہنے   نظیر اس ریختے کو سن وہ ہنس کر یوں لگی کہنے

اگر ہوتے تو میں دیتی، تجھے، اِک تھال بھر موتی

(۳۹) موت

دنیا کے بیچ یارو سب زیست کا مزا ہے   جیتوں کے واسطے ہی یہ ٹھاٹھ سب ٹھٹا ہے
جب مر گئے تو آخر پھر عرصۂ خاک پا ہے   نے باپ ہے نہ بیٹا، نہ یار آشنا ہے
ڈرتی ہے روح یارو اور جی بھی کانپتا ہے
مرنے کا نام مت لو مرنا بری بلا ہے

جیتوں کے دل کو ہر دم کیا عیش پے بہ پے ہے   گلزار، ناچ، سیریں، ساقی، صراحی، مے ہے
جب مر گئے تو ہرگز مے ہے نہ کوئی شے ہے   اس مرگ کے ستم کو کیا کیا کہوں میں ہے ہے
ڈرتی ہے روح یارو اور جی بھی کانپتا ہے
مرنے کا نام مت لو مرنا بری بلا ہے

ہے دم کی بات جو تھے مالک یہ اپنے گھر کے   جب مر گئے تو ہرگز گھر کے رہے نہ در کے
یوں مٹ گئے کہ گویا تھے نقش رہ گزر کے   پوچھا نہ پھر کسی نے یہ تھے میاں کدھر کے
ڈرتی ہے روح یارو اور جی بھی کانپتا ہے
مرنے کا نام مت لو مرنا بری بلا ہے

مرنے کے بعد کوئی الفت نہ پھر جتاوے   نے بیٹا پاس آوے نے بھائی منہ لگاوے
جو دیکھے ان کی صورت دہشت سے بھاگ جاوے   اس مرگ کی جفائیں کیا کیا کوئی سناوے
ڈرتی ہے روح یارو اور جی بھی کانپتا ہے

مرنے کا نام مت لو مرنا بُری بلا ہے

پیتے تھے دودھ شربت اور چابتے تھے میوا　　مرتے ہی پھر کچھ ان کا سکہ رہا نہ تھیوا
بچے یتیم ہو گئے، بی بی کہائی بیوا　　اس مرگ نے اکھاڑا کس کس بدن کا لیوا
ڈرتی ہے روح یارو اور جی بھی کانپتا ہے
مرنے کا نام مت لو مرنا بری بلا ہے

جب روح تن سے نکلے آنا نہیں یہاں پھر　　کا ہے کو دیکھنے ہیں یہ باغ و بوستاں پھر
ہاتھی پہ چڑھ سکے یاں پھر گھوڑے پہ چڑھ سکے واں پھر　　جب مر گئے تو لوگو یہ عشرتیں کہاں پھر
ڈرتی ہے روح یارو اور جی بھی کانپتا ہے
مرنے کا نام مت لو مرنا بری بلا ہے

گھر ہو بہشت جن کا اور بھر رہی ہو دولت　　اسباب عشرتوں کے محبوب خوب صورت
پھر مرتے وقت ان کو کیونکر نہ ہووے حسرت　　کیا سخت بے بسی ہے کیا سخت ہے مصیبت
ڈرتی ہے روح یارو اور جی بھی کانپتا ہے
مرنے کا نام مت لو مرنا بُری بلا ہے

کھانے کو نعمت اُن کے سو سو طرح کی آتی　　اور وہ نہ پاویں ٹکڑا دیکھو ٹک ان کی چھاتی
کوڑی کی جھونپڑی بھی چھوڑی نہیں ہے جاتی　　لیکن نظیرؔ سب کچھ یہ موت ہے چھڑاتی
ڈرتی ہے روح یارو اور جی بھی کانپتا ہے
مرنے کا نام مت لو مرنا بُری بلا ہے

(۱۴۰) اکبرآباد

شہر سخن میں اب جو ملا ہے مجھے مکاں　　کیونکر نہ اپنے شہر کی خوبی کروں بیاں
دیکھی ہیں آگرے میں بہت ہم نے خوبیاں　　ہر وقت اس میں شاد رہے ہیں جہاں تہاں
رکھیو الٰہی اس کو تو آباد جاوداں

ہر صبح اس کی رکھتی ہے وہ نورِ گستری　　شرمندہ جس کو دیکھ کے ہو عارضِ پری
ہر شام بھی وہ رشکِ ملاحت سے ہے بھری　　لیلیٰ کی جعد کر نہ سکے جس کی ہمسری
دن روئے مہر طلعت و شب زلفِ مہوشاں

باغات پر بہار عمارات پُر نگار　　بازار وہ کہ جس پہ چمن دل سے ہو نثار
محبوب دل فریب گل اندام و گلعذار　　گلیاں کہیں ہیں آپ کو گلزار پر بہار
کوچے کہیں ہیں اپنے تئیں صحنِ گلستاں

آب و ہوا کے لطف کوئی کیا کیا اب کہے　　دیکھو جدھر اُدھر گلِ عشرت ہیں کھل رہے
ایدھر کو قہقہے ہیں تو اودھر کو چہچہے　　اشجار باغ و شہر وہ سرسبز لہلہے
سبزوں کو جن کے دیکھ کے حیراں ہو آسماں

ہر فصل میں وہ ہوتے ہیں پاکیزہ میوہ جات　　دیکھے تو پھر نبات سے بن آوے کچھ نہ بات
شہد ان پہ آٹھ پہر لگائے رہے ہے گھات　　قند و شکر بھی دل سے فدا ہیں دن اور رات
رہتے ہیں اُن کے وصف میں ہر دم شکر فشاں

نہر چمن کو دیکھو تو جیسے چمن کی نہر　　لاکھوں بہاریں رکھتی ہے ایک ایک جس کی لہر

کوئی نہاوے اور کوئی مُنہ دھووے شاد ہو کر	اس پر ہجوم رکھتے ہیں یوں ساکنان شہر
شمشاد و سرو بہتے ہیں جوں نہر پر عیاں

گر یاں کے پیرنے کا کروں وصف میں رقم	تو بحر صفحہ بیچ لگے پیرنے قلم
پیرے ہیں اس روش کی بہاروں سے ہو بہم	سو سو چمن بھرے ہوئے شبنم کے دمبدم
آجاتے ہیں نظر وہیں دریا کے درمیاں

اہل شنا جو کرتے ہیں سو سو طرح شنا	لہریں نشاط و عیش کی اُٹھتی ہیں دل میں آ
ملتا نہیں کنارہ کچھ عشرت کے بحر کا	ساحل پہ جوش خلق سے ملتی نہیں ہے جا
ہوتا ہے وہ ہجوم بھی اک بحر بیکراں

یارو عجب طرح کا یہ دلچسپ ہے مقام	ہوتے ہیں ایسے کتنے ہی خوبی کے اژدہام
ہر طور خوش رہے ہے دل اور طبع شاد کام	میری نظیر دل سے یہی ہے دعا مدام
ہنستا رہے یہ شہر بصد امن اور اماں

(۲)

(۴۱) پری کا سراپا

خوں ریز کرشمہ، ناز ستم، غمزوں کی جھکاوٹ ویسی ہے	مژگاں کی سناں، نظروں کی انی، ابرو کی کھنچاوٹ ویسی ہے
عیار نظر، مکار ادا، تیوری کی چڑھاوٹ ویسی ہے	قتال نگہ اور دشت غضب، آنکھوں کی لگاوٹ ویسی ہے
پلکوں کی جھپک، پتلی کی پھرت، سرمے کی گھلاوٹ ویسی ہے

جو کافر اس کا عالم ہے وہ عالم حور کہاں پاوے — گر پردہ منہ سے دور کرے، خورشید کو چکر آجاوے
جب ایسا حسن بھبھوکا ہو، دل تاب بھلا پھر کیا لاوے — وہ مکھڑا چاند کا ٹکڑا سا جو دیکھ پری کو غش آوے
گالوں کی دمک، خوبی کی جھمک، رنگوں کی کھلاوٹ ویسی ہے

تھی زور ادا سے سر اوپر سنجاف ڈوپٹے کی الٹی — بلدار لٹیں تصویر جبیں، جکڑی مینڈھیں نیچی کنگھی
دل پیچ نہ کھاوے اب کیونکر اور دیکھ نہ الجھے کیونکر جی — وہ رات اندھیری بالوں کی، وہ مانگ چمکتی بجلی سی
زلفوں کی ظلمت، پٹی کی جمت، چوٹی کی گندھاوٹ ویسی ہے

بیدرد، ستمگر، بے پروا، چنچل، بے کل، چٹکیلی سی — دل سخت قیامت پتھر سا اور باتیں نرم رسیلی سی
ڈوروں کی بان رنگیلی سی، کاجل کی آن کٹیلی سی — وہ آنکھیں مست نشیلی سی، کچھ کالی سی کچھ پیلی سی
چتون کی دغا، نظروں کی کپٹ، سینوں کی لڑاوٹ ویسی ہے

اس کافر بینی اور نتھ کے انداز قیامت شان بھرے — اور ٹھوڑی سے چاہ زنخداں میں سو آفت کے طوفان بھرے
وہ تیرے صاف ستارا سے اور موتی سے دامان بھرے — وہ کان نرے طوفان بھرے کن پھولوں بالے جان بھرے
بُندوں کی ہلت، جھمکوں کی جھمکت، بالے کی ہلاوٹ ویسی ہے

چہرے پر حسن کی گرمی سے ہر آن جھمکتے موتی سے — خوش رنگ پسینے کی بوندیں، سو بار جھلکتے موتی سے
ہنسنے کی ادائیں پھول جھڑیں، باتوں میں ٹپکتے موتی سے — وہ پتلے پتلے ہونٹ غضب، وہ دانت چمکتے موتی سے
پاؤں کی رنگاوٹ قہر ستم، دھڑیوں کی جماوٹ ویسی ہے

تقریر بیاں سے باہر ہے وہ کافر حسن اہا ہا ہا — کچھ آپ نہی کچھ حسن نیا، کچھ جوش جوانی کا اومکا
پلکیں جھپکیں ان باہوں کی بازو میں واہ کہوں کیا کیا — وہ بانکے بازو ہوش ربا، عاشق سے کھیلیں بانک پٹا
پہنچی کی پہنچ، پھونچے پہ غضب، بانکوں کی بناوٹ ویسی ہے

وہ گورے گورے ہاتھ غضب، وہ نرم کلائی نازک بھری — کچھ شوخ کڑوں کی جھنکاریں، کچھ جھنکے چوڑی باہوں کی

یہ عالم دیکھ کے عاشق کا سینے میں نہ تڑپے کیونکر جی　　وہ پیاری پیاری انگشتیں، وہ پوریں نازک نازک سی
مہندی کی رنگت، فندق کی نبت، چھلّوں کی چھلاوٹ ویسی ہے

کچھ ناز و ادا کی مغروری، کچھ جور و جفا کچھ بانک پنا　　کچھ آمدِ حسن کے موسم کی، کچھ کافر جسم رہا گدرا
یہ شور جوانی اٹھتی کا، آتا ہے امنڈ کر جوں دریا　　وہ سینہ ابھرا جوش بھرا، وہ حسن کا عالم جھوم رہا
شانوں کی اکڑ، گردن کی مرت، مونڈھوں کی کھنچاوٹ ویسی ہے

یہ کافر گدی کا عالم، گھبرا ئے پری بھی دیکھ جسے　　اور گورا صاف گلا ایسا ہو جاوے موتی دیکھ جسے
دل لوٹے تڑپے ہاتھ ملے اور غش کھاوے جی دیکھ جسے　　وہ گردن اونچی حسن بھری، کٹ جائے صراحی دیکھ جسے
دائیں کی مرت، بائیں کی پھرت، کولھوں کی کھنچاوٹ ویسی ہے

اس سینے کا وہ چاک ستم، اس کرتی کا تن زیب غضب　　اس قد کی زینت قہر بلا، اس کافر چھب کا زیب غضب
ان ڈبیوں کا آزار برا، ان گیندوں کا آسیب غضب　　وہ چھوٹی چھوٹی سخت کچیں، وہ کچے کچے سیب غضب
انگیا کی بھڑک، گوٹوں کی جھمک، بندوں کی کساوٹ ویسی ہے

اس گورے گورے سینے پر وہ گہنے کی گلزار کھلی　　چمپے کی کلی، ہیرے کی جڑی، توڑے، جگنو، ہیکل بدھی
دل لوٹے تڑپے ہاتھ ملے اور جائے نظر ہر دم پھسلی　　وہ پیٹ ملائی سا کافر، وہ ناف چمکتی تارا سی
شوخی کی کھلاوٹ اور ستم، شرموں کی چھپاوٹ ویسی ہے

ہر آن نرالی ہر ایک سے اس شوخ پری کی شوخی　　کچھ ناز و ادا کی مرغوبی، کچھ شرم و حیا کی محجوبی
اب گہنے کی تعریف کروں یا کافر جوڑے کی خوبی　　پوشاک سنہری عطر بھری، سر پاؤں جواہر میں ڈوبی
جگنوں کی دمک، سینے کی صفا، کرتی کی پھنساوٹ ویسی ہے

وہ کافر چنچ، جی دیکھ جسے سو بار قیامت کا لرزے　　پازیب کڑے، پایل گھنگرو، کڑیاں، چھڑیاں، گجرے، توڑے
ہر جنبش میں سو جھنکاریں ہر ایک قدم پر سو کھٹکے　　وہ تخل ہیال جوانی کی، اونچی ایڑی، نیچے پنجے

کفشوں کی کھٹک، دامن کی جھٹک، ٹھوکر کی لگاوٹ ویسی ہے

قاتل ہر آن نیا عالم، کافر ہر آن نئی جھمکیں
بانکی نظریں، ترچھی پلکیں، بھولی صورت، میٹھی باتیں
دل بس کرنے کے لاکھوں ڈھب، جی لینے کی سو سو گھاتیں
ہر آن پھبن، ہر آن سجن، ہر دم میں بدلے لاکھ دھجیں
آنکھوں کی لگاوٹ، قہر ستم، باتوں کی رکھاوٹ ویسی ہے

تصویر کا عالم نکھ سکھ سے چھب تختی صاف پری کی سی
کچھ چین جبین کے اینٹھ رہے اور ہونٹوں میں کچھ کالی سی
بیدردی سختی بہتیری اور مہر محبت تھوڑی سی
جھوٹی عیاری ناک چڑھی، بھولی سیانی، پکی پیسی
ٹھٹھوں کی اوڑاوٹ اور غضب قہ قہ کی ہنساوٹ ویسی ہے

نظروں میں صاف اڑالے دل، اس طرح کی کافر عیاری
اور ہٹ جاوے سو کوس پرے گر بات کہو کچھ مطلب کی
کہنی مارے چٹکی لے لے، چھیڑے، جھڑکے دیوے گالی
ہر آن چہ خوش، ہر دم اچھا، ہر بات ہنسی کی چھل بھری
رمزوں کے ضلع، غمزوں کے جگت، پھبتی کی پھباوٹ ویسی ہے

یہ ہوش قیامت کافر کا جو بات کہو وہ سب سمجھے
رو بیٹھے، مچلے، سو سوانگ کرے، باتوں میں لڑے، نظروں میں ملے
یہ شوخی اور یہ بیتابی، ایک آن کبھی نچلی نہ رہے
چنچل، اچپل، مٹکے، چٹکے، سر کھولے، ڈھانپے، ہنس ہنس دے
باہوں کی جھٹک، گھونگھٹ کی ادا، جوبن کی دکھاوٹ ویسی ہے

ایک شور قیامت ساتھ چلے نکلے کافر جس دم بن ٹھن
بل دار کمر، رفتار غضب، دل کی قاتل جی کی دشمن
مذکور کروں میں اب یارو اس شوخ کے کیا کیا چنچل پن
کچھ ہاتھ ہلیں، کچھ پاؤں ہلیں، اچھلیں بازو پھڑکے سب تن
گاتی وہ بلا، تالی وہ ستم، انگلی کی نچاوٹ ویسی ہے

جو ایسا حسن کا دریا ہو، کس طور نہ لہروں میں بہیے
گر مہر و محبت ہو بہتر، اور جور جفا ہو تو سہیے
دل لوٹ گیا ہے غش ہو کر بس اور تو آگے کیا کہیے
مل جائے نظیرؔ ایسی جو پری چھاتی سے لپٹ کر سو رہیے
بوسوں کی چپک، بغلوں کی لپٹ، سینوں کی ملاوٹ ویسی ہے

۴۲ آئینہ

لے آئینے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ   صورت میں اپنی قدرتِ پروردگار دیکھ
خالِ سیاہ اور خطِ مُشکبار دیکھ   زلفِ دراز و طرّۂ عنبر نثار دیکھ
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

آئینہ کیا ہے، جان وہ ترا پاک صاف دل   اور خال و خط ہیں تیرے سُویدائے رُخ کے تل
زلف دراز فہم رسا سے رہی ہے رل   لاکھوں طرح کے پھول رہے ہیں تجھی میں کھل
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

مُشک تتار و مُشک ختن بھی تجھی میں ہے   یاقوت سرخ و لعل یمن بھی تجھی میں ہے
نسرین و موتیا و سمن بھی تجھی میں ہے   القصہ کیا کہوں میں چمن بھی تجھی میں ہے
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

مشک ختن ہے کیا، یہ تری زلف پر شکن   یاقوت و لعل کیا ہیں یہ تیرے لب و دہن
اور موتیا ہے کیا ترے دندان گہر ثمن   باغ و چمن ہے کیا یہ سراپا ترا بدن
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

سورج مکھی کے گل کی اگر دل میں تاب ہے — تو اپنے مُنہ کو دیکھ کہ خود آفتاب ہے
گل اور گلاب کا بھی تجھی میں حساب ہے — رخسار تیرا گل ہے پسینہ گلاب ہے
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

نرگس کے پھول پہ تو نہ اپنا گمان کر — اور سرو سے بھی دل نہ لگا اپنا جان کر
یہ سب سما رہے ہیں تجھی میں تو آن کر — اپنے سوا کسی پہ تو ہرگز نہ دھیان کر
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

نرگس وہ کیا ہے، جان، تری چشم خوش نگاہ — اور سرو کیا ہے یہ ترا قدِ دراز آہ
گر سیرِ باغ چاہے تو اپنی ہی کر تو چاہ — حق نے تجھی کو باغ بنایا ہے واہ واہ
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

گر دل میں تیرے قمری و بُلبل کا دھیان ہے — تو ڈھونڈھ تیرے قمری ہیں، بُلبل زبان ہے
ہے تو ہی باغ اور تو ہی باغبان ہے — باغ و چمن ہیں جتنے تو اُن سب کی جان ہے
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

بیلا، گلاب، سیوتی، نسرین و نسترن — داؤدی، جوہی، لالہ وندا، اسیل و یاسمن
جتنی جہاں میں پھولوں کی پھولی ہے انجمن — یہ سب تجھی میں پھول رہے ہیں چمن چمن
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ

اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

عالم میں تیرے باغ کا اے جاں وہ گھیر ہے — طوطی تدرو طوطی و کبک و بٹیر ہے
باغ و چمن کی تجھ کو عبث گھیر اگھیر ہے — سر پاؤں سے تو آپ ہی پھولوں کا ڈھیر ہے
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

باغ جہاں کے غنچہ و گل میں نہ ہو اسیر — قمری کی سن نفیر نہ بلبل کی سن صفیر
اپنے تئیں تو دیکھ کہ کیسا ہے بے نظیر — ہیں حرف مَن عَرَف کے یہی معنی اے نظیر
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

۴۳ روٹی نامہ

جب آدمی کے پیٹ میں آتی ہیں روٹیاں — پھولی نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں — سینے اوپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں !!!
جتنے مزے ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی سے جن کا ناک تلک پیٹ ہے بھرا — کرتا پھرے ہے کیا وہ اچھل کود جا بجا
دیوار پھاند کر کوئی کوٹھا اچھل گیا — ٹھٹھا، ہنسی، شراب، صنم، ساقی اس سوا
سو سو طرح کی دھوم مچاتی ہیں روٹیاں

جس جا پہ ہانڈی چولھا توا اور تنور ہے — خالق کی قدرتوں کا اسی جا ظہور ہے

چولھے کے آگے آنچ جو جلتی حضور سے ہے — جتنے ہیں نور، سب میں یہی خاص نور ہے
اس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں

آوے تو سے تنور کا جس جا زباں پہ نام — یا چکی چولھے کا جہاں گلزار ہو تمام
یہاں سر جھکا کے کیجیے ڈنڈوت اور سلام — اس واسطے کہ خاص یہ روٹی کے ہیں مقام
پہلے انھیں مکانوں میں آتی ہیں روٹیاں

ان روٹیوں کے نور سے سب دل ہیں پور پور — آٹا نہیں ہے چھلنی سے چھن چھن گرے ہے نور
پیڑا ہر ایک اس کا ہے برفی و موتی چور — ہرگز کسی طرح نہ بجھے پیٹ کا تنور
اس آگ کو مگر یہ بجھاتی ہیں روٹیاں

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے — یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے — ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

پھر پوچھا اس نے کہیے یہ ہے دل کا نور کیا — اس کے مشاہدے میں ہے کھلتا ظہور کیا
وہ بولا سن کے "تیرا گیا ہے شعور کیا — کشف القلوب اور یہ کشف القبور کیا
جتنے ہیں کشف، سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں"

روٹی جب آئی پیٹ میں سو قند گھل گئے — گلزار پھولے آنکھوں میں اور عیش تل گئے
دو تر نوالے پیٹ میں جب آ کے ڈھل گئے — چودہ طبق کے جتنے تھے سب بھید کھل گئے
یہ کشف، یہ کمال، دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو — میلے کی سیر، خواہش باغ و چمن نہ ہو
بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو — سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو

اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

اب جن کے آگے مال پوے بھر کے تھال ہیں — پوری بھگت انھیں کی وہ صاحب کے لال ہیں
اور جن کے آگے روغنی اور شیرمال ہیں — عارف وہی ہیں اور وہی صاحب کمال ہیں
پکی پکائی اب جنھیں آتی ہیں روٹیاں

کپڑے کسی کے لال ہیں روٹی کے واسطے — سینے کسی کے لال ہیں روٹی کے واسطے
باندھے کوئی رومال ہیں روٹی کے واسطے — سب کشف اور کمال ہیں روٹی کے واسطے
جتنے ہیں روپ سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی سے ناچے پیادہ تو اعد دکھا دکھا — اسوار ناچے گھوڑے کو کاوا لگا لگا
گھنگرو کو باندھے پیک بھی پھرتا ہے جا بجا — اور اس سوا جو غور سے دیکھا تو جا بجا
سو سو طرح کے ناچ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی کے ناچ تو ہیں سبھی خلق میں پڑے — کچھ بھانڈ بھگتیے یہ نہیں پھرتے ناچتے
یہ رنڈیاں جو ناچے ہیں گھونگھٹ کو منہ پہ لے — گھونگھٹ نہ جانو دوستو تم زینہار اسے
اس پردے میں یہ اپنی کماتی ہیں روٹیاں

اور وہ جو ناچنے میں بتاتی ہیں بھاؤ تاؤ — چتون اشارتوں سے کہیں ہیں کہ روٹی لاؤ
روٹی کے سب سنگار ہیں روٹی کے راؤ چاؤ — رنڈی کی تاب کیا جو کرے اس قدر بناؤ
یہ آن یہ جھمک تو دکھاتی ہیں روٹیاں

اشرافوں نے جو اپنی یہ ذاتیں چھپائی ہیں — سچ پوچھیے تو اپنی یہ شانیں بڑھائی ہیں
کہیے انھوں کی روٹیاں کس کس نے کھائی ہیں — اشراف سب میں کہیے تو اب نان بائی ہیں
جن کی دکان سے ہر کہیں جاتی ہیں روٹیاں

بھٹیاریاں کہا دیں نہ اب کیونکہ رانیاں — مہتر خصم ہیں اُن کے وہ ہیں مہترانیاں
ذاتوں میں جتنے اور ہیں قصے کہانیاں — سب میں انھیں کی ذات کی اونچی ہیں بانیاں
کس واسطے کہ سب یہ پکاتی ہیں روٹیاں

دنیا میں اب بدی نہ کہیں اور نکوئی ہے — نا دشمنی و دوستی نا تند خوئی ہے
کوئی کسی کا اور کسی کا نہ کوئی ہے — سب کوئی ہے اسی کا کہ جس ہاتھ ڈوئی ہے
نوکر، نفر، غلام، بناتی ہیں روٹیاں

روٹی کا اب ازل سے ہمارا تو ہے خمیر — روکھی بھی روٹی حق میں ہمارے ہے شہد و شیر
یا پتلی ہووے موٹی، خمیری ہو یا فطیر — گیہوں کی جوار باجرے کی جیسی ہو نظیرؔ
ہم کو تو سب طرح کی خوش آتی ہیں روٹیاں

(۴۴) آندھی

نہ ہو کیونکر جہاں یارو زبر اور زیر آندھی میں — کہ ہو کر باؤلے پھرتے ہیں بن کے شیر آندھی میں
لگا لینے جو گل دامن ہوا کا گھیر آندھی میں — بگولے اٹھ چلے تھے اور نہ تھی کچھ دیر آندھی میں
کہ ہم سے یار سے آ ہو گئی مڈبھیڑ آندھی میں

کہا میں نے اجی کچھ خیر ہے جاتے ہو تم کیدھر — ہوا پر بھی تمھیں کچھ ہے نظر اے نازنیں دلبر
چلو بھاگو شتابی ورنہ آندھی آ گئی سر پر — جتا کر خاک کا اڑنا دکھا کر گرد کا چکر
وہیں ہم لے چلے اس گلبدن کو گھیر آندھی میں

یہ سنتے ہی پھری ڈر کر وہ چنچل نازنیں گل رو — چلی اس چال سے اس دم کہ میرا جی گیا غش ہو

کہ اس میں آ کے اک جھونکا اندھیرا کر گیا یارو ۔ رقیبوں نے جو دیکھا یہ اڑا کر لے چلا اس کو
پکارے ہائے یہ کیسا ہوا اندھیر آندھی میں

یہ کہہ کر کھڑکھڑا تیغ و سپر اور ڈل کے سب دوڑے ۔ پکارے لے چلو جانے نہ پاوے اس کو جلدی سے
کہاں کا وہ بھلا اور کس کا لینا ہم جو دھر بھاگے ۔ وہ دوڑے تو بہت لیکن انھیں آندھی میں کیا سوجھے
زبس ہم اس پری کو لائے گھر میں گھیر آندھی میں

چلے اس میں ہوا کے پھر تو آ کر اور سناٹے ۔ اندھیرا ہو گیا یکسر منوں خاکیں لگیں اڑنے
انھیں جھوکوں میں ہم نے اس پری چنچل کو آندھی میں ۔ چڑھا کوٹھے پہ دروازے کو موندا اور کھول کر پردے
لگا چھاتی سے لئے بوسے کیا ہت پھیر آندھی میں

ادھر تو آ کے آندھی سے اندھیرا ہو گیا ہر سو ۔ خبر کس کو کسی کی میں کہاں ہوں اور کہاں ہے تو
اہا ہا عجب عشرت کی اس دم بہ گئی اک جو ۔ وہ کوٹھے کا مکاں وہ کالی آندھی وہ صنم گل رو
عجب رنگوں کی ٹھہری آ کے ہیرا پھیر آندھی میں

اسی آندھی نے گلشن کر دیا یارو مرے گھر کو ۔ بچھایا شاد ہو میں نے پلنگ پر جھاڑ بستر کو
صراحی کی خبر لی اور سنبھالا جا کے ساغر کو ۔ اٹھا کر طاق سے شیشہ لگا چھاتی سے دلبر کو
نشوں میں عیش کے کیا کیا کیا دل سیر آندھی میں

بہن سا کھل گیا یار مرے کوٹھے کے زینے پر ۔ ہوئی پنکھوں کی مارا مار گرمی کے پسینے پر
لگے پھر عیش و عشرت جب تو ہونے اس قرینے پر ۔ کبھی بوسہ کبھی انگیا پہ ہاتھ اور گاہ سینے پر
لگے لٹنے مزے سے کر منگتر سے اور بہیر آندھی میں

یہ ٹھہرا جب تو پھر واں عیش کے بادل لگے گھرنے ۔ جو ڈوبی حسرتیں تھیں دل میں سب اُس دم لگیں ترنے
لپٹ کی ٹھہری اور بھی ہاتھ سینے پر لگے پھرنے ۔ مزے عیش و طرب لذت سے لگے یوں لوٹ کر گرنے

کہ جیسے ٹوٹ کر میووں کے ہو دیں ڈھیر آندھی میں

اس آندھی میں اہاہا ہا عجب ہم نے مزے مارے　　فلک پر عیش و عشرت کے دکھائی دے گئے تارے
رقیبوں کی میں اب خواری خرابی کیا لکھوں بارے　　تلے کوٹھے کے بیٹھے اٹ گئے سب گرد کے مارے
بھری نتھنوں میں ان کے خاک دس دس سیر آندھی میں

کسی نے بھاگ کر جلدی سے جا گھر کا لیا آنگن　　گرا کوئی گڑھے میں اور کوئی بھاگا کہیں دشمن
کسی کے چھن گئے کپڑے اچکنوں کی گئی واں بن　　کسی کی اڑ گئی پگڑی کسی کا پھٹ گیا دامن
گئی ڈھال اور کسی کی گر پڑی شمشیر آندھی میں

یہ دن آندھی کے یار و یوں تو سب کے ہوش کھوتے ہیں　　جنھیں ہے عیش وہ آندھی میں موتی سے پروتے ہیں
مزا ہے جن کو ہنستے ہیں جنھیں غم ہے سو روتے ہیں　　نظیرؔ آندھی میں کہتے ہیں کہ اکثر دیو ہوتے ہیں
میاں ہم کو تو لے جاتی ہیں پریاں گھیر آندھی میں

(۴۵) اژدھے کا بچہ

بیچے ہے اب تو کوئی بلبل بیٹے کا بچا　　اور بیچتا ہے کوئی طوطے ہرنے کا بچا
مینا، بیا، لٹورا اور ابطقے کا بچا　　تیتر، بٹیر، سارس، شکرے، لوسے کا بچا
سب بیچتے ہیں آکر چیتے گھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو، اوازدہے کا بچا

کھاتے تھے ہم تو اس سے آگے پلاؤ قلیا　　یا روکھی سوکھی روٹی یا باجرے کا دلیا
پھرتے ہیں سر پہ رکھ کر چالیس من کی ڈلیا　　اب کوئی آگرے میں ایسا نہیں ہے بلیا

سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچا

جب بیچتے تھے یارو ہم اژدہا پرانا　　سو سو طرح کا جب تو آتا تھا ہم کو کھانا
اب گاہکی جو کم ہے تو ہے یہ دل میں ٹھانا　　ایک بچہ روز لانا اور روز بیچ کھانا
سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچا

گاہک نہ کوئی بولا ہے یہ بُرا زمانا　　آج اس کو سر پہ رکھ کر سب شہر ہم نے چھانا
اب بھی بکا تو بہتر نہیں پھر پڑے گا لانا　　ہے اس سے ہی ہماری نت روٹی کا ٹھکانا
سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچا

ہے ڈر ہم اس کو رکھیں یا پھیر کر لے جاویں　　تو کیا ہم آپ کھاویں اور کیا اسے کھلاویں
کچھ بن نہیں ہے آتا یہ دکھ کسے سناویں　　جی چاہتا ہے اب تو یہ شہر چھوڑ جاویں
سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچا

سو من گیہوں کا ہر دن کھانے کو کہاں سے آوے　　اور سو پکھال پانی کب تک کوئی پلاوے
جب رات ہو تو ہر دم یہ خوف جی میں آوے　　شاید اسے چرا کر کوئی چور لے نہ جاوے
سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچا

روزی کے اب تو ایسے گھر گھر میں ہیں کسالے　　ہاتھی و گھوڑے اپنے دیتے ہیں لوگ ڈھالے

جب تنگ ہووے روزی کون اژدہے کو پالے   اس کی بھی اور ہماری یارو خبر خدا لے

سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچا

تو دس ہزار تک تو تجھ سے نہ اسے نہ دیں گے   اتنے روپے تو اس کے اِک پر کے ہم نہ لیں گے
ستر ہزار تک بھی سودا نہیں کریں گے   اسی ہزار دے گا تو ہم بھی دے چکیں گے

سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچا

سب اٹھ گئے جہاں سے وہ تھے جو لوگ جیا   وہ رہ گئے ہیں جن کے گھر میں نہیں ہے ہنیا
اس بات کو تو عمدہ ہو بھوگ کا بلسیا   جو اژدہے کو پالے ایسا ہے کون رسیا

سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچا

آگے تو گھر بہ گھر تھے اکثر تمام داتا   سیمرغ پالتے تھے کرنے کو نام داتا
اب تو کوئی ہرگز آیا نہ کام داتا   سچ ہے نظیر آخر اجگر کے رام داتا

سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچا

(۱۴۶) ککڑی

پھوپچے نہ اس کو ہرگز کابل دُرے کی ککڑی   نے پورب اور نہ پچھم خوبی بھرے کی ککڑی

نے چین کے پرے کی اور نہ ورے کی ککڑی　　دکھن کی اور نہ ہرگز اس سے پرے کی ککڑی
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

کیا پیاری پیاری میٹھی اور پتلی پتلیاں ہیں　　گنے کی پوریاں ہیں ریشم کی تکلیاں ہیں
فرہاد کی نگاہیں، شیریں کی ہنسلیاں ہیں　　مجنوں کی سرد آہیں لیلیٰ کی انگلیاں ہیں
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

کوئی ہے زرد سی مائل کوئی ہری بھری ہے　　پکھراج منفعل ہے اپنے کو بھر بھری ہے
ٹیڑھی ہے سو تو چوڑی وہ ہیر کی ہری ہے　　سیدھی ہے سو وہ یار و رانجھے کی بانسری ہے
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

میٹھی ہے جس کو برفی کہیے گلابی کہیے　　یا حلقے دیکھ اس کے تازی جلیبی کہیے
تل شکریوں کی پھانکیں اب یا امرتی کہیے　　سچ پوچھیے تو اس کو دندان مصری کہیے
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

چھونے میں برگ گل ہے کھانے میں کرکری ہے　　گرمی کے مارنے کو اک تیر کی سری ہے
آنکھوں میں سکھ کلیجے ٹھنڈک ہری بھری ہے　　ککڑی نہ کہیے اس کو ککڑی نہیں پری ہے
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

بیل اس کی ایسی نازک جوں زلف پیچ کھائی　　　بیج ایسے چھوٹے چھوٹے خشخاش یا کہ رائی
دیکھ اس کی ایسی نرمی باریکی اور گلائی　　　آتی ہے یاد ہم کو محبوب کی کلائی
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

لیتے ہیں مل اس کو گل کی طرح سے کھل کے　　　معشوق اور عاشق کھاتے ہیں دونوں مل کے
عاشق تو ہیں بجھاتے شعلوں کو اپنے دل کے　　　معشوق ہیں لگاتے ماتھے پہ اپنے چھلکے
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

مشہور جیسے ہر جا یاں کی جمالیاں ہیں　　　ویسی ہی ککڑی نے بھی دھومیں مچالیاں ہیں
میٹھی ہیں سو تو گویا شکر کی تھالیاں ہیں　　　کڑوی ہیں سو بھی گویا خوباں کی گالیاں ہیں
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

جو ایک بار یاروا اس جا کی کھائے ککڑی　　　پھر جا کہیں کی اس کو ہرگز نہ بھائے ککڑی
دل تو نظیر غش ہے یعنی منگائے ککڑی　　　ککڑی ہے یا قیامت کیا کہیے ہائے ککڑی
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

(۴۷) بھونچال

بھونچال کا جو حق نے یہ نقشا دکھا دیا قدرت کا اپنی زور جہاں کو دکھا دیا
روشن دلوں کے نورِ نظر کو بڑھا دیا غفلت زدوں کو مار کے ٹھوکر جگا دیا

دریا و کوہ شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

جن منکروں کو نوح کے طوفاں کا شبہ تھا اور دوزخ و بہشت کو سمجھیں تھے توتیا
قائل نہ قبر کے تھے نہ خطرا تھا حشر کا ایک زلزلے نے سب کے دیئے وسوسے مٹا

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

سنہ بارہ سو اٹھارہ میں یہ واردات تھی اول جمادی بارھویں تاریخ، سات تھی
دن بدھ کا جمعرات کی وہ آدھی رات تھی بھونچال کیا تھا قدرتِ خالق کی بات تھی

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

تھی آدھی رات جب ہوا بھونچال کا گزر پتا سا تھر تھرا گیا پتال کا جگر
ساتوں طبق کے ہل گئے سکان سربسر در بولے الحفیظ تو دیواریں الحذر

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

اجزائے ارض قاف سے تا قاف ہل پڑے — اجگر اچھل اٹھے کے کلیجے نکل پڑے
انسان گھر سے، دشت سے وحشی نکل پڑے — طائر بھی آشیانوں میں اپنے اچھل پڑے

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

گڑھ، کوٹ، قلعہ روئے زمیں پر ڈھل گئے — کانپیں النگیں، برج کے کنگورے ہل گئے
سنگیں محل مکان تھے سو وہ بھی ادسل گئے — اینٹوں کے زہر سے پھٹ گئے پتھر پگھل گئے

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

باہم کواڑ لڑ گئے زنجیریں ہل پڑیں — کڑیاں سہرک سرک کے چھتوں سے نکل پڑیں
چھجے، ستون کانپے، منڈیریں ڈھل پڑیں — دیواریں جھوم جھوم کے ہلنے سے جھل پڑیں

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

گھر گھر میں شور ہوگیا اور غل گلی گلی — روئے زمیں پہ پڑ گئی ایک دم میں کھلبلی
کوئی اللہ اللہ کہہ اٹھا کوئی علی علی — کوئی یا حسین کہہ اٹھا کوئی رام رام جی

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

تھیں جتنی جتنی اصل زمیں کی رسائیاں — ایک زلزلے نے سب وہ پکڑ کر ہلائیاں
بھونچال نے یہ جیسی ہوائیں دکھائیاں — ایسی ہزاروں اس کی ہیں قدرت نمائیاں

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

دستِ قضا کی انگلی کی چھوٹی سی پور ہے   ہلنے سے جس کے کانپا ہر اک مار مور ہے
بھونچال کا تو یارو، یہ ادنیٰ سا شور ہے   سو درجہ اس سے، اس کی تو قدرت میں زور ہے

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

جیسا کہ حکم اس کے سے آیا تھا زلزلہ   کانپی تمام روئے زمیں جس سے تھرتھرا
ویسا ہی اپنے حکم سے گر وہ نہ روکتا   پھر کچھ نہ تھا جہان میں فقط پانی پانی تھا

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

بھونچال کے تو ہم کو خیالات خام تھے   یہ چھوڑنے یہ روکنے قدرت کے کام تھے
تھا ڈول تو وہی کہ نہ خاص اور نہ عام تھے   رحم آ گیا وگرنہ وہیں سب تمام تھے

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

سجدا کرو خدا کے تئیں یارو دم بدم   آخر کریم تھا تو کیا اس نے پھر کرم
باقی تو کچھ رہی نہ تھی پر تھم گیا قدم   ورنہ گھڑی میں یارو نہ پھر تم تھے اور نہ ہم

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

بھونچال کیا جو چاہے تو اک پل کے مارتے   کر ڈالے آسمان و زمیں کو اُپر تلے
اڑتے پھریں پہاڑ روئی کی طرح پڑے   قادر، کریم، دم میں جو کچھ چاہے سو کرے

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

کہتے ہیں یوں حکیم کہ بھرتی ہے سب ہوا — آتا ہے اس سے روئے زمیں پر یہ زلزلہ
خالق کا بھید ہے، یہ کسی پر نہیں کھلا — ہم تو اُسی کے حکم کا جانتے ہیں دبدبہ

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

محکوم سب اسی کے ہیں حاکم وہی اِلٰہ — تابع ہیں اُس کے حکم کے ماہی سے تا بہ ماہ
جب اس کا حکم آوے تو ہو کون سدِّ راہ — کیا حکم ہے عزیزو، ذرا دیکھو واہ واہ

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

لرزے میں آ کے ڈالیاں نخلوں کی ہل گئیں — دہشت سے جل بچل ہو، جڑیں بھی نکل گئیں
تھرا کے گاؤ ماہی کی چولیں اوسل گئیں — جل تھل کے ہوش اڑ گئے، ریخیں نکل گئیں

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

جو ارض سب جہان کے بوجھوں کے تئیں سہے — جب وہ ہی تھرتھرا دے تو پھر ہم کہاں رہے
جنات دیو فیل و شتر، شیر اژدہے — اک دم میں سب کے تن کے غرض کھل گئے پٹھے

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

بھونچال کی دھمک کا وہ سنتے ہی کھڑکھڑا — جی پیٹوں میں آ گیا اور دم نکل چلا

اوروں کے دل کی کیا کہوں جانے وہی خدا ۔۔۔ پر میں تو جانا صور سرافیل پھونک گیا
دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

قدرت کی تیغ کی ہے یہ کچھ آب دردری ۔۔۔ کھنچتے ہی جس کے پڑ گئی سینوں میں تھرتھری
دارائی کام آئی نہ یہاں کچھ سکندری ۔۔۔ ایک دم میں تھرتھرا گئی سب خشکی و تری
دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

آنکھوں سے میری اس گھڑی آنسو عجب چلے ۔۔۔ گزرا یہ جی میں ہائے ہوا کیا غضب چلے
تحت الثریٰ کی سیر کو ہم سب کے سب چلے ۔۔۔ دل میں یہی یقین ہوا یعنی بس اب چلے
دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

ہیبت کے مارے پہلے تو دل ہو گیا دو نیم ۔۔۔ جب تھم گیا تو ہو گیا جی دو ہیں مستقیم
یہ قدرتوں کی دیکھ کے شان امید و بیم ۔۔۔ نظیر کو جھکائے میں سنے کہا دو ہیں یا کریم
دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

بھونچال میں کہاں تھا یہ عالم مجال کا ۔۔۔ سب حکم تھا یہ حضرت ایزد تعال کا
اک دم میں یوں بڑھا دیا شعلہ جلال کا ۔۔۔ اک دم میں یوں دکھا دیا جھمکا جمال کا
دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

بھونچال کا تو کہنے کی خاطر یہ نام تھا　　یہ شور زور دیکھا تو قدرت کا کام تھا
احکامِ ذوالمنن کا جہاں اہتمام تھا　　یہ زلزلہ تو وہاں کا اک ادنیٰ غلام تھا

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلادیا
ایک آن میں ہلادیا اور پھر تھمادیا

حاکم وہی، حکیم وہی، حق وہی کبیر　　خالق وہی، خدا وہی، دانا وہی خبیر
مالک وہی، ملک وہی، قادر وہی قدیر　　قدرت کا اُس کی ایک یہ شمہ تھا اے نظیر

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلادیا
ایک آن میں ہلادیا اور پھر تھمادیا

(۴۸) کوڑی نامہ

کوڑی ہے جن کے پاس وہ اہلِ یقین ہیں　　کھانے کو ان کے نعمتیں سو بہترین ہیں
کپڑے بھی ان کے تن میں نہایت نہین ہیں　　سمجھیں ہیں اس کو وہ جو بڑے نکتہ چین ہیں

کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کوڑی بغیر سوتے تھے خالی زمین پر　　کوڑی ہوئی تو رہنے لگے شہ نشین پر
ٹپکے سنہری بندھ گئے جاموں کی چین پر　　موتی کے گچھے ٹک گئے گھوڑوں کی زین پر

کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کوڑی ہی چاہتی ہے سدا بادشاہ کو   کوڑی ہی تھام لیتی ہے فوج و سپاہ کو
لے کر چھڑی، رومال گدا بھی نباہ کو   پھرتا ہے ہر دوکان پہ کوڑی کی چاہ کو
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کوڑی نہ ہو تو پھر یہ جھمیلا کہاں سے ہو   رتھ خانہ، فیل خانہ، طویلا کہاں سے ہو
منڈوا کے سر فقیر کا چیلا کہاں سے ہو   کوڑی نہ ہو تو سائیں کا میلا کہاں سے ہو
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کاندھے پہ تیغ دھرتے ہیں کوڑی کے واسطے   آپس میں خون کرتے ہیں کوڑی کے واسطے
یاں تک تو لوگ مرتے ہیں کوڑی کے واسطے   جو جان دے گزرتے ہیں کوڑی کے واسطے
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کوڑی سے ہر امیر کی چلتی ہے بادنی   کوڑی کے ساتھ ہوتی ہے لشکر کی چھاؤنی
کوڑی سے ہے کئی لاکھ طرح کی اٹھاؤنی   کوڑی عجب ہے چیز یہ . . . .
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

گالی و مار کھاتے ہیں کوڑی کے واسطے   شرم و حیا اٹھاتے ہیں کوڑی کے واسطے
سو ملک چھان آتے ہیں کوڑی کے واسطے   مسجد کو دھم سے ڈھاتے ہیں کوڑی کے واسطے
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں

کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کتنے تو ہم میں ایسے ہیں کوڑی کے مبتلا　　کوڑی ہو گندگی میں تو لیں دانت سے اٹھا
خست نہیں ہے ایسا ہے کوڑی کا مرتبہ　　کوئی دانت سے اٹھا دے ہم آنکھوں سے لیں اٹھا
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کوڑی ہی ڈالتی ہے طوائف کے تئیں لتاڑ　　کوڑی ہی اس کی لیتی ہے کرتی اور لنگیا پھاڑ
کوڑی ہی ..... ہو کرتی ہے چھیڑ چھاڑ　　لڑکا بھی دم میں آتا ہے سن کوڑیوں کا جھاڑ
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

بن کوڑی خوردے کے برابر بھی بیت نہ تھی　　کوڑی جب آئی پاس تو بن بیٹھے سیٹھ جی
آگے گماشتوں کے کھلی ہر طرف بہی　　پھر وہ جو کچھ کہیں تو وہی بات ہے سہی
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

بن کوڑی تھیں نہ تیل کی باسی منگوڑیاں　　کوڑی ہوئی تو چھٹنے لگیں تیلی چوڑیاں
یوں خلق دوڑے مکھیاں جوں گڑ پہ دوڑیاں　　خالق نے کیا ہی چیز بنائی ہیں کوڑیاں
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

اب جن کے گھر میں روز برستی ہیں کوڑیاں　　کیا کیا انہوں کی جان میں بستی ہیں کوڑیاں
دانت ان کے نکلے پڑتے ہیں سجتی ہیں کوڑیاں　　وہ کیا ہنسیں گے یار یہ ہنستی ہیں کوڑیاں

کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

تنکے سے جن کے دانت تھے یوں زرد کوڑیاں — کھوتی ہیں ان کے آن میں دکھ درد کوڑیاں
خوبی میں اپنی ایسی ہیں اب فرد کوڑیاں — نامرد کو کریں ہیں غرض مرد کوڑیاں
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

خاصے محل اٹھاتے ہیں کوڑی کے زور سے — پکے کوئیں کھداتے ہیں کوڑی کے زور سے
پل اور سرا بناتے ہیں کوڑی کے زور سے — باغ و چمن لگاتے ہیں کوڑی کے زور سے
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

لے مفلس اور فقیر سے تا شاہ اور وزیر — کوڑی وہ دلربا ہے کہ ہے سب کی دل پذیر
دیتے ہیں جان کوڑی پہ طفل و جوان و پیر — کوڑی عجب ہے چیز میں اب کیا کہوں نظیر
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

(۴۹) وجد و حال

کیا علم انھوں نے سیکھ لیا جو بن لکھے کو باچتے ہیں — اور بات نہیں منہ سے نکلے بن ہونٹھ ہلائے جاچتے ہیں
دل ان کے تار ستاروں کے تن ان کے طبل طماچے ہیں — منہ چنگ زباں دل سارنگی پا گھنگرو ہاتھ کماچے ہیں

ہیں راگ انھیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
جو بے گت، بے سرتال ہوئے، بن تال پکھاوج ناچے ہیں

کل باجے بج کر ٹوٹ گئے آواز لگی جب لہرانے — اور چھم چھم گھنگرو بند ہوئے، تب گت کا انت لگے پانے
سنگیت نہیں یہ سنگت ہے نٹوے بھی جس سے نٹ مانے — یہ ناچ کوئی کیا پہچانے، اس ناچ کو ناچے سو جانے

ہیں راگ انھیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
جو بے گت، بے سرتال ہوئے، بن تال پکھاوج ناچے ہیں

جب ہاتھ کو دھویا ہاتھوں سے جب ہاتھ لگے تھرکانے کو — اور پاؤں کو کھینچا پاؤں سے جب پاؤں لگے گت پانے کو
جب آنکھ اُٹھائی ہستی سے جب نین لگے مٹکانے کو — سب کاچھ کچھے، سب ناچ نچے، اُس رسیا چھیل رجھانے کو

ہیں راگ انھیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
جو بے گت، بے سرتال ہوئے، بن تال پکھاوج ناچے ہیں

جو آگ جگر میں بھڑکی ہے اس مشعل کی اجیالی ہے — جو منہ پر حسن کی زردی ہے اس زردی کی سب لالی ہے
جس گت پر ان کا پاؤں پڑا اس گت کی چال نرالی ہے — جس مجلس میں وہ ناچے ہیں وہ مجلس سب سے خالی ہے

ہیں راگ انھیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
جو بے گت، بے سرتال ہوئے، بن تال پکھاوج ناچے ہیں

سب گھونگٹا بڑھنا پھینک اِدھر اور دھیان اُدھر دھرتے ہیں — بن تاروں تار ملاتے ہیں جب نرت نرالا کرتے ہیں
بن گھنگھرو جھنک دکھلاتے ہیں بن جوڑے من کو ہرتے ہیں — بن ہاتھوں بھاؤ بتاتے ہیں بن پاؤں تھرکے گت بھرتے ہیں

ہیں راگ انھیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انھیں کے سانچے ہیں
جو بے گت، بے سرتال ہوئے، بن تال پکھاوج ناچے ہیں

تھا جن کی خاطر ناچ کیا جب مورت ان کی آئے گی — کہیں آپ کہا کہیں ناچ کہا اور تان کہیں لہرائے گی

جب چھیل چھبیلی سندر کی چھب نینوں اندر چھائے گی　　اک مورچھا گت سے آئے گی اور جوت میں جوت سمائے گی

ہیں راگ انھیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
جو بے گت، بے سرتال ہوئے، بن تال پکھاوج ناچے ہیں

سب ہوش بدن کا دور ہوا جب گت پر آ مردنگ بجی　　تن بھنگ ہوا، دل دنگ ہوا، سب آن گئی بے آن سجی
یہ ناچا کون نظیرؔ اب یاں اور کس نے دیکھا ناچ اجی　　جب بوند ملی جا دریا میں، اس تان کا آخر نکلا جی

ہیں راگ انھیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
جو بے گت، بے سرتال ہوئے، بن تال پکھاوج ناچے ہیں

(۵۰) جوانی بڑھاپے کی لڑائی

جہاں میں یارو خدا کی عجب خدائی ہے　　کہ ہر کسی کو تکبر ہے خود نمائی ہے
ادھر جوانی بڑھاپے پہ چڑھ کے آئی ہے　　ادھر بڑھاپے کی اس پہ ہوئی چڑھائی ہے
عجب جوانی، بڑھاپے کی اب لڑائی ہے

جوانی اپنی جوانی میں ہو رہی سرشار　　بڑھاپا اپنے بڑھاپے کا ہو رہا دم مار
ہوئے ہیں دونوں جو لڑنے کے واسطے تیار　　اُدھر جوانی نے کھینچی ہے آ سپر تلوار
بڑھاپے نے بھی اُدھر لاٹھی اک اٹھائی ہے

اُدھر ہے تیر سا قامت، اُدھر ہے پشت کمان　　اُدھر ہے کبڑی کمر اور اُدھر اکڑ کے نشان
جوانی کہتی ہے بڑھ کر کہ سن بڑھاپے میاں　　تیری ہے خیر اسی میں کہ جا سرک اب یاں
وگرنہ تیری اجل میرے ہاتھ آئی ہے

میں آج وہ ہوں کہ رستم کو کھڑ کھڑ اڑا دوں پہاڑ ہووے تو اک دم میں ہل ہلا ڈالوں
درخت جڑ سے اکھاڑوں، زمیں ہلا ڈالوں ابھی کہے تو تری دھجیاں اڑا ڈالوں
کہ مجھ کو زور کی قوت کی بادشائی ہے

کہا بڑھاپے نے، "گر تجھ میں زور یہ ہے بجا تو ہاں جی دیکھیں ہمارے تو سامنے آجا
اگرچہ دانت ہمارے نہیں ہے منہ میں رہا مسوڑوں سے ہی تری ہڈیوں کو ڈالیں چبا
نہ ہم سے لڑ کہ اسی میں تری بھلائی ہے

ہزار گو کہ ترا زور پہ چڑھا ہے سن یہ ہم نہ چھوڑیں ترے کان اب مروڑے بن
اگرچہ تو ہے نیا ہم پرانے ہیں لیکن نیا ہے تو ہی دن آخر پرانا ہے سو دن
قدیم ہے یہ مثل، ہم نے کیا بنائی ہے"

کہا جوانی نے "تیرا تو ہے گا کیا احوال تو میرے سامنے آوے کہاں یہ تیری مجال
نہ تیرے پاس طمنچہ، نہ تیر، سیف نہ ڈھال ابھی گھڑی میں بکھرتا پھرے گا ایک ایک بال
یہ ڈاڑھی تو نے جواب سوپ سی بڑھائی ہے"

کہا بڑھاپے نے سن کر "اگرچہ تو ہے پہاڑ تو ہم بھی سوکھ کے جھڑ بیری کے ہوئے ہیں جھاڑ
ابھی کہے تو ترے کپڑے سے لیویں پھاڑ ذرا سی بات میں اک دم کے بیچ ڈالیں جو اکھاڑ
ہر ایک مونچھ تیری یہ جو تاؤ کھائی ہے"

کہا جوانی نے سن کر کہ "چل نہ کہہ یہ بات ابھی میں آن کے ماروں تری کمر میں لات
کہیں ہو پاؤں کہیں سر کہیں پڑا ہو ہات جسے تو جینا سمجھتا ہے اور خوشی کے سات
یہ تیرا جینا نہیں یہ تو بے حیائی ہے"

کہا بڑھاپے نے سن کر کہ تو نے خوب کہا جو پوچھو سچ تو مزا ہے ہمیں کو جینا کا

شراب ہو جو پرانی تو اُڑ چلے ہے نشا　　پرانے جب ہوئے چاول تو ہے انھیں میں مزا
یہ بات تو نے نہیں کیا سنی سنائی ہے

تری جو پوچھو تو ہے چار دن کی سب کو چاہ　　جہان تو ہو چکی، بس ہے گا تیرا حال تباہ
ہمیں ہیں وہ جو کریں ہیں تمام عمر نباہ　　تو ٹک تو دیکھ گریبان میں ڈال کر منہ آہ
کہ اب سے کس میں وفا کس میں بے وفائی ہے

جوانی جب تو یہ بولی بڑھاپے سے سن کر　　تری وفا سے مری بے وفائی ہے بہتر
میں جب تلک ہوں، بہاریں، مزے ہیں سر تا سر　　جو سلطنت ہو گھڑی بھر تو وہ بھی ہے خوش تر
مزے تو لوٹ لئے گو کہ پھر گدائی ہے

کہا بوڑھاپے نے سن کر وہ سلطنت ہے کیا　　کہ جس کے سات لگا ہو زوال کا دھڑکا
ہمیں ملی ہے بزرگی کی وہ سند اس جا　　کہ جب تلک ہیں، رہے گی ہمارے سات سدا
خدا نے ایسی ہی دولت ہمیں دلائی ہے

کہا جوانی نے "چل جھوٹی اب نہ کر تکرار　　تجھے تو عیش ہے لیکن تری ہے مٹی خوار
شراب، ناچ، مزے، گل بدن، گلے میں ہار　　تری خرابی یہ دیکھی ہے میں نے کتنی بار
جہاں گیا ہے تیری ڈاڑھی وہاں ہلائی ہے

مجھے خدا نے دیا ہے یہ مرتبہ اور شان　　جدھر کو جاؤں اُدھر عیش رنگ پھول اور پان
اچھل ہے کود ہے لذت مزے خوشی کے دھیان　　گلے لپٹتے ہیں محبوب گل بدن ہر آن
جہاں گئے تو وہاں سیر ہی اڑائی ہے"

کہا بڑھاپے نے "چل جھوٹ مجھ سے مست بولے　　فدا تو جن پہ ہے وہ میرے پاؤں ہیں پڑتے
ہمیں کہیں ہیں وہ حضرت تجھے کہیں آ بے　　ہزار بار پڑے ہے تجھ پہ لات اور گھونسے

بھلا بتا تو کہیں ہم نے مار کھائی ہے

کچل گیا ہے تو جن گل رخوں کی لاتوں میں
ہم ان کو مار اتاریں ہیں دم کی باتوں میں
ہم عیش دن کو اڑاتے ہیں اور راتوں میں
کریں ہیں عشق کو ہم بھی ہزار گھاتوں میں
تجھے کہاں ابھی اس ڈھب کی آشنائی ہے

تو جن کے واسطے گلیوں میں اب پھرے ہے خوار
ہم ان کی لوٹتے ہیں چھو منتر کے بیچ بہار
تجھے تلاش و طلب میں کٹے ہے لیل و نہار
ہم اپنی دھوکے کی ٹٹی میں کھیلتے ہیں شکار
تو کیا وہ جانے جو کچھ گھات ہم نے پائی ہے

کہا جوانی نے "تو کس سند سے ہے کہتا
مرا تو وصف کتابوں میں ہے لکھا ہر جا
کہ واہ وقت جوانی ہے زندگی کا مزا
تری جو بات کا مذکور ہے کہیں آیا
تو ہر طریق سے خواری ہی تجھ پر آئی ہے"

جونہی جوانی نے خواری کا نام منہ سے سنا
بڑھاپا دوڑ جوانی سے جا وہیں لپٹا
مروڑیں مونچھیں ادھر اس نے ڈاڑھی کو کھینچا
لڑے جو دونوں تو آ ہر طرف یہ شور مچا
کہ "یارو دوڑیو، فریاد ہے، دہائی ہے"

کھڑے تھے لوگ ہزاروں یہ دونوں لڑتے تھے
کبھی پچھاڑتے تھے اور کبھی پچھڑتے تھے
جو بازو چھوڑتے تھے تو کمر پکڑتے تھے
کچھ اس طرح کے نئے گھونسے لات جڑتے تھے
کہ سب یہ کہتے تھے "کیا ان کے دل میں آئی ہے"

یہ مار کوٹ کا آپس میں جب ہوا چرچا
نظیر اس میں وہیں ایک ادھیڑ بن آیا
کچھ اس کو روکا ادھر اور کچھ اس کو سمجھایا
تم اپنے خوش رہو، وہ اپنے خوش رہے ہر جا
ملاپ خوب ہے، لڑنے میں کیا بھلائی ہے

(۵۱) بلدیو جی کا میلہ

کیا وہ دلبر کوئی نویلا ہے — ناتھ ہے اور کہیں وہ چیلا ہے
موتیا ہے، چنبیلی، بیلا ہے — بھیڑ انبوہ ہے اکیلا ہے
شہر قصباتی اور گنویلا ہے — زر اشرفی ہے پیسہ دھیلا ہے
ایک کیا کیا وہ کھیل کھیلا ہے — بھیڑ ہے خلقتوں کا ریلا ہے

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو کا جی میلا ہے

ہے کہیں یار اور کہیں اغیار — کہیں عاشق ہے اور کہیں دلدار
کہیں بستی ہے اور کہیں گلزار — کہیں جنگل ہے اور کہیں بازار
وہی بھگتی ہے اور وہی اوتار — اس کی لیلائیں کس سے ہوں اظہار
آپ آتا ہے دیکھنے کو بہار — آپ کہتا ہے یوں پکار پکار

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

ہے کہیں رام اور کہیں لچھمن — کہیں کچھ مچھ ہے اور کہیں راون
کہیں بارا کہیں مدن موہن — کہیں بلدیو اور کہیں سیکشن
سب سروپوں میں ہیں اسی کے جتن — کہیں نرسنگھ ہے وہ نارائن
کہیں نکلا ہے سیر کو بن ٹھن — کہیں کہتا پھرے ہے یوں بن بن

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

آج میلے کا یاں جو ہے سامان | آئے ہیں دور دور سے انسان
کوئی درشن کوئی دعائیں مان | سب کی ہوتی ہیں مشکلیں آسان
ہر طرف کھل رہے گل و ریحان | ہار، بدھی، مٹھائی اور پکوان
بھیڑ انبوہ غل دکان دکان | اور یہی شور ہر گھڑی ہر آن

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

ہر طرف حسن کی پکاریں ہیں | دلربا، سوبرن، سنواریں ہیں
اک طرف نوبتیں جھنکاریں ہیں | جھانجھ، مردنگ، راس دھاریں ہیں
سیر ہے دید ہے بہاریں ہیں | کرکے جے جے یہی پکاریں ہیں
کہیں عاشق نظارے مارے ہیں | سو نگاہوں کی جیت ہاریں ہیں

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

اتنے لوگوں کے ٹھٹھ لگے ہیں آ | جو کہ تل دھرنے کی نہیں ہے جا
لے کے مندر سے دو دو کوس لگا | باغ و بن بھر رہے ہیں سب ہر جا
ہیں ہزاروں بساطی اور سودا | لاکھوں بکتے ہیں گہنے اور مالا
بھیڑ انبوہ اور دھوم دھکا | جس طرف دیکھئے اہا ہا ہا

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے

زور بلدیو جی کا میلا ہے

بس کہ امڈے ہے خلقتوں کا دل　　جابجا بھر رہے ہیں جر جنگل
چوک بازار نوج اور ڈنگل　　جنگلوں میں ہیں مچ رہے منگل
کوئی انبوہ میں رہا ہے کچل　　کوئی دھکوں میں کر رہا ملدل
کتنے کرتے ہیں جست کود اچھل　　کتنے کہتے ہیں مور چھل چھل چھل

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

ہیں ہزاروں ہی جنس کے ہٹے　　موتی مونگا اور آرسی سٹے
پیڑے لڈو جلیبی اور گٹے　　کولے، نارنگی، سنگترے، کھٹے
کوئی تو کر رہا ہے چھل بٹے　　کوئی چڑھاتا ہے کھیر کے پتے
پُر ہیں مندر کے کوٹھے اور اٹے　　بوڑھے لڑکے جوان اور سٹے

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

لوگ چاروں طرف کے آتے ہیں　　آکے عیش و طرب مناتے ہیں
دل سے سب درشنوں کو جاتے ہیں　　اپنے دل کی مراد پاتے ہیں
جھانجھ مردنگ دف بجاتے ہیں　　راس منڈل بھجن سناتے ہیں
دل میں پھولے نہیں سماتے ہیں　　سب یہ ہنس ہنس کے کہتے جاتے ہیں

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

ہر طرف گلبدن رنگیلے ہیں نک پلک غنچہ لب سجیلے ہیں
بات کے ترچھے اور کٹیلے ہیں دل کے لینے کو سب ہٹیلے ہیں
خشک، تر، نرم، سوکھے، گیلے ہیں ٹیڑھے بل دار اور نکیلے ہیں
جوڑے بھی سرخ سبز پیلے ہیں پیار الفت بہانے حیلے ہیں

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

خلق آتی ہے سب جڑی جکڑی چیز رکھتے ہیں باندھ کر جکڑی
کوئی دوڑے ہے ہاتھ لے لکڑی دوڑیو چور لے چلا گٹھڑی
جیب کتری کہیں گئی پکڑی کہیں لوٹی اور دوکان اور ہٹری
چور نے تاک لی کہیں پگڑی سو تماشے ہنسی خوشی پھکڑی

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

نازنیں ہیں وہ سانوری گوری جن کی نازک ہر اک پری پوری
کر کے چتون نگاہ کی ڈوری دل کو چھینے ہیں سب برا زوری
دھوم ناز و ادا جھکا جھوری برج میں جیسے مچ رہی ہوری
گھونگھٹوں میں ہیں کر رہی چوری چوری کیسی کہ صاف سر زوری

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

کنڈ پر بھی نہان ہوتے ہیں جس میں گنگا برن کے سوتے ہیں

پانی لے ہاتھ منہ کو دھوتے ہیں   کتنے کنگھی کر کے پروتے ہیں
کتنے جا کر بنوں میں سوتے ہیں   بندروں میں چنوں کو بوتے ہیں
ان بہاروں میں ہوش کھوتے ہیں   سو مزے سو تماشے ہوتے ہیں

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

کوئی آ کر بہانے اور جس سے   مل رہا ہے ملا ہے دل جس سے
ہوتے ہیں آملاپ جس تس سے   لڑ رہا ہے کوئی کہیں اس سے
کوئی کھویا گیا ہے مجلس سے   کون چلائے پوچھے کس سے
کہنی بازو میں لگ رہے گھس سے   اور دھکا پیل اور گھمان کھٹے

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

ناچ اور راگ کے کھڑاکے ہیں   گھنگرو اور تال کے جھناکے ہیں
نقلیں، قصے، کہانی، ساکے ہیں   کھنڈ و دوہرے، کبت کتھا کے ہیں
کہیں آغوش کے لپاکے ہیں   کہیں بوسوں کے سو جھپاکے ہیں
تھرتھری دانت پر کڑاکے ہیں   تس پہ جاڑے کے سو جھڑاکے ہیں

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

صحن مندر کا سب سے ہے اعلیٰ   اس کا گنبد ہے عالم بالا
ہو رہا جھانکیوں کا اجیالا   پردے جیسے ہیں چاند پر ہالا

ہے کوئی درشنوں کا متوالا   کوئی جپتا ہے دھیان میں مالا
کوئی ڈنڈوتیں کر رہا لالا   کوئی جے جے کرے ہے دھن والا

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

ہے جو مندر میں آپ وہ لالن   ہر گھڑی میں بدل رہی ہے برن
نئی پوشاک اور سنئے بھوجن   نئی جھانکی ہے اور نئے درشن
آرتی کی کہیں مچی ٹھن ٹھن   کہیں گھنٹوں کی ہو رہی چھن چھن
تال مردنگ جھانجھ کی جھن جھن   خاص پرشاد مصری اور ماکھن

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

کوئی چنچل چلے ہے ٹھمکی چال   کچھ وہ پتلی کمر وہ لمبے بال
آنکھوں میں حسن کے نشے رنگ لال   مصری ماکھن کے ہاتھوں اوپر تھال
کچھ وہ پوشاک کچھ وہ حسن و جمال   مالنوں کا زیادہ اُن سے کمال
ڈال دیں ہار کا گلے میں جال   بُدھی ہو کر لیں صاف دل کو نکال

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

بس کہ آتے ہیں راجا اور رانی   اور لاکھوں ہیں رانی اور نانی
بھیڑ انبوہ کی فراوانی   اور ہجوموں کی لاکھ طغیانی
پالکی، ہاتھی، گھوڑے، رتھ بانی   جوگی بیراگی گیانی اور دھیانی

کچھ نہیں مول تول کیا پانی　　پانی کا دودھ، دودھ کا پانی
رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

کتنے کچے ہیں کتنے پکے ہیں　　ان کے منہ اور ایچال چھکے ہیں
چورنٹ کھٹ ہیں اور اچکے ہیں　　دودھ، کھویا، ملائی، چکے ہیں
بھیڑ، انبوہ اور بھڑکے ہیں　　دھوم دھونسوں کے اور دھڑکے ہیں
پالکی ہاتھی گھوڑے ڈنکے ہیں　　سو تماشے ہیں، سو جھمکے ہیں
رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

لاکھوں بیٹھے بساطی اور منہار　　اپنا سب گرم کر رہے بازار
چوڑی بنگڑی کی اک طرف جھنکار　　نوگرہی، پونچھا، انگوٹھی چھلے ہار
لڑتے پڑتے گنواری اور گنوار　　جس گنواری کو چلنے دھکا مار
گر کے دے گالی یوں کہے ہے پکار　　کیسو اٹھلا چلو ہے ڈاڑھی جار
رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

مٹی اور کاٹھ کے کھلونے ڈھیر　　کوئی لیوے ہے کوئی ریوے پھیر
کوئی کمہاری کے کر رہا ہت پھیر　　کوئی کا پھن کے چن رہا ہے بیر
کوئی کنجڑن سے لڑ رہا منہ پھیر　　کوئی بنئے کو مارتا ہے سیر
گالی ڈک مار کوٹ سانجھ سویر　　لاٹھی پاٹھی ہے شور غل اندھیر

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

سیکڑوں رنگ رنگ کی چھڑیاں — پھول گیندوں کے ہار کی لڑیاں
کہیں چھوٹیں انار پھلجھڑیاں — کہیں کھلتی ہیں دل کی گلجھڑیاں
کہیں الفت سے انکھڑیاں لڑیاں — کہیں باہیں گلے میں ہیں پڑیاں
عیش و عشرت کی لٹ رہی دھڑیاں — دال موٹھیں، منگوچی اور بڑیاں

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

لگ رہی بھیڑ اس قدر ٹھٹھ ہو — راہ آگے کو اور نہ پیچھے کو
جو جہاں تھا وہیں پھنسا پھر وہ — جس کو کھینچے ہیں گر پڑے ہے سو
بیٹھے کہتے ہیں کھا کے دھکوں کو — جے مہاراج رام رام بھجو
اور کنور دل پکار کر ہو ہو — اب تو لٹھ وار ہے لگانے کو

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

کیا مچی ہے بہار جے بلدیو — عیش کے کاروبار جے بلدیو
دھوم لیل و نہار جے بلدیو — ہر کہیں آشکار جے بلدیو
ہر زباں پر ہزار جے بلدیو — دمبدم یادگار جے بلدیو
کہہ نظیر اب پکار جے بلدیو — سب کہو ایک بار جے بلدیو

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے

غزلیات

غزلیں

(۱)

بتوں کی مجلس میں شب کو مہ و جو اور فلک بھی قیام کرتا
کنشت ویراں، صنم کو بندہ، برہمنوں کو غلام کرتا

خراب خستہ سمجھ کے تو نے پیارے مجھ کو عبث نکالا
جو رہنے دیتا تو گل رخوں میں قسم ہے تیری میں نام کرتا

بھلا ہوا جو نقاب تو نے اٹھایا چہرے سے اے پری رو
وگرنہ سینے سے دل تڑپ کر نگہ میں آ کر مقام کرتا

قیامت آتی جو مسکرا کر چمن میں جاتا وہ سیر کرنے
تڑپتی بلبل، سسکتی قمری، گلوں پہ ہنسنا حرام کرتا

ظفر تیری اشارتوں سے یہ باتیں غیروں کی سن رہا ہے
وگرنہ کس میں تھی تاب و طاقت جو مجھ سے آ کر کلام کرتا

کلال گردوں اگر جہاں میں جو خاک میری کو جام کرتا
تو میں صنم کے لبوں سے مل کر عجب عیش مدام کرتا

جو پاتا لذت بستان مستان مے محبت سے تیری زاہد   تو صومعے سے نکل کے اپنے، وہ میکدے میں قیام کرتا
وہ بزم اپنی تھی میکشی کی فرشتے ہو جاتے مست و بیخود   جو شیخ جی واں سے بچ کے آتے تو پھر میں ان کو سلام کرتا
جو زلفیں مکھڑے پہ کھول دیتا صنم ہمارا تو پھر یہ گردوں   نہ دن دکھاتا، نہ شب بتاتا، نہ صبح لاتا، نہ شام کرتا

نظیر آخر کو ہار کر میں، گلی میں اس کی گیا تھا بکنے
تماشا ہوتا جو مجھ کو لے کر وہ شوخ اپنا غلام کرتا

شور افگن جنوں ہے جس جا نگاہ کرنا   رکھتا ہے کام ہمدم واں ضبط آہ کرنا

لالے کو گو کہ لال کا پیالہ بنا دیا   پر ساتھ اس کے داغ بھی کیسا لگا دیا
گردوں نے ہم کو کیا نہ دیا اور کیا دیا   سب کچھ دیا اگر دل بے مدعا دیا
لے گل سے تا بہ خار مرے دل کے باغ کو   اس شعلہ رو نے ایک نظر میں جلا دیا
اے ابر تر ہمارے بھی ابر مژہ نے آج   پل مارنے میں اشک کا دریا بہا دیا

خواب عدم میں ہم تو فراغت سے اے نظیر
سوتے تھے، لیکن عشق نے آکر جگا دیا

الفت نے اس کی اوج یہ ہم کو دلا دیا   جو رفتہ رفتہ خاک میں آکر ملا دیا
شرمندۂ رفو نہیں عاشق کا چاک جیب   کس باغباں نے گل کا گریباں سلا دیا
جیتے رہے فنا نہ ہوئے پھر بھی اب تلک   قاتل نے ہم کو مار کے ایسا جلا دیا
ساقی نے سب کو بھر کے دیئے جام بزم میں   ساغر جو ہم نے مانگا تو شیشہ ہلا دیا

چاہا کہ مجھ سے پھر وہ نہ بولے کبھی نظیر
لوگوں نے بارے منتیں کر کے ملا دیا

وہ رشکِ چمن کل جو زیبِ چمن تھا　　چمن جنبشِ شاخ سے سینہ زن تھا
گیا میں جو اُس بن چمن میں تو ہر گُل　　مجھے ہر گھڑی اخگرِ پیرہن تھا
یہ غنچہ جو بیدرد گلچیں نے توڑا　　خدا جانے کس کا یہ نقشِ دہن تھا
تنِ مردہ کو کیا تکلف سے رکھنا　　گیا وہ تو جس سے عزیز یہ تن تھا
کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا　　مشین بدن تھا، معطر کفن تھا
جو قبرِ کہن ان کی اکھڑی تو دیکھا　ق　نہ عضوِ بدن تھا، نہ تارِ کفن تھا
نظیرؔ آ گئے ہم کو ہوس تھی کفن کی
جو سوچا، تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

وہ مجھ کو دیکھ کچھ اس ڈھب سے شرمسار ہوا　　کہ میں حیا ہی پر اس کی فقط نثار ہوا
سبھوں کو بوسے دئیے ہنس کے اور ہمیں گالی　　ہزار شکر، بھلا اس قدر تو پیار ہوا
قرار کر کے نہ آیا وہ سنگ دل کافر　　پڑیں قرار پہ پتھر، یہ کچھ قرار ہوا
گلے کا ہار جو اس گلبدن کے ٹوٹ پڑا　　تو ڈر نظر کا وہیں اس کو ایک بار ہوا
کسی سے اور تو کچھ بس چلا نہ اس کا نظیرؔ
ندان میرے ہی آ کر گلے کا ہار ہوا

ادھر اس کی نگہ کا ناز سے آ کر پلٹ جانا　　اِدھر مرنا تڑپنا غش میں آنا، دم الٹ جانا
کہوں کیا کیا میں نقشے اس کی ناگن زلف کے یارو　　لپٹنا، اڑ کے آنا، کاٹ کھانا پھر پلٹ جانا
اگر ملنے کی دھن رکھنا تو اس ترکیب سے ملنا　　سرکنا، دور ہٹنا، بھاگنا اور پھر لپٹ جانا
نہ ملنے کا ارادہ ہو تو یہ عیاریاں دیکھو　　ہمکنا، آگے بڑھنا، پاس آنا اور ہٹ جانا
یہ کچھ بہروپ پن دیکھو کہ بن کر شکل دانے کی　　بکھرنا، سبز ہونا، لہلہانا پھر سمٹ جانا

یہ یکتائی یہ یک رنگی لیس اور پر یہ قیامت ہے — نہ کم ہونا نہ بڑھنا اور ہزاروں گھٹ میں بٹ جانا
نظیر ایسا جو چنچل، دلربا بہروپیا ہووے
تماشا ہے پھر ایسے شوخ سے سودے کا پٹ جانا

لاکر ہر ایک ادا میں وہ عیار چٹکلا — چٹکی بجا کے چھوڑے ہے ہر بار چٹکلا
ظاہر میں گرچہ وصل کی کہتا ہے مجھ سے یار — پر دل میں اور کرتا ہے تیار چٹکلا
سب جانتے ہیں چٹکلے بازی نظیر کی
اس کے تو ہر سخن میں ہے اے یار چٹکلا

نہ گل اپنا نہ خار اپنا نہ ظالم باغباں اپنا — بنایا آہ کس گلشن میں ہم نے آشیاں اپنا

بہار آئی کیا ہر شاخ پر گل نے مکاں اپنا — بنا اب تو بھی اے بلبل چمن میں آشیاں اپنا
بڑے حظ لوٹتے ہم بھی لب جو میکشی کر کر — اگر آتا چمن میں آج وہ سرو رواں اپنا
مقابل اس کے منہ کے گل کو تو کس منہ سے کرتا ہے — کہاں گل اور کہاں وہ، منہ تو دیکھ اے باغباں اپنا
عدم سے جو ہمیں اے ہمنشیں ہستی میں لایا ہے — وہی غمخوار اپنا، یار اپنا، مہرباں اپنا
اسی کی مہربانی سے سبھوں کی مہربانی ہے
ہوا جب وہ نظیر اپنا تو پھر ہے سب جہاں اپنا

دیا قاتل نے پہلی ہی نظر میں جان کو دہلا — الٰہی شرم رکھیو ابھی یہ وار ہے پہلا
بحق ذوالفقار حیدری ہم منہ نہ موڑیں گے — اگر زخموں سے بن جاوے گا تن شمشیر کا دہلا
چمک جا پھر خدا کے واسطے اے طور کے شعلے — کہ مثل آتش افسردہ پھر کچھ دل چلا کھلا
جو شاعر ہے تو خالی ڈال مت اس یار کا کہنا

نظیر اب دیکھتا کیا ہے تو ہی یہ ریختہ کہہ لا

جھمک دکھاتے ہی اس دلربا نے لُوٹ لیا — ہمیں تو پہلے ہی اُس کی ادا نے لوٹ لیا
نگہ کے ٹھگ کی لگاوٹ نے فن سے کر غافل — ہنسی نے ڈال دی پھانسی، دعا نے لوٹ لیا

وفا جفا نے یہ کی جنگ زرگری ہم سے — وفا نے باتوں لگایا، جفا نے لوٹ لیا
لُٹے ہم اس کی گلی میں تو یوں پکارے لوگ — کہ ایک فقیر کو ایک بادشاہ نے لوٹ لیا
ابھی کہیں تو کسی کو نہ اعتبار آوے — کہ ہم کو راہ میں ایک آشنا نے لوٹ لیا

ہزاروں قافلے جس شوخ نے کیے غارت
نظیر کو بھی اُسی بے وفا نے لوٹ لیا

ایک دن آپ نے اس کا نہ کبھی دھیان کیا — جس نے یہ حسن دیا اور تمھیں انسان کیا
طور کو پھونک دیا اس نے تمھاری خاطر — چشم کے واسطے جب سرمے کا سامان کیا

ٹھہرنا عشق کے آفات کے صدموں میں نظیر
کام مشکل تھا، پر اللہ نے آسان کیا

دل یار کی گلی میں کر آرام رہ گیا — پایا جہاں فقیر نے بسرام رہ گیا
کس کس نے اس کے عشق میں مارا نہ دم ولے — سب چل بسے مگر وہ دل آرام رہ گیا

جس کام کو جہان میں تو آیا تھا اے نظیر
خانہ خراب تجھ سے وہی کام رہ گیا

جو پوچھا میں نے یہاں آنا مرا منظور رکھیے گا — تو سن کر یوں کہا یہ بات دل سے دور رکھیے گا
بہت روئیں یہ آنکھیں اور بڑی دن رات روتی ہیں — اب ان کو چشم بھی کیجیے گا یا ناسور رکھیے گا
جو پردہ بزم میں منہ سے اُٹھاتے ہو تو یہ کہہ دو — کہ پھر یہاں شمع کے جلنے کا کیا مذکور رکھیے گا

دیا دل ہم نے تم کو اور تو اب کیا کہیں لیکن — یہ ویرانہ تمہارا ہے اسے معمور رکھئے گا
نظیر اب تو دل و جاں سے تمہارا ہو چکا بندہ
میاں اپنے غلاموں میں اسے مشہور رکھئے گا

چاند اپنا تو کسی اور کا ہالا نکلا — ہم نے سمجھا تھا جسے گل سو وہ لالا نکلا
بھیک لینے تیرے اس گورے سے مکھڑے کی رات — بدر چاندی کا لئے ہاتھ میں پیالا نکلا
اس کے چہرے پہ نہیں کاکل مشکیں کی نمود — یہ ٹپاری کے تئیں توڑ کے کالا نکلا
طور پر جیسی کسی وقت میں چمکی تھی چمک — کچھ سر بام سے ویسا ہی اُجالا نکلا
مٹ گئی شور فغاں جی کے نکلتے ہی نظیر
پھر نہ سینے سے اُٹھی آہ نہ نالا نکلا

کدھر ہے آج الٰہی وہ شوخ چلبلیا — کہ جس کے غم سے مرا دل ہوا ہے باولیا
تمام گوروں کے حیرت سے رنگ اُڑ جاتے — جو آج گھر سے نکلتا وہ میرا سانولیا
تجھے خبر نہیں بلبل کہ باغ سے گل چیں — بڑی سی پھولوں کی ایک بھر کے لے گیا ڈلیا
خدا کے واسطے سمجھو نہ اس کو کوٹھے وال — فریب دیتا ہے تم کو یہ بوالہوس ٹلیا
نظیر یار کی کل ہم نے جو ضیافت کی — پکایا قرض منگا کر پلاؤ اور قلیا
سو آپ یار نہ آیا رقیب کو بھیجا — ہزار حیف ہم ایسے نصیبوں کے بلیا
اُدھر تو قرض ہوا اور اُدھر نہ آیا یار
پکائی کھیر تھی قسمت سے ہو گیا دلیا

آغوش تصور میں جب ہم نے اسے مسکا — لبہائے نزاکت سے ایک شور تھا لس لس کا
سو بار حریر اس کا مسکا نگہ گل سے — شبنم سے کب اے بلبل پیراہن گل مسکا

اس تن کو نہیں طاقت شبنم کے تلبس کی ❊ اے دست ہوس اس پہ تو قصد نہ کر مس کا
ملتا ہے پری آنکھیں اور حور جبیں سا ہے ❊ ہے نقش جہاں یارو اس پائے مقدس کا
تر رکھیو سدا یارب تو اس مژۂ تر کو ❊ ہم عطر لگاتے ہیں گرمی میں اسی خس کا

اس گریۂ خونی کی دولت سے نظیر اپنی
اب کلبۂ احزاں میں کل فرش ہے اطلس کا

ادھر مدت ہوئی وہ حسرت گلشن نہیں آتا ❊ شکار دل تڑپتا ہے شکار افگن نہیں آتا
نزاکت اور خوش اندامی زیادہ اس سے کیا ہوگی ❊ مہ کنعاں کا جس کے بر میں پیراہن نہیں آتا
لڑی منہ سے نہ بولی روٹھ بیٹھی جھڑکیاں دے لیں ❊ اسے سب کچھ بن آتا ہے مجھے کچھ بن نہیں آتا
طرح دینا، اڑا دینا، لگا دینا، بچھا دینا ❊ یہ ڈھب ہیں یاد تس پر کچھ فریب و فن نہیں آتا
صریحاً یہ تو ضد ہے مجھ سے اس بیدرد ظالم کو ❊ کہ ہر دم روٹھنا آتا ہے لیکن من نہیں آتا

نظیر اس شوخ نے سیکھی زبان فارسی جب سے
دلوں کے حق میں جز بشکن اُسے مشکن نہیں آتا

اس کے شرار حسن نے شعلہ جو اک دکھا دیا ❊ طور کو سر سے پاؤں تک پھونک دیا جلا دیا
پھر کے نگاہ چار سو ٹھہری اسی کے روبرو ❊ اس نے تو میری چشم کو قبلہ نما بنا دیا
میرا اور اس کا اختلاط ہو گیا مثل ابر و برق ❊ اس نے مجھے رلا دیا میں نے اسے ہنسا دیا
میں ہوں پتنگ کاغذی ڈور ہے اس کے ہاتھ میں ❊ چاہا ادھر گھٹا لیا چاہا ادھر بڑھا دیا
تیشے کی کیا مجال تھی یہ جو تراشے بے ستوں ❊ تھا وہ تمام دل کا زور جس نے پہاڑ ڈھا دیا
شکوہ ہمارا ہے بجا مفت بروں سے کس لئے ❊ ہم نے تو اپنا دل دیا ہم کو کسی نے کیا دیا

سن کے ہمارا عرض حال یار نے یک بیک نظیر

ہنس کے کہا کہ بس جی بس تم نے تو سر پھرا دیا

زیرِ فلک وہ خلق ہوئے ماہ پارہ ہا | دیکھے ہے جن کو رشک سے چشمِ ستارہ ہا
ہر شب ترے فراق میں اُسے اخترِ مراد | اپنی ہر ایک آہ ہے گنجِ ستارہ ہا
ہے تو وہ مہرِ حسن کہ ہر دم تری طرف | گُل اخترِ سپہر ہیں گرمِ نظارہ ہا
یوں سنگِ ہجر توڑے ہے آئینہ ہائے دل | جیتا کے ٹکڑے کرتے ہیں جوں سنگ خارہ ہا
کرتی ہے اک نگاہ کی گردش ہزار ناز | رکھتی ہے ایک جنبشِ ابرو اشارہ ہا
پیدا ہوئے وہ خلقتِ انساں میں اور نظیر | کرتا ہے عرش جن پہ فدا گوشوارہ ہا

ہیں دم کے ساتھ عشرت و عسرت ہزار ہا | وابستہ ایک تارِ نفس سے ہیں تار ہا
کچھ صیدِ زخم خوردۂ جاناں ہمیں نہیں | ہر صید گہ میں اس کی ہیں بسمل شکار ہا
آیا وہ جب تو ہم نہ رہے آپ میں غرض | دیکھا اسی طرح سے اُسے ہم نے بار ہا
اس گُل کے چاکِ جیب کی حسرت سے باغ میں | ہر صبح چاک ہوتی ہیں جیب و کنار ہا
اس سوزنِ مژہ کے تصور میں شانہ ساں | ٹوٹے ہیں ایک خلق کے پہلو میں خار ہا
کس کس کی دیکھئے چمنِ صنع میں بہار | اپنی فقط دو چشم ہیں اور یہاں بہار ہا
تھے کل یہ خطِ عارضِ خوباں سبزہ رنگ | سے کہتے ہیں آج آفاق جنہیں سبزہ زار ہا
تھے کل یہ شاہدانِ سہی سرو و سیمتن | شاہد ہیں آج مرگ کے جن کے مزار ہا

سب کو نظیر سونا ہے ایک دن بہ زیرِ خاک
سنگِ مزار، اس کے ہیں آئینہ دار ہا

یار نے ہم کو اگر رسوا کہا اچھا کہا | ہم تو رسوا ہیں ہی کیا بے جا کہا اچھا کہا
وصف اس کے حسن کا کلی ہوا کس سے مگر | جس کے جتنا فہم میں آیا کہا اچھا کہا

آپ سے جب آپ کو ہم نے ملایا خاک میں — پھر تو جس جس نے جو کچھ چاہا کہا اچھا کہا
یار کے آگے پڑھا یہ ریختہ جا کر نظیر
سن کے بولا واہ واہ اچھا کہا اچھا کہا

نہ آیا رات بھی کتنا ہی انتظار کیا — قرار کر کے مجھے کافر نے بیقرار کیا
چمن میں اس گل رنگین کی جامہ زیبی نے — ہر ایک گل کے گریبان کو تار تار کیا
کیا ہے کیا مہ کنعاں پہ حسن نے احسان — کہ اس کے دور میں تجھ کو نہ آشکار کیا
بہار دیکھ اسے رشک سے یہ کہتی ہے — کہ تھا یہ حسن تو پھر مجھ کو کیوں بہار کیا
نظیر آج تصدق کو کچھ نہ تھا ہم پاس
وہی جو باقی تھا اک جی وہی نثار کیا

تجھے کچھ بھی خدا کا ترس ہے اے سنگ دل ترسا — ہمارا دل بہت ترسا ارے ترسا نہ اب ترسا
نہ جاؤں میں تو اس کے پاس لیکن کیا کروں یارو — یکایک کچھ جگر میں آ کے لگ جاتا ہے نشتر سا
نظیر اک دو گلے کرنے بہت ہوتے ہیں خوباں سے
چلو اب چپ رہو بس کھول بیٹھے تم تو دفتر سا

جال میں زر کے اگر موتی کا دانا ہو گا — وہ نہ اس دام میں آوے گا جو دانا ہو گا
آج دیکھا اس نے مری چاہ کی چتون یارو — منہ سے گو کچھ نہ کہا دل میں تو جانا ہو گا
پھر نظر دیکھیں گے اس عہد شکن کی صورت — دیکھئے کون سا یارب وہ زمانا ہو گا
خوں بہانے کا مرے حشر میں جب ہو گا بہا — دیکھیں کیا اس گھڑی قاتل کو بہانا ہو گا
وہاں بھی کچھ ایسی ہے کہہ دے گا کہ جب اس شوخ — بات کی بات بہانے کا بہانہ ہو گا
دیکھ لے اس چمن دہر کو دل بھر کے نظیر — پھر تیرا کاہے کو اس باغ میں آنا ہو گا

دل فدا تجھ پہ جو اے سرو گل اندام ہوا   حلقۂ زلف بتاں پھر اُسے کب دام ہوا
ہو گیا دیکھتے ہی مشرق خورشید خجل   اس کف پا سے مشرف جو سر بام ہوا

آ گیا اس میں وہ محبوب دل آرام نظیر
جب اُسے دیکھ لیا تب ہمیں آرام ہوا

۴ص گر ہم نے دل صنم کو دیا پھر کسی کو کیا   اسلام چھوڑ کفر لیا، پھر کسی کو کیا
اس بے وفا نے ہم کو اگر اپنے عشق میں   رسوا کیا، خراب کیا، پھر کسی کو کیا
۷ص آپ ہی کیا ہے اپنے گریباں کو ہم نے چاک   آپ ہی سیا سیا نہ سیا پھر کسی کو کیا

دنیا میں آ کے ہم سے بُرا یا بھلا نظیر
جو کچھ کہ ہو سکا سو کیا پھر کسی کو کیا

سبھوں کو مے ہمیں خوناب دل پلانا تھا   فلک مجھی پہ سمجھے کیا یہ زہر کھانا تھا
لگی تھی آگ جگر میں بجھائی اشکوں نے   اگر یہ اشک نہ ہوتے تو کیا ٹھکانا تھا
نگہ سے اس کی بچاتا ہے کس طرح دل کو   ازل سے یہ تو اسی تیر کا نشانا تھا
نہ کرتا خون میں ہمیں کس طرح وہ رنگین آہ   اسے تو ساتھ ہمارے یہ رنگ لانا تھا
شب فراق کی ادنیٰ سی اک یہ حالت ہے   کہ تھا جو گھر سو ہمارا وہ قید خانا تھا
جو کروٹیں تھیں سو وہ بے کلی کی شدت تھی   جو خواب تھا سو وہ دل غش میں ڈوب جانا تھا

غرض نہ سر کی خبر تھی نہ پا کا ہوش نظیر
سرہانا پائنتی اور پائنتی سرہانا تھا

کیا جو یار نے ہم سے پیام رخصت کا   تو دم نکل گیا سنتے ہی نام رخصت کا
مثال شمع کے ٹپ ٹپ ٹپک پڑے آنسو   سنا جو شوخ کے منہ سے کلام رخصت کا

تم اپنے ظلم سے ہرگز نہ باز آؤ گے
چلا، نظیر سے لیجے، سلام رخصت کا

جب میں سنا کہ یار کا دل مجھ سے ہٹ گیا — سنتے ہی اس کے میرا کلیجا الٹ گیا
میں عشق کا جلا ہوں مرا کچھ نہیں علاج — وہ پیڑ کیا ہرا ہو جو جڑ سے اُکھٹ گیا
اتنا کوئی کہے کہ دوا سے پڑا ہے کیا — جا دیکھو ابھی اُدھر کوئی پریوں کا غٹ گیا
آنکھوں میں میری صبح قیامت گئی جھمک — سینے سے اس پری کے جو پردہ الٹ گیا
یہ کشمکش ہوئی کہ گریباں مرا ادھر — ٹکڑے ہوا اور اس کا دوپٹہ بھی پھٹ گیا
آخر اسی بہانے ملا یار سے نظیر
کپڑے بلا سے پھٹ گئے سودا تو پٹ گیا

پھر آن کے منت سے ملا ہم سے وہ لالا — المنۃ للہ تقدس و تعالیٰ
کر قتل مجھے تو نے ہمیشہ کو جلایا — ظالم تجھے جیتا رکھے اللہ تعالیٰ
دیکھ اب تو مجھے ہر کوئی کہتا ہے یہی آہ — پھر قبر سے اللہ نے مجنوں کو نکالا
مرمر کے مجھے کہتا تھا سو مرتا ہوں میں یارو — اب لاؤ کہاں ہے وہ مرا کوسنے والا
شاید وہی بن ٹھن کے چلا ہے کہیں گھر سے — ہے یہ تو اسی چاند سی صورت کا اجالا
لے لے کے بلائیں مجھے یہ کہتی ہیں آنکھیں — صدقے ترے پھر ایک نظر ہم کو دکھالا
ہم تجھ سے اسی روز کو روتے تھے نظیر آہ
کیوں تو نے پڑھا عشق و محبت کا رسالا

پھر ہو کے خفا روٹھ گیا ہم سے وہ لالا — اے داغ مبارک ہو تجھے منصب و اقبال
یہ سیل کے اشکوں کی بیاباں میں نہیں نہر — پھوٹا کوئی مجنوں کے مگر پاؤں کا چھالا

شیریں کے در اوپر یہ جوئے شیر نہ جانو　　فرہاد کے لہو کا چھلکتا ہے پیالا
کیا جانئے کس حال میں ہووے گا عزیزؔ　　دل آج مرا سلمہ اللہ تعالیٰ
وہ آپ سے روٹھا نہیں منتے کا نظیرؔ آہ
کیا دیکھے ہے چل پاؤں پڑ اور اس کو منالا

مانی نے جو دیکھا تری تقدیر کا نقشا　　سب بھول گیا اپنی وہ تحریر کا نقشا
اس ابروئے خم دار کی صورت سے عیاں ہے　　خنجر کی شباہت دم شمشیر کا نقشا
یہ زلف سیہ عارض قاتل یہ نہ جانو　　تقدیر نے کھینچا ہے یہ زنجیر کا نقشا
کیا گردش ایام ہے اے آہ جگر سوز　　الٹا نظر آیا تری تاثیر کا نقشا
تدبیر تو کچھ بن نہیں آتی ہے نظیرؔ آہ
اب دیکھئے کیا ہوتا ہے تقدیر کا نقشا

ترے جمال کی سورج جھلک نہ دیکھ سکا　　کھلی نقاب رہی جب فلک نہ دیکھ سکا
تو وہ ہے نور سراپا کہ تیری صورت کو　　بشر تو کیا ہے مری جاں ملک نہ دیکھ سکا
گلی کی خاک بھی ہو کر نہ ٹھہرنے پائے　　ہمیں تو آہ فلک یاں تلک نہ دیکھ سکا
یہ ناتواں ہوں کہ آیا جو یار ملنے کو　　تو صورت اس کی اٹھا کر پلک نہ دیکھ سکا
نظیرؔ تم سے نہ ہوتا کبھی جدا پیارے
پہ کیا کرے کہ یہ کافر فلک نہ دیکھ سکا

ملا مجھ سے وہ آج چنچل چھبیلا　　ہوا رنگ سن کر رقیبوں کا نیلا
کیا مجھ سے جس نے عداوت کا پیچہ　　سنلقی علیہم عذاباً ثقیلا
نکل اس کی زلفوں کے کوچے سے اے دل　　تو پڑھتا قم اللیل الا قلیلا

کہتاں میں ماروں اگر آہ کا دم　　فکانت جبالاً کثیباً مہیلا

نظیرؔ اس کے فضل و کرم پر نظر رکھ
فقل حسبی اللہ نعم الوکیلا

کل جو رخِ عرق فشاں یار نے ٹک دکھا دیا　　پانی چھڑک کے خواب سے فتنے کو پھر جگا دیا
اس کے شرارِ حسن نے جلوہ جو اک دکھا دیا　　طور کو سر سے پاؤں تک پھونک دیا جلا دیا
گزرے جو سوئے خانقاہ واں بھی یہ شکل جانماز　　اہلِ صلاح و زہد کو فرش کیا بچھا دیا
نکلے جو راہ دیر سے اک ہی نگاہ مست میں　　گبر کا صبر کھو دیا، بُت کو بھی بُت بنا دیا

سُن کے یہ میرا عرضِ حال یار نے یوں کہا نظیرؔ
چل بے زیادہ اب نہ بک تو نے تو سر پھرا دیا

خرامِ ناز سے اس شوخ نے دامن کو جب جھٹکا　　ہماری خاک نے کیا کیا ہوا کے ساتھ سر پٹکا
نہیں کٹّا عبادت کا ترے ماتھے پہ اے زاہد　　نشاں ہے یہ کسی محبوب بے پروا کی چوکھٹ کا

نظیرؔ آرام سے گر تجھ کو اس دنیا میں رہنا ہے
سوا اللہ کے ہرگز کسی سے دل کو مت اٹکا

سامنے اس صفِ مژگاں کے میں کل جاؤں گا　　چھد تو جاؤں گا پر آگے سے نہ ٹل جاؤں گا
ہے کفِ پا وہ مصفا کہ جسے دھیان میں لا　　پائے نظارہ یہ کہتا ہے پھسل جاؤں گا
مجھ کو دیتے ہو عبث خانۂ زنجیر میں جا　　جوں صدا میں ابھی اس گھر سے نکل جاؤں گا
گرچہ ہوں بے حرکت ضعف سے جوں آتشِ سنگ　　پر جو چھیڑا تو شرر ساں میں اچھل جاؤں گا

بے کلی آج بھی واں لے گئی مجھ کو تو نظیرؔ
میں نے ہر چند یہ چاہا تھا کہ کل جاؤں گا

شہر دل آباد تھا جب تک وہ شہر آرا رہا　　جب وہ شہر آرا گیا پھر شہر دل میں کیا رہا
کیا رہا پھر شہر دل میں جز ہجوم درد و غم　　تھی جہاں بزم طرب واں لشکرِ غم آ رہا
آ رہا آنکھوں میں دم تو بھی نہ آیا وہ صنم
حیف کس سے پوچھیے جا کر کہ وہ کس جا رہا

عشق کا جو گُل زخم دمِ شمشیر کھلا　　رہ گیا جسم پہ مثلِ گُلِ تصویر کھلا
طفل اشک اے مژہ چاہے کہ رہے ٹک تو اُسے　　پیار سے مہر سے الفت سے یہ تدبیر کھلا
تو تدبیر میں ہم لیک خدا ہی جانے
کون سا گُل ہے پسِ پردۂ تقدیر کھلا

کان میں نام خدا اس مہ کے جب بالا پڑا　　آ گئی چکر میں برق اور ماہ پر ہالا پڑا
دیکھنا ہمدم یہ اترا سنبلستاں میں قمر　　یا تہ کاکل کسی کے جھلکے ہے بالا پڑا
لائق اس بالے کے گوہر یہاں تو ہاتھ آیا نہ ایک　　دیکھنا ہم کو مگر اب عالم بالا پڑا
گوہر مقصود سمجھے ہم وہی اس راہ میں　　پا شتہ سے تا سرِ انگشت جو چھالا پڑا
دیکھ نقش تن مرا اپنی گلی کی خاک پر　　ق　یوں کہا یاں تو نہ دیوانہ نہ متوالا پڑا
نیند بھر کر سکھ سے سونے کے لیے اس جا مگر　　رات تھا کوئی ہمارا چاہنے والا پڑا
کل گُل لالہ سے پوچھا میں نے اے دل سوختہ　　ق　کس سبب سینے میں تیرے داغ یہ کالا پڑا
سُن کے بولا جس سے تو پھنکتا ہوا آیا ہے یہاں　　یار مجھ پر بھی اسی آتش کا پرکالا پڑا
سنگ دل محبوب کو کہنا غلط تھا پر نظیرؔ
ہم نے جب جانا جب اس بے درد سے پالا پڑا

دیکھ لے عالم جو اس کے حُسن بالا دست کا　　حوصلہ اتنا کہاں اپنی نگاہِ پست کا

نیست رہتے ہم تو یہ سیریں کہاں سے دیکھتے　　یہ فقط احسان ہے اُس ذات پاکِ ہست کا
بے صدا آکر لگا، اور ہو گیا سینہ سے پار　　یہ خدنگ ناز تھا کس بے نشاں کی شست کا
پنجۂ خورشید رنگین خونِ حسرت کے سوا　　برق ساں چمکا جو رنگ اس کے حنائی دست کا

بات کچھ کہتا ہے اور نکلے ہے کچھ منہ سے نظیر
یہ نشا ایسا ہوا کس کی نگاہِ مست کا

لائے خاطر میں ہمارے دل کو وہ مغرور کیا　　جس کے آگے مہر کیا، مہ کیا، پری کیا حور کیا
دل نیا ہم نے لگایا ہے بتا دو، مہرباں　　اس کی ہے رہ کیا روش کیا رسم کیا دستور کیا
یاد ہوں عیاریاں جس کو بہت پھر بس کریں　　اُس کے آگے مکر کیا چھل کیا فسوں کیا زور کیا
یوں کہا ہم بوسہ لیں گے ابتو چھو کر زلف کا　　بولا منہ کیا دست گہ کیا تاب کیا مقدور کیا

ہم کو چاہت ایک ہی ہے اس پری رو کی نظیر
رو برو کیا درقفا کیا متصل کیا دور کیا

دل ہوا جس روز بسمل ابروئے خمدار کا　　تھا وہی پہلا دن اُس بسمل کی بسم اللہ کا
جس نے دیکھا وہ رخِ انور تو اُس کو عمر بھر　　پھر نہ روئے مہر خوش آیا نہ چہرہ ماہ کا
ایک دن آ گے خلیل اللہ کے ایک شخص نے　　یک بیک آکر لیا منہ سے جو نام اللہ کا
اُس خلیل اللہ نے سنتے ہی آکر شوق میں　　سب دیا اُس کو جو تھا اسبابِ عز و جاہ کا
اور کہا اے شخص پھر بہرِ خدا یہ نام لے　　میں بجاں مشتاق ہوں اس اسم خاطر خواہ کا
گر وہ لیتا نام پھر اللہ کا تو بالیقیں　　جی نکل جاتا وہیں حضرت خلیل اللہ کا
حاصل اس کہنے سے اُس کی چاہ کچھ آساں نہیں　　جب کوئی ایسا ہو تب لے نام اُس کی چاہ کا

اس میں کیا طاقت جو مالک ہو کوئی بہت اے نظیر

جان بھی اللہ کی اور مال بھی اللہ کا

دریا و کوہ و دشت و ہوا ارض اور سما — دیکھا تو ہر مکاں میں وہی ہے رہا سما
ہے کونسی وہ چشم نہیں جس میں اس کا نور — ہے کونسا وہ دل کہ نہیں جس میں اُس کی جا
قمری اُسی کی یاد میں کوکو کرے ہے یار — بلبل اسی کی شوق میں کرتی ہے چہچہا
مفلس کہیں غریب تونگر کہیں غنی — عاجز کہیں نبل کہیں سلطاں کہیں گدا
بہروپ سا بنا کے ہر اک جا وہ آن آن — کس کس طرح کے روپ بدلتا ہے واہ وا
ملکِ رضا میں لیکے توکل کی جنس کو — بیٹھے ہیں سب اسی کی دکاں میں لگا لگا
سب کا اُسی دکان سے جاری ہے کاروبار — لیتا ہے کوئی حُسن کوئی دل ہے بیچتا
دیکھا جو خوب غور سے ہم نے تو یاں نظیر
بازار مصطفےٰ ہے خریدار ہے خدا

ترے رخسار رنگیں نے کیا دل زیر پھولوں کا — ترے حُسنوں کی فوجوں نے دیا نخ بھیر پھولوں کا
بدن گُل چہرہ گُل لب گُل اور دہن ہے گُل — سراپا اب تو وہ رشکِ چمن ہے ڈھیر پھولوں کا
یہ پر بلبل کے اکڑے مت سمجھ اے باغباں ہرگز — ہوا ہے میکدہ میں لوٹ کر یہ ڈھیر پھولوں کا
گلے میں ہار اور ہاتھوں میں گجرے ہو کے یوں لیٹے
خدا کے واسطے دیکھو ذرا اندھیر پھولوں کا

اک پردۂ ہستی نہ رہا جوں نظر آیا — وہ پردہ برانداز ہمیں کیوں نظر آیا
اس مہرِ پُرانوار سے شبنم کی طرح ہم — گم ہوتے گئے ہم کو وہ جوں جوں نظر آیا

سرسبز دل جلوں کو نہ ہرگز کرے فلک — دانہ کہیں اُگا ہے جو آتش میں بھن گیا
جب سے ہوئے ہیں وہ لب جاں بخش جلوہ گر — تب سے تمام نسخۂ عیسیٰ کا گُن گیا

پہنچے نہ ذیل وصف میں دست اس کے عام کا　　موصوف ہو جو خاص خدا کے کلام کا

چمن طراز حقیقی نے اپنی صنعت سے　　کسی کو پھول بنایا، کسی کو گھاس کیا

وصل اس کا ہوتا کیونکر میسر　　وہ نور جاں تھا، میں آب و گل تھا

جو وصف زلف کو پوچھا تو حلقے حلقے کو　　مآب و مرجع و ملجائے صد اسیر کہا

دیکھ اُسے رنگِ بہارِ سرو و گل ادر جو بنا　　اِک اُڑا، اک گر گیا، اک جل گیا، اک کٹ گیا

تو ہے وہ گل اے جان کہ تیرے باغ میں ہے شوق　　جبریل کو بلبل کی طرح نغمہ زنی کا

نہ آئی بو جو ذرا تیرے مصحفِ رُخ کی　　نسیم پھاڑ گئی آکے ہر ورق گُل کا

ہم وہ درخت ہیں کہ جسے دم بہ دم قضا　　ارہ ادھر دکھاتی ہے، اُدھر تبر قضا

بتوں کی ناز برداری میں بھی تیری عبادت ہے　　مری اس بندگی کا اب تو ہی شاہد ہے معبودا

عزیزو کیا پڑے سوتے ہو غفلت میں ذرا جاگو　　جرس فریاد می دارد کہ بربندید محمل ہا

نظیر اب اس ندامت سے کہوں کیا　　فآہا، ثُمّ آہا، ثُمّ آہا

پان سے سرخ ہوئے پھر بُتِ عیار کے لب　　دیکھ اس وقت تو اے دل مرے خونخوار کے لب
منفعل ہو کے کبھی دعویٰ سرخی نہ کرے　　دیکھے گر لعل بدخشاں مرے دلدار کے لب
خوفِ نرمی و نزاکت کا مجھے ہے ورنہ　　چوم لوں میں ابھی اس شوخ پری وار کے لب
لذتِ زندگی اس دم مجھے ہووے گی نظیر
جب ملے ہوں گے بہم میرے لب اور یار کے لب

اس کی تجلی سے کب ہووے دوچار آفتاب　　ایک تو کیا ہے اگر ہوویں ہزار آفتاب
پاس ادب ہے اسے ورنہ ترے حسن پر　　حکم جو ہو تو ابھی ہووے نثار آفتاب
خانہ زیں میں تجھے دیکھے تو پھر رشک سے　　توسنِ افلاک پر ہو نہ سوار آفتاب
ایک نظر گر تجھے دیکھیں تو شادی سے پھر　　مہ کو لگیں چار چاند، مہر کو چار آفتاب
جیسے یہ ہیں مہر و مہ ایسے تو اس نے نظیر
چمکیں ہیں سو ماہتاب اور ہزار آفتاب

ہو تیرے مہر حسن سے کب ہمسر آفتاب　　ذرہ تری نگاہ سے ہو یکسر آفتاب
تو حسن میں وہ مہر سپہر جمال ہے　　ہر روز جبہہ سا ہے ترے در پہ آفتاب
ہر لحظہ تیرے چہرۂ انور کے وصف میں　　یہ بیت پڑھ رہا ہے فدا ہو کر آفتاب
از بہر دفع چشم بد از روئے خوب تو　　سیارہ ہا سپند شود اخگر آفتاب
اس مہر کبریا کی اشارت سے اے نظیر
مغرب تلک پہنچ کے پھرا اکثر آفتاب

ہوا جو ہم کو وہ کوچہ چمن سرشت نصیب　　خدا نے ہم کو اسی جا کیا بہشت نصیب

جُدا جو اس سے ہوئے ہم تو اپنی قسمت سے
ہے وہ تو خوب پر اپنے ہی کچھ ہیں نوشت نصیب

لکھیں نہ حرفِ وفا کیا کریں کہ ازل سے
ہوئی قلم کو ہمارے یہی نوشت نصیب

زمینِ دل میں گرایا ہے تخم تو لیکن
کریں گے دیکھیے سرسبز کب یہ کشت نصیب

یہ کم نصیب ہوئے ہم کہ بعد مرگ نظیر
ہوئی مزار کو اپنے نہ ایک خشت نصیب

ساقی شراب ہے تو غنیمت ہے اب کی اب
پھر بزم ہوگی جب تو سمجھ لیجو جب کی جب

ساغر کے لب سے پوچھیے اس لب کی لذتیں
کس واسطے کہ خوب سمجھتا ہے لب کی لب

کم فرصتی سے عمر کی اپنی ہزار حیف
جتنی تھیں خواہشیں وہ رہیں دل میں سب کی سب

سُن کر وہ کل کی آج نہ ہو کس طرح خفا
اے ناشناس طبع کہی تو نے کب کی کب

پھولا ہوا بدن میں سماتا نہیں نظیر
وہ گُل بدن جو پاس رہا اس کے شب کی شب

کچھ اور تو نہیں ہمیں اس کا عجب ہے اب
یعنی وہ شوخ ہم سے خفا بے سبب ہے اب

آہ و فغان و گریہ و اندوہ و درد و داغ
جو جنسِ عشق ہے وہ مرے پاس سب ہے اب

دیکھے سے جس کے غنچہ صفت گل ہو رشک سے
ایسا تو اس چمن میں وہی غنچہ لب ہے اب

صبحِ فلک بھی جس کی تجلی سے ہو خجل
اس رشکِ ماہتاب سے اپنی وہ شب ہے اب

آئینہ ایک دم نہیں رکھتا ہے ہاتھ سے
ایسا وہ اپنے رخ کا تماشا طلب ہے اب

اس گل بدن کے وصل سے ہر دم نظیر کو
سب سے زیادہ خلق میں عیش و طرب ہے اب

خوباں میں اس طرح ہے وہ دلخواہ سب سے خوب
چوں وقتِ شب ستاروں میں ہے ماہ سب سے خوب

محبوب کا جو وصل تصور میں ہو تو پھر — مشتاق وصل کو ہے یہی راہ سب سے خوب
دل جس کو چاہتا ہو اُسے بھی خبر نہ ہو — اپنے تو فہم میں ہے یہی راہ سب سے خوب
کیسا ہی وہ بُرا ہو تو لگ جائے جس سے دل — لگتا ہے دل کو پھر وہی واللہ سب سے خوب
خوبی میں خوب رو تو سبھی خوب ہیں نظیرؔ
پر خوب غور کی تو ہے اللہ سب سے خوب

بوسہ اس لب سے نہ کر اے دل افگار طلب — یہ زیادہ طلبی سے ہے نہ ہو دشوار طلب
جلد آ یار کہ اب ہم کو ستاتے ہیں بہت — گوش گفتار طلب، دیدۂ دیدار طلب
ربط اس عربدہ جو سے ہیں کس طور سے ہو — ہم تو ہیں صلح طلب اور وہ ہیں پیکار طلب
آرزو خوب ہے موقع سے اگر ہو ورنہ — اپنے مقصود کو کم پہنچے ہیں بسیار طلب
عذر عاصی کو نہیں چاہئے کچھ اس سے نظیرؔ
جس خطا پوش کی رحمت سے ہے گنہگار طلب

جب کھلے اس معجزہ آرا کے لب — بند ہوئے حضرت عیسیٰ کے لب
عشق میں اس گوہر نایاب کے — آج تلک خشک ہیں دریا کے لب
لعل بھی ہو رشک سے یاقوت زرد — دیکھے اگر اس دُر یکتا کے لب
نام سے اُس لب کے ہیں لب ریز شہد — خُلد میں حوران شکر خا کے لب
ایک تبسم میں کریں لاکھ کام — ایسے ہیں اس شاہد رعنا کے لب
تھی وہ اسی لب کی شکر جس کو دیکھ — مصر میں چُپکے سے تھے زلیخا کے لب
اس لب جاں بخش کے آگے نظیرؔ
کس کو خوش آتے ہیں مسیحا کے لب

کس کے لئے کیجئے جامۂ دیبا طلب
دل تو کرے ہے مدام دامنِ صحرا طلب

کا مروا ہوں بھلا اس سے ہم اب کس طرح
اس کو تمنا نہیں، ہم ہیں تمنا طلب

کس سے کہیں کیا کریں ہے یہ تماشے کی بات
وہ تو ہے پردہ نشیں ہم ہیں تماشا طلب

کہئے تو کس کس کے اب غور کرے وہ طبیب
جس کے طلبگار ہوں لاکھ مداوا طلب

ایک تمنا ہو تو یار سے کہئے نظیرؔ
دل ہے پر از آرزو کیجئے کیا کیا طلب

ہے اب تو وہ ہمیں اس سرو سیم بر کی طلب
کہ طائران ہوا سے ہے، بال و پر کی طلب

جو کہئے حسن کو خواہش نہیں یہ کیسا امکاں
اُسے بھی اہل نظر سے ہے اک نظر کی طلب

کمال عشق بھی خالی نہیں تمنا سے
جو ہے ایک آہ تو اس کو بھی ہے اثر کی طلب

پری رخوں کو غرض کیا تھی زیب و زینت سے
نہ ہوتی گر انہیں اپنے نظارہ گر کی طلب

طلب سے کس کو رہائی ہے بحر ہستی میں
اگر صدف ہے تو اس کو بھی ہو گہر کی طلب

چمن میں بلبل و گل بھی ہیں اپنے مطلب کے
اسے ہے گل کی طلب، اس کو مشت پر کی طلب

جہاں وہ باغ تمنا ہے جس کے بیچ نظیرؔ
جو اک شجر ہے تو اس کو بھی ہے ثمر کی طلب

ہو کس طرح نہ ہم کو ہر دم ہوائے مطلب
دیکھا جو خوب ہم نے دنیا ہے جائے مطلب

جو گلبدن کہ آیا آغوش میں ہمارے
کچھ اور بو نہ نکلی اس میں سوائے مطلب

عشاق کی بھی الفت خالی نہیں غرض سے
مرتے ہیں یہ بھی اس پر بس ہے برائے مطلب

کوئی کسی کے اوپر ہم نے فدا نہ دیکھا
منہ پر فدا ہیں لیکن دل میں فدائے مطلب

مطلب کے آشنا کو ہو کس سے آشنائی
کب آشنا کسی کا ہو آشنائے مطلب

گر بزم رقص دیکھی تو واں بھی گوش دل میں　　کوئی صدا نہ آئی غیر از صدائے مطلب
زیر فلک تو ہم سے جاتی نہیں تمنا　　ہاں پھر فلک پہ جاویں جب ہم سے جائے مطلب
وہ آبرو کہ جس پر کرتے ہیں جاں تصدق　　اس کو بھی دے چکے ہیں اکثر برائے مطلب

جب حرف آبرو تک پہنچا نظیرؔ پھر تو
کیا کہیے ایسی جاگہ جز یہ کہ ہائے مطلب

یوں جھمکتا ہے رخ اس محبوب کا زیر نقاب　　ہو نمایاں جس طرح ابر تنک میں آفتاب
دیکھ اس مہ رو کے رخ کا رات چشم تر میں عکس　　کیا ہی لوٹا رشک سے دریا میں عکس ماہتاب
کیا نزاکت ہے کہ اس نازک کمر کے روبرو　　رشتہ ساں حسرت سے کھاتی ہے رگ گل پیچ و تاب
رنگ رخسار اس گل باغ حیا کا دیکھ کر　　قطرۂ شبنم نہیں ہے شرم سے گل آب آب
وہ عرق آلود رخ جس دن سے آیا ہے نظر　　جب سے ہم واقف نہیں کیسا گل اور کیسا گلاب
جس کی ایک دم لڑ گئی اس چشم میگوں سے نگاہ　　پھر اسے یارو کہاں کا جام اور کیسی شراب

خواب کر جاتا ہے رم ایک لخت آنکھوں سے نظیرؔ
یاد آ جاتی ہے جب ساقی کی چشم نیم خواب

بحر ہستی میں صحبت احباب　　یوں ہے جیسے بروئے آب حباب
بادۂ ناب کیا ہے خون جگر　　زردی رنگ ہے شب مہتاب
جس کو رقص و سرود کہتے ہیں　　وہ بھی ہے ایک ہوائے خانہ خراب
حسن اور عشق جن کو کہتے ہیں　　خندۂ برق و قطرۂ سیماب
گردش آسماں میں ہم کیا ہیں　　پر کا ہے میانۂ گرداب
عمر کہتے ہیں جس کو وہ کیا ہے　　مثل تحریر موج نقش بر آب

جسم کیا روح کی ہے جولانگاہ — روح کیا ایک سوار پا بہ رکاب
زندگانی و مرگ بھی کیا ہیں — ایک مثل خیال و دیگر خواب
فرصت عمر قطرۂ شبنم — وصل محبوب گوہر نایاب
قفس غم ہے مسکن وادی — اشک حسرت بجائے دانۂ آب

سب کتابوں کے کھل گئے معنی
جب سے دیکھی نظیر دل کی کتاب

جو کچھ ہے حسن میں ہر مہ لقا کو عیش و طرب — وہی ہے عشق میں ہر مبتلا کو عیش و طرب
اگرچہ اہل نوا خوش ہیں ہر طرح لیکن — زیادہ اُن سے ہے ہر بینوا کو عیش و طرب
وہ میکدے میں حلاوت ہے رند میکش کو — جو خانقاہ میں ہے پارسا کو عیش و طرب
رکھے ہے ہر تن عریاں برہنہ پائے وہی — جو کچھ ہے صاحب اسپ و قبا کو عیش و طرب

کمال قدرت حق ہے نظیر کیا کہئے
جو شاہ کو ہے وہی ہے گدا کو عیش و طرب

جو اس کی چشم گلابی کی دیکھ پائے شراب — تو اس کو حشر تلک ہو نہ پھر ہوائے شراب
ہماری بزم میں ہے مے فروش کا کیا کام — وہ اپنے دہاں کے ہی لوگوں میں بیچ کھائے شراب
ہم اس شراب کے خواہاں نہیں ہیں اے ساقی — پئیں جو تو ہمیں اس چشم کی پلائے شراب
نشہ جو اس کی نگہ میں ہے وہ نہ ہو ہرگز — اگر ہزار طرح کی کوئی بنائے شراب
جہاں میں موسم گل ہے میں کیا کروں ہیہات — مجھے تو آب میسر نہیں چہ جائے شراب

بہ قول حضرت صائب ہزار حیف نظیر
کہ در بہار ندارم بہ کف بہائے شراب

ہو حسن اثر کیوں نہ مری آہ میں یارب　　سب کچھ ہے مہیا تری درگاہ میں یارب
پہنچے ہے وہی منزلِ مقصود کو جو شخص　　چلتا ہے فدا ہو کے تری راہ میں یارب
ہر چاہ میں ملتا ہے اسے یوسفِ اقبال　　جو تشنہ و والا ہے تری چاہ میں یارب
جو خانہ بدوشی میں ہے طالب کو ترے عیش　　وہ عیش نہیں خیمہ و خرگاہ میں یارب

اپنا ہی طلبگار نظیرؔ اپنے کو رکھیو
ہر طور میں، ہر رسم میں، ہر راہ میں یارب

ترے مریض کو اسے جان شفا سے کیا مطلب　　وہ خوش ہے درد میں اس کو دوا سے کیا مطلب
فقط جو ذات کے ہیں دل سے چاہنے والے　　انہیں کرشمہ و ناز و ادا سے کیا مطلب
نہال تازہ رہیں نامیہ کے منت کش　　درخت خشک کو نشو و نما سے کیا مطلب
مراد و مقصد و مطلب ہیں سب ہوس کے ساتھ　　ہوس ہی مر گئی پھر مدعا سے کیا مطلب
مجھے وہ پوچھے تو اُس کا ہی لطف ہے ورنہ　　وہ بادشاہ ہے اُسے مجھ گدا سے کیا مطلب
جو اپنے یار کے جور و جفا میں ہیں مسرور　　انھیں پھر اور کے مہر و وفا سے کیا مطلب

رضائے دوست جنھیں چاہیے بہر صورت
نظیرؔ پھر اُنھیں اپنی رضا سے کیا مطلب

نہ دل میں صبر نہ اب دیدۂ پُر آب میں خواب　　شتاب آ کہیں آوے اس عذاب میں خواب
جہاں بھی خواب ہے اور ہم بھی خواب ہیں اے دل　　عجب بہار کا دیکھا یہ ہم نے خواب میں خواب
ہماری چشم کا اے شہسوار توسنِ ناز　　جو غور کی تو کیا ہے تری رکاب میں خواب
ہر ایک مکاں میں گزرگاہِ خواب ہے لیکن　　اگر نہیں تو نہیں عشق کے جناب میں خواب
ہجومِ اشک میں لگتی ہے چشم تر اس طور　　کہ جیسے ماہی کو آتا ہے اپنے آب میں خواب

رواروی میں لگے آنکھ کس طرح سے نظیر
مسافروں کو کہاں ایسے اضطراب میں خواب

ہنسنا ہوا ازل سے کب اے یار کے نصیب
رونا ہماری دیدۂ خونبار کے نصیب

دل سا در یتیم بکا اک نگہ کے مول
کیا کہئے خیر یہ بھی خریدار کے نصیب

بھیجے ہے جام خور میں ہوا ہر سحر مسیح
اس اوج پر ہیں اب ترے بیمار کے نصیب

بازار یوسفی میں نہ دیکھی تھیں خواب میں
جو گرمیاں ہوئیں ترے بازار کے نصیب

دیکھا اس کو آج باغ میں بولی یہ بلبلیں
بارے کھلے ہمارے بھی گلزار کے نصیب

غش تھے معانقے کی تمنا میں ہم و لے
وہ بھی سنا کہ اب کے ہوا ہار کے نصیب

کل ہم سے روٹھ کر وہ رقیبوں سے جا ملا
چمکے ہیں کیا ہی دیکھئے اغیار کے نصیب

جس گل کو اپنے سر پہ چڑھاتے تھے ہم نظیر
وہ گل ہوا رقیب کے دستار کے نصیب

نامہ کو میرے دھو کے نہ اس نے لکھا جواب

اتنا تو نامہ بر سے نہ ہوتا میں شرمسار
اسنے کاش بھیجتا وہ بُرا یا بھلا جواب

پہروں تلک میں کہتا ہوں حال اپنا پر مجھے
وہ اپنی ایک بات میں کرتا ہے لاجواب

حاضر جوابی دیکھو کہ لب سے مرے ہنوز
نکلا نہیں سوال کہ واں ہو گیا جواب

کوچے سے اس کے آتا ہوں یوں ہو کے نا امید
نوکر شکستہ حال کو جیسے ملا جواب

کہتا ہے تو تو جیتا ہے اپنی خوشی سے اب
ورنہ میاں خدا تو تجھے دے چکا جواب

کھوئی تمام عمر بتوں کی جناب میں
دے گا نظیر کیا تو خدا کو بھلا جواب

ہیں گو کہ یوں تو اور بھی محبوب خوب خوب
لیکن اُسی کو کہتے ہیں سب خوب خوب خوب

نام خدا میں کیا کہوں اس گل کے حُسن میں
کیا کیا بڑے ہیں تازگے اسلوب خوب خوب

فضل خدا سے اب تو نظیر اپنی بزم میں
اسباب سب ہیں عیش کے مرغوب خوب خوب

ہیں اس طرف تو ساقی و مطرب کرشمہ سنج
اور اس طرف کو بیٹھے ہیں محبوب خوب خوب

تمھاری آن عزیزا ور ہر ایک ادا محبوب
تمھیں ہو حسن ہیں اب سر سے تا بہ پا محبوب

تمھیں وہ ہو کہ تمھیں دیکھنے ہم آتے ہیں
وگرنہ یوں تو ہزاروں ہیں جا بجا محبوب

کہیں جو ہم تمھیں محبوب مت بُرا مانو
بھلا ہم اور کہیں کیا تمھیں سوا محبوب

جو چاہے آپ سے محبوب بن سکے کیا ذکر
وہی بنے ہے کہ جس کو خدا کرے محبوب

تمھاری آج وہ محبوبیاں ہیں نام خدا
کہ تم کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں دلربا محبوب

کوئی کہے ہے بہ صد اشتیاق دل یا دوست
کوئی پکارے ہے بیتاب ہو کے یا محبوب

نظیر بھی تمھیں اب دیکھ کر یہ کہتا ہے
الٰہی خلق ہو اور میں ہوں اور مرا محبوب

گزرے خوشی سے نہ دو دم کبھی اسے وائے نصیب
تھے عجب کلک وہ جس سے مرے لکھوائے نصیب

قاصد اس دولت بیدار سے کہیو کہ کبھی
دو گھڑی آ کے ہمارے بھی جگا جائے نصیب

آ دیں ہم بھی جو تری بزم میں جوں شمع اے جاں
ایسے ہم سوختہ بختوں نے کہاں پائے نصیب

یار دیکھ اس کو لگے رکھنے عداوت مجھ سے
دوست بھی ہو گئے دشمن مرے اسے وائے نصیب

ایک دم نزع میں لائے نہ اُسے بالیں پر
اپنی قسمت سے تو اتنے بھی نہ کام آئے نصیب

یاد آتا ہے ہمیں جب وطن اپنا تو نظیر

سر کو حسرت سے پٹک کہتے ہیں ہم ہائے نصیب

یہ گلہ دل سے تو ہرگز نہیں جانا صاحب　　سب نے جانا ہمیں پر تم نے نہ جانا صاحب
ان بیانوں سے غرض ہم نے یہ جانا صاحب　　آپ کو خون ہمارا ہے بہانا صاحب
چھوڑ کر آپ کے کوچے کو پھروں صحرا میں　　سو تو مجنوں سا نہیں ہوں میں دوانا صاحب
یاد تھے ہم کو جوانی میں تو سو مکر و فریب　　ایک کرشمہ تھا تمھیں دام میں لانا صاحب

اب جو بوڑھے ہیں تو اب بھی ہیں شیطان نظیر
ہنس کے کہتا ہے اجی آیئے نانا صاحب

تمہارے ہاتھ سے کل ہم بھی رو لئے صاحب　　جگر کے داغ جو دھونے تھے دھو لئے صاحب
غلام عاشق و چاکر مصاحب و ہمراز　　غرض جو تھا ہمیں ہونا سو ہو لئے صاحب
قرار صبر جو کرنے تھے کر چکے برباد　　حواس و ہوش جو کھونے تھے کھو لئے صاحب
ہمارے وزن محبت میں کچھ ہو فرق تو اب　　پھر امتحاں کی ترازو میں تو لئے صاحب
کچھ انتہائے بکا ہو تو اور بھی یک چند　　سرشکِ چشم سے موتی پرو لئے صاحب
کل اس صنم نے کہا دیکھ کر ہمیں خاموش　　کہ اب تو آپ بھی ٹک لب کو کھولئے صاحب

یہ سُن کے میں نے نظیر اس سے یوں کہا ہنس کر
جو کوئی بولے تو البتہ بولئے صاحب

کچھ اسے شرم کچھ ہے ہم کو حجاب　　ہے نئی چاہ میں یہ طرفہ عذاب
کیوں نہ عشرت دو چند ہو جو ملے　　یار مہ چہرہ اور شب مہتاب
زور کیفیتیں دکھاتے ہیں　　ساقیٔ گلعذار و بادہ ناب
کرتے ہیں تار تار جیب الم　　تار قانون و بین و چنگ و رباب

وقت خلوت یہ ہم نے اس سے کہا قطعہ اب تو ٹک منہ سے دور کیجیے نقاب
بولے ہم تو ابھی اٹھا دیں مگر لائیں کب آپ دیکھنے کی تاب
اور جو آجاوے غش تمھیں تو نظیرؔ
پھر چھڑکنا پڑے گا ہم کو گلاب

رکھتا ہے صدا ہونٹ کو جوں گل کی کلی چپ — وہ غنچہ دہن آہ یہ سیکھا ہے بھلی چپ
سوتا ہے تو لیتا ہوں میں یوں چوری سے بوسہ — جوں منہ میں کھلا دے کوئی مصری کی ڈلی چپ
منت سے کہا ہم نے تو تم آہ نہ بولے — جب غیر نے کی گدگدی پھر کچھ نہ چلی چپ
پروانے سے عاشق کے تئیں شمع جلا کر — پھر آپ بھی روتی ہے کھڑی بخت جلی چپ
سبزی بھی اگی باغ میں غنچے بھی کھلے آہ — پر اس مری گونگی کے لبوں سے نہ ٹلی چپ
غصے میں رقیب آتا ہے جب بھوت سا بن کر — پڑھتا ہوں میں جب دل میں کھڑا نادعلی چپ
مر جائیں پہ شکوے کی کبھی بات نہ نکلے — یہ ہونٹھ وہ ہیں جن میں ازل سے ہے ملی چپ
جس دم یہ خبر جا کے رقیبوں کو ہوئی پھر — بس سنتے ہی سُن ہو گئے اور سانس نہ لی چپ
الٹی ہی سمجھ یار کی سنتا ہے نظیر آہ
زنہار نہ کچھ بولیو یہاں سب سے بھلی چپ

دل کو لے کر ہم سے اب جاں بھی طلب کرتے ہیں آپ — لیجیے حاضر ہے پر یہ تو غضب کرتے ہیں آپ
مورد تقصیر گر کرتے ہو لازم تھی سزا — یہ جفا پھر کہیے ہم پر کس سبب کرتے ہیں آپ
کرتے ہو ابرو سے کشتہ رخ سے دیتے ہو جلا — حسن میں اعجاز کیا کیا روز و شب کرتے ہیں آپ
قیس سے جو تھا کیا در پردہ لیلیٰ نے سلوک — سو وہی اے مہرباں ہم سے بھی اب کرتے ہیں آپ
بے کلی ہوتی ہے حسرت سے دلِ صد چاک کو — اپنی زلفِ عنبریں میں شانہ جب کرتے ہیں آپ

ہم نے پوچھا پھر بھی اس کی جاں پھری سب جسم میں
نزع میں دُوری سے جس کو جاں بہ لب کرتے ہیں آپ

ہنس کے فرمایا نظیرؔ اپنی نگاہ لطف سے
یہ بھی ہو سکتا ہے کیا اس کا عجب کرتے ہیں آپ

ہے جو اس محبوب کی انگشتری در دست چپ
رکھتی ہے کیا کیا نزاکت پروری در دست چپ

آج صہبا کی گلابی اس کے ہے در دست راست
اور چھلکتی مے کی ایک پیالی بھری در دست چپ

جس کماں کو کھینچتا ہے وہ بت ابرو کماں
اس کے قبضے میں ہے سو زینت وری در دست چپ

کچھ جو لکھتا ہے قلم لے کر تو پھر کیا کیا رقم
کرتے ہیں قرطاس پر زیب آوری در دست چپ

کل تو بائیں ہاتھ میں تسبیح رکھتا تھا نظیرؔ
اور مصلے کی عنایت گستری در دست چپ

نہ چین گھر میں نہ کل ہے باہر نہیں جو تم نے دکھائی صورت
تمھارے ناز و عتاب نے تو عجب ہماری بنائی صورت

وہ شکل دیکھی تو ہو کے بے حس رہے تحیر میں اس طرح ہم

نظر میں آنکھوں میں اور جاں میں بھری اسی کی وجاہتیں ہیں
کچھ ایسے نقشے سے اپنے دل میں ہے اب کسی کی سمائی صورت

پری کی بیہودہ ہمسری نے کیا جو اس کا مزاج برہم
تو آپ ہی ہو کر خجل وہ بولی کہ ایسی کب ہم نے پائی صورت

بیاں ہو کیا حسن صورت اس کا جو دیکھ آئینہ ہے یہ کہتا
ہو ایسی صورت تو پھر غرض کیا ہمیں جو دیکھیں پرائی صورت

الم میں چاہت کے اب ہماری بدل گئی ہے جو شکل ہمدم
کسی کو پھر یاد کیا رہے جب ہمیں نے اپنی بھلائی صورت

نظیرؔ محفل میں گل رخوں کی جو ہم نے دیکھا تو اُن سبھوں میں
فدا ہوا ہے دل اپنا جس پر اسی کی ہم کو خوش آئی صورت

اے چشم جو یہ اشک تو بھر لائی ہے کم بخت
اس میں تو سراسر مری رسوائی ہے کم بخت

الفت میں تو لے دل تری رسوائی ہے کم بخت
کم بخت تجھے کیا یہی اب بھائی ہے کم بخت

اِس قد میں جو رعنائی و زیبائی ہے اے سرو
مت بھول کہ وہ تو نے نہیں پائی ہے کم بخت

ایک بات بھی حل کر نہ کریں اُس سے ہم اے چرخ
کیا تجھ کو یہی بات پسند آئی ہے کم بخت

یارو ہمیں تکلیف نہ دو سیرِ چمن کی
آنے دو بلا سے جو بہار آئی ہے کم بخت

رہنے دو ہمیں کنجِ قفس میں کہ ہماری
قسمت میں یہی گوشۂ تنہائی ہے کم بخت

اس جام نگوں سے مئے راحت نہ طلب کر
یہاں بادہ نہیں بادیہ پیمائی ہے کم بخت

توڑے ہیں بہت شیشۂ دل جس نے نظیر آہ
یہ چرخ وہی گنبدِ مینائی ہے کم بخت

آگے ہی دل اپنا تو یہ سودائی ہے کم بخت
اور تس پہ سنا یہ کہ بہار آئی ہے کم بخت

کھل گیا رخسار اس کا جس گھڑی کاکل سمیت
حسن کے گلشن میں دیکھا ہم نے گل سنبل سمیت

ہم کو دیکھا باغ میں اس نازنیں کے ساتھ جب
ہو گئی محوِ نگاہِ رشک بلبل گل سمیت

بزم میں اس کی بہارِ چشم سے گوں دیکھ کر
کیا کہوں کیا کیا ہوا مدہوش ساقی گل سمیت

اس کے بازو کی لچک سے لگ کے یوں ہلتا ہے دل
جس کی جنبش پر فدا ہو شاخِ گل بلبل سمیت

خوش ہوا دل میں دلے ناخوش وہ ظاہر میں نظیر
آ گیا اس کی نظر جب ہاتھ میرا گل سمیت

صورت کبھی دکھلائی تو اس میں بھی لگا وٹ
باتوں کی جو ٹھہرائی تو اس میں بھی لگا وٹ

آتے نہیں اول تو کہیں اور کہیں شاید
تشریف جو فرمائی تو اس میں بھی لگا وٹ

جس بات میں کچھ رمز تھی اور ہم جو نہ سمجھے
وہ ہم کو جو سمجھائی تو اس میں بھی لگا وٹ

بوسے کا جو اقرار کیا وہ بھی فقط جُبل
اور ہنس کے قسم کھائی تو اس میں بھی لگا وٹ

ہنسنے میں نظیرؔ اس کے لگاوٹ تو ہے لیکن
ابرو میں جو چین آئی تو اس میں بھی لگاوٹ

دے کے دل بے مہر کو کرنا گلہ یہ بھی عبث
اور جو کہیے اس سے مت کر تو جفا یہ بھی عبث

دام میں پھنس کر غلط فہمی ہے کہنا چھوڑ دو
پھر جو یہ کہیے نہ کیجئے اب رہا، یہ بھی عبث

ہوں جو بے درد اُن سے کیا رکھیے توقع لطف کی
کچھ اگر رکھیے تو پھر ہوتا ہے کیا یہ بھی عبث

سُن کے خواہش بوسہ و دشنام کی بولا وہ شوخ
یہ تمنا بھی ہے بے جا، مدعا یہ بھی عبث

جب نہ ہو دشنام کے دینے کے لائق تو نظیرؔ
پھر جو بوسے کے لئے تو نے کہا یہ بھی عبث

کرنے لگا دل طلب جب وہ بت خوش مزاج
ہم نے کہا جان کل، اس نے کہا ہنس کے آج

زلف نے اس کی دیا کاکل سنبل کو رشک
چشم سیہ نے لیا، چشم سے آہو کے باج

اس کی وہ بیمار چشم دیکھ رہا تو جو دل
رہ تو سہی میں ترا کرتا ہوں کیسا علاج

کام پڑا آن کر چاہ سے جس دن ہمیں
چھٹ گئے اس روز سے اور جو تھے کام کاج

دل تو نہ دیتے ہم آہ لے گئی لیکن نظیرؔ
اس کی جبیں کی حیا اور وہ آنکھوں کی لاج

اس کے تشریف جو لانے کی خبر پائی آج
دل نے کی پھر ہوس انجمن آرائی آج

کیوں نہ جوں جام ہنسیں ہم کہ بہت مدت میں
اپنے دل خواہ پھر آ کے مد مینائی آج

ہو گئی باغ میں عطریت سنبل برباد
نکہت اس زلف کی لے کر جو صبا آئی آج

اس کے کوچے کی طرف جا کے ہم نے ہمدم
امتحاں کو، جو ذرا دیر کی ٹھہرائی آج

شام نزدیک جب آئی تو کہا اس نے نظیرؔ

کیا سبب ہے نہیں آیا جو وہ سودائی آج

طریق عشق بے مرشد نہ ہو سطے
کہ یہ رہ ہے نہایت پیچ در پیچ

بتوں کی کاکلوں کے دیکھ کر پیچ
پڑے ہیں دل پہ کیا کیا پیچ پر پیچ

نہ ہووے دل کی اکل کٹ کے برباد
اگر ڈالے نہ وہ تار نظر پیچ

نظیرؔ ایک روز اپنے زخم سر کو
جو باندھا ہم نے دے کر بیشتر پیچ

نظر کرتے ہی اس سرکش نے یکبار
کہا کر کر سخن کا مختصر پیچ

دعا دیجے ہماری تیغ کو آج
کہ جس نے آپ کو بخشا ہے یہ پیچ

کی تم نے جفا ہم نے وفا جھوٹ ہے یا سچ
سوچو تو اسے دل میں ذرا جھوٹ ہے یا سچ

غصہ بھی کیا، دکھ بھی دیئے تم نے ولیکن
چپ ہو رہے ہم سر کو جھکا جھوٹ ہے یا سچ

تم ہم سے کئی بار خفا ہو گئے اے جان
پر ہم نہ ہوئے تم سے خفا جھوٹ ہے یا سچ

جو تم نے کہا اس کے بجا لانے میں ہم نے
اک لحظہ توقف نہ کیا جھوٹ ہے یا سچ

سن کر یہ نظیرؔ اس نے کہا ہنس کے بہ صد ناز
جانے اسے اب میری بلا جھوٹ ہے یا سچ

تھی چھوٹی اس کے مکھڑے پہ کل زلف مسلسل اور طرح
پھر دیکھا آج تو اس گل کے تھے کاکل کے بل اور طرح

وہ دیکھ جھڑکتا ہے ہم کو اکثر غصہ ہر دم اور ہمیں
ہے چین اسی کے ملنے سے زنہار نہیں کل اور طرح

معلوم نہیں کیا بات کہی غماز نے اس سے جو ہم سے
تھیں پہلی باتیں اور نمط اب بولے ہے چنچل اور طرح

دل مجھ سے اس کے ملنے کو کہتا ہے تو اس کے پاس مجھے
جب پہنچا تھا کنبیں بدل پھر اب کے نے چھل اور طرح

ہے کتنے دنوں سے عشق نظیرؔ اس یار کا ہم کو بس کے ہیں

صبح اور بدن، شام اور یہیں آج اور روش کل اور طرح

ہم تو ہو جائیں اس سے اب گستاخ   ہونے دے گا مگر وہ کب گستاخ
ایک شب ہم نے بیقراری سے   چھو لی زلف اس کی ہو کے جب گستاخ
لاکے ابرو پہ چیں کہا اس نے   نکلے تم تو کوئی عجب گستاخ
ہم تو اس کی بہت سزا دیں گے   کس لیے تم ہوا بے ادب گستاخ
آج تو زلف چھو لی تم نے نظیر
کل یونہی چوم لو گے لب گستاخ

بر سر بام دل زلف نے ڈالی کمند   پھرنے کی ہرگز نہیں اب کے یہ خالی کمند
ہاتھ لگا زلف کو اس کا تری گھات میں   بھاگ رہے دل ورنہ دیکھا اس نے سنبھالی کمند
مر کے بھی چھٹتا نہیں اس میں بندھا جو غرض   کاکل پر پیچ ہے سب سے نرالی کمند
جب وہ چلا صید کو ابرو نے لے لی کمان   گیسوئے بل دار نے جھپ سے اٹھا لی کمند
شال کے جھرمٹ میں زلف کے ہے چھپا اس لیے   یعنی ملا جب کہ صید تو تو نکالی کمند
اور نہ چڑھا جو کوئی گھات کے اوپر نظیر
تو اسی جھرمٹ میں پھر اپنی چھپا لی کمند

کیا نہ جس نے ہمیں نامہ و پیام سے یاد   ستا رہی ہے ہمیں اس کی آج شام سے یاد
جگر میں جوش تپش اور یہ لب پہ جوم فغاں   ہوئی ہے آج یہ کچھ اس کی اژدہام سے یاد
ہمارے آگے نہ لو نام گل کوئی ورنہ   وہ گل بدن ہمیں آوے گا گل کے نام سے یاد
دلایا نالہ ہمیں یاد بڑھ کے بلبل نے   یہ بات سچ ہے کہ آتا ہے کام کام سے یاد
علیحدہ خط وہ لکھے گا نظیر کیا جس نے

کیا نہ غیر کے خط میں کبھی سلام سے یاد
عشق کا دور کرے دل سے جو دھڑکا تعویذ	اس دھڑاکے کا کوئی ہم نے نہ دیکھا تعویذ

ہو کچھ آسیب تو واں چاہیئے گنڈا تعویذ	اور جو ہو عشق کا سایہ تو کرے کیا تعویذ
دل کو جس وقت یہ جن آن کے لپٹا پھر تو	کیا کریں واں وہ جو لکھتے ہیں فلیتا تعویذ
ہم تو جب ہوش میں آویں جو کہیں سے پاویں	یار کے ہاتھ کا، بازو کا، گلے کا تعویذ
زور تعویذ کا چلتا تو عرب میں یارو	کیا کوئی ایک بھی مجنوں کو نہ دیتا تعویذ
کوہکن کوہ کو کس واسطے کاٹا کرتا	دیتے غم خوار نہ کیا اس کے تئیں لا تعویذ
آخر اس کے بھی گیا دل کا دھڑکنا اس روز	قبر کا تیشے نے جب اس کے تراشا تعویذ
ہم کو بھی کتنے ہی لوگوں نے دیئے آہ نظیر
پر کسی کا کوئی کچھ کام نہ آیا تعویذ

ہرگز نہ پلا مے مجھے تو آنکھ بدل کر	ساقی ترے کوچے سے نہ جاؤں گا سنبھل کر
میں کشتۂ ابرو ہوں ترا اے مرے قاتل	آتے ہو لئے ہاتھ میں کیوں تیغ مچل کر
کہتا ہے نظیر اس کو ذرا پیار سے تو سو جا
تب اُٹھ کے کھڑا ہوتا ہے وہ شوخ مچل کر

رکھی ہرگز نہ ترے رخ نے بدر کی قدر	کھوئی کاکل نے بھی آخر کو شب قدر کی قدر
عزت و قدر کی اُس گل سے توقع ہے عبث	واں نہ عزت کی کچھ عزت ہے نہ کچھ قدر کی قدر
راستی خوار ہے اس چشم فسوں پرور سے	ہاں مگر منزلت مکر ہے اور غدر کی قدر
مے پرستوں میں ہے یوں ساغر و مینا کا وقار	جیسے اسلام میں ہو محتسب و صدر کی قدر

کفش برداری سے اس مہر کی چمکا ہے نظیر
ورنہ کیا خاک تھی، اس ذرۂ بے قدر کی قدر

اس کے بن دیکھے جو مر جاؤں میں آنکھیں پھیر کر ۔۔۔ ڈر خدا سے اے فلک اتنا تو مت اندھیر کر
میں تو بے غیرت نہیں کیا جاؤں اس بدخو کے پاس ۔۔۔ کون سا کم بخت پھر لاتا ہے مجھ کو گھیر کر
داغ مرنے کا وہی محروم جانے جس کو آہ
موت آ پہونچی شتاب اور یار آیا دیر کر

بسمل کے گلے کی نہیں تدبیر کوئی اور ۔۔۔ جز یہ کہ لگا جائیے شمشیر کوئی اور
یوں چھوڑ کے زخمی جو ہمیں جاتے ہو تم آہ ۔۔۔ کیا ترکش مژگاں میں نہیں تیر کوئی اور
اس لطف سے جز موقلم مانیِ تقدیر ۔۔۔ کیا تاب جو کھینچے تری تصویر کوئی اور
بندے کے قلم ہاتھ میں ہوتا تو غضب تھا ۔۔۔ صد شکر کہ ہے کاتب تقدیر کوئی اور
غنچہ بھی تری تنگ دلی دیکھ نظیر آہ
کہتا ہے کہ ایسا نہیں دلگیر کوئی اور

کہ جوں ساغر میں دے ساقی شراب ارغوانی بھر
گل عارض شگفتہ صبح دم دیکھ اس کا خجلت سے ۔۔۔ گیا پانی سحر کا آفتاب ارغوانی بھر
بھری ہے کاسۂ سر میں وہ ہی اپنے ہوا ساقی ۔۔۔ کہ جس سے ہے رہا مے کا حباب ارغوانی بھر
گلوں کے اشک سے اس دیدۂ خونبار نے یارو ۔۔۔ دیا اک دم میں دامان سحاب ارغوانی بھر
نظیر اس گل نے بنوائی جو تھی اوراق گلگوں کی
گئی شعروں سے تیرے وہ کتاب ارغوانی بھر

پڑی ہے خاک گورستاں میں، کیا کیا قد موزوں پر ۔۔۔ اُگی ہے گھاس کس کس گل بدن کے روئے گل گوں پر

وہ رکھے اینٹ چھاتی پر بہ زیر خاک سوتے ہیں　　　چمکتے تھے سنہرے قصر جن کے بام گردوں پر

لن ترانی نے کیا اپنا ظہور آخر کار　　　موسیٰ بے خود ہوئے اور جل گیا طور آخر کار
قرب سمجھا تھا جسے تو وہ ہے دوری اے شیخ　　　اسی نزدیک نے پھینکا تجھے دور آخر کار

کتنا تنک صفا ہے کہ پاسے نگاہ کا　　　ہلکا سا اک غبار ہے چہرے کے رنگ پہ

اے شوخ ہر گھڑی نہ ہوس آشنا کو چھیڑ　　　ایسا ہی چھیڑنا ہے تو اہل وفا کو چھیڑ
چھیڑے گا جب تو پیش نہ جاوے گا کچھ فسوں　　　اے دل نہ اس کے افعیٔ زلف دوتا کو چھیڑ
چھیڑیں تو یاد مجھ کو بھی ہیں گی بہت ولے　　　دل کی خوشی یہ ہے کہ نہ اس دلربا کو چھیڑ
رگ رگ سے اشک چشم کے لایا ہے عنقریب　　　اے غنچہ لب بس اب نہ دل مبتلا کو چھیڑ
اک حرف چھیڑ کا تو صریحاً نہ کہہ نظیر
چھیڑے تو پردے پردے میں اس پُرجفا کو چھیڑ

جو آوے منہ پہ ترے ماہتاب ہے کیا چیز　　　غرض یہ ماہ تو کیا آفتاب ہے کیا چیز
یہ پیرہن میں ہے اس گورے گورے تن کی جھلک　　　کہ جس کے سامنے موتی کی آب ہے کیا چیز
بھلا دیں ہم نے کتابیں کہ اس پری رو کے　　　کتابی چہرے کے آگے کتاب ہے کیا چیز
تمہارے ہجر میں آنکھیں ہماری مدت سے　　　نہیں یہ جانتیں دنیا میں خواب ہے کیا چیز
نظیر حضرت دل کا نہ کچھ کھلا احوال　　　میں کس سے پوچھوں یہ خدمت مآب ہے کیا چیز
جو سخت ہووے تو ایسا کہ کوہ آہن کا　　　جو نرم ہووے تو برگ گلاب ہے کیا چیز

گھڑی میں سنگ گھڑی موم اور گھڑی فولاد　　خدا ہی جانے یہ عالی جناب ہے کیا چیز

غمزہ و ادا میں مزا نہ لذت ناز　　آہ کا ہے کو خط ہوا آغاز
نام سنتے ہی اس پری رو کا　　ہوش اپنے تو کر گئے پرواز
دیکھ تنہا نظیر کو خاموش　　بولا آہی سے وہ بت طناز
مار ڈالا تری خموشی نے　　کچھ تو بہتر بیان کر اپنا راز
جب تو لاچار ہو کے بھر کر آہ　　یہی اس نے کہا کہ بندہ نواز
عاشقاں کشتگان معشوق اند
بر نہ آید ز رفتگاں آواز

زلفیں یہ دو نہیں رخ دلبر کے آس پاس　　ابر سیہ ہے ماہ منور کے آس پاس
تجھ میں تو یہ شمیم نہ تھی سچ کہہ اے نسیم　　کس کے پھری تو زلف معنبر کے آس پاس
گلشن میں جا کے پھرتا ہوں اُس قد کو یاد کر　　دو دو پہر میں سرو صنوبر کے آس پاس
رو دیں گے ہم تو دیکھیو کوچے میں اپنے یار　　پانی ہی پانی ہوگا، ہر اک گھر کے آس پاس
کیا کیا ہجوم ہوں گے مجبوں کے اے نظیر
محشر کے روز ساقیٔ کوثر کے آس پاس

گر وہ مژہ ہو مائل جنگ پر طاؤس　　تو سہم سے بلے پر ہو خدنگ پر طاؤس
یوں زلف معنبر کے خط سبز سے ہے نزدیک　　گویا پر طوطی ہے بہ چنگ پر طاؤس
دکھلائیں جو ہم داغ دل اپنے کی سیاہی　　پرواز کرے خوف سے رنگ پر طاؤس
دیکھے جو ترے عاشق گل خوردہ کی تصویر　　حیرت زدہ ہو دیدۂ نیرنگ پر طاؤس
لکھ لکھ کے نظیر اس غزل تازہ کو خوباں

رکھ لیں گے کتابوں میں بہ رنگِ پرِ طاؤس

انکار ہم سے غیر سے اقرار بس جی بس
دیکھے تمھارے ہم نے یہ اطوار بس جی بس

اتنا ہوں جائے رحم جو کرتا ہے وہ جفا
تو اس سے رو کے کہتے ہیں اغیار بس جی بس

ساقی ہمیں پلائیے یوں جام پے بہ پے
جو ہم نشیں کہہ اٹھیں یک بار بس جی بس

ہوں نا امید وصل سے یوں جیسے وقتِ نزع
رو کر کہے طبیب سے بیمار بس جی بس

غش ہوں میں وقتِ بوسہ جو کہتا ہے ہنس کے وہ
منہ کو ہٹا ہٹا کے بہ تکرار بس جی بس

اس کا جو بس جی بس مجھے یاد آوے ہے تو آہ
پہروں تلک میں کہتا ہوں ہر بار بس جی بس

کل وہ جو بولا ٹک تو کہا ہم نے منہ پھرا
خیر اب نہ ہم سے بولیے زنہار بس جی بس

ق

ہم دل لگا کے تم سے ہوئے یہاں تلک بہ تنگ
جو اپنے جی سے کہتے ہیں لاچار بس جی بس

سن کر کہا کہ کیا مرے لگتی ہے دل میں آگ
شکوہ سے جب کرے ہے تو اظہار بس جی بس

ایسے طمانچے ماروں گا منہ میں ترے نظیر
گر تو نے مجھ سے پھر کہا ایک بار بس جی بس

ابھی تازہ حلقۂ زلف میں جو پھنسا ہے طائرِ دل بھلا
اسے رنج پہنچے ہے اے صبا تو گھڑی گھڑی نہ ہلا قفس

ہم ایسے کب تھے کہ خود بدولت یہاں بھی کرتے قدم نوازش
مگر یہ اک اک قدم پہ اے جاں فقط عنایت کرم نوازش

کہاں یہ گھر اور کہاں یہ دولت جو آپ آتے ادھر کو اے جاں
جو آن نکلے ہو بندہ پرور تو کیجیے اب کوئی دم نوازش

لگا کے ٹھوکر ہمارے سر پر بلا تمھاری کرے تاسف
کہ ہم تو سمجھے ہیں اس کو دل سے تمھارے سر کی قسم نوازش

جواب مانگا جو نامہ بر سے تو اس نے کھا کر قسم کہا یوں
زباں قلم ہو جو جھوٹ بولے کہ واں نہیں یک قلم نوازش

اٹھاویں ناز ان کے ہم نہ کیونکر نظیر دل سے کہ جن کے ہو ویں

جفا، لطف، عتاب، شفقت، غضب، توجہ، ستم، نوازش
واماندگان راہ تو منزل پہ جا پڑے اب تو بھی اے نظیر یہاں سے قدم تراش

ہے تو کہنے کو ہر کہیں اخلاص لیک مشکل ہے ہم نشیں اخلاص
اس کی باریکیاں وہی جانے ہووے جس شخص کے تئیں اخلاص
رشک سے ایک غیر نے اس کو اپنے دل کا جتا وہیں اخلاص
یوں کہا تم نظیر سے اے جان دل سے رکھتے ہو یا یوہیں اخلاص
اس نے اخفائے راز کو میرے منہ سے اس کے سنا جو ہیں اخلاص
یوں کہا ایسے پوچ لوگوں سے کوئی رکھتے ہیں نازنیں اخلاص

اس کو ہو کچھ تو خیر وہ جانے
ہم کو تو اس سے کچھ نہیں اخلاص

سنئے اے جاں کبھی اسیر کی عرض اپنے کوچے کے جانیزیر کی عرض
چھد گیا دل زباں تلک آتے ہم نے جب کی نگہ کے تیر کی عرض
اس گھڑی کھلکھلا کے ہنس دیجئے ہے یہی اب تو کہنہ پیر کی عرض
جب تو اس گل بدن شکر لب نے یوں کہا سن کے اس حقیر کی عرض

اب تلک دھن ہے حسن ندان کی
دیکھو اس پوپلے نظیر کی عرض

حسن کو ہے دلبری سے ارتباط رخ کو ہے جاں پروری سے ارتباط
ہر مژہ کو تیر سے ہے ہم سری چشم کو افسوں گری سے ارتباط

قد کو ہے سروِ سہی سے ہم قدی
تن کو ہے نازک تری سے ارتباط

ناز کو شوخی سے ہے پیوستگی
آن کو غارت گری سے ارتباط

مل سکے ایسے نازنیں سے پھر نظیرؔ
کب کیا ہم نے پری سے ارتباط

دل ہے اس کج کلاہ سے محظوظ
جی بھی ہے اس کی چاہ سے محظوظ

تم سے جو ناز ہو کرو اے جاں
ہم ہیں اس رسم و راہ سے محظوظ

خوش پری بھی جو ہو سو ہو ہم تو
ہیں اسی رشکِ ماہ سے محظوظ

کیا تماشا ہے یارو کل تو نظیرؔ
تھا بہت خانقاہ سے محظوظ

آج بیٹھا ہے میکدے کے بیچ
مغبچے کی نگاہ سے محظوظ

ہے ترا رخ بھی تجلی میں کچھ اس نور کی شمع
دیکھ جس نور کو کافور ہو کافور کی شمع

چشمِ بد دور اسی رخ نے ہوئی تھی روشن
مشعلِ وادیٔ ایمن، شجرِ طور کی شمع

ہے شبِ میں وہ رخشاں ترے عارض کی جھلک
جس کے پرتو سے خجل ہو شبِ دیجور کی شمع

آفریں ہے دلِ پروانہ کو جس نے جل کر
حسن کی گرمیٔ بازار میں مشہور کی شمع

آیا نزدیک جو محفل کے وہ مہ رات نظیرؔ
اہلِ محفل نے خجل ہو کے وہیں دور کی شمع

ساقیا ہے بہارِ زینتِ باغ
دے چھلکتے ہمیں بھی مے کے ایاغ

دیکھی جس دن سے اس پری کی چشم
پھر ہمیں ہوش کا ملا نہ سراغ

اس نے بھیجا نہ رقعہ ایک اور ہم
کئی مکتوب کر چکے ابلاغ

جائے حیرت ہے کل نظیر اپنا تھا پراگندہ بوئے مے سے دماغ
آج لینے کو جام پے در پے
نہیں ساقی کی منتوں سے فراغ

اے صف مژگاں تکلف برطرف دیکھتی کیا ہے الٹ دے صف کے صف
دیکھ وہ گورا سا مکھڑا رشک سے پڑ گئے ہیں ماہ کے منہ پر کلف
آ گیا جب بزم میں وہ شعلہ رو شمع تو بس ہو گئی جل کر تلف
ساقی بھی یوں جام لے کر رہ گیا جس طرح تصویر ہو ساغر بکف
جب تو ہم نے بھی وہیں یہ عرض کی دیکھ کر اس شاہ خوباں کی طرف
جان و دل لائے ہیں ہم بھی نذر کو گر قبول افتد زہے عز و شرف
آبرو رکھیو نظیر اپنے کی تم
یا امیر المومنین شاہ نجف

ساقی یہ پلا اس کو جو ہو جام سے واقف ہم آج تلک مے کے نہیں نام سے واقف
مستی کے سوا دور میں اس چشم سیہ کے کافر ہو جو ہو گردش ایام سے واقف
مر کر بھی تہ خاک نہ آسودہ ہوئے آہ اے عشق نہ تھے ہم ترے انجام سے واقف
صیاد کی الفت سے پھنسے آن کے ورنہ تھے کاہے کو ہم اس قفس و دام سے واقف
ملنے کا پیام اس سے کہو جا کے عزیزو جو اس کے نہ ہو وصل کے پیغام سے واقف
اوروں سے قسم کھائیے اور ہم تو مری جاں ہیں خوب تمہارے قسم اقسام سے واقف
کوئی نہیں کرتا جو کیا تو نے نظیر آہ
دل اس کو دیا جس کے نہیں نام سے واقف

محفل میں ہم تھے اس طرف وہ شوخ چنچل اس طرف
تھی سادہ لوحی اس طرف مکر و فسوں چھل اس طرف

بیٹھے ہم اپنے دھیان میں بیٹھا وہ اپنی آن میں
فکر نظارہ اس طرف گھرے پہ آنچل اس طرف

کیا کیا دکھاتی ہے الم کیا کیا رکھے ہے پیچ و خم
آہوں کی شورش اس طرف زلف مسلسل اس طرف

ہم دے کے دل ہیں رنج کش وہ لے کے دل ہے جی میں خوش
بے تابیٔ جاں اس طرف، راحت، خوشی، کل اس طرف

آج اس سے ملنے کو نظیرؔ احوال ہے دل کا عجب
ہم کھنچتے ہیں اس طرف کہتا ہے وہ چل اس طرف

مضمون سرد مہریٔ جاناں رقم کروں
گر ہاتھ آئے کاغذ کشمیر کا ورق

دیکھا جو ہیں اس نے لگا پاؤں سے تا فرق
ہنس کر یہ کہا تیس میں اور اس میں ہے کیا فرق

وہ دست وہ پا اس کے حنا بستہ جو دیکھے
پھر دست میں اور پا میں ہیں کچھ نہ رہا فرق

کل ہنس کے نظیرؔ اس نے کہا ناز میں ہم سے
کچھ بوسہ و دشنام میں بھی تم نے کیا فرق

جو چاہو سو ہم دیویں تمھیں ہم نے کہا خوب
دونوں کی حلاوت میں نہیں ہم کو ذرا فرق

گو لطف سے دینے کو کہا آپ نے ہم کو
پر کہنے میں اور کرنے میں اے جاں ہے بڑا فرق

جوتن درست سین بجا باتیں ٹھیک ٹھیک
ناز و ادا کی اس میں ہیں سب باتیں ٹھیک ٹھیک

کیا دل کو اچھی لگتی ہیں ان خوش قدوں کی آہ
یہ پیاری پیاری بولیاں یہ گاتیں ٹھیک ٹھیک

منہ میں طمانچے چھاتی میں گھونسا کمر میں لات
کیا کیا ہوئیں یہ مجھ پہ عنایاتیں ٹھیک ٹھیک

موقع سے بوسہ موقع سے گالی کبھی ہم کو دی
کی شوخ نے یہ دونوں مداراتیں ٹھیک ٹھیک

جب دوستی میں قول کے پورے ہوں دونوں شخص
ہوتی ہیں پھر تو کیا ہی ملاقاتیں ٹھیک ٹھیک

جب بن پڑی تو شیخ جی شیخی نہ ماریں کیا　　ہم سے بھی پھر تو ہو دیں کرامات ٹھیک ٹھیک
سچ ہے بہ قولِ حضرت سید نظیر آہ
بن آتی ہیں تو ہوتی ہیں سب باتیں ٹھیک ٹھیک

تیرے بھی منہ کی روشنی رات گئی تھی مہ سے مل　　تاب سے تاب، رخ سے رخ، نور سے نور، ظل سے ظل
یوسف مصر سے مگر ملتے ہیں سب ترے نشاں　　زلف سے زلف، لب سے لب، چشم سے چشم، تل سے تل
جتنے ہیں کشتگانِ عشق، اُن کے ازل سے ہیں ملے　　اشک سے اشک، نم سے نم، خون سے خون، گل سے گل
جب سے مُوا ہے کوہکن، کرتے ہیں اس کا غم سدا　　کوہ سے کوہ، جو سے جو، سنگ سے سنگ، سل سے سل
یار ملا، جب اے نظیر میرے گلے تو مل گئے
جسم سے جسم، جاں سے جاں، روح سے روح، دل سے دل

کب مثلِ شیشہ ان کا کسی سے برائے دل　　پتھر جنھیں دیا ہے خدا نے بجائے دل
جب لے چلا وہ دل مرے پہلو سے کھینچ کر　　دل سے مرے صدا یہی نکلی کہ ہائے دل
آوے اگر بتاں کے تئیں رسمِ دلبری　　تو تو جہاں میں پھر کہیں ڈھونڈھا نہ پائے دل
اب تو تری جفا سے یہ مانگوں ہوں میں دعا　ق　ظالم خدا کرے کہ کہیں تو لگائے دل
اور جس پہ تو فدا ہو وہ ظالم ہو اس قدر　　جو مطلقاً ترا وہ نہ خاطر میں لائے دل
تجھ پر بھی چند روز تو یہ کشمکش رہے　　ٹک ٹک اِدھر کرے اور اُدھر کو ستائے دل
ناچار جیسے تجھ سے چھڑاتا ہوں دل کو میں　　ایسا ہی تو بھی اس سے لگا کر چھڑائے دل
شیدا ہوں میں تو لیلیٰ و مجنوں کی چاہ پر　　خالق نے کیا ہی خوب تھے ان کے بنائے دل
تھے اس کے پاس کے آپ بھی جھاتی پہ اس کے آہ　　کیا اتحادِ جسم تھا اور کیا صفائے دل
ہیں یاں بڑے جو اہلِ دل اکثر یہ کہتے ہیں

چھوٹا سا اک نظیر بھی ہے خاک پائے دل

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم — بس ترستے ہی چلے افسوس پیمانے کو ہم
مے بھی ہے مینا بھی ہے ساغر بھی ہے ساقی نہیں — دل میں آتا ہے لگا دیں آگ مے خانے کو ہم
طاق ابرو میں صنم کے کیا خدائی رہ گئی — اب تو پوجیں گے اسی کافر کے بت خانے کو ہم
باغ میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل — اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

کیا ہوئی تقصیر ہم سے، تو بتا دے اے نظیر
تاکہ شادیٔ مرگ سمجھیں ایسے مر جانے کو ہم

کبھی دیکھوں نہ سنبل باغ کو میں مجھے اس خم زلف دوتا کی قسم — نہ نگہ کروں عارض گل کی طرف مجھے اس رخ مہر وفا کی قسم
یوں بکھرے ہے چمن کی فضا میں صبا وہ ہزار طرح سے ہو نافہ کشا — مرے دل کو نہ ہو کبھی اس کی ہوا مجھے کوئے صنم کی ہوا کی قسم
جو نہیں آیا ادھر کو وہ چشم سیہ، وہیں لے گیا دل کو بسیر نگہ — رہی عقل و خرد کو نہ جی میں جگہ مجھے اس بت ہوش ربا کی قسم
بدن اس کا ہے روکش برگ سمن، کہ بر میں جو آوے وہ رشک چمن — کھلے غنچہ سا دل مرا گل کے تن مجھے اس کھلے بند قبا کی قسم
ترے عشق نے دل میں درد دیا، تو کچھ اس سے مزہ میں ایسا لیا — نہ کروں نہ کروں گا میں دوا، میں نے کھائی ہے اب تو دوا کی قسم
لگی مہندی جو ہاتھوں میں اس کے میاں، تو وہ سرخی کچھ ایسی ہے لالہ نشاں — وہ شفق جو کہ صبح کو ہووے عیاں سو وہ دکھائی ہے اس کی حنا کی قسم

میں نے دیکھا نظیر جو اس کے تئیں، تو وہ شرم و حیا سے ہو سرد قریں
لئے نیچی نگاہوں سے جان دل و دیں، میں کہوں کیا، اب اس کی حیا کی قسم

ہوں تیرے تصور میں مری جاں ہمہ تن چشم — دل ہے مرا جوں آئینہ حیراں ہمہ تن چشم
تا ایک نظر دیکھے تجھے اے مہ تاباں — رہتا ہے سدا مہر درخشاں ہمہ تن چشم
آنکھوں کو ملے تا کہ ترے پاؤں کے نیچے — ہر نقش قدم سے ہے بیاباں ہمہ تن چشم
دیوانگی میری کے تحیر میں شب و روز — ہے حلقۂ زنجیر سے زنداں ہمہ تن چشم

اس آئینہ رو کے ہے تصور میں نظیر اب
حیرت زدہ نظارہ، پریشاں ہمہ تن چشم

نہ میں دل کو اب ہر مکاں بیچتا ہوں — کوئی خوب رو لے تو ہاں بیچتا ہوں
وہ مے جس کو سب بیچتے ہیں چھپا کر — میں اس مے کو یارو عیاں بیچتا ہوں
یہ دل جس کو کہتے ہیں عرش الٰہی — سو اس دل کو یارو میں یہاں بیچتا ہوں
ذرا میری ہمت تو دیکھو عزیزو — کہاں کی ہے جنس اور کہاں بیچتا ہوں
لئے ہاتھ پر دل کو پھرتا ہوں یارو — کوئی مول لیوے تو ہاں بیچتا ہوں
وہ کہتا ہے جی کوئی بیچے تو ہم لیں — تو کہتا ہوں لو ہاں میاں بیچتا ہوں
میں ایک اپنے یوسف کی خاطر عزیزو — یہ ہستی کا سب کارواں بیچتا ہوں
جو پورا خریدار پاؤں تو یارو — میں یہ سب زمین و زماں بیچتا ہوں
زمیں آسماں عرش کرسی بھی کیا ہے — کوئی لے تو میں لامکاں بیچتا ہوں
جسے مول لینا ہو لے لے خوشی سے — میں اس وقت دونوں جہاں بیچتا ہوں
بکی جنس خالی دوکاں رہ گئی ہے — سو اب اس دوکاں کو بھی ہاں بیچتا ہوں

محبت کے بازار میں اے نظیر اب
میں عاجز غریب اپنی جاں بیچتا ہوں

جان کر ہم سے نہ پوچھو کہ تم عاشق ہو بہ جاں — ہم تو عاشق ہی تمھارے ہیں عیاں راچہ بیاں
دو بدو اس بت سرکش سے نہ ہونا اے دل — مژہ و ابرو کی طیار ہے وہاں تیر و کماں

جب یہ کہتے ہیں کہ ہم دل سے تمھیں چاہتے ہیں
دیکھ کر ہم کو تعجب سے یہ کہتا ہے کہ ہاں

نہ دیویں ہم تو دل اپنا کبھی بتوں کے تئیں | پر ان کے حسن کے آگے کچھ اختیار نہیں
جنھیں ہو دل کے ستانے کی خو وہ دل لے کر | اگر جفا نہ کریں تو کب ان کو ہو تسکیں
کہاں تلک نہ پھنسے آن کر وہ طائر دل | بچھا دے جس کے لئے دام کاکل مشکیں
نظیر ایک دن اُس تند خو سے میں نے کہا | یہ فارسی میں کہ اے مہ عذار مہر جبیں
چہ کردہ ام کہ نگاہے بہ حال من نہ کنی | چہ گفتہ ام کہ نگوئی دمے بیا بنشیں
بہ جز جفا و تعدی نمی کنی بر من | نظر عتاب قریں داری و جبیں پُر چیں

دلم برائے ہمیں بردۂ کہ ظلم کنی
شنید و گفت بلے بردہ ام برائے ہمیں

چاہت کے اب افشا کن اسرار تو ہم ہیں | کیوں دل سے جھگڑتے ہو گنہگار تو ہم ہیں
رو آئینے کو دیتے ہو بہر عکس ہمارے | آئینہ رُخو طالب دیدار تو ہم ہیں
گلشن میں عبث جاتے ہو کر حُسن کی تزئین | اس جنس دل آرا کے خریدار تو ہم ہیں
کیا کبک کو دکھلاتے ہو انداز خرام آہ | حسرت زدۂ شوخیٔ رفتار تو ہم ہیں
کی چشم سوئے نرگس بیمار تو پھر کیا | اس عین عنایت کے سزاوار تو ہم ہیں
دل دے کے دل آزار کو کیا شکوۂ بیداد | گر سوچئے اپنے لئے آزار تو ہم ہیں

جس دن سے پھنسے دیکھی نہ پھر شکل رہائی
کیا کہیے نظیر ایسے گرفتار تو ہم ہیں

کہیں بیٹھنے دے دل اب مجھے جو اس ٹک کہیں بچا کروں | نہیں تاب مجھ میں کہ جب تلک تو پھرے تو میں بھی پھرا کروں
تو ہزار مجھ کو ستائے پر تری چاہ مجھ سے نہ چھوٹے گی | مرے دل کی بھی ہے یہی خوشی تو جفا کرے میں وفا کروں
کبھی اس کے کوچے میں جا ملی جو یہ کام دل گھڑی دو گھڑی | تو ہیں یاد مجھ کو وہ مکر و فن کہیں اس سے دل میں بھی جا کروں

جو نگہ سے چاہ کی دیکھوں ٹک تو چڑھا کے تیوری یہ کہتا ہے   تری اس نگہ کی سزا ہے یہ کہ لب اب میں تجھ سے چھپا کروں
جو میں بوسہ میں نے طلب کیا تو کہا کہ تجھے تو نہیں ہے ڈر   مجھے خوف ہے کہ مبادا اگر کوئی دیکھ لے تو میں کیا کروں
مجھے مدتوں سے ہے دردِ دل، جو کہا کچھ اس کا علاج کر   تو کہا کہ اس کی دوا یہ ہے تو کہا کرے میں سنا کروں
کوئی بولا تم نے نظیر کو نہ جھڑک دیا تو کہا میاں
دل و جاں سے مجھ پہ وہ ہے فدا اسے کس طرح سے خفا کروں

عبث چمن میں نہیں گل عذار آتے ہیں   گلوں کو اپنی دکھانے بہار آتے ہیں
گھڑی گھڑی ہیں دیکھ اپنے در پہ کہتا ہے   یہ کون ہیں جو ادھر بار بار آتے ہیں
قرار لینے کو جاتے ہیں ہم جب اس کے پاس   زیادہ اور بھی ہو بے قرار آتے ہیں
جو سادی وضع میں کل لے گئے تھے ہوش اور دل   سنا ہے آج وہ کر کر سنگار آتے ہیں
گئے تھے ملنے کو شاید جھڑک دیا اس نے
میاں نظیر تو کچھ شرمسار آتے ہیں

مجھ پہ ابرو کی تو نہ کھینچ کماں   او میں تیری کمان کے قرباں
داد تیرے بھی حسن کی دیتا   آج ہوتا اگر مہ کنعاں
ٹھنڈی آہیں جگر سے نکلیں ہیں   اشک بھی متصل ہیں قطرہ زناں
دم غنیمت ہے پھر کہاں اے دل   یہ ہوا سرد اور یہ آب رواں
بوسہ لیجے جو ہو سکے دست و کمر   قطعہ اتنی ہم میں کہاں ہے تاب و تواں
وہ دہن اور کہاں لب اپنے نظیر
وہ کمر اور کہاں یہ ہاتھ میاں

تو کہتا ہے میں آؤں گا دو چار گھڑی میں   مر جائے گا ظالم ترا بیمار گھڑی میں

جس کام کو برسات میں لگتے ہیں مہینے — وہ کرتے ہیں یہ دیدۂ خونبار گھڑی میں
میں تجھ کو نہ کہتا تھا نظیر اس سے نہ ملنا
اب دیکھو حال اپنا تو ایک چار گھڑی میں

نہ دن کو چین نہ راتوں کو خواب آنکھوں میں — بھرا رہے ہے ترے غم سے آب آنکھوں میں
جدھر وہ دیکھیے اُدھر صف کی صف الٹ دے ہے — بھری ہے شوخ کی ایسی شراب آنکھوں میں
تمھارے ہم تو قدیمی غلام بندے ہیں — تمھیں نہ چاہیے ہم سے حجاب آنکھوں میں
ٹھکانہ اشک نہ نیند آئی نہ پلک جھپکی — بسا ہے جب سے وہ خانہ خراب آنکھوں میں
قسم ہے چشم گلابی کی تیری اسے گل رو — کہ یہاں کھنچے ہے پڑا بت گلاب آنکھوں میں
خدا کی بات جنھیں بات بھی نہ آتی تھی — وہ اب کریں ہیں سوال و جواب آنکھوں میں
شتابی آن کے مجبو چند ریاں رنگ لو
نظیر لایا ہے بھر کر شہاب آنکھوں میں

مرتے ہیں ہم تو جان تو اب جان یا نہ جان — باقی ہے کوئی آن تو اب جان یا نہ جان
تیری تغافلوں کی جفا سے ترس ترس — جی دیں گے ہم ندان تو اب جان یا نہ جان
مجنوں کے جو نشان تھے سو اب تجھ میں اے نظیر
ہیں سب وہی نشان تو اب جان یا نہ جان

وہ بے نشاں دہن رخ خورشید تاب میں — ذرہ سما گیا ہے دل آفتاب میں
مردے کو ٹھوکروں میں جلا دیتے ہوں جہاں — وہاں حضرت مسیح ہیں پھر کس حساب میں
ہر زخم پر ہے آہ کے بدلے صدائے واہ — کیا پُردلی ہے اس دل خانہ خراب میں
لگتے ہی آنکھ شب کو نظر آ گئی وہ شکل — پائی یہ ہم نے دولت بیدار خواب میں

آبھی تو دل کو لے گئے آپ ہی ہیں پوچھتے — کہئے میاں نظیر ہیں کس اضطراب میں
قدرت کہاں جو اس سے کہوں میں یہ بات آہ
صاحب تمھیں تو ڈال گئے ہو عذاب میں

ہم میں بھی اور انھوں میں پہلے جو یاریاں تھیں — دونوں دلوں میں کیا کیا امیدواریاں تھیں
وہ منتظر کہ آ دیں ہم پرستش کہ جاویں — اس ڈھب کی ہر دو جانب بے اختیاریاں تھیں
نہ ضبط ہے نگہ کا نہ رک سکے نظارہ — کیا شوق ورزیاں تھیں کیا بیقراریاں تھیں
اُٹھنے میں بیٹھنے میں، ہنسنے میں بولنے میں — کچھ بے شعوریاں تھیں کچھ ہوشیاریاں تھیں
جس جا نظیر آ کر ہوتی ہیں الفتیں تو
واں ایسی ایسی کتنی عشرت شعاریاں تھیں

لطف جو چاہت کے ہیں سو وہ جتانے نہیں — چاہ چھپی چاہیے تا کوئی جانے نہیں
گنج محبت عبث کیجئے برباد کیوں — یہ تو بڑا نقد ہے آنے دو آنے نہیں
نکلیں ہیں جو اشک آہ دل ہی میں وہیں رو کئے — دیدہ و لب کو مزے اُن کے چکھانے نہیں
خواب میں آ کر کوئی پوچھے کہ عاشق ہو تم — واں بھی تعشق کے راز اس کو بتانے نہیں
تھا جو نظیر اس کو ایک شخص نے آ کر کہا — پڑھیئے کچھ اپنا سخن کیجئے بہانے نہیں
جب نہ پڑھا کچھ تو پھر اس نے خفا ہو کہا — کیا تمھیں شعر اپنے آہ ہم کو سنانے نہیں
سنتے ہی اس بات کے بھر کے دم سرد آہ
کہنے لگا کیا پڑھیں، دل تو ٹھکانے نہیں

قتل پر باندھ چکا وہ بت گمراہ میاں — دیکھیں اب کس کی طرف ہوتے ہیں اللہ میاں
نزع میں چشم کو دیدار سے محروم نہ رکھ — ورنہ تا حشر یہ دیکھیں گی تری راہ میاں

تو جدھر چاہے اُدھر جا کہ سحر سے تا شام
میں بھی سائے کی طرح ہوں ترے ہمراہ میاں

ہم تری چاہ سے چاہیں گے اُسے بھی دل سے
جس کو جی چاہے لگے شوق سے تو چاہ میاں

لیکن اتنا ہے کہ اس چاہ میں دریا ہیں کئی
ایسے ایسے کئی ہیں جن کی نہیں تھاہ میاں

آگے مختار ہو تم ہم جو تمھیں چاہے ہیں
اس سبب سے تمھیں ہم کرتے ہیں آگاہ میاں

جب دم نزع نہ آیا وہ ستمگر تو نظیر
مر گیا کہہ کے یہ حسرت زدہ اے واہ میاں

دل ٹھرا ایک تبسم پہ کچھ اور بہا اے جان نہیں
گر ہنس دیجئے اور لے لیجے تو فائدہ ہے نقصان نہیں

یہ ناز ہے یا استغنا ہے یا طرز تغافل ہے یارو
جو لاکھ کوئی تڑپے سسکے فریاد کرے کچھ دھیان نہیں

جب سنتا ہے احوال مرا یوں کہتا ہے عیاری سے
ہے کون وہ اس سے ہم کو تو کچھ جان نہیں پہچان نہیں

کچھ بن نہیں آتا کیا کیجے کس طور سے ملیے اے ہمدم
وہ دیکھ ہمیں رک جاتا ہے اور ہم کو چین اک آن نہیں

تر دیکھ کے میری آنکھوں کو یہ بات سناتا ہے ہنس کر
ہیں کہتے جس کو چاہ میاں وہ مشکل ہے آسان نہیں

دل پھنس کر اس کی زلفوں میں تدبیر رہائی کی مت کر
کب چھوٹے اس کے دام سے تو وہ دانا ہے نادان نہیں

زنہار نہ رکھیو دل میں نظیر اس لب سے توقع بوسے کی
گر بھولے سے بھی یار تجھے دشنام وہ دے امکان نہیں

کر گئی ہے اس کی مژگاں کی جھپک بے کل ہمیں
کل اگر چاہے تو ہمدم اس گھڑی کچھ کل ہمیں

کچھ تو جاتی دل سے خار بیقراری کی خلش
کاش وہ نوک مژہ دیتی قرار اک پل ہمیں

وہ کف پا ہم نے سہلائی ہے نازک نرم نرم
کیا جتاتی ہے تو اپنی نرمی اے مخمل ہمیں

اس پری رو کی گلی میں یا نہاں یا آشکار
جس طرح سے ہو سکے آ ہمنشیں لے چل ہمیں

ہم تو ہوں کیفی ترے پر کیا کریں اے چشم یار
ہوش میں آنے نہیں دیتا ترا کاجل ہمیں

دل خمِ ابرو کو دیتے ہیں تو کس کس پیچ سے
دام میں لیتا ہے اس کاکُل کا اِک اِک بل ہمیں

ہم تو اس کے چاہنے والے ہیں مُدّت سے نظیرؔ
اور نیا کہتا ہے اب تک وہ صنم چنچل ہمیں

کہتے ہیں یاں کہ مجھ سا کوئی مہ جبیں نہیں
پیارے جو ہم سے پوچھو تو یاں کیا کہیں نہیں

ساقی کو جام دینے میں اُس خوش نگہ کو آہ
ہر دم اشارتیں ہیں کہ اس کے تئیں نہیں

پوچھے ہے اس سے جب کوئی قتلِ نظیرؔ کو
کہتا ہے ہم نے مارا ہے؟ ہاں ہاں نہیں نہیں

وہ چاندنی میں جو ٹک سیر کو نکلتے ہیں
تو مہ کے طشت میں گھی کے چراغ جلتے ہیں

چراغِ صبح یہ کہتا ہے آفتاب کو دیکھ
یہ بزم تم کو مبارک ہو ہم تو چلتے ہیں

فدا جو دل سے ہیں یاں شوخ سبز رنگوں پر
یہ کافران کی بھی چھاتی پہ مونگ دلتے ہیں

ہوا ہوں خشک میں یہاں تک کہ حضرتِ مجنوں
یہ مجھ سے کہتے ہیں اور اپنے ہاتھ ملتے ہیں

کوئی تو پگڑی بدلتا ہے یار سے، لیکن
میاں نظیرؔ ہم اب تم سے تن بدلتے ہیں

عیش کر خوباں میں اے دل شادمانی پھر کہاں
شادمانی گر ہوئی تو زندگانی پھر کہاں

جس قدر پینا ہو پی لے پانی ان کے ہاتھ سے
آبِ جنت تو بہت ہوگا یہ پانی پھر کہاں

لذتیں جنت کے میوے کی بہت ہوں گی وہاں
پر یہ میٹھی گالیاں خوباں کی کھانی پھر کہاں

واں تو ہاں حوروں کے گہنے کے بہت ہوں گے نشاں
ان پریزادوں کے چھلوں کی نشانی پھر کہاں

الفت و مہر و محبت سب ہیں جیتے جی کے ساتھ
مہرباں ہی اٹھ گئے جب مہربانی پھر کہاں

واعظ و ناصح بکیں تو ان کے کہنے کو نہ مان
دم غنیمت ہے میاں یہ نوجوانی پھر کہاں

جا پڑے چپ ہو کے جب شہر خموشاں میں نظیر
یہ غزل، یہ ریختہ، یہ شعر خوانی پھر کہاں

صفائی اس کی جھلکتی ہے گورے سینے میں — چمک کہاں ہے، یہ الماس کے نگینے میں
نہ توئی ہے، نہ کناری، نہ گوکھرو، ریش پر — سجی ہے شوخ نے انگیا بنت کی سینے میں
جو پوچھا میں کہ کہاں تھی تو ہنس کے یوں بولی — میں لگ رہی تھی اس انگیا موئی کے سینے میں
پڑا جو ہاتھ مرا سینے پر تو ہاتھ جھٹک — پکاری آگ لگے آہ، اس قرینے میں
جو ایسا ہی ہے تو اب ہم نہ روز آویں گے — کبھو جو آئے تو ہفتے میں یا مہینے میں
کبھو مٹک، کبھو بس بس، کبھو پیالہ پٹک — دماغ کرتی تھی کیا کیا شراب پینے میں
چڑھی جو دوڑ کے کوٹھے پہ وہ پری اک بار — تو میں نے جا لیا اس کو ادھر کے زینے میں
وہ اٹھتی چھاتیاں دکھا اپنی کہتی ہے ہے ہے — یہ کیا بلا ہے کہ اٹھتی ہے میرے سینے میں
وہ پہنا کرتی تھی انگیا جو سرخ لاہی کی — لپٹ کے تن سے وہ تر ہو گئی پسینے میں

یہ سرخ انگیا جو دیکھی ہے اس پری کی نظیر
مجھے تو آگ سی کچھ لگ رہی ہے سینے میں

بت سے جان میری تو میں سربدست ہوں — اے یار میں تو کشتۂ روز الست ہوں
اک دم کی زندگی کے لئے مت اٹھا مجھے — اے بے خبر میں نقش زمیں کی نشست ہوں
تو مست کر شراب سے اے گل بدن مجھے — ظالم میں تیری چشم گلابی سے مست ہوں
دیوانہ از طریق مجھ کو سمجھ نہ زاہدا — گر تو خدا پرست ہے میں بت پرست ہوں

ان سنگ دل بتوں کا گلہ کیا کروں نظیر
میں آپ اپنے شیشۂ دل کی شکست ہوں

تفرقہ ہوتا ہے ایسا بھی گل اندام کہیں
مے کہیں شیشہ کہیں ساقی کہیں جام کہیں

دل کی بیتابی نہیں ٹھہرنے دیتی ہے مجھے
دن کہیں، رات کہیں، صبح کہیں شام کہیں

ایک دل دیجیے کس کس کو سبھی مانگتے ہیں
بُندے بالے کہیں اور زلفِ سیہ فام کہیں

نامہ بر نامہ لکھوں یا میں زبانی کہہ دوں
خط کے پُرزے سے یہ لکھوں قاصد نا کام کہیں

دل بھی اور جان بھی، دی سب نے اُسی پر ہے نظیر
گل کہیں غنچہ کہیں، بلبل بدنام کہیں

چمن میں جب سے لباس غنچہ لب نے کھولے ہیں
گلوں کے بہلو میں غنچے نہیں بھبولے ہیں

یہ مہر و مہ جو نشیب و فراز ہیں گرداں
تمہارے باغ میں ایسے کئی ہنڈولے ہیں

ہمارے قطرۂ اشک اس کی سرد مہری سے
کسی زمانے میں موتی تھے اب تو اولے ہیں

تمہارے خندۂ دنداں نما کی دولت سے
صدف تو کیا ہے کہ نیساں نے موتی رولے ہیں

غلط ہے یہ جو مرے گھر وہ بھول کر آویں
ادھر جو بھول پڑیں کیا وہ ایسے بھولے ہیں

تُلا نہ حسن تمہارا وگرنہ میزاں نے
فلک کی شمس و قمر لاکھ بار تولے ہیں

وہ سنگ دل جو نہ بولا تو کیا تعجب ہے
میاں نظیر کہیں بت بھی منہ سے بولے ہیں

طلعت یوسف صباحت میں ہے لاثانی شلے
یہ نمک یہ خال و خط یہ زلف یہ ابرو کہاں

کس طرح سنبل ہوا ان زلفوں سے آکر سبر
یہ لٹک یہ بل یہ پیچ و تاب یہ خوشبو کہاں

جب کہ الٹی ہم نے تکرار نظر پر آستیں
کھینچ لی اس نے رخ رشک قمر پر آستیں

اسی پری رو کے دِوانے کی یہ ہے شکلِ لباس
تار دامن خار پر، شاخِ شجر پر آستیں

یہ جن دی بہاراں جن دہلی آندھیاں ہیں — کہ کہ طرح جگر وچ دھوہاں مچاندیاں ہیں
کوئی نہ دیکھدا ہے، دیکھو ادھر تو پیارے — تم بن ہماری انکھیاں آنجھو بہاندیاں ہیں

طوفاں اٹھا رہا ہے مرے دل میں سیل اشک — وہ دن خدا نہ لائے جو میں آب دیدہ ہوں

صبح جب بول اٹھا مرغ سحر ککڑوں ککڑوں — اُٹھ گئے پاس سے وہ رہ گئے ہم ٹٹڑوں ٹوں

مبتلا ایسے ہی خوش وضعوں کے ہوتے ہیں نظیر — بے قرار و دل فگار و خستہ حال و بے وطن

آپڑے ہیں اب تو کوئے یار میں ہم شاد ہو — دیکھیں اس اُفتاد کی آگے کو کیا اُفتاد ہو
ہے چمن میں اپنی رعنائی سے پابند غرور — گر وہ قد دیکھے تو سرو اس قید سے آزاد ہو
ایک بت بیداد گر سے ہم نے باعجز و نیاز — یوں کہا کچھ ہم کہیں خدمت میں گر ارشاد ہو
سن کے فرمایا کہو، جب ہم نے یوں اس سے کہا — دل کو ہم اس شرط سے دیں گر نہ کچھ بیداد ہو
سوچ کر اس نے کہا ہم عہد تو کر لیں دلے — اور جو وقت جور وہ پیماں نہ ہم کو یاد ہو
پھر یہ کہئے کیا کروگے جب تعدی و جفا — جو معین ہے وہ سب ہو بلکہ کچھ ایجاد ہو
عافیت کی گر ہوا خواہی تمھیں ہے تو نظیر
تم ہوا میں ہم سے بے دردوں کی مت برباد ہو

ہمدم چھپا دے واں کوئی کیا دل کی چاہ کو — شاہد جہاں سمجھتے ہیں پہلی نگاہ کو
دکھلا حنائی دست لیا جھپ سے چھین دل — کیا دست رس ہے دیکھئے اس دستگاہ کو

بیٹھا جو چاندنی میں تو رُخ کی جھلک دکھا — خجلت تھی کون سی کہ نہ دی روئے ماہ کو
ناصح تو راست کہتا ہے لیکن وہ کیا کرے — دے بیٹھے اپنا دل جو کسی کج کلاہ کو
جھڑکی سے اُس نے ہم کو خفا دیکھ کر کہا — کیا ناپسند گنتے ہو اس رسم و راہ کو
جانتے ہیں جھڑکیوں میں ہماری وہ لذتیں — جو چاہ میں سمجھتے ہیں بہتر نگاہ کو

گر عار ہے کچھ اس میں تمھیں تو میاں نظیر
لے جاؤ اپنے اس دل عزت پناہ کو

جھڑکے بھی نہ الفت سے جو ایذا کوئی ہو — تو ناز کا حسرت زدہ کیا شاد کوئی ہو
مشاطہ ذرا بہر خدا حُسن کی اُس کے — اتنی نہ ہوا باندھ جو برباد کوئی ہو
اے دل تو عبث اس سے نہ کر خواہش دشنام — دشنام تو وہ دے جو اسے یاد کوئی ہو
تخفیف جفا کا یہ سبب ہے کہ مبادا — شاید کہیں مجھ سا نہ پری زاد کوئی ہو
منظور ہوا دام میں جب دل کو پھنسانا — پھر وسوسہ کیا چاہیئے صیاد کوئی ہو
ڈر ہم کو بناوٹ کی اداؤں کا نہیں ہے — وہ آن غضب ہے جو خداداد کوئی ہو

بیداد بھی کرتا ہے بہت وہ تو نظیر آہ
البتہ جو شائستہ بیداد کوئی ہو

سرچشمۂ بقا سے ہرگز نہ آب لاؤ — حضرت خضر کہیں سے جا کر شراب لاؤ

رکھتی ہے جیسے ناز میں اس کی جبیں گرہ — اس لطف کی تو آہ نہ ہوگی کہیں گرہ
مُنہ دیکھتے ہی دور سے تیوری چڑھاتی ہو — پھر کہئے دل میں آپ کے کیونکر نہیں گرہ
غیروں کی تاب کیا جو رکھیں ہم سے کچھ مروڑ — بس جانا ہم نے رکھتے ہو ہا ہم سے تمھیں گرہ

دل میں چمن کے ہے تری حسرت کی گلجھڑی　　باور نہیں تو دیکھ یہ غنچہ نہیں گرہ
ہم سے تو نزع میں بھی نہ بولا وہ غنچہ لب　　اپنی کھلی نہ تا بہ دم واپسیں گرہ
چین جبیں عرق میں ہوئی اس صنم کی تر　　اے دل بس اب تو چل کہ یہ کھلنی نہیں گرہ
کوتہ نہ ہووے رشتۂ عمر آہ کس طرح　　جب غم میں اس کے آ کے پڑے ہر کہیں گرہ
مر کر بھی اپنا عقدۂ مشکل ہوا نہ وا　　سچ پوچھئے تو کہتے ہیں اس کے تئیں گرہ
الفت کا تار توڑ کے جوڑا تو کیا ہوا　　خوبی جبھی تلک ہے کہ جب تک نہیں گرہ
کانوں کے موتیوں کو ترے دیکھ رشک سے　　تنہا چمن میں دانۂ شبنم نہیں گرہ
وہ کیا کھلی کلی کے جگر میں ہے بے کلی　　کلیاں بھی کیا کہ پہونچی ہے تاروں تئیں گرہ

اس بحر میں نظیرؔ تو لکھ اور بھی غزل
زلف سخن میں چاہیے ہو ہر کہیں گرہ

یوں ہم سے اس کی رکھتی ہے زلف و جبیں گرہ　　پڑتی ہے جیسے پاس گرہ کے کہیں گرہ
ظاہر میں گو وہ تیوری چڑھاتا ہے ہم کو دیکھ　　لیکن ہزار شکر کہ دل میں نہیں گرہ
ڈوری کی یہ گرہ نہیں جو لے تو اس کو کھول　　ناصح ہے میرے اس کے تو اب ریشمیں گرہ
بھر عمر میرے دل کا یہ غنچہ کھلا نہ آہ　　ایسی فلک نے کس کے دی میرے تئیں گرہ
ملنے کے یاد رکھنے کو مدت کے بیچ آہ　　دے کر گیا ہے بند میں وہ نازنیں گرہ
بندھتا ہے جیسا دل کی محبت کا عقدہ　　ایسی جہاں میں کوئی نہیں دلنشیں گرہ
تم اپنے دل میں چاہیے جیسی رکھو مروڑ　　ورنہ ہمارے دل میں تو ہرگز نہیں گرہ
نافے میں مشک غم سے گرہ ہو کے مر گیا　　دیکھ اس پری کی زلف کی وہ عنبریں گرہ
اے شوخ تیرے سینے کے تکمے کے رشک سے　　دریا میں سوکھ کر ہوا دُرِ ثمیں گرہ

مدت میں کل تو زلف کے دل کی جبیں کی آہ
کھولی ہے ہم نے بیٹھ کے اے ہم نشیں گرہ

باقی رہی گرہ جو محبت کی غیر کی
وہ بھی نظیر کھولیں گے آخر ہمیں گرہ

بس کہ دل اس کا ہے مانوس خیال آئینہ
ہے وہ ملک حسن محروس خیال آئینہ

تھا وہ پشت بام پر عکس آرسی میں لیے ہم بھی
زور حکمت سے لیا بوس خیال آئینہ

تا ابد آزاد ہیں دام و قفس کے جور سے
بلبل تصویر و طاؤس خیال آئینہ

دل جفا سے اس کی آزردہ ہو سو ہوتا نہیں
بے خطر ہے زنگ سے روس خیال آئینہ

کل اسے آئینہ خانے میں جو تھی مشق خرام
تھا وہ صد جا ہم کو پابوس خیال آئینہ

صافیٔ دل کا لغت اس سے نہ پھر پنہاں رہے
یک نظر دیکھے جو قاموس خیال آئینہ

ہے اگر منظور سیر عالم حیرت نظیر
تو دل اپنا کر تو محبوس خیال آئینہ

رفتار سے دلوں کو کچلتے ہیں وہ جو آہ
اپنا یہ بد چلن دل انھیں کا ہے خاک راہ

سچ پوچھئے تو اس میں خطا دل کی کچھ نہیں
خوباں کی شوخیاں ہی بڑھاتی ہیں جی کی چاہ

دشنام میں یہ کچھ ہے حلاوت کہ دم بہ دم
ہوتے ہیں ہم اسی کے لیے مصدر گناہ

تیوری چڑھا کے دیکھیں ہیں جس دم عتاب سے
کس کس طرح کے لطف دکھاتی ہے وہ نگاہ

چٹکی میں دیر ہووے تو ہوتے ہیں ہم دیا
بے رحمی و لطافت فضل ناخن کے داد خواہ

کہنی کے التماس کا رہتا ہے جاں کو عزم
ٹھوکر کے اشتیاق میں پھرتا ہے دل تباہ

کہیے اگر کہ ہم ہیں تمہیں دل سے چاہتے
تو کہتے ہیں چہ خوش کوئی شاہد کوئی گواہ

گر چشم نم نے دی بھی گواہی تو کہتے ہیں
اے بے وقوف کس نے کہا تھا تو ہم کو چاہ

یہ کہہ کے جب جھڑکتے ہیں ہو کر خفا نظیر
وہ جھڑکیاں بھی ایسی ہی دل خواہ ہیں کہ واہ

زاہد و روضۂ رضواں سے کہو عشق اللہ / عاشقو کوچۂ جاناں سے کہو عشق اللہ
جس کی آنکھوں نے کیا بزم دو عالم کو خراب / کوئی اس فتنۂ دوراں سے کہو عشق اللہ
یارو دیکھو جو کہیں اس گل خنداں کا جمال / تو مرے دیدۂ گریاں سے کہو عشق اللہ
ہیں جو وہ کشتۂ شمشیر نگاہ قاتل / جا کے ان گنج شہیداں سے کہو عشق اللہ
آہ کے ساتھ مرے سینے سے نکلے ہے دھواں / اے بتاں مجھ دل بریاں سے کہو عشق اللہ
یاد میں اس کے رخ و زلف کی ہر آن نظیر
روز و شب سنبل و ریحاں سے کہو عشق اللہ

ہم سے تو آج بھی نہ ملا وہ نگار آہ / ہم عید کے بھی دن رہے امیدوار آہ
ملنا تو اک طرف ہے عزیزو کہ بھر نظر / پوشاک کی بھی ہم نے نہ دیکھی بہار آہ
تھی آس عید کی سو گئی وہ بھی دوستو / اب دیکھیں کیا کرے دل امیدوار آہ
ہر عید میں ہمیں تو سدا آس ہی رہی / کافر کبھی نہ ہم سے ہوا ہم کنار آہ
جس عید میں کہ یار سے ملنا نہ ہو نظیر
اس کے اپر تو حیف ہے اور صد ہزار آہ

صحن گلشن میں چلی پھر کے ہوا بسم اللہ / چشم بد دور بہار آئی ہے کیا بسم اللہ
مصحف رخ پہ ترے ابروئے پیوستہ نہیں / مو قلم سے ید قدرت نے لکھا بسم اللہ
اس قدر تھا وہ نشے میں کہ یکایک جو گرا / میں نہ بولا پہ مرے دل نے کہا بسم اللہ
زلف اس عارض رنگیں پہ بکھرنے جو لگی / بول اٹھی منہ سے وہیں باد صبا بسم اللہ

آج گلشن میں ذرا پاؤں جو پھیلا اُس کا
گل ہنسا، غنچے نے جلدی سے کہا بسم اللہ

یار قاتل میرے سے جو جو کہ لگاتا تھا وار
لب پہ ہر زخم کے نکلے تھی صدا بسم اللہ

شیشہ و ساقی و ساغر سبھی حاضر ہیں نظیر
مے کشی کیجئے اب دیر ہے کیا بسم اللہ

تری وہ شان کی رفعت ہے یا رسول اللہ
کہ لامکاں نے کہا لا الٰہ الا اللہ

وہ نورِ دیدۂ احمد کہ جس کے رتبے کی
حدیث بضعۃ منی ہے دو جہاں میں گواہ

غم نہیں گر دلبری سے دل کو لے جاتا ہے وہ
پاس میرے تب تو آتا ہے جو دل پاتا ہے وہ

تم سے ہم اے حسن کے سردار رخصت ہو چلے
مدتوں میں دیکھ کر دیدار رخصت ہو چلے

چاہتا تھا دل تو یوں رہتے تمہارے پاس ہم
پر فلک کے ہاتھ سے ناچار رخصت ہو چلے

آ گئے تھے سیر کرتے تم کو دیکھا خوش ہوئے
اب خدا حافظ ہے ہم اے یار رخصت ہو چلے

پھر بھی آ جاویں گے ایدھر کو اگر جیتے رہے
اب تو رہنا ہے یہاں دشوار رخصت ہو چلے

کیوں نہ لالہ کی طرح دل ہو ہمارا داغدار
کس مزے میں چھوڑ کر گلزار رخصت ہو چلے

گل رخوں کی بزم میں کیا بیٹھتے ہو اے نظیر
تم بھی رخصت ہو کہ اب سب یار رخصت ہو چلے

منہ سے برقع نہ اٹھے صاحب من یاد رہے
پھر قیامت ہی عیاں ہے یہ سخن یاد رہے

مر بھی جاویں گے تو جز پیرہن عریانی
آپ سے ہم نہیں لینے کے کفن یاد رہے

اب تو ہے ناز پہ ٹھکرا کے سروں کو چلنا
لیکن آخر نہیں اچھا یہ چلن یاد رہے

سو چمن ایک فقط اس کے ہیں ٹکڑے میں نظیر
جب یہ صورت ہو تو پھر کس کو چمن یاد رہے

تن دیکھ کے جس گل کا جان چھوڑ کے تن نکلے
وہ سیم تن اس تن سے کس طرح نہ تن نکلے
ہیں خالِ سیہ کاکل یا ڈالیاں سنبل کی
چرنے کے لئے شب کو آہوئے ختن نکلے
ہم درجِ گہر اپنے سینے میں سمجھتے تھے
جب رو دئے تو آنکھوں سے کل لعل یمن نکلے
آنے کی قسم کھا کر پھر منہ بھی نہ دکھلایا
سادہ جنھیں سمجھے تھے سو ان میں یہ فن نکلے
اب رو دیجے الفت کو یا پھوٹ گئے قسمت کو
جو قول کے پورے تھے وہ عہد شکن نکلے

تھا میں جو نظیر اس کے دنداں کے تصور میں
جب منہ سے مرے ایسے موتی سے سخن نکلے

نہ سرخی غنچۂ گل میں ترے دہن کی سی
نہ یاسمن میں صفائی ترے بدن کی سی
میں کیوں نہ پھولوں کہ اس گل بدن کے آنے سے
بہار آج مرے گھر میں ہے چمن کی سی
یہ برق ابر میں دیکھے سے یاد آتی ہے
جھلک کسی کے دوپٹے میں نورتن کی سی
گلوں کے رنگ کو کیا دیکھتے ہو اے خوباں
یہ رنگتیں ہیں تمھارے ہی پیرہن کی سی
جو دل تھا وصل میں آباد تیرے ہجر میں آہ
بنی ہے شکل اب اس کی اجاڑ بن کی سی
تو اپنے تن کو نہ دے نسترن سے اب تشبیہ
بھلا تو دیکھ یہ نرمی ہے تیرے تن کی سی
ترا جو پاؤں کا تلوا ہے نرم مخمل سا
صفائی اس میں ہے کہنے کو نسترن کی سی

نظیر ایک غزل اس زمین میں اور بھی لکھ
کہ اب تو کم ہے روانی ترے سخن کی سی

نہیں ہوا میں یہ بو نافۂ ختن کی سی
لپٹ ہے یہ تو کسی زلف پر شکن کی سی

میں ہنس کے اس لئے منہ چومتا ہوں غنچے کا — کہ کچھ نشانی ہے اس میں ترے دہن کی سی
خدا کے واسطے گل کو نہ میرے ہاتھ سے لو — مجھے تو آتی ہے اس میں کسی بدن کی سی
ہزار تن کے چلیں بانکے خوب رو لیکن — کسی میں آن نہیں تیرے بانکپن کی سی
مجھے تو اس پہ نہایت ہی رشک آتا ہے — کہ جس کے ہاتھ نے پوشاک تیرے تن کی سی
کہا جو تم نے کہ منہ کا ڈھلا تو آؤں گا — ہے بات کچھ نہ کچھ اس میں بھی مکر و فن کی سی
وگرنہ سچ ہے تو اے جان اتنی مدت میں — یہی بس ایک کہی تم نے میرے من کی سی
وہ دیکھ شیخ کو لاحول پڑھ کے کہتا ہے — یہ آئے دیکھیے ڈاڑھی لگا کے سن کی سی

کہاں تو اور کہاں وصل اس پری کا نظیر
میاں تو چھوڑ یہ باتیں دوانہ پن کی سی

درج غم میں چشم نے گوہر اگل کر بھر دئے — اشک نے جنگل کے جنگل دم میں ڈھل کر بھر دئے
جلوہ گر محفل میں رات اس حسن کے شعلے کو دیکھ — شمعداں شمعوں نے اپنے سب پگھل کر بھر دئے
کل جو ٹک رویا کسی کو یاد کر وہ گل بدن — اشک سے آنکھوں میں یا موتی مچل کر بھر دئے
جام کم بھرنے میں ساقی کو ذرا چھیڑا جو میں — اس نے ایک دو چار ساغر مجھ کو جل کر بھر دئے
ذبح کرتا تھا جو قاتل مجھ تپش آلودہ کو — خون میں سب دامن کے پاٹ اس کے اچھل کر بھر دئے
زخم شانے کے تری زلفوں نے اے وعدہ خلاف — آخرش لیت و لعل سے آج کل کر بھر دئے
کہتے ہیں اے باغباں جتنے کہ خالی تھے چمن — جوش گل نے اب کے سب وہ پھول پھل کر بھر دئے

اب ترے رونے کا عالم حد سے گزرا ہے نظیر
اشک نے تیرے تو سب جل تھل اگل کر بھر دئے

ہنسے روئے پھر سے رسوا ہوئے بھاگے بندھے چھوٹے — غرض ہم نے بھی کیا کیا کچھ محبت کے مزے لوٹے

کلیجے میں پھپھولے دل میں داغ اور گلے میں ہاتھوں کے
کھلے ہیں دیکھئے ہم میں بھی الفت کے یہ گل بوٹے

تفاوت کچھ نہیں گلچیں میں اور بے درد خوباں میں
جو اس کے ہاتھ گل ٹوٹے تو ان کے ہاتھ دل ٹوٹے

ہزاروں گالیاں دیں پھر ذرا ہنس کر ادھر دیکھا
بھلا اتنی تسلی سے پھپھولے دل کے کب پھوٹے

کھلتے ہو سب مجھے تم اب یہ مانگوں ہوں دعا دل میں
کوئی دلبر مرے آگے تمھیں بھی خوب سا کوٹے

زباں کی کر کے مقراض اور بنا دشنام کا کاغذ
ہمارے حق میں کیا کیا آپ نے کترے ہیں گل بوٹے

یہ کہتے ہیں کہ عاشق چھوٹ جاتا ہے اذیت سے
جب اس کی عمر کو لشکر اجل کا آن کر لوٹے

ہماری روح تو پھرتی ہے معشوقوں کی گلیوں میں
نظیر اب ہم تو مر کر بھی نہ اس جنجال سے چھوٹے

خوشی دوچند تمھیں سیر ماہتاب میں ہے
جلو میں چاہنے والے قمر رکاب میں ہے

ملا ہے اس لب میگوں کے ساتھ خال اے دل
فقط یہی نہیں افیوں بھی اس شراب میں ہے

وہ جلوہ گر ہو تو رہتی ہے جان وگرنہ آج
دل نظارہ طلب سخت اضطراب میں ہے

لیا ہے ہم سے دل اب دین بھی ہو طلب کرتے ق
دل اس تقاضے سے اپنا تو پیچ و تاب میں ہے

کہا کہ دفتر حسن پری رخوں کا نظیر
تمھیں خبر نہیں یہ بھی اسی حساب میں ہے

نہیں آئے کل سے جو تم ادھر اسے کیا خیال میں لائیے
جو کچھ عذر ہو تو بیان کرو نہیں جیسے آئے تھے آئیے

کہا جب کہ ہم سے بھی بولئے تو بنا کے منہ کہا غیر سے
یہ سخن ہے سچ کہ ہر ایک کو بہت اپنے منہ نہ لگائیے

لگے جب بچھانے بساط ہم گلی اس کی میں تو کہا میاں
یہ جو دام یہاں ہو بچھاتے ہو اسے جلد یہاں سے اٹھائیے

وہ نگار گل رخ و غنچہ لب جو گلے سے آ کے لگے تو پھر
یہ شگفتگی ہو بہ رنگ گل کہ نہ پھولے دل میں سمائیے

یہ وہ ہاتھ ہیں کہ ستم کریں یہ بہار ان کی عجب ہو جب
کڑے ان میں سونے کے ڈالئے حنا ان میں خوب رچائیے

جو کہا تھا تم نے کہ بزم میں تمھیں پاس اپنے بٹھائیں گے — نہیں لائق اس کے تو ہم مگر جو کہا تو کر بھی دکھائیے
جو ہیں آتے دیکھا نظیر کو طرف اپنے ہنس کے کہا کہ ہاں
تمھیں لائی اپنی کشش ادھر، اجی آئیے اجی آئیے

دل اس کی زلف میں پھنس کر یہ خوش دلی تو لے — کہ جب صبا سے ہلے وہ تو اس میں تو جھولے
لگا ہے اس کو بہت وقت بھی ابھی اے دل — میں اس کے چوم لوں منہ کو تو زلف کو چھو لے
جو دو بدو ہو دل اس کے تو کیونکہ ہو جاں بر — بچے جو تیر نگہ سے تو تیغ ابرو سے لے
ہے اس کی چشم سیہ وہ کہ دیکھ کر اس کو — مقام حلقۂ حیرت میں چشم آہو لے
ہنسی ہنسی میں دل اپنے کو مفت کھو بیٹھے
میاں نظیر بتوں کے تپاک پر بھولے

نہ دیں گے ہم تو دل اور تم ہو کہتے دو زبردستی — نہ صاحب ہم نہیں راضی اگر لے لو زبردستی
جو تم زور آوری کرتے ہو ہم سے دل لگانے میں — کسی نے دل لگایا ہے کہیں لوگو زبردستی
ہمیں کچھ مدعا ہوتا تو آپ ہی بیٹھتے اس جا — تمھیں کچھ ہے غرض جب تو بٹھاتے ہو زبردستی
بتاں دست حنا بستہ یہ کرتے ہیں جسے مائل — وہ جانے ہے کریں ہیں اس پہ یہ جو جو زبردستی
کہاں تک دل نہ دیوے وہ کہ ہم جس کے پاس آ جا — بنا کر حسن تم ہنس ہنس کے آ بیٹھو زبردستی
نہ ہوتے ہم تو مل کر تم سے بے بس اس قدر لیکن — کریں کیا جب تمھیں آپ ہی سے آ لپٹو زبردستی
جو محبوبوں سے دل مانگیں تو جھڑکیں اور بٹھا رکھیں — نہ دل دیویں نہ گھر جانے دیں یہ دیکھو زبردستی
کریں حجت تو کہتے ہیں خوشی سے کیا دیا تھا دل — ارے ناداں لیا ہے گا وہ ہم نے تو زبردستی
نظیر اب تو تمھارے بس میں ہے کچھ کہہ نہیں سکتا
کرو جو ہو سکے تم سے زبردستو، زبردستی

جو تم نے پوچھا تو حرف الفت بر آیا صاحب ہمارے لب سے
سو اس کو سن کر ہوئے خفا تم نہ کہتے تھے ہم اسی سبب سے

نہ دیتے ہم تو کبھی دل اپنا نہ ہوتے ہرگز خراب و رسوا
ولے کریں کیا کہ تم نے ہم کو دکھائیں جھلکیں عجب ہی چھب سے

وہ جعد مشکیں جو دن کو دیکھے تو یاد اس کی ہیں شام ہی سے
یہ پیچ و تاب آ کے دل سے الجھے کہ پھر سحر تک نہ سلجھے شب سے

لگائی فندق جو ہم نے اس کی کلائی پکڑی تو ہنس کے بولا
یہ انگلی پہنچے کی یہاں نہ ٹھہری بس آپ رہیے ذرا ادب سے

کہا تھا ہم کچھ کہیں گے تم سے کہا تو ایسا کہ ہم نہ سمجھے
سمجھتے کیونکر کہ اس نے لب سے سخن نکالا کچھ ایسے ڈھب سے

ہوس تو بوسے کی ہے نہایت پہ کیجیے کیا کہ بس نہیں ہے
جو دسترس ہو تو مثل ساغر لگا دیں لب کو ہم ان کے لب سے

کسی نے پوچھا نظیر کو بھی تمہاری محفل میں بار ہوگا
کہا کہ ہوگا وہ بولا کب سے کہا کبھو کا کبھی نہ اب سے

قدم پہ نقد دل اپنا رکھ دیں جو اس طرف بھی ہو جلوہ سازی
تمہیں تو پرواہ نہیں ولیکن ہماری اس میں ہے سرفرازی

مقابل اس چشم کے ہوں کیونکر کہ دیتی فرصت نہیں ہے پل بھر
ادھر نگاہوں کی ترکتازی ادھر کو مژگاں کی نیزہ بازی

جو حال دل کا کبھی ہیں کہتے تو وہ ہی باتیں ہے سن کے کہتا
بہ خوبی ہم تو سمجھتے اس کو جو تم نہ کہتے بہ این درازی

کہا یہ ایک شمع رو نے شب کو کہ ہم کو چاہو تو ہم یہ بولے
وہ دل کو تم سے لگا دے صاحب کہ جس کو لینی ہو دل گدازی

جو ایک دلبر سے دل چھڑایا تو دوسرے سے وہیں لگایا
نظیر ہم تو رہیں خوشی سے جو چین لینے دے عشق بازی

بوسۂ لب سے ہمیں جو خوش کیجیے
پھر ہمیں دل چاہے سو کہہ لیجیے

ہے تمہیں اے جان اگر سر کی قسم
آج تو ایک ساغرِ مے دیجیے

قابل محفل ہمیں سمجھو اگر
تو کبھی آنے ہمیں وہاں دیجیے

جیب تو پھاڑا مرا دلدار نے
فائدہ کیا ہے اسے جو سیجیے

صلح کو تم پاس آیا ہے نظیر

اور جو لڑنا ہے تو لڑ لیجیے

یوں نہ ہنس ہنس کے تم اغیار کے گل دستوں سے ۔۔۔ اتنی ضد بھی نہ کرو اپنے جگر خستوں سے
فندقیں بزم میں دیکھ اس کے سر انگشتوں کی ۔۔۔ رشتۂ ربط نے لی رہ کف گل دستوں سے
دو بہ دو ہو جو نہ چشمان بتاں کے لے دل ۔۔۔ ڈرتے رہنا ہی مناسب ہے سیہ مستوں سے
دست صیاد سے چھوٹے تو اچھل پے در پے ۔۔۔ ورنہ کیا فائدہ اے آہوئے دل جستوں سے
بیش جاتی نہیں ہرگز کوئی تدبیر نظیر
کام جب آن کے پڑتا ہے زبردستوں سے

جلد آؤ اگر تم کو مری خواہش خوں ہے ۔۔۔ کچھ دیر نہیں لگنے کی یہاں صید زبوں ہے
عشاق سے ملنے کی عبث پوچھو ہو ساعت ۔۔۔ جب دل ادھر آجاوے وہی نیک شگوں ہے
جب میں نے کہا تم مجھے پہچانتے ہو گے ۔۔۔ میں وہ ہوں کہ مدت سے جسے شوق دروں ہے
یہ سن کے نظیر اس نے کہا کہتا ہے کس سے ۔۔۔ ہیں یہ بھی کوئی زور تماشے کا فسوں ہے
ہم تیری تو صورت سے بھی واقف نہیں ہرگز
اے شخص تو بے عقل ہے یا تجھ کو جنوں ہے

ابرو نے کماں زلف نے زنجیر دکھا دی ۔۔۔ مژگاں نے بھی اک ترکش پر تیر دکھا دی
مل کر در دنداں میں مسی شوخ نے ہنس کر ۔۔۔ کچھ زور نزاکت بھری تحریر دکھا دی
کوچے میں ہمیں خاک نشینی نے تمہاری ۔۔۔ تانبا ہو طلا جس سے وہ اکسیر دکھا دی
کل اس سے کہا حسن میں ہم رشک پری ہیں ۔۔۔ مکھڑے نے ہمارے ہی وہ تنویر دکھا دی
ہم بولے نظیر اس سے کہ ہے جھوٹ تو ہنس کر
چھپ اس نے پری کی ہمیں تصویر دکھا دی

کاکلِ مشکیں کا تجھ کو شوق بیتابانہ ہے
اے دلِ صد چاک سچ کہہ دل ہے تو یا شانہ ہے

کر دیا پہلے ہی ساغر میں ہمیں مدہوش و مست
ہم نشیں چشمِ بتاں کا بھی عجب مے خانہ ہے

شمع رویوں کو تو کچھ پروا انہیں پر کیا کریں
دل جو ہم رکھتے ہیں وہ دل تو نہیں پروانہ ہے

پڑ گئی تھی ایک دن اس چشمِ مے گوں پر نظر
اب تلک پایہ ہماری لغزشِ مستانہ ہے

پھر وہ چشمِ مست اے دل میل کرتی ہے ادھر
یاد ہے اس کا نشہ کچھ یہ وہی پیمانہ ہے

حالِ دل ہم نے کہا جس دم تو بولا سچ کہو
یہ کوئی قصہ نیا ہے یا کہن افسانہ ہے

اس پری رو سے چلا پھر دل لگانے کو نظیرؔ
کیا کہیں یہ بھی کوئی وحشی ہے یا دیوانہ ہے

ناگن ہے تری زلف کی دل کیونکہ نہ ڈر جائے
یہ کاٹ بھی کھا دے جو کسی کو تو مکر جائے

شکل و بدن و زیور و پوشاک سب اس کی
ایک عالمِ تصویر ہے جس جس پہ نظر جائے

ہے حسن پرستی بھی عجب چیز وفا کیش
دل پیر بھی ہو جائے پہ اس کا نہ اثر جائے

محبوب کے رتبے پہ نظر رکھیو نظیرؔ آہ
ایسا نہ ہو جو یار کے دل سے تو اُتر جائے

جام نہ رکھ ساقیا شب ہے پڑی اور بھی
پہر جہاں کٹ گئے چار گھڑی اور بھی

موسمِ برسات کی کر تو چھُپکے بات ہم
دیدۂ گریاں بھلا، کوئی جھڑی اور بھی

پہلے ہی ساغر میں تھے ہم تو پڑے لوٹتے
اتنے میں ساقی نے دی اُس سے کڑی اور بھی

عشق کھلا ہے تجھے زلفِ بتاں کی قسم
ہجر کی شب سے کوئی شب ہے بڑی اور بھی

کچھ تپشِ دل تھی کچھ سُنتے ہی فرقت کا نام
آگ سی ایک آگ پر آن پڑی اور بھی

گرچہ اُپڑ آئیں ہیں تن پہ مرے پر میاں
اتنی لگائیں جہاں، ایک چھڑی اور بھی

کیا کہوں اُس شوخ کی واہ میں خوبی نظیر
سنتے ہی اس بات کے ایک جڑی اور بھی

دیکھ عقد ثریا ہمیں انگور کی سوجھی — کیوں بادہ کشاں ہم کو بھی کیا دور کی سوجھی
ہم نے تو اُسے دیکھ کے جانا کہ پری ہے — پریوں نے جو دیکھا تو انھیں حور کی سوجھی
غش کھا کے گرا پہلے ہی شعلے کی جھلک سے — موسیٰ کو بھلا کہئے جو کیا طور کی سوجھی
دیکھا جو نہانے میں وہ گورا بدن اس کا — بلّور کی چوکی پہ جھلک نور کی سوجھی
سر پاؤں سے جب پھنس گیا اس زلف سیہ میں — تب ہم کو سیاہی شب دیجور کی سوجھی
جنت کے لئے شیخ جو کرتا ہے عبادت — کی غور جو خاطر میں تو مزدور کی سوجھی

مصنوع میں صانع نظر آوے تو نظیر آہ
نزدیک ہی کیا ہے کہ جہاں دور کی سوجھی

بھولتی دل سے نہیں ہوش رُبائی تیری — دلبری عشوہ گری جلوہ نمائی تیری
کیوں نہ پھروں میں تکوں اب تیرے مکھڑے کی طرف — کیا کروں مجھ کو یہ صورت ہے خوش آئی تیری
مہ کی صورت مجھے آگے تیرے کب خوب لگے — اُس کے چہرے سے تو صورت ہے سوائی تیری
آنکھ جوں آئینہ رہ جاتی ہے پریوں کی کھلی — جب نظر آتی ہے مکھڑے کی صفائی تیری
ہے تو مختار جو کچھ چاہے سو کر ناز غرور — کشورِ دل میں پھری اب تو دُہائی تیری
کل جو گلشن میں گیا میں کہ ذرا غم بھولے — واں بھی ہر گل نے مجھے یاد دلائی تیری
سونگھا ایک گل کو جو میں نے تو اس میں بھی تھی — اے مرے غنچہ دہن بُو مجھے آئی تیری

غم میں مرتا تھا نظیر اس کو جلایا تو نے
جانِ کس منہ سے کہوں اب میں بُرائی تیری

سب ٹھاٹھ یہ ایک بوند سے قدرت کی بنا ہے
یہاں اور کسی کی نہ بنی ہے نہ منا ہے

بالفرض اگر ہم ہوئے حوا کے شکم سے
آدم کے تئیں دیکھئے وہ کس کا جنا ہے

یہاں لوگ دولہن دولہا کے قصے میں پھنسے ہیں
وہاں اور بنت ہے نہ بنی ہے نہ بنا ہے

ظلمت کا الٹ پھیر نہیں جن کی نظر میں
وہ کہتے ہیں غافل یہ بقا ہے یہ فنا ہے

لے عرش سے تا فرش جو روشن ہے طلسمات
یہ نور سب اس نور کی چھلنی سے چھنا ہے

ہم کچے سے کچا اُسے سمجھے ہیں وگرنہ
اس دیگ کے چاول ہیں کنی ہے نہ کنا ہے

ملنا بھی غرض کا ہے لڑائی بھی غرض کی
نہیں اور کسی سے کوئی روٹھا نہ منا ہے

حاجت نہ بر آئی تو وہیں کرنے لگے ہجو
اور ہو گیا مطلب تو وہیں وصف و ثنا ہے

یا بس کہیں مرطوب کہیں گرم کہیں سرد
مصری ہیں کہیں زہر ہلاہل ہیں سنا ہے

ایک اس کی دوا سمجھی نہیں جاتی نظیر آہ
کچھ زور ہی معجون کا نسخہ یہ بنا ہے

تم آگے بہت جیسے خوش اے یار ہمیں سے
ویسے ہی تم اب رہتے ہو بیزار ہمیں سے

ہے سب سے تو ایما روا شارات ولیکن
رہتی ہے پھری ابروئے خمدار ہمیں سے

محفل میں جو دیکھا تو ادھر تم ہو خفا اور
ساقی کو بھی ہے حجت و تکرار ہمیں سے

اوروں سے جو کہتے ہو کہ ہم ان سے ہیں ناخوش
اس کو تو فقط کرنا ہے اظہار ہمیں سے

گلگشت چمن کرتے ہو جب ہمرہ یاراں
وہاں بھی غرض آتی ہے تمہیں عار ہمیں سے

اقرار ملاقات ہر ایک سے ہے بصد مہر
کی غور تو ہے گا تمہیں انکار ہمیں سے

سمجھے گا جو رستے کو نظیر اہل وفا کے
تو ملنے لگے گا وہ طرحدار ہمیں سے

سرسبز رکھیو کشت کو اے چشم تو مری
تیری ہی آب سے ہے بس اب آبرو مری

گو میں جفا سے مر گیا اُڑ رنگ کے روسیاہ
پر شکر ہے وفا تو ہوئی سرخ رو مری

اس کی جبین پاک پر اس دم تک اے نسیم
کافر ہوں گر پڑی ہو نظر بے وضو مری

بل کھا کے زلف کان میں اس کان حسن کے
پھونکے ہے پردے پردے میں کچھ مو بہ مو مری

میں مر گیا تھا زہر جو کھا کر تو اس لئے ق
یعنی وہ شاد ہو کہ مٹی ہاؤ و ہُو مری

سو تو نے میرے غم میں رلایا اسے فلک
اے روسیاہ یہ تو نہ تھی آرزو مری

پہروں تلک بکا میں پر اس شوخ نے نظیر
ایک چٹکی میں اڑا دی وہ سب گفتگو مری

کیا ادا کیا ناز اور کیا آن ہے
یاں پری کا حسن بھی حیران ہے

حور بھی دیکھے تو ہو جاوے فدا
آج اس عالم کا یہ انسان ہے

اس کے رنگ سبز کی ہے چین میں دھوم
کیوں نہ ہو آخر کو ہندوستان ہے

جان و دل ہم نذر کو لائے ہیں آج
لیجئے یہ دل ہے اور یہ جان ہے

دل بھی دل سے ہے تصدق آپ پر
جان بھی سو جان سے قربان ہے

قطعہ

دل کہاں پہلو میں جو ہم دیں تمہیں
یہ تو گھر اک عمر سے ویران ہے

عقل و صبر و ہوش سب جاتے رہے
ہاں میاں اک ادھ موئی سی جان ہے

وہ اگر لینی ہو تو لے جائیے
خیر یہ بھی آپ کا احسان ہے

آن کر مل لو نظیر اپنے سے جان
اب وہ کوئی آن کا مہمان ہے

خجلت تو نہ دی کچھ اس بے مہر کی یاری نے　　شرمندہ کیا ہم کو نا تجربہ کاری نے
گلشن میں نقاب الٹا دو بار رُخ اس کے سے　　کیا لُطف کیا ہم پر گل باد بہاری نے
اور پارہ کیا دم میں سو گل کے گریباں کو　　اس رشک گلستاں کی ایک زیب شعاری نے
رات اس کو سنا آئی پھر صبح تلک ہم کو　　ایک لحظہ نہ فرصت دی ساعات شماری نے

کیا کیا چمن پُر گل دکھلائے نظیر اس دم
اس دست نگاریں کی توصیف نگاری نے

سرشک چشم سے موتی بہت پروئے گئے　　ولے یہ داغ جگر کے نہ ہم سے دھوئے گئے
غرور نے تو ہمارے بہت ہی کھینچا سر　　پر اس کو ہم بھی سدا خاک میں رلوئے گئے
ہماری اُن کی رہی عمر بھر یہی صحبت　　ادھر وہ ہنستے رہے ہم ادھر سے روئے گئے
سمائے ایسے ہی آ کر کہ پھر مرے دل سے　　نہ جاگتے میں کبھی اور کبھی نہ سوتے گئے

نظیر کیا ہی مزا تھا کہ کل خوشی سے ہم
گئے تھے یار کو لینے سو آپ ہی کھوئے گئے

ہمیں اس غنچہ لب کی بات کیا دل سے لگی پیاری　　کہ جس کو بے کلی لینی ہو وہ ہم سے کرے یاری
جو دل کے لینے والے ہیں وہ لے ہی جاتے ہیں آخر　　دھری رہتی سب اپنی نگہبانی و ہشیاری
کیا ہم نے یہ استفسار اس سے یعنی اب ہم پر　　قطعہ　کسی کے کہنے سننے سے یہ رہتی ہے ستمگاری
اگر کہنے سے ہو تو کچھ کریں تدبیر ہم اس کی　　وگر اپنی ہی مرضی ہے تو یوں ہی تو خیر لاچاری

مکدر ہو گیا لیتے ہی دل کے یک بہ یک ہم سے
نظیر اس آئینہ رو نے تو کی یہ صاف عیاری

کمر تک اس نے زلفوں کو جو بل دے دے کے چھوڑا ہے　　یہ دو زلفیں نہیں کافر یہ ایک ناگن کا جوڑا سا ہے

پھرے ہے حرص سے بلبل چمن کے تختے تختے میں — جو کچھ بھی صبر ہو تو ایک گُل کیا اس کو تھوڑا ۔
دیا ہے سنگ دل کے ہاتھ جس نے شیشۂ دل کو — جو سچ پوچھو تو اس نے لعل کو پتھر سے توڑا ۔
سمندِ آسماں کب آپ سے دوڑے ہے اس پر تو — کسی کی ایڑ پر ہے ایڑ اور کوڑے پہ کوڑا ۔
کل اس نے نیلگوں ناخن سے ایسے میرے چٹکی لی — کہ جس کے نیل کا اب تک مرے تن میں ددوڑا
تپک ہے درد ہے کو ندن پڑی ہے ہول اٹھتے ہیں — مرے پہلو میں کیوں یارو یہ دل ہے یا کہ پھوڑا ۔
نشے میں پا کے اس کو کس طرح بوسہ نہیں لیتا — بھلا یارو کسی نے بھی شکار اپنے کو چھوڑا ۔
عبث اس بے وفا کے تو جو نکتوڑے اٹھاتا ہے — ارے دل تجھ کو کیا دنیا میں محبوبوں کا توڑا ۔
یہی ہے دھوم کل سے وہ مرے ملنے کو آتا ہے — گلے میں ہار ہیں اور تن میں نافرماں کا جوڑا ۔

غرض میں تو نظیرؔ اس سے یہ سمجھا ہوں کہیں شاید
کسی کا نیل بگڑا ہے کہ یہ طوفان جوڑا ہے

اظہار ہم بھی کرتے احوالِ دل فگاری — شرمِ وفا گر ایک دم دیتی زباں کو یاری
جن میں فریب وفن کی سوختہ کاریاں ہیں — ہم اُن کے مبتلا ہیں اے وائے خام کاری
شکوہ فراموشی کا کیا اُن سے کیجے جن کو — صورت ہی بھول جاوے پھر کیسی یادگاری ۔
یک بار ملتے ملتے رُک جاؤ تم تو اے جاں — دل بستگاں کی پھر ہو کیونکر نہ اشک باری
وعدے پہ گل رخوں کے مت کھا فریب اے دل — ان کے قرار میں ہیں صد خار بے قراری
لیتی ہے ہم سے بدلا اب صبحِ حشر اس کا — جو شام مُو میں ہم نے کی تھی سیاہ کاری

گر کر نظیرؔ ہم اس محبوب کی نظر سے
ایسے ہوئے ہیں ہلکے جو زندگی ہے بھاری

جس وقت خوابِ ناز سے وہ چشم وا ہوئی — صد خستۂ نخفتہ کی حاجت روا ہوئی

لا بوئے گل نہ کلبۂ احزاں میں اے نسیم — یہ کب ہماری روح کی راحت فزا ہوئی
یوں کارواں شباب کا گزرا کہ گوش زد — آوازِ پا ہوئی نہ صدائے درا ہوئی
پوچھی نظیرؔ ایک نے کل شکلِ وصلِ یار — ہم نے کہا یہ اس سے کہ کیا کہئے کیا ہوئی

جو شکل دورباشش تھی روزِ نخست کی
اب بھی جو ہم گئے تو وہی برملا ہوئی

بتا کے منہ جو سراسر ہمیں بُرا کہئے — تمھارا ہم نے بگاڑا ہے کیا بھلا کہئے
غرض تھی چاہ سے ہم کو سو ہم لئے کی آ گئے — گناہ اس کو سمجھ لیجئے خطا کہئے
وفا جو ہم میں ہے کم سینکڑوں میں نکلے گی — اگر ہزار طرح ہم کو بے وفا کہئے
صریح خوش تھے ہمیں دیکھ کر ہوئے ناخوش — یہ اختلاط میں ہے کون سی ادا کہئے
جو چاہے آپ کو دل سے اسے خفا کیجے — یہ ناروا ہے محبت میں یا روا کہئے
رہو خوشی سے تم اپنی تو ہے مراد مری — تمھارے دل کا جو کچھ ہو وہ مدعا کہئے
ہم آویں جاویں بھلا کیا خوشی سے آپ کے پاس — نہ جانکا لئے لب سے کبھی نہ آ کہئے
جو لے کے دل کو کریں رات دن ستمگاری — تو منصفو انھیں پھر کچھ نہ کہئے کیا کہئے

گلے کی داد نزاکت سے دیتے ہم بھی نظیرؔ
پر اس صنم کا ہے نازک مزاج کیا کہئے

جان بھی بہ جان ہے ہجر میں اور دل فگار بھی — تر ہے مژہ بھی اشک سے جیب کا تار تار بھی
طرفہ فسوں سرشت ہے چشمِ کرشمہ سنجِ یار — لیتی ہے ایک نگاہ میں صبر بھی اور قرار بھی
کوچے میں اس کے بیٹھنا حسن کو اس کے دیکھنا — ہم تو اسی کو سمجھے ہیں باغ بھی اور بہار بھی
دیکھئے کیا ہو بے طرح دل کی لگے ہیں گھات میں — عشوۂ پُر فریب بھی غمزۂ سحر کار بھی

زلف کو بھی ہے دمبدم عزم کمند افگنی　　دام لئے ہے مستعد طرۂ تابدار بھی

گننے لگی وہ اپنے جب چاہنے والوں کو نظیر
اٹھ کے یکایک اس گھڑی ہم نے کہا کہ یار بھی

ہم اطوار تاسف سے نہ کرتے آج جہاں کاہی　　گر اس بے درد کے طرزوں سے ہوتی کچھ بھی آگاہی
خیال شوخی چشم اس کا اپنے دیدۂ تر میں　　پھرے ہے یوں کہ جیسے ہو شناور بحر میں ماہی
ہم اس کو بادکش بھی جھل نہیں سکتے ہیں اس ڈر سے　　کہ ہے وہ رمز فہم اور اس میں ہے طرز ہوا خواہی
نہ کر پہلو تہی اس کے جفا و جور سے اے دل　　مزا کیا عشق کے آفات کا جب عافیت چاہی

بتوں کو دل دیا تھا تو نے اب دیں کو بھی دے بیٹھا
ارے کچھ تو خدا سے ڈر نظیر اتنی بھی گمراہی

غفلت میں جو رہا وہ نہ بھولے تو کیا کرے　　فربہ جسے کیا وہ نہ پھولے تو کیا کرے
گل سے کوئی کہے کہ شگفتن سے باز آ　　اس کو تو پھولنا ہے نہ پھولے تو کیا کرے
جو ناقبول شے کے بنایا قبول کو　　پھر اس کو وہ بھلا نہ قبولے تو کیا کرے
لڑکے کو دیں جو تھد میں مادر پدر سلا　　لاچار پھر وہ اس میں نہ جھولے تو کیا کرے

جس فیلباں کو حکم ہو سر دار کا نظیر
پھر وہ غریب ہاتھی نہ ہولے تو کیا کرے

اس رشک مہ کے منہ پہ وہ مشکیں جو خال ہے　　ایسا تو خال خال ہی اب خال خال ہے
اے مردمان چشم بتاں یہ وہ خال ہے　　تم سب کے آج خال کو یہاں جائے حال ہے
کیا دام زلف چاہئے جس جا یہ خال ہے　　دانا کے واسطے تو یہ دانہ ہی جال ہے
اس مہ جبیں کے گوشۂ ابرو میں خال ہے　　جیسا وہ نیمچہ ہے یہ ویسا ہی ڈھال ہے

کھڑے پہ اس کے گرچہ بناوٹ کا خال ہے
اصلی کو یہ حسن بنانا محال ہے

جس منہ پہ جوشِ حسن سے تل بھر بھی جا نہ ہو
وہاں تل بھی آ پڑے تو یہ تل کا کمال ہے

اس خال کے فراق میں اپنے جگر کا آج
وہ حال ہے جو چاند کے سینے کا حال ہے

خوبی میں اس کی چشمِ سلیمانی کہیے آہ
نیلم ہے یا کہ مردمِ چشمِ غزال ہے

اب کس سے اس کے خال کو تشبیہ دیں نظیر
کافر یہ رو سیہ تو کوئی بے مثال ہے

اب تو ہر لحظہ وہ بے درد ستاتا ہے مجھے
بے نہایت ستم و ظلم دکھاتا ہے مجھے

جاگتا ہوں تو یہ کہتا ہے کہ جا سو بھی کہیں
اور جو سوتا ہوں تو ٹھوکر سے جگاتا ہے مجھے

جس طرح جلتی ہے فانوس میں شمعِ محفل
اس طرح پردے ہی پردے میں جلاتا ہے مجھے

خوش نصیبی مری الفت کی تو دیکھو یارو
یاد کرتا ہوں جسے میں وہ بھلاتا ہے مجھے

شوقِ دیدار ہے یا جذبۂ الفت ہے غرض
کوئی تو ہے کہ جو کھینچے لئے جاتا ہے مجھے

آج وہ خاک نشیں ہوں میں کہ جوں نقشِ قدم
ہر کوئی پاؤں کی ٹھوکر سے مٹاتا ہے مجھے

عشق میں اس کے نہ مرتا ہوں نہ جیتا ہوں نظیر
ایسی مشکل ہے کہ کچھ بن نہیں آتا ہے مجھے

یہ کس نے آج چمن میں قبا اتاری ہے
کہ جس کی بو سے ہر ایک گل بیقراری ہے

تو وہ ہے گل کہ ہمیشہ قدم قدم پہ ترے
چمن نے باغ میں سو سو بہار واری ہے

ترا میں حسن زلیخا سے پوچھ آتا جان
تو کیا کروں کہ وہ تشریف لے سدھاری ہے

نہ برق میں ہے نہ سیماب میں نہ شعلے میں
الٰہی دل کو کہاں کی یہ بیقراری ہے

نظیر ابروئے مژگاں کو اپنا دل دے ڈال

نہیں تو دم میں میاں پھر چھری کٹاری ہے

لینے کو ہم آئے ہیں دلِ زار کسی سے
کچھ اور نہیں حُجت و تکرار کسی سے

اب خیر اسی میں ہے کہ دے ڈالئے دل کو
تا مفت نہ ہو قصہ و پیکار کسی سے

ہم اپنی ہی خوبی سے نہیں بولے ہیں ورنہ
ہوتا خلش اب تک تو کئی بار کسی سے

اقرار جو کر کے کوئی مُکرے تو وہ جانے
ہم نے تو کیا کچھ نہیں اقرار کسی سے

سب جانتے ہیں دل کے تئیں مُفت لیا ہے
بوسے بھی نہیں پائے ہیں دو چار کسی سے

کیا وجہ نہ دینے کی کوئی مُنہ سے تو بولو
تو ہم بھی نہ ہوں دل کے طلبگار کسی سے

یہ سن کے نظیر اس نے کہا سنتے ہو یارو
ہم کو تو عداوت نہیں زنہار کسی سے

سو آپ ہیں اس مکر کو ہوں خوب سمجھتا
اس پر تو نہ بولے میری بیزار کسی سے

ان کو اُدھر سے حسن دکھانا گھڑی گھڑی
اور ہم کو غش پہ غش اِدھر آنا گھڑی گھڑی

دن رات اس کے ہجر میں گھڑیال کی طرح
پڑتا ہے مجھ کو شور مچانا گھڑی گھڑی

آتے ہیں اب تو پہر میں کچھ آٹھ سات بار
کیا جانے کیا کرے گا یہ آنا گھڑی گھڑی

آنا کبھی تو گھر میں یہ کہہ آنا بار بار
یعنی کہ مجھ کو وہاں سے بلانا گھڑی گھڑی

اور آپ بھی جو چار گھڑی بیٹھنا تو پھر
کرنا ہر ایک طرح کا بہانا گھڑی گھڑی

گر وصل کی ہو شب تو انھیں ہونا مضطرب
کہہ جاؤں جاؤں مجھ کو کُڑھانا گھڑی گھڑی

القصہ وقت صبح تک اُن کو تو روٹھنا
اور ہم کو پاؤں پڑ کے منانا گھڑی گھڑی

جاتی ہے قدر اس میں کچھ اچھا نہیں نظیر
گھر میں کسی کے دوڑ کے جانا گھڑی گھڑی

جلد اتنا نہ چل او جلوہ دکھانے والے
ہیں نقاہت زدہ پیچھے ترے آنے والے

وائے غفلت جنھیں ہے فکر جراحت درپیش
ہم انھیں سمجھے ہیں مرہم کے لگانے والے

جرم میں چاہ کے جو چاہو سو کہہ لو صاحب
شرم سے ہم نہیں اب سر کو اٹھانے والے

یک سر مو نہ پریشان ہو تو اسے کاکل یار
ہم ترے دام میں آ کر نہیں جانے والے

ہم تو جا بیٹھیں ابھی یار کے کوچے میں مگر
چین دینے کے نہیں رشک کے کھانے والے

دل نہ سہے درد بتوں سے ہمیں ہے خوف نظیر
تو سہے کم زدہ ہیں زور جتانے والے

کہہ گئے اس قاتل نے آج ایک بات میرے سامنے
دل کے دو ٹکڑے کئے ہیہات میرے سامنے

شعلۂ دل سے مرے پروانہ کیا ہوگا دوچار
شمع نے رو رو دیا تھا رات میرے سامنے

کیا کوئی اس شعلہ رو سے ہو مقابل حسن میں
ہو گئی برسوں پری کی مات میرے سامنے

نقطۂ حسن اس کے رخ کا ایک کتاب حسن ہے
ہو چکی اس کی بھی تحقیقات میرے سامنے

اس کی ابرو کی صفت میں ہر کمان ابرو نے رات
بزم میں کیا کیا پڑھیں ابیات میرے سامنے

میں تو اس غماز کو کیا کیا سزا دیتا مگر
کیا کروں منکر ہوا بد ذات میرے سامنے

پھر چلا تو آج اس چنچل کے کوچے میں نظیر
کل تو تو آیا تھا کھا کر لات میرے سامنے

گئی فلک تئیں پر اس کے دل میں راہ نہ کی
ہماری آہ نے پیدا یہ دستگاہ نہ کی

جگر کو دیکھنے میرے کہ یوں ہوا ہوں قتل
سپر تو کیا ہے کہ ہاتھوں تلک پناہ نہ کی

زیادہ اس سے اب اخفا نہ درد کیا ہوگا
کہ جان آنکھوں میں آ آ گئی پر آہ نہ کی

کہا میں یار سے ایک دن کہ اے مہ تاباں
ہماری شام کبھی تم نے صبح گاہ نہ کی

نہ ہم سے پیار نہ الفت نہ مہر نہ اخلاص جو سرسری سی نگہ گاہ کی تو گاہ نہ کی
یہ سن کے مجھ سے کہا یہاں بھی کچھ اجارہ ہے نہ کی تو چل بے نہ کی واہ خواہ مخواہ نہ کی

میاں نظیرؔ ہمیں چاہتے رہے سب کو
ہزار حیف کسی نے ہماری چاہ نہ کی

غنچہ لب، مہر جبیں، عارض گلفام پری گلشن حسن ہے اب وہ گل اندام پری
کیوں نہ جھمکیں طرب و عیش کہ جس بزم میں ہو مے و مینا پری ساقی پری اور جام پری
وہ پری رو جہاں آوے تو ہو وہاں کی یاد دن پری، رات پری، صبح پری، شام پری
یوں مرے سینے پہ سوتا ہے شب وصل میں وہ جس طرح اپنے پلنگ پر کرے آرام پری
اس کے مکھڑے کی جھمک بھی وہی کرتی ہے جو کچھ کرتی ہے حسن کی دکھلا کے جھمک کام پری
میں نے پوچھا کہ ہے کیا نام تمہارا کہئے بولی کیا تو نہیں واقف ہے مرا نام پری

جس گل اندام کو اپنا دیا دل تو نے نظیرؔ
حسن میں نام خدا ہے وہ دل آرام پری

ہو جو دو چار صبح اس عارض برق تاب سے نکلیں ستارے رشک کے دیدۂ آفتاب سے
چھپتے ہیں یوں پری رخاں اس رخ مہر تاب سے جیسے ستارے صبح کو چھپتے ہیں آفتاب سے
مکھڑے کی اس کے ہمسری کیونکہ ہو ماہتاب سے باتیں کرے ہے اب تو صاف بڑھ کے وہ آفتاب سے
دل کو اسیر کر لیا زلف کے پیچ و تاب سے آنکھوں کی نیند لے گیا نرگس نیم خواب سے
چہرے پہ اپنے تم نقاب کھینچو ہو کیوں حجاب سے یہ تو چھپو کا اب نہیں وہ کہیں چھپے نقاب سے
اس کا وہ روئے مہر وش چمکے ہے یوں نقاب سے جیسے شعاع آفتاب چھوٹے تنک سحاب سے
سویا ہے وہ ابھی نسیم لگیو نہ اس کے تن سے تو اور جو لگی تو وہ ابھی چونک پڑے گا خواب سے

زلفیں جو کھولیں آپ نے سنبل تر کا جرم ہے
یا کہ ختن میں کچھ خطا ہو گئی مشکناب سے

اس کا وہ قد ہے جلوہ گر دیدۂ تر سے یوں مری
جیسے عیاں ہو عکس سرو نہر چمن کے آب سے

اپنا کتابی رخ جو یوں پھیر رہا ہو ہم سے دم بدم
تم نے کیا ہے انتخاب کیا یہی اس کتاب سے

چھوڑ کے مجھ کو نیم جاں اب تو چلے ہو تم مگر
دیر نہ کیجیو مہرباں پھریو ذرا شتاب سے

سخت عذاب تھا ہمیں آہ ہوس سے دل کی کیا کہیں
بارے وہ تم نے لے لیا چھوٹے ہم اس عذاب سے

کہتے ہیں جس کو زندگی دم کی ہوا ہے اے نظیر
ہم کو تو آج کھل گیا عقدہ یہ ایک حباب سے

نقل بدر منیر

آیا نہیں جو کر کے اقرار ہنستے ہنستے
چل دے گیا ہے شاید عیار ہنستے ہنستے

اتنا نہ ہنس تو دل اس سے ایسا نہ ہو کہ چنچل
لڑنے کو تجھ سے ہووے تیار ہنستے ہنستے

لے کر صریح دل کو وہ گل عذار یارو
ظاہر کرے ہے کیا کیا انکار ہنستے ہنستے

ہنس ہنس کے چھیڑ اس کو زنہار تو نہ اے دل
ہو گا گلے کا تیرے یہ ہار ہنستے ہنستے

ہنسنے کی آن دکھلا لیتا ہے دل کو گل رو
کرتا ہے شوخ یارو یہ کار ہنستے ہنستے

جھنجھلا کے حال دل کا کہنا نہیں روا ہے
لائق یہاں تو کرنا انکار ہنستے ہنستے

دستار سرخ کج کر طرہ زری کا رکھ کر
آیا جو دل کو لینے دلدار ہنستے ہنستے

آنکھیں لڑا کے اس نے ہنس کر نگہ کی ایسی
جو لے گیا دل آخر خونخوار ہنستے ہنستے

آیا ہے دیکھنے کو تیرے نظیر اے گل
دکھلا دے ٹک تو اس کو دیدار ہنستے ہنستے

لگایا دام زلفوں کی شکن نے پیچ نے بل نے
بنایا پان نے رنگ اور سنبھالا سحر کاجل نے

مرا دل دیکھتے ہی اس صنم کو ہو گیا شادا
لگے ہیں دم بدم ہونے نشیلے شوخ سے لگیں سینے

کبھی خوش ہو کے ہُو ہُو کی، کبھی بولا اہاہا ہا عجب لوٹے مزے اس وقت نظاروں کی اٹکل نے
نہ بولا مُنہ سے ہرگز دیکھ کر وہ خوش دلی میری مگر کچھ کچھ تبسم کی شکر لب سے لگا ملنے
مجھے کر حِل سے غافل، بھولی صورت کا بنا نقشا کیا اک بار مُنہ غصّے سے سرخ عیار چھل بل نے
اب اس ظالم کے ہاتھوں سے بچاؤں کیونکر اپنا جی اٹھا کر جھٹ قدم واں سے لگا گھر کی طرف چلنے
چلا ڈرتا جو آگے کو تو وہ پھر ہنس کے یوں بولا "اڑا کر مفت نظارے بچا، اب تم لگے ٹلنے"
ادب سے یوں کہا "اب تو ہوئی تقصیر یہ مجھ سے لگے قطرے پسینے کے مرے مُنہ سے وہیں ڈھلنے
لگے غمزے لگانے تیر اِدھر دکھلا کے سو پھُرتی اُدھر سے تیغ ابرو کی بھی پھر کیا کیا لگی چلنے
اِدھر آنکھوں کے جادو نے بنایا باولا کیا کیا اُدھر کیں پھُرتیاں کیا کیا نگاہوں کی بھی چھل بل نے

دکھا کر مجھ کو اپنی واں زبردستی کے یہ نقشے
وہیں دل لے لیا جھٹ پٹ نظیر اس شوخ چنچل نے

ہم تو عاشق ہیں ترے ناز اٹھانے والے تم سے کم دیکھتے ہیں محبوب ستانے والے
بند کر قیدِ محبت میں خبر میری نہ لی دام میں جس کے پھنسے دام چھُڑانے والے
کل شب وصل میں کیا جلد کٹی تھیں گھڑیاں آج کیا مر گئے گھڑیال بجانے والے
کل جو رستے میں ملاقات ہوئی تو یہ کہا کہاں جاتے ہو طرحدار جلانے والے
گزری مدت کہ مرے ساتھ لپٹنے نہیں آئے کیا ہوئے یار وہ گلے ہم کو لگانے والے
یوں تو اوقات گزرتی ہے مزے داری میں نہ ملے چین مزے دار دکھانے والے

اب کے ملنا ہو نظیر اس سے تو کہنا جا کے
کیا ملیں ہم، نہ رہے یار بلانے والے

کسی کی چھین نہ لی ہم نے چاہ کی گھڑی نظر پڑی نہیں ہرگز نباہ کی گھڑی

پس از وفات نہ آئے ہماری تربت پر — بجائے سبزہ رکھی لاکے کاہ کی گٹھری
مژہ سے اس کی پڑا ہے مقابلہ یارب — ادھر یہ دل ہے اُدھر ہے سپاہ کی گٹھری
تمھارے طرۂ رہزن نے چھین لی سرِ شام — متاعِ صبر اسی دادخواہ کی گٹھری
حضور میں تری رحمت کے جھک نہیں سکتا — کہ سر پہ ہے مرے بارِ گناہ کی گٹھری
رکھے ہے کون، جنون، وادیٔ محبت میں — بغیر آبلہ پا زادِ راہ کی گٹھری
بہم ہوا تھا جو کچھ یاں طوافِ کعبہ سے — کرشمے نے وہ بتوں کے، تباہ کی گٹھری
کوئی تو غرق ہے بحرِ فراق کا یاں شوخ — نہیں حباب یہ ہے سوز و آہ کی گٹھری
اُبھار سینے پہ اس کے کچوں کا ہے بارے — یہ شاہِ حسن کے ہے خیمہ گاہ کی گٹھری
پڑا ہے ناز و ادا کا بہم جو یہ لشکر — بجا ہے گر کہیں گردِ سپاہ کی گٹھری

زمین نظیرؔ نہیں گرم، اس میں ہے کیا خاک
مگر بہ زورِ طبیعت نباہ کی گٹھری

دَیر سے آج جو نکلے بت ذی شان کئی — لے گئے صبر کئی، دین کئی، ایمان کئی
اتنا رو یا ہوں کہ اب لختِ جگر کے یارو — ڈھیر ہیں چشم سے لے تا سرِ دامان کئی
اب تو ٹک منہ کو دکھا یار کہ نرگس بن کر — نکلے ہیں خاکِ چمن سے ترے حیران کئی
اس کے دامن سے لگوں پاؤں پڑوں ساتھ چلوں — خاک ہوں تو بھی مرے دل میں ہیں ارمان کئی
آخر آیا ہے تو گلشن میں بھی ٹک اب تو چل — یاں کھلی رہتے ہیں ترے چاک گریبان کئی
پان کھا کھا نہ ہنس اس درجہ تو اے دشمنِ جاں — ابھی بھر جائیں گے خون میں لب و دندان کئی
نظر آتے ہیں مجھے اس کی گلی میں دن رات — ٹکڑے ٹکڑے کئی، بسمل کئی، بے جان کئی
جان کر گورِ غریباں میں قیامت نہ مچا — ابھی سوتے ہیں ترے بے سر و سامان کئی

بادشاہ کو نہ لکھا رقعہ کبھی جس نے نظیر
اُس شہِ حسن کے آئے ہے مجھے فرمان کئی

کب آہ وہ کر سکتے ہیں دل کی تپشوں سے　　صحبت ہے جنھیں حسن کے نازک منشوں سے
ہو چرب زباں سے نہ پری رویوں کی تسخیر　　یہ لوگ جو ملتے ہیں تو دل کی کششوں سے
ہے آج تو خوش پر نہیں بلبل کو یہ معلوم　　گل سر کو پٹکتا ہے چمن کی روشوں سے
خوباں تو چلے ہم سے چلن ناز کے لیکن　　چھیڑا ہے انھیں ہم نے بھی کن کن روشوں سے
مدت میں نظیر اس نے کیا دل کے تئیں قتل
صد شکر کہ ہم آج چھٹے سب خلشوں سے

نہ آیا آج بھی سب کھیل اپنا مٹی ہے　　تمام رات یہ سر اور پلنگ کی پٹی ہے
جبیں پہ قشقہ نہ تنہا سیاہ پٹی ہے　　بھووں کی تیغ بھی کافر بڑی ہی کٹی ہے
بھبکتی نکلیں ہیں اشکوں کی شیشیاں یارو　　ہمارے سینے میں کس شیشہ گر کی بھٹی ہے
گلے لگائیے منہ چومیے سلا رکھیے　　ہمارے دل میں بھی کیا کیا ہوس اٹھی ہے
کوئی حجاب نہیں تجھ میں اور صنم میں نظیر
مگر تو آپ ہی پردہ ہے آپ ہی ٹٹی ہے

وہ جب گھر سے نکلے لچکتے لچکتے　　قدم بھی اٹھائے جھجکتے جھجکتے
نہ مانا کبھی دل نے کہنا ہمارا　　نہایت ہم عاجز ہوئے بکتے بکتے
نہ آیا ادھر کر کے وعدہ وہ اور ہم　　گئے جی میں گھبرا ادھر تکتے تکتے
نظیر اُس کی محفل میں جب دور بیٹھا　　ہوا جب وہ ناخوش جھڑکتے جھڑکتے
بٹھایا تو دور اُس نے پر اپنے ڈھب سے　　وہ پھر واں ہی پہنچا سرکتے سرکتے

عشق پھر رنگ وہ لایا ہے کہ جی جانے ہے
دل کا یہ رنگ بنایا ہے کہ جی جانے ہے

ناز اٹھانے میں جفائیں تو اٹھائیں لیکن
لطف بھی ایسا اٹھایا ہے کہ جی جانے ہے

زخم اُس تیغ نگہ کا مرے دل نے ہنس ہنس
اس مزے داری سے کھایا ہے کہ جی جانے ہے

اُس کی دزدیدہ نگہ نے مرے دل میں چھپ کر
تیر اِس ڈھب سے لگایا ہے کہ جی جانے ہے

بام پر چڑھ کے تماشے کو ہمیں حسن اپنا
اِس تماشے سے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے

اُس کی فرقت میں ہمیں چرخ ستمگار نے آہ
یہ رُلایا، یہ رُلایا ہے کہ جی جانے ہے

حکم چپنی کا ہوا شب کو، سحر تک ہم نے
رت جگا ایسا منایا ہے کہ جی جانے ہے

پا کے سہلانے میں گو اونگھ گئے جھک جھک کر
پر مزہ بھی وہ اٹھایا ہے کہ جی جانے ہے

رنج ملنے کے بہت دل نے سہے لیک نظیرؔ
یار بھی ایسا ملایا ہے کہ جی جانے ہے

ہم اشکِ غم ہیں اگر تھم رہے رہے نہ رہے
مژہ پہ آن کے ٹک جم رہے رہے نہ رہے

رہیں وہ شخص جو بزمِ جہاں کی رونق ہیں
ہماری کیا ہے اگر ہم رہے رہے نہ رہے

مجھے ہے نزع وہ آتا ہے دیکھنے اب آہ
کہ اس کے آنے تلک دم رہے رہے نہ رہے

بقا ہماری جو پوچھو تو جوں چراغِ مزار
ہوا کے بیچ کوئی دم رہے رہے نہ رہے

ملو جو ہم سے تو مل لو کہ ہم بہ نوکِ گیاہ
مثالِ قطرۂ شبنم رہے رہے نہ رہے

یہی ہے عزم کہ دل بھر کے آج رو لیجے
کہ کل یہ دیدۂ پرنم رہے رہے نہ رہے

تمہارے غم میں غرض ہم تو دے چکے ہیں جی
بلا سے تم کو بھی اب غم رہے رہے نہ رہے

یہی سمجھ لو ہمیں تم کہ ایک مسافر ہیں
جو چلتے چلتے کہیں تھم رہے رہے نہ رہے

نظیرؔ آج ہی چل کر بتوں سے مل لیجے
پھر اشتیاق کا عالم رہے رہے نہ رہے

جب سے حقہ تجھ لب جاں بخش کا ہم راز ہے   تب سے حق حق کیا کہ قہ قہ کی سی کچھ آواز ہے
یہ جو اڑتا ہے دھواں اب تیرے مُنہ سے آ پری   اس دھوئیں والا نسب کی عرش تک پرواز ہے
نیچواں پینے میں کس کس آن کا کھلتا ہے پیچ   گڑگڑی پینے میں کافر اور ہی انداز ہے
نیچواں کو اپنے نیچوں پر نہیں اتنا غرور   جتنا تیری گڑگڑی کو ڈیڑھ خم پر ناز ہے
دل جلانے کو تو ابھی عاشق جانباز ہے

آب نے حقے تو سے نیچے کو یہ رتبہ کہاں   منہ سے لگنے میں تو اب منہال بھی ممتاز ہے
گر تجھے ہونا ہے گل اے دل تو جل اور دم نہ مار   دیکھ تمبا کو کو کیا کیا سوز ہے اور ساز ہے
گل کیا دم بھر میں تمبا کو جلا کر آگ میں   اے پری رو تیرے دم میں یہ کچھ غماز ہے
ہے کہاں ٹک بول اُٹھ جلدی خدا کے واسطے   او میاں حُقے عجب پیاری تری آواز ہے
کیوں نہ تجھ کو منہ لگا دیں خلق میں شاہ و گدا   تو تو پریوں کے لبوں کا ہمدم و ہمراز ہے
نیچواں پر پیچ کھاتی ہے بڑی حوروں کی زلف   گڑگڑی تیری بھی سادی اے پری طناز ہے
آدم ایک دمڑی کی حقیا کو رہے عاجز سدا   ہم کو کیا کیا گڑگڑی اور نیچواں پر ناز ہے

غور کر دیکھا تو اب یہ وہ مثل ہے اے نظیر
باپ نے پدڑی نہ ماری بیٹا تیر انداز ہے

کچھ نہ دیکھا ہم نے جز بیداد تیرے ہاتھ سے   اے مرے بیداد گر فریاد تیرے ہاتھ سے
پنجۂ خورشید بھولا تھا ید بیضا کا رشک   پھر وہی رشک اس کو آیا یاد تیرے ہاتھ سے
زخم کھایا ہم نے مُنہ پر جب تو قاتل نے کہا   اپنے چہرے پر ہوا یہ صاد تیرے ہاتھ سے
کھولی ناخن سے رگ جاں تو نے اے فصاد یاں   یہ نیا نشتر ہوا ایجاد تیرے ہاتھ سے
صید کیا تو نے تو مارا دل پہ صیادوں کے ہاتھ   ہاتھ ملتے ہیں غرض صیاد تیرے ہاتھ سے

ہاتھ ٹوٹیں تیرے گل چیں تو نے کیوں توڑے وہ گل   حیف کیا گلشن ہوا برباد تیرے ہاتھ سے

تو نے چنگل سے نہ چھوڑا یار کا دامن نظیر
ہم ہوئے دل میں نہایت شاد تیرے ہاتھ سے

زلف ہو بر سر احسان تو گرفتار کرے   چشم کی عین عنایت ہو تو بیمار کرے
تیغ ابرو کی نوازش ہو تو ہو زخم حصول   شور لب زخم کو چاہے تو نمک زار کرے

پکارا قاصد اشک آج فوج غم کے ہاتھوں سے   ہوا تاراج پہلے شہر جاں دل کا نگر پیچھے
سنو میں خون کو اپنے ساتھ لے آیا ہوں درباقی   چلے آتے ہیں اٹھتے بیٹھتے لخت جگر پیچھے

ہستیاں نیستیاں یاں بھی ہیں ایسی جیسے   وہ کمر اور وہ دہاں کچھ نہیں اور سب کچھ ہے
بے زری، فاقہ کشی، مفلسی، بے اسبابی   ہم فقیروں کے بھی ہاں کچھ نہیں اور سب کچھ ہے

میں دست و گریباں ہوں دم بازپسیں سے   ہمدم اسے لانا ہے تو لا جلد کہیں سے

منہ زرد و آہ سرد و لب خشک و چشم تر   سچی جو دل لگی ہے تو کیا کیا گواہ ہے

مری اس چشم تر سے ابر باراں کو ہے کیا نسبت   کہ وہ دریا کا پانی اور یہ خون دل ہے برساتی

گئی گزری اپنی وہ مے کشی لگی آگ جب سے فراق کی   یہ جلے ہے دل سو کباب ہے یہ سرشک چشم شراب ہے

مرتا ہے جو محبوب کی ٹھوکر پہ نظیر آہ   پھر اس کو کبھی اور کوئی لت نہیں ہوتی

ہو کے خفا اور تیوری چڑھا کر بولی میں اپنی کہا نظیر   آپ نے جد کھالی تھی نہیں بن ٹھن، او ہو کا بن چھپے

باتیں ہمارے دل کی کہہ دیں نظیر اس نے   ہے سچ تو یوں کہ دل کو ہوتی ہے راہ دل سے
بیٹھے بٹھائے خلد میں ابلیس نے نظیر   کیا دم دیا ہے حضرت آدم کو دیکھئے

مسلسل غزلیں

(۲)

ہو کیوں نہ ترے کام میں حیران تماشا — یارب تری قدرت کا ہے ہر آن تماشا
ہے عرش سے تا فرش نئے رنگ، نئے ڈھنگ — ہر شکل عجائب ہے، ہر ایک شان تماشا
افلاک پہ تاروں کی جھمکتی ہے طلسمات — اور روئے زمیں پر گل و ریحان تماشا
جنات، پری، دیو، ملک، حور بھی نادر — انسان عجوبہ ہیں تو حیوان تماشا
جب حسن کے جاتی ہے مرقع پہ نظر آہ — کیا کیا نظر آتا ہے ہر اک آن تماشا
چوٹی کی گندھاوٹ کہیں دکھلاتی ہے لہریں — رکھتی ہے کہیں زلف پریشان تماشا
گر عشق کے کوچے میں گزر کیجے تو واں بھی — ہر وقت نئی سیر ہے، ہر آن تماشا
منہ زرد، بدن خشک، جگر چاک، الم ناک — غل، شور، تپش، نالہ و افغان تماشا

ہم پست نگاہوں کی نظر میں تو نظیر آہ
سب ارض و سما کی ہے گلستان تماشا

سحر اس جھمک سے آیا نظر اک نگار رعنا　　　　کہ خور اس کے حسن رخ کو لگا تکنے ذرہ آسا
خد و خال خوبی آگیں لب لعل پان سے رنگیں　　　　نظر آفت دل و دیں مژہ صد مضرت افزا
کھلی رخ پہ زلف پُر خم سی رشک رنگ سیلم　　　　غرض اس طرح کا عالم کہ پری کہے اہاہا
کہا ہم نے اے سمن بر پری چہرہ مہر پیکر　　　　جو چلی ہو یوں جھمک کر کہو عزم ہے کدھر کا
ہے جو قصد سیر بستاں چلیں ہم بھی ساتھ ہی اے جاں　　　　کہا سن کے یہ ارے میاں کوئی تم بھی ہو تماشا
نہ کچھ آشنائی اگلی نہ شناخت اک دو دن کی　　　　جو یہ ہے اسی کی مرضی تو ہے سوچ پھر یہ کیسا

کہا جب نظیرؔ ہم نے یہی دل میں ہم تو سمجھے
تو کہا جو نیکی ہووے تو پھر اس کا پوچھنا کیا

کی وصل میں دلبر نے عنایات تو پھر کیا　　　　یا ظلم سے دی ہجر کی آفات تو پھر کیا
جب آئی اجل پھر کوئی ڈھونڈا بھی نہ پایا　　　　قصوں میں رہے حرف و حکایات تو پھر کیا
حد بوس و کنار او رجو تھا اس کے سوا آہ　　　　گر وہ بھی میسر ہوا ہیہات تو پھر کیا
دو دن اگر ان آنکھوں نے دنیا میں مری جاں　　　　کی ناز و اداؤں کی اشارات تو پھر کیا
پھر اڑ گئی اک آن میں سب حشمت و سب شان　　　　لے شرق سے تا غرب لگا ہات تو پھر کیا
اسپ و شتر و فیل و خر و نوبت و لشکر　　　　گر قبر تلک اپنے چلا سات تو پھر کیا
آخر کو جو دیکھا تو ہوئے خاک کی ڈھیری　　　　دو دن کی ہوئی کشف و کرامات تو پھر کیا
جب آئی اجل ایک ریاضت نہ گئی پیش　　　　مر مر کے جو کی کوشش و طاعات تو پھر کیا
جب آئی اجل پھر وہیں اٹھ بھاگے شتابی　　　　رندوں میں ہوئے اہل خرابات تو پھر کیا
جب آئی اجل آہ تو اک دم میں گئے مر　　　　گر یہ بھی ہوئی ہم میں کرامات تو پھر کیا
دو دن کو جو تعویذ و فلیتے و عمل سے　　　　تسخیر کیا عالم جنات تو پھر کیا

اس عمر دو روزہ میں اگر ہو کے نجومی — سب چھان لیے ارض و سماوات تو پھر کیا
اک دم میں ہوا ہو گئے سب علمی و نظری — تجھے یاد جو اسباب و علامات تو پھر کیا
اس نے کوئی دم بیٹھ کے آرام سے کھایا — وہ مانگتا در در پھرا خیرات تو پھر کیا

دولت ہی کا ملنا ہے بڑی چیز نظیرؔ آہ
بالفرض ہوئی اس سے ملاقات تو پھر کیا

سحر آیا جونہی میں کلبۂ احزاں میں بیچارا — وہیں اک بارگی جوشِ جنوں نے دل کو للکارا
پڑا ہے کیا فسردہ مثلِ برقِ اے شعلۂ آتش — بہار آئی، دکھا گر تجھ میں ہے کچھ قوت و یارا
اٹھا کر گرد دل کر خاک نکلا گھر سے پھر باہر — پڑھا یہ بند اور ہو کر کے نالہ آہ کا مارا
ہجومِ محشرم، ہنگامہ ام، دیوانہ ام مستم — نہ از پا می شناسم سر، نمی دانم ز سر پا را
قضا نے لا وہیں اک اس قدر زنجیر پہنائی — کہ جس کے غل کا پہنچا عرش سے کانوں میں جھنکارا
کھٹکتی دور تک جاتی تھی اس شور و فغاں سے وہ — مگر گرجا زمیں کے رعد کی نوبت کا نقّارا!

نظیرؔ آیا جونہی پھر ہوش میں تو کہہ کے یہ بولا
کہ آخر ہر کمالے را زوالے می شود یارا

سحر جو نکلا میں اپنے گھر سے تو دیکھا اک شوخ حسن والا — جھمک وہ مکھڑے کی اس صنم کے کہ جیسے سورج کا ہو اُجالا
وہ زلفیں اس کی سیاہ پُرخم کہ ان کے بل اور شکن کو یارو — نہ پہونچے سنبل نہ پہنچے ریحاں نہ پہنچے ناگن نہ پہنچے کالا
ادائیں بانکی عجب طرح کی وہ ترچھی چتون بھی کچھ تماشا — بھویں وہ جیسے کھنچی کمانیں پلک سناں کش نگاہ بھالا
وہ آنکھیں مست اور گلابی اس کی کہ ان کو دیکھے تو دیکھتے ہی — مے محبت کا اس کی دل کو ہو گیا ہی گھر انشہ دوبالا
لبوں پہ سرخی وہ پان کی کچھ کہ لعل بھی منفعل ہو جس سے — وہ آن ہنسنے کی بھی پھر ایسی کہ جس کا عالم ہی کچھ نرالا
وہ جامہ زیبی وہ دل فریبی وہ سج دھج اس کی وہ قد زیبا — کہ دیکھ جس پر فدا ہوں دل سے وہ جن کو کہتے ہیں سرو بالا

نگہ لڑائی ہے اس نے جس دم چھٹک لیا چھپ کے دل کو میرے ادا ادا نے ادھر دبوچا، پلک پلک نے ادھر اچھالا
جو لے لیا دل کو میرے یارو، تو اس نے لی راہ اپنے گھر کی پڑا تڑپتا میں رہ گیا واں، زباں پہ آہ اور لبوں پہ نالا
بہت میں نے تو چاہا پوچھوں میں نام اس کا وہ لے وہ گل رد نہ مجھ سے بولا، نہ کی اشارت نہ دی تسلی نہ کچھ سنبھالا
پری رخ من مشکل لب من، دمے تو باز آ، بہ پیش چشم بہ یاد سرو تو بے قرارم، نہال عشقت شدہ است بالا
فدائے دہک عشق شرقا دموع نہرا دمن فسیرا تکسا کثیر حزنا مع الہموم، کقتیل ہجرا دکا کجالا
تسا دسے ملنے توں، دل ہے بیکل ابھی وہ کلاں نتا کیدا، سا کے میوں دے، اپنے گھر وچ نہیں تو اٹھے ساون آ
تمہاری آسا گئی ہے نس دن تمہارے درشن کو ترسیں نیناں دلا سے سندر اتو، سٹے ابرت بٹکیلے موہن، انو سکھے لالا
اپن سے من کو جو چھپنوں تھی ابار کائیں سگائی کا انی پھر آئیں آکر کھبر لو مہاں کی پلک کٹا راجا تمہاں سنے کھالا
اگن برت ہے پیا میں تو ہے برہ میں تیرے سنے من موہنوا تو رہے جو نیناں نے مو باہکو نہ چھینوں تنکو بھواد کھالا
جگت سیہوا است ہر ہکہ، اٹک گیسے من کرن کہا دوانی کیتی تمن ہمر یجن نہ سدھ کی گرہ بڑ نہ بدہ کی چھالا
کبھی تو ہنس کر شتاب آجا، نظیر کی بھی طرف ٹک آ جان بنا کے بیچ در بیچ پھر اکے دامن، لگا کے ٹھوکر ہلا کے بالا

دل نہ لو دل کا یہ لینا سے نہ اخفا ہوگا اس کو دل کہتے ہیں بس لیتے ہی چرچا ہوگا
تم کو ہر آن ادھر ہووے گی حسن آرائی ہم کو ہر لحظہ ادھر ذوق تماشا ہوگا
ہم بھی سوچا وسے دیکھیں گے تمہاری حیا تم سے بھی ضبط تبسم نہ پھر اصلا ہوگا
جب تمھیں دیکھیں گے اور تم متبسم ہوگے چیا غنچہ زیر بستہ وہیں وا ہوگا
گفتگو ہووے گی باہم جو اشاراتوں میں متن اس کا بھی جو زلفوں میں محشا ہوگا
یاد رہ تک ہاتھ جو لادیں گے کسی عذر سے ہم تا ظرف نے والوں میں شور اس کا بھی برپا ہوگا
جب یہ تقریر سنی اس گل خنداں سے نظیر ہم سے دل لے لیا اور ہنس کے کہا کیا ہوگا
قاصد صنم نے خط کو مرے دیکھ کیا کہا حرف عتاب یا سخن دل کشا کہا

تجھ کو قسم ہے کچھ نہ پوشیدہ مجھ سے تو — کہیو وہی جو اس نے مجھے برملا کہا
قاصد نے جب تو سن کے کہا کیا کہوں میں یار — پہلے مجھی کو اس نے بہت ناسزا کہا
پھر تجھ کو سو عتاب سے جھنجھلا کے دم بدم — کیا کیا کہوں میں تجھ سے کہ کیا کیا بُرا کہا
اس کا مزا چکھاؤں گا جا کر اسے شتاب — رہ رہ اسی سخن کے تئیں بارہا کہا
میری تو کچھ خطا نہیں تو ہی سمجھ اسے — بے جا کہا یہ اس نے مجھے یا بجا کہا
کہتا تھا میں تجھے کہ نہ بھیج اس کو خط میاں — لیکن نظیر تو نے نہ مانا مرا کہا
رخ و جبین و مژہ تیر و چشم و ابرو کو — سنان و بدر و مہ و نرگس و ہلال لکھا
سنان و دل، لب و دنداں کو روئے فکرت سے — عقیق و سیم و دُر و سنگ کے مثال لکھا
ذقن کو چاہ، زنخداں کو گوش و گردن کو — صراحی، سیب و گل و چشمۂ زُلال لکھا
کف حنائی و انگشت و ساعد و قد کو — سنان و برگ گل و غنچہ و نہال لکھا
نہ ٹوکو دوستو اس کی بہار نام خدا — یہی اب ایک ہے یہاں گلعذار نام خدا
یہ وہ صنم ہے پری رو کہ جس پہ ہوتی تھیں — ہزار جان سے پریاں نثار نام خدا
اسی صنم کی نگاہوں کی برچھیاں یارو — ہوئی ہیں میرے کلیجے کے پار نام خدا
اسی کے نشتر مژگاں ہیں اب وہ تیزی ہے — کہ جن سے ہوتے ہیں ہم دل فگار نام خدا
اسی صنم کے رخ و زلف کے تصور میں — ہماری گزرے ہے لیل و نہار نام خدا
گلی ہیں کوچہ و بازار میں ہم اب دن رات — اسی کے واسطے پھرتے ہیں خوار نام خدا
اسی کے سر کی قسم ہے کہ ہم تو مر جاتے — اگر نہ ہوتا یہ گل رو نگار نام خدا
بنے ہیں یہاں جو کبھی دیر اور صنم خانے — اُدھر جو ہوتا ہے اس کا گزار نام خدا
اُٹھا کے سینہ جھٹک بازو اور بنا کر دھج — چلے ہے جس گھڑی ٹھوکر کو مار نام خدا

قدم قدم پر برہمن کہیں ہیں بسم اللہ — صنم بھی کہتے ہیں سب بار بار نام خدا
غرض جدھر کو نکلتا ہے یہ تو ہر اک کے — زباں سے نکلے ہے بے اختیار نام خدا

نظیر ایک غزل اور لکھ کہ تیرے سخن
ہیں اب تو سب گہر آبدار نام خدا

نہ پہنے کیونکہ وہ پھولوں کے ہار نام خدا — ابھی تو اس کی نئی ہے بہار نام خدا
جو مجھ سے پوچھے ہے ہنس کر کہ میں پری ہوں کیا — تو میں یہ کہتا ہوں ہاں میری یار نام خدا
نشے کی اب تلک آنکھوں میں کچھ نہ تھی مستی — پر اب کچھ آ چلا ہے خمار نام خدا
وہ دو بدو کی نگاہیں لڑانا کیا جانے — حیا سے ہے وہ ابھی شرم دار نام خدا
ابھی تو اس کی بڑھائی ہیں ہنسلیاں یارو — ابھی یہ آیا ہے چوٹی اُتار نام خدا
مجھی سے سینے کی دل کے ہوئی ہے بسم اللہ — مجھی پہ اس کا یہ پہلا ہے وار نام خدا
ابھی تو آنکھ اُٹھا کر مجھی کو دیکھا ہے — ابھی تو مجھ سے ہی رکھتا ہے پیار نام خدا
میں اپنی دیکھ کے ایڑی یہ بات کہتا ہوں — نہ ہوگا ایسا کوئی وضع دار نام خدا
کمر کو باندھ کے اپنی پری سے توسن پر — جدھر کو نکلے گا ہو کر سوار نام خدا
ادھر غرض کہ صفیں کی صفیں الٹ دے گا — کرے گا حشر سا ایک آشکار نام خدا

نظیر دیکھ اسے سب یہ مجھ سے کہتے ہیں
پری ہے یار تیرا، یہ تو یار، نام خدا

کل اس کے چہرے کو ہم نے جو آفتاب لکھا — تو اس نے پڑھ کے وہ نامہ بہت عتاب لکھا
جبیں کو مہ جو لکھا تو کہا ہو چیں بہ جبیں — یہ کیسی اس کی سمجھ تھی جو ماہتاب لکھا
چمکتے دانتوں کو گوہر لکھا تو ہنس کے کہا — ستارے اُڑ گئے تھے جو دُرِ خوش آب لکھا

لکھا جو مشک خطا زلف کو تو بل کھا کر
کہا خطا کی جو یہ حرف ناصواب لکھا

گلاب عرق کو لکھا تو یہ بولا ناک چڑھا
اسے نہ عطر میسر تھا جو گلاب لکھا

جگر کباب لکھا اپنا تو کہا جل کر
بھلا جی کیا میں شرابی تھا جو کباب لکھا

حساب شوق کا دفتر لکھا تو جھنجلا کر
کہا میں کیا متصدی تھا جو حساب لکھا

جو بے حساب لکھا اشتیاق دل تو کہا
وہ کس حساب میں ہے یہ بھی بے حساب لکھا

ہوئی جو رد و بدل ایسی کتنے بار نظیر
تو اس نے خط کا ہمارے نہ پھر جواب لکھا

نظر پڑا اک بت پری وش نرالی سج دھج نئی ادا کا
جو عمر دیکھو تو دس برس کی یہ قہر آفت غضب خدا کا

جو گھر سے نکلے تو یہ قیامت کہ چلتے چلتے قدم قدم پر
کسی سے کہ چٹکی کسی کے کہنی کسی کے ٹھوکر نپٹ لڑاکا

گلے سے لپٹنے میں یہ شتابی یہ اضطرابی کہ مثل بجلی
ادھر جو چمکا چمک چمک کر ادھر جو لپکا تو پھر چھپاکا

یہ رنج وحشت یہ دور کھنچنا یہ ننگ عاشق کے دیکھنے کا
جو پتا کھڑکے ہوا سے آ کر تو سمجھے کھٹکا نگہ کے پا کا

نہ وہ سنبھالا کسی کے سنبھلے نہ وہ منایا منے کسی سے
جو قتل عاشق پہ آکے مچلے تو خنجر کا پھر نہ آشنا کا

یہ چنچلاہٹ یہ اچپلاہٹ خبر نہ سر کی نہ تن کی سدھ بدھ
جو چیرا اکھڑا بلا سے بکھرا نہ بند باندھا کبھی قبا کا

یہ ناز چلنے میں اچپلاہٹ کہ دل کہیں ہے نظر کہیں ہے
کہاں کا اونچا کہاں کا نیچا خیال کس کو قدم کے جا کا

لڑا دی آنکھیں یہ بے حجابی کہ پھر پلک سے پلک نہ ماری
جو نظریں نیچے کرے تو گویا کھلا سراپا چمن حیا کا

جو شکل دیکھو تو بھولی بھالی جو باتیں سنئے تو میٹھی میٹھی
یہ دل وہ پتھر کہ سر اڑا دے جو نام لیجے کبھی وفا کا

نظیر چھپ جا کہیں سرک جا بدل لے صورت چھپا لے منہ کو
جو دیکھ پاتا ہے وہ ستم گر تو یار پھر ہے ابھی جھڑاکا

وہ رشک حور جو وقت سحر بے نقاب تھا
دیکھ اُس کے رُخ کو دھہ بہ زمیں آفتاب تھا

اک دن دل اپنا عیش گزشتہ کو یاد کر قطعہ رہ رہ کے ہم سے مانگتا اس کا جواب تھا
یعنی وہ کیا زمانۂ عشرت تھا اے نظیرؔ جس میں ہزار عیش سے میں کامیاب تھا
اب زار و ناتوان و ضعیف و نحیف ہوں نقش طلسم تھا وہ کوئی یا حباب تھا
اک جنبش مژہ میں وہ برہم ہوا طلسم کیا کہیے اس کو اور مگر یہ کہ خواب تھا
جب ہم نے دل سے بھر کے دم سرد یوں کہا جس میں مے طرب سے تو مست و خراب تھا
ہیہات کیا بتائیں ہم اس عصر خوش کا نام اے غفلت آشنا وہی عہد شباب تھا
تھی باغ زندگی کی اسی سے ہی آب و رنگ دیوان عمر کا بھی وہی انتخاب تھا
اپنی تو فہم میں وہی ہنگام دل فروز
مجموعۂ حیات کا لب لباب تھا

ہر ایک گھاٹ پہ ہے اب رواج پریوں کا عجب نہان ہے دریا پہ آج پریوں کا
جو خوبرو ہیں ہم ان کے حکیم ہیں یارو کیا ہے ہم نے ہمیشہ علاج پریوں کا
جدھر کو دیکھیے پریاں تمام پھرتی ہیں ہوا جہان میں کیا یارو راج پریوں کا
نہ بیٹھے دل کا کبوتر کسی کے دانے پر ہمیشہ اس نے تو کھایا ہے ناج پریوں کا
ملی کل ایک جو رنڈی سیاہ بدصورت ق ہمارا دیکھ کرے جس کو لاج پریوں کا
کہا نظیرؔ تو ہم پاس کیوں نہیں آتا کہ ہم نے حسن میں پایا ہے تاج پریوں کا
ہم آج وہ ہیں پری زاد گل بدن گل رو کہ ہم کو حسن میں آیا خراج پریوں کا
یہ سن کے میں نے کہا بی یہ وہ مثل ہے آج
کہ ہو چڑیل کی صورت مزاج پریوں کا

جن دنوں حسن بتاں کے دل نپٹ نظارہ تھا سو یہ سو ہر دم دواں ادھر کو یہ کو آوارہ تھا

بس طفلی پل میں طے کر آ گیا پیری میں حیف　　ہمدم اپنی عمر کا اختر عجب سیارہ تھا
جب تلک خون تھا رگوں میں گردیتے خونخوار بھی　　ہو چکا جب وہ تو پھر کب آشنا خونخوارہ تھا
مدتوں میں ایک دن ہم دل سے ملنے کو گئے　　کس سبب مربوط اس سے اپنا جی ہموارہ تھا

ساقی بہار آئی اور جوش ہے گلوں کا　　لا جام بھر کے سن لیں ٹک شور بلبلوں کا
دل لے کے تو بھی ظالم ملتا نہیں خوشی سے　　شکوہ کروں میں کیا کیا اس کے تغافلوں کا

قطعہ

کل تو نظر کیا کیا سیریں ہوئیں چمن میں　　مدت کے بیچ نکلا ارمان دل جلوں کا
باراں میں مے کشی کی ٹھہریں عجب بہاریں　　کچھ باغ کی ہوائیں، کچھ رنگ بادلوں کا
اس میں وہ شوخ گل رو منہ پاس میرے لا کر　　بولا کہ لے لے بوسہ ان حسن کے گلوں کا
منہ دیکھ دیکھ اس کا میں نے کہا کہ پیاری　　سمجھا ہوں میں، تمہارے انداز چوچلوں کا
رخسار کا تو بوسہ زنہار میں نہ لوں گا　　اس کا ادب نہ رکھنا ہے فہم جاہلوں کا
ایسا ہی گر ہے دینا تو دیجئے لبوں سے　　بوسہ لبوں کا لینا ہے کام کاملوں کا
جب تو وہ شوخ ہنس کر بولا یہ وہ مثل ہے
یعنی کہ گڑ تو کھا دیں پرہیز گلگلوں کا

گلہ لکھوں میں اگر تیرے غم کے چھالوں کا　　تو پھر نباہ نہ پچھلوں کا اور نہ پہلوں کا
سنے سے نام محبت کا تھرتھراتے ہیں　　یہ کچھ تو حال ہے تیرے ستم کے دہلوں کا
جدھر کو دیکھیے ادھر آپ ہی جھمکتا ہے　　مزا پڑے نہ اسے کیونکہ شیش محلوں کا
کہا میں یار سے ایک دن کہ جی یہ چاہے ہے　　طریق جیسے ہے عشرت کے اہلے گہلوں کا
مکاں ہو ایک سنہرا دھرے ہوں شیشہ و جام　　بچھا ہو فرش بھی واں بادلے رو پہلوں کا

کھلی ہو چاندنی بکھرے ہوں ڈھیر پھولوں کے ۔۔۔ پلنگ بھی نرمی سے ہو جی رُئی کے پھلوں کا
یہ سن کے اس نے کہا یہ تو وہ مثل ہے نظیر
کہ سوویں جھونپڑے میں خواب دیکھیں محلوں کا

رتبہ کچھ عاشقی میں نہ کم ہے فقیر کا ۔۔۔ ہیں جن کے سب صنم وہ صنم ہے فقیر کا
تکیہ اسے نہ بھول کے کہنا کبھی میاں ۔۔۔ تکیہ نہیں یہ باغِ ارم ہے فقیر کا
رہتا ہے پھر وہ پھولتا مثل سدا سہاگ ۔۔۔ جس گلبدن پہ لطف و کرم ہے فقیر کا
گھٹ جائیں جس کو دیکھ کے لاکھوں تری گھٹا ۔۔۔ اے ابرِ تر وہ دیدۂ نم ہے فقیر کا
لکھتا ہے بن تراشے ہی حرفوں کے جوڑ توڑ ۔۔۔ اے خوش نویس یہ وہ قلم ہے فقیر کا
ظلِ ہما بھی واں سے سعادت کرے حصول ۔۔۔ جس سرزمیں پہ نقشِ قدم ہے فقیر کا
ہیں زیرِ سایہ اس کے ہزاروں گدا و شاہ ۔۔۔ بیرق اسے نہ کہو یہ علم ہے فقیر کا
کیونکر لکھے نہ فقر کے شان و شکوہ کو
یارو نظیر پر بھی کرم ہے فقیر کا

عیسیٰ کے قُم سے حکم نہیں کم فقیر کا ۔۔۔ اِذنی پکارتا ہے سدا دم فقیر کا
خوبی بھری ہے جس میں دو عالم کی کوٹ کوٹ ۔۔۔ اللہ نے کیا ہے وہ عالم فقیر کا
سب جھوٹ ہے کہ تم کو ہمارا ہو غم میاں ۔۔۔ بابا کسے خدا کے سوا غم فقیر کا
ہم کیوں نہ اپنے آپ کو رولیویں جیتے جی ۔۔۔ اے دوست کون پھر کرے ماتم فقیر کا
مرجائیں ہم تو یہ بھی خبر ہو نہ تم کو آہ ۔۔۔ کیا جانے کب جہاں سے گیا دم فقیر کا
اب ہم پہ کیا گزرتی ہے اور کیا گزر گئی ۔۔۔ کس سے کہیں وہ یار ہے محرم فقیر کا
جب جیتے جی کسی نے نہ پوچھا تو مہربان ۔۔۔ پھر بعد مرگ کس کو رہا غم فقیر کا

ہو کیوں نہ اس کو فقر کی باتوں میں دستگاہ
ہے بالکا نظیرؔ یہ اُتم فقیر کا

رہوں کا ہے کو دل خستہ پھروں کا ہے کو آوارہ
اگر آں ترک شیرازی بہ دست آرد دل مارا

خدا اگر مجھ گدا کو سلطنت بخشے تو میں یارو
بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

ہم اپنا تو بہشت اور چشمۂ کوثر سمجھتے ہیں
کنارِ آبِ رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را

زمیں پر آیا جب یوسف اسی دن آسماں رویا
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

جو صاحب حسن ہیں ہرگز نہیں محتاج زینت کے
بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

بتوں کی گالیوں میں بھی عجب لذّت نکلتی ہے
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خا را

تو ہستی کی گرہ پر عقل کا ناخن نہ توڑ اے دل
کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معما را

نصیحت کیمیا ہے جب تو گوش دل سے سنتے ہیں
جوانان سعادت مند پند پیر دانا را

نظیرؔ اس لطف سے تضمین تو کر مصرعۂ حافظ
کہ بر نظم تو افشاند فلک عقد ثریا را

میں ہوں اور مہ رو ہے اور ساقی ہے اور بزم شراب
پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب

جوش عشرت دور ساغر رقص خوباں صحن باغ
پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب

قصر رنگیں فرش زریں وقت خلوت جائے عیش
پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب

بوسہ بازی ہمکناری بے حجابی سرخوشی
پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب

خوش لباسی خوش معاشی خوش مذاقی خوش رہا
پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب

گل فشانی شادمانی، کامرانی، خرمی
پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب

عشق بازی عیش سازی شہ خیالی بے غمی
پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب

دل کشائی بادہ نوشی، ذوقِ مستی خرمی — پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب

اس طرح کی عشرتوں میں اب تو بیٹھا ہے نظیرؔ
پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب

بزمِ طرب وقتِ عیش ساقی و نقل و شراب — کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب
مجمعِ خوباں و لے، زمزمۂ چنگ و نے — کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب
صحنِ چمن، حسنِ گل، ابر و ہوا، شربِ مل — کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب
عشرتِ صبحِ بہار، سیرِ گل و لالہ زار — کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب
رقصِ بتِ غنچہ لب، کثرتِ عیش و طرب — کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب
عشق کے عجز و نیاز، حسن کے انداز و ناز — کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب
مستیٔ میخانہ ہا، گردشِ پیمانہ ہا — کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب
شادیٔ وصلِ بتاں، صحبتِ مہ طلعتاں — کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب
غلغلِ کوسِ نشاط، خوش دلی و انبساط — کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب
ثروت و مال و منال، حشمت و جاہ و جلال — کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب

قصر و محل دل پذیر زینت و زیب اے نظیرؔ
کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب

یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے با آب و تاب — اہلِ صورت کا ہے دریا اہلِ معنی کا سراب
وہ معلّیٰ قصرِ رنگین و منقّش زرنگار — جن کی رنگینی سے تھا قصرِ ارم کو پیچ و تاب
وہ مطلّا شہ نشینیں وہ مذہّب بام و در — وہ مرصّع خواب گاہیں بہرِ عیش و بہرِ خواب
وہ عظیم الشان مکاں دیتی تھیں جن کی رفعتیں — ہنس کے طاقِ آسماں کو طاقِ ابرو سے جواب

صحن میں بُستاں بھرا ایسے پُراز غلمان و حور　　جن کے انہاروں میں جائے آب گل خالص گلاب
ان میں تھے وہ صاحب ثروت جنھیں کہتے تھے خلق　　کیقباد و قیصر و کیخسرو و افراسیاب
مہروش، بہرام صولت بدر قدر و چرخ رخش　　مشتری ہمت ثریا بارگہ، کیواں جناب
وہ تجمل وہ تمول وہ تفوق وہ غرور　　وہ تحشم وہ تنعم وہ تعیش وہ شباب
ہر طرف فوج بتاں ہر سو ہجوم گل رخاں　　جن کے عارض رشک ماہ و رشک روئے آفتاب
چشمک و آن و اشارات و ادا و سرکشی　　طنز و تعریض و کنایت غمزہ و ناز و عتاب
صبح سے لے شام تک اور شام سے لے تا بہ صبح　　متصل رقص و سرود و پے بہ پے جام شراب
ساقی و مطرب، ندیم و مستی و میخوارگی　　ساغر و مینا گل و عطر و مے و نقل و کباب
کثرت اہل نشاط و جوش نوشا نوش مے　　از زمیں تا آسماں شور نے و چنگ و رباب
وہ بہاریں وہ فضائیں وہ ہوائیں وہ سرور　　وہ طرب وہ عیش کچھ جس کے نہیں حد و حساب
یا تو وہ ہنگامہ تنشیط تھا یا دفعتاً　　کر دیا ایسا کچھ اس دور فلک نے انقلاب
جو وہ سب جاتے رہے دم میں حباب آسا مگر　　رہ گئے عبرت زدہ وہ قصر ویران و خراب
تھا جہاں وہ مجمع عالی وہاں اب ہے تو کیا　　نقش سُم گور خر یا کوئی کھنڈر پر عقاب
ہیں اگر دو خشت باہم تو لب افسوس ہیں　　اور جو کوئی طاق ہے تو صورت چشم پُر آب

خواب کہیے اس تماشے کو نظیر اب یا خیال
کچھ کہا جاتا نہیں واللہ اعلم بالصواب

کہا یہ آج ہمیں فہم نے سنو صاحب　　یہ باغ دہر غنیمت ہے دیکھ لو صاحب
جو رنگ و بو کے اٹھانے ہیں حظ اُٹھا لیجئے　　مبادا پھر کف افسوس کو ملو صاحب
یہ وہ چمن ہے نہیں ایک سے نہیں جس میں　　تبدل اس کا ہر ایک گل سے سوچ لو صاحب

کہ تھا جو صبح شگفتہ نہ تھا وہ شام کے وقت جو شام تھا سو نہ دیکھا وہ صبح کو صاحب
پس اس مثال سے ظاہر ہے یہ سخن یعنی اسی طریق سے عالم میں تم بھی ہو صاحب

جو سرنوشت ہے ہوگا اسی طرح سے نظیر
قضا قضا نہیں ہونے کی کچھ کرو صاحب

تری قدرت کی قدرت، کون پا سکتا ہے کیا قدرت ترے آگے کوئی قادر کہا سکتا ہے کیا قدرت
تو وہ یکتائے مطلق ہے کہ یکتائی میں اب تیری کوئی شرکِ دُوئی کا حرف لا سکتا ہے کیا قدرت
زمیں سے آسماں تک تو نے جو جو رنگ رنگے ہیں یہ رنگ آمیزیاں کوئی دکھا سکتا ہے کیا قدرت
ہزاروں گل، ہزاروں گلبدن تو نے بنا ڈالے کوئی مٹی سے ایسے گل کھلا سکتا ہے کیا قدرت
ہوئے ہیں نور سے جن کے زمین و آسماں پیدا کوئی یہ چاند، یہ سورج بنا سکتا ہے کیا قدرت
ہوا کے فرق پر کوئی بنا کر ابر کا خیمہ طنابیں تار باراں کی لگا سکتا ہے کیا قدرت
جم و اسکندر و دارا و کیکاؤس و کیخسرو کوئی اس ڈھب سے دل بادل بنا سکتا ہے کیا قدرت
کیا نمرود نے گو کبر سے دعویٰ خدائی کا کہیں اُس کا یہ دعویٰ پیش جا سکتا ہے کیا قدرت
نکالا تیرے اک پشے نے کفشیں مار مغز اس کا سوا تیرے خدا کوئی کہا سکتا ہے کیا قدرت
نکالے لکڑیوں سے تو نے جس جس لطف کے میوے کوئی پیڑوں میں یہ پیڑے لگا سکتا ہے کیا قدرت
ترے ہی خوانِ نعمت سے ہے سب کی پرورش، ورنہ کوئی چیونٹی سے ہاتھی تک کھلا سکتا ہے کیا قدرت
ہماری زندگانی کو بغیر از تیری قدرت کے کوئی پانی کو پانی کر بہا سکتا ہے کیا قدرت
ترے حسنِ تجلی کا، جہاں ذرہ جھمک جاوے تو پھر موسیٰ کوئی واں تاب لا سکتا ہے کیا قدرت
دمِ عیسیٰ میں وہ تاثیر تھی تیری ہی قدرت کی وگرنہ کوئی مُردے کو جلا سکتا ہے کیا قدرت
تو وہ محبوب تجمل ہے کہ بارِ ناز کو تیرے بغیر از مصطفیٰ کوئی اٹھا سکتا ہے کیا قدرت

نظیر اب طبع پر جب تک نہ فیضانِ الٰہی ہو
کوئی یہ لفظ یہ مضمون بنا سکتا ہے کیا قدرت

درپے ہیں دل لینے کے ادھر عشوہ گرے چند
خواہندۂ یک جان ہیں اُدھر مو کمرے چند

کیا کیا مگس عقل کے باندھیں ہیں پر و بال
کر کر کے شکر خندہ بہم لب شکرے چند

مژگان تر و سرد دم و رنگ شکستہ
ہیں الفت پنہاں کے یہی پردہ درے چند

ایک دن یہ ہوا عزم کہ با صد طرب و عیش
گلشن میں بسر کیجیے شام و سحرے چند

جب گھر سے چلے ہم تو ملے راہ میں یک جا
حیرت زدہ خستہ خونیں جگرے چند

دیکھا جو مجھے سوئے چمن گرم تگ و پو
یوں لب سے کہے پند کے افشا گہرے چند

اے یار تو جاتا ہے چمن میں تو خبردار
جلدی سے نکل آئیو کر کر نظرے چند

واں آج تو البتہ مہیا ہیں یہ ہر سو
داؤدی و نسرین و گل و برگ و برے چند

گل برگ خزاں دیدہ نظیر اس میں اڑیں گے
اور ہوں گے پڑے بلبل و قمری کے پرے چند

اے مری جان ہمیشہ ہو تری جان کی خیر
نازکی و دلربا حسن کے سامان کی خیر

رات دن شام سحر پہر گھڑی پل ساعت
مانگتے جاتی ہے ہم کو تری آن آن کی خیر

مہندی چوٹی ہو سوائی ہو چک پیٹی کی
عمر چوٹی کی بڑی زلف پریشان کی خیر

بے طرح بوجھ سے جھمکوں کے جھکے پڑتے ہیں
کیجو اللہ تو ان جھمکوں کی اور کان کی خیر

پان کھایا ہے تو اس وقت بھی لازم ہے یہی
ایک بوسہ ہمیں دیجیے لب و دندان کی خیر

آنکھ اٹھا دیکھیے اور دیکھ کے ہنس بھی دیجیے
اپنے کاجل کی زکوٰۃ اور مسی و پان کی خیر

پہلے جس آن تمہاری نے لیا دل ہم سے
اب تلک مانگتے ہیں دل سے ہم اس آن کی خیر

کیا غضب نکلے ہے بن ٹھن کے وہ کافر یارو   آج ہوتی نظر آتی نہیں ایمان کی خیر
جتنے محبوب پری زاد ہیں دنیا میں نظیرؔ
سب کے اللہ کرے حسن کی اور جان کی خیر

سحر ہم نے چمن اندر عجب دیکھا کل اک دلبر   سہی قامت پری پیکر مقطع وضع خوش منظر
سخن پر غنچہ لب گل رو جبین مہر اور کماں ابرو   دو چشم شوخ پر جادو نگہ تیر اور مژہ نشتر
شمیم زلف مشک افشاں تغافل سو ستم ساماں   غرور اور ناز بے پایاں مزاج اور طبع نازک تر
ادائیں سب فسوں آئین چھوٹیں دل نچھوڑیں دیں   فریب و عشوہ صلح آگیں عتاب و غمزہ جنگ آور
یہ دیکھا ہم نے جب عالم تو رکھ دل ہاتھ پر ہمدم   کہا ہیں نذر کرتے ہم جو لے لیجئے تو ہے بہتر
کہا لیجا تو اپنا دل کہ تو کیا اور تیرا دل   نہ لیویں ہم تو ایسا دل کہا جب ہم نے یوں ہنس کر
یہی ایک دل ہے بیچارہ بھلا ہے یا کہ ناکارہ   اگرچہ ہے یہ آوارہ ولیکن ہے وفا پرور
جو نا منظور کرتے ہو تو کر دو یہ کب اٹھتا ہے   ہے جب تک دم میں دم اس کے رہے گا یہ اسی در پر
نظیرؔ اس نے سنا یہ جب تو بولا یوں وہ شیریں لب
ہمارا ہو چکا یہ اب بس اس قصے کو کوتہ کر

دنیا ہے اک نگار فریبندہ جلوہ گر   الفت میں اس کی کچھ نہیں جز کلفت و ضرر
آج اس پہ تھی کمین تو لگائی کل اس پہ گھات   حسرت فزا و ہوش ربا و شکیب بر
ہوتا ہے آخر اس کے گرفتار کا یہ حال   جیسے مگس کے شہد میں بھر جاویں بال و پر
سحر و فسوں وہ رکھتی ہے بہر فریب دل   حیران ہو سحر سامری بھی جس کو دیکھ کر
لینے کو نقد عمر کے شیریں ہے مثل قند   جب چکھئے تو ہوتی ہے حنظل سے تلخ تر
جو اس سے دل لگاتے ہیں آخر ہو منفعل   ملتے ہیں اپنے دست تاسف بہ یک دگر

تو بھی جو اُس کے پاس لگاوے گا دل تو یار
اس نخل سے ملے گا تجھے بھی یہی ثمر

میں تجھ کو اس کے ربط سے کرتا نہ منع آہ
لیکن کروں میں کیا تجھے در پیش ہے سفر

تو اس مثل کو سوچ ذرا، گر سفر گزیں
کرتا ہے قطع راہ کو باندھے ہوئے کمر

گر درمیان رہ کوئی مل جاوے باغ اُسے
تو چلتے چلتے دیکھتا جاتا ہے اک نظر

بس اس نگار خانے کو تو بھی اسی نمط
سیر مسافرانہ کر اور اس سے درگزر

اِس حرف کو نظیرؔ کے یوں دل میں دے مکان
کرتا ہے جیسے نقش، نگیں کے جگر میں گھر

قصر رنگیں سے گزر باغ و گلستاں سے نکل
ہے وفا پیشہ تو مت کوچۂ جاناں سے نکل

نکہت زلف یہ کس کی ہے کہ جس کے آگے
ہوئی خجلت زدہ بو سنبل و ریحاں سے نکل

گو بہار اب ہے ولے روز خزاں آکے بلبل
یک قلم نرگس و گل جاویں گے بستاں سے نکل

امتحاں کرنے کو یوں دل سے کہا ہم نے رات
اے دل غمزدہ اس کاکل پیچاں سے نکل

کھا کے سو پیچ کہا میں تو نکلنے کا نہیں
مگر اے دشمن جاں چل تو مری ہاں سے نکل

ہو پریشانی سے جس کی مجھے سو جمعیت
کس طرح جاؤں میں اس زلف پریشاں سے نکل

لاکھ زنداں پر آفات میں ہوتا ہے وہ قید
جو کوئی جاتا ہے اس طور کے زنداں سے نکل

مجھ سے ممکن نہیں محبوب کی قطع اُلفت
گرچہ میں جاؤں گا اس عالم امکاں سے نکل

چاہ میں مجھ کو یہ مرشد کا ہے ارشاد نظیرؔ
آبرو چاہے تو مت چاہ زنخداں سے نکل

جو دل کو دیجیے تو دل میں خوش ہو کرے ہے کس کس طرح کی چہلیں
وگرنہ دیجیے تو وہ ہیں کیا کیا جتاوے خفگی، عتاب، اکڑ، بل

اگر یہ کہیے کہ ہم میں بیکلی ذرا سی ہے اے دل تو ہنس کے ظالم
دکھاوے بے کل اٹھا کے یعنی بلا سے میری تجھے تو ہے کل

گر اس بہانے سے ہاتھ پکڑیں کہ دیکھ دل کی دھڑک ہمارے — تو ہاتھ جھپ سے چھڑا لے کہہ کر مجھے نہیں ہے کچھ اس کی اٹکل
جو چھپ کے دیکھیں تو تاڑ جاوے، اگر صریحاً تو دیکھو پھرتی — کہ آتے آتے نگاہ رخ تک چھپا لے منہ کو الٹ کے آنچل
کرے جو وعدہ تو اس طرح کا کہ دل کو سنتے ہی ہو تسلی — جو سوچیے پھر تو کیسا وعدہ فقط بہانہ، فریب اور چھل
جو دل کو بوسے کے بدلے دیجے، تو ہنس کے لیلے بہت خوشی سے — جو بوسہ مانگو تو پھر یہ نقشا کبھی تو آج اور کبھی کہے کل

نہ چل میں آوے نہ بھڑکے نکلے نہ پاس بیٹھے نظیرؔ اک دم
بڑا ہی پُرفن، بڑا ہی سیانا، بڑا ہی شوخ اور بڑا ہی چنچل

دکھا کر ایک جھمک دل کو نہایت کر گیا بیکل — پری رو، تند خو، سرکش، ہٹیلا، چلبلا، چنچل
وہ عارض اور جبیں تاباں کہ ہوں شرمندہ دیکھ اس کو — قمر، خورشید، زہرہ، شمع، شعلہ، مشتری، مشعل
کفوں میں انگلیوں میں لعل لب میں چشم مژگوں میں — حنا، آفت، ستم، فندق، مسی، جادو، فسوں، کاجل
بدن میں جامۂ زرکش سراپا جس پہ زیب آور — کڑے، بندے، چھڑے، چھلے، انگوٹھی، نورتن، ہیکل
نزاکت اور لطافت وہ کف پا تک کہ حیراں ہوں — سمن، گل، لالہ، نسریں، نسترن، دُر، پرنیاں، مخمل
سراسر پُر فریب ایسا کہ ظاہر جس کی نظروں سے — شرارت، شوخی، عیاری، ٹھگ، پھرتی، دغا، چھل بل

نظیرؔ ایک عمر عشرت ہو جو ملے ایسا پری پیکر
اگر ایک آن، اگر ایک دم، اگر ایک چھن، اگر ایک پل

اسی کی ذات کو ہے دائماً ثبات و قیام — قدیر و حی، کریم و مہیمن و منعام
بہ درج بارہ میں لاکر رکھی وہ بارہ دری — کہ جس کو پہنچے نہ فکرت نہ دانش و اوہام
ادھر فرشتہ کروبی اور ادھر غلمان — قلم کو لوح پہ بخشی ہے جس نے طاقت ارقام
یہ دو ہیں شمس و قمر اور ساتھ ان کے یار — عطارد و زحل و زہرہ، مشتری بہرام
جو چاہیں ایک پلک ٹھہریں یہ سو طاقت کیا — پھرا کریں گے یہ آغاز سے لے تا انجام

بشر جو چاہے کہ سمجھے انھیں سو کیا امکان / ہے یہاں فرشتوں کی عاجز عقول اور افہام
نکالے ان سے گل و میوہ شاخ و برگ و بار / سب اُس کے لطف و کرم کے ہیں عام یہ انعام
اسی کے باغ سے دل شاد ہو کے کھاتے ہیں / چھُہارے کشمش و انجیر پستہ و بادام
چمک رہا ہے اسی کی یہ قدرتوں کا نور / بہ ہر زمان و بہ ہر ساعت و بہ ہر ہنگام
کہ اس کا شکر کریں شب سے تا بہ روز ادا / اطاعت اس کی بجا لاویں صبح سے تا شام
نظیرؔ نکتہ سمجھ، مہر و فضل خالق کو
اسی کے فضل سے دونوں جہاں میں ہے آرام

ہر آن تمھارے چھپنے سے ایسا ہی اگر دکھ پائیں گے ہم / تو ہار کے آخر اس کی بھی تدبیر کوئی ٹھہرائیں گے ہم
بیزار کریں گے پہلے تو خاطر کو تمھاری چاہت سے / پھر دل کو بھی کچھ ہیبت سے کچھ منت سے سمجھائیں گے ہم
گر کہنا دل نے مان لیا اور رک بیٹھا تو بہتر ہے / اور چین نہ لینے دیوے گا تو بھیس بدل کر آئیں گے ہم
اول تو نہیں پہچانو گے اور لو گے بھی پہچان تو پھر / ہر طور سے چھپ کر دیکھیں گے اور دل کو خوش کر جائیں گے ہم
گر چھپنا بھی کھل جاوے گا تو مل کر جادو سازوں سے / کچھ اور ہی لٹکا سحر بھرا اس وقت بہم پہنچائیں گے ہم
جب وہ بھی پیش نہ جاوے گا اور شہرت ہووے گی پھر تو / جس صورت سے بن آوے گا تصویر کھنچا منگوائیں گے ہم
موقوف کرو گے چھپنے کو تو بہتر ورنہ نظیرؔ آسا
جو حرف زباں پر لاویں گے ہم پھر وہ ہی کر دکھلائیں گے ہم

تدبیر ہمارے ملنے کی جس وقت کوئی ٹھہراؤ گے تم / ہم اور چھپیں گے یہاں تک جی خوب ہی پھر گھبراؤ گے تم
بیزار کرو گے دل ہم سے نا منت ڈر سے روکو گے / وہ دل تو ہمارے بس میں ہے کس طور اسے سمجھاؤ گے تم
گر بھیس بدل کر آؤ گے ہم کتنے تاڑنے والوں کو / اس کوچے میں بٹھلا دیں گے پھر کیونکر آؤ گے تم
گر چھپ کر دیکھنے آؤ گے ہم اپنے بالا خانے کے / در پردے چھوڑ کے رکھیں گے پھر کیونکر دیکھنے پاؤ گے تم

گر جادو منتر سیکھو گے تو سحر ہماری نظروں کا　　تاثیر کو اس کی کھو دے گا کچھ پیش نہیں لے جاؤ گے تم
تصویر اگر منگواؤ گے تو دیکھ ہماری صورت کو　　حیران مصور ہووے گا پھر رنگت کہو کیا لاؤ گے تم

جس وقت نظیر ان باتوں کی ہم خوب کریں گے ہشیاری
جو حرف زباں پر لاؤ گے تم پھر کیونکر کر دکھلاؤ گے تم

کی طلب ایک شہ نے کچھ پند از حکیم نکتہ داں　　اس نے سن کے یوں کہا اے صاحب اقبال و شاں
یاد رکھ اور پاس رکھ اور سخت رکھ اور جمع کر　　کھا اور چھپا، کاٹ اور اٹھا دے سے بخوبی ہر زماں
اس نے اس مجمل کے تفصیلات جب پوچھے تو پھر　　لطف سے اس نکتہ رس نے یوں کہا اس کا بیاں
یاد رکھ ہر دم خدا کو پاس رکھ حسن وفا　　سخت رکھ دین کو مدام اور جمع کر علم اے جواں
کھا غضب غصہ، چھپا عیب رفیق و آشنا　　کاٹ ربط ہم نشین بد کہ ہے اس میں زیاں
اور اٹھا ہر دم ضعیف و ناتواں سے ظلم و جور　　داد مظلوموں کی دے اور لے بہشت جاوداں

نثر میں مجھ کو نظیر آئے تھے یہ نکتے نظر
میں نے نظم ان کو کیا تو دل ہو ہر دم شادماں

کل نظر آیا چمن میں اک عجب رشک چمن　　گل رخ و گل گوں قبا و گل عذار و گل بدن
مہر طلعت، زہرہ پیکر، مشتری رو، مہ جبیں　　سیم بر، سیماب طبع و سیم ساق و سیم تن
نازنیں، ناز آفریں، نازک بدن، نازک مزاج　　غنچہ لب، رنگیں ادا، شکر دہاں، شیریں سخن
تیر قد، نشتر نگہ، مژگاں سناں، ابرو کماں　　برق تاز و رزم ساز و نیزہ باز و تیغ زن
بے مروت، بے وفا، بے درد، بے پرواہ خرام　　جنگ جو، قتال وضع و سرفراز و سر فگن
زلف و کاکل، خال و خط چاروں کے یہ چاروں علام　　مشک تبت، مشک چیں، مشک ختا، مشک ختن
دوش و بر، دنداں و لب چاروں کے یہ چاروں بدل　　نسترن، برگ سمن، در عدن، لعل یمن

مبتلا ایسے ہی خوش وصفوں کے ہوتے ہیں نظیرؔ
بے قرار و دل فگار و خستہ حال و بے وطن

مجھ کا سے سر کو چھپا ہوں یوں میں بحرِ غم کی لہروں میں ۔۔۔ کوئی کھیلے ہے جیسے بازیٔ شطرنج پہروں میں
پھنسے ہیں جیسے مہرے خانے خانے میں بساط اوپر ۔۔۔ رکھیں ہیں دل یونہی اس زلف کے حلقوں کے لہروں میں
ہمارے دل سے کیا کیا پیل بند صبر توڑے ہے ۔۔۔ پڑی ہے یہ جو زنجیر طلا پے چھلے سنہروں میں
رکھیں سرسبز کشتِ غم کو کیونکر اسے شہ خوباں ۔۔۔ نہیں یک قطرۂ آب اب تو ان آنکھوں کی نہروں میں
تدبر و کیک فرزیں بند غم سے رُخ ہیں سلے مہ رُخ ۔۔۔ تری ان اچپلی چالوں کی سُن کر دھوم شہروں میں
دلا تو یا پیادہ، وہ سوارِ اسپ خوبی ہے ۔۔۔ نہ کر ملنے کے منصوبے، نہ پڑ ان سورج گھروں میں

نظیرؔ اب دل تجھیں دیتا ہے لے لو، بُرد ہی سمجھو
وگرنہ یار پھر ہوگی یہ بازی مات پہروں میں'

کر کے بسنتی لباس سب سے برس دن کے دن ۔۔۔ یار ملا آن کر ہم سے برس دن کے دن
کھیت پہ سرسوں کے جا، جام صراحی منگا ۔۔۔ دل کی نکالی میاں ہم نے ہوس دن کے دن
سب کی نگاہوں میں دی عیش کی سرسوں کھلا ۔۔۔ ساقی نے کیا ہی لیا واہ یہ جس دن کے دن
خلق میں شورِ بسنت یوں تو بہت دن سے تھا ۔۔۔ ہم نے تو لوٹی بہارِ عیش کی بس، دن کے دن
آگے تو پھرتا رہا غیروں میں ہو زرد پوش ۔۔۔ ہم سے ملا پر وہ شوخ کھا کے ترس دن کے دن
گرچہ یہ تہوار کی پہلی خوشی ہے زیاد ۔۔۔ عین جو رس ہے سو وہ نکلے ہے رس دن کے دن

لوٹے گا پھر سال بھر گلبدنوں کی بہار
یار سے مل لے نظیرؔ، آج برس دن کے دن

نہ لذتیں ہیں وہ ہنسنے میں اور نہ رونے میں ۔۔۔ جو کچھ مزا ہے ترے ساتھ مل کے سونے میں

پلنگ پہ سیج بچھاتا ہوں مدتوں سے جان — کبھی تو آن کے سو جا مرے بچھونے میں
مسک گئی ہے وہ انگیا جو تنگ بندھنے سے — تو کیا بہار ہے کافر کے چاک ہونے میں
کہا میں اُس سے کہ ایک بات مجھ کو کہنی ہے — کہوں ہوں جب کہ چلو میرے ساتھ کونے میں
یہ بات سنتے ہی جی میں سمجھ گئی کافر — کہ تیرا دل ہے کچھ اب اور بات ہونے میں
یہ سن کے بولی کہ ہے ہے یہ کیا کہا تو نے — پڑا ہے کیوں مجھے دنیا سے اب ڈکھونے میں
تو بوڑھا مردوا اور بارھواں برس مجھ کو — میں کس طرح سے چلوں تیرے ساتھ کونے میں

نظیر ایک وہ عیار سرتی ہے کافر
کبھی نہ آوے گی وہ تیرے جادو ٹونے میں

حال دل ہم نے کہا زہرہ جبیں کہہ دیویں — پھر جو ہو حکم سو وہ دل کے تئیں کہہ دیویں
اس پہ جو جو کہ گزرتا ہے تغافل کے سبب — ہو اگر آپ کے خاطر کو یقیں کہہ دیویں
چاہ میں اس نے جو کچھ دیکھیں ہیں رنج و کلفت — اور وہ جتنی کہ جفائیں ہیں سہیں کہہ دیویں
سُن کے اس بات کو اور ہم کو سمجھ کر بیباک — دل میں سوچا کہ مبادا یہ کہیں کہہ دیویں

ہنس دیا اور یہ کہا اس پہ جو گزری ہے نظیر
ہم کو معلوم ہے، کہیئے تو ہمیں کہہ دیویں

کیا کاسۂ مے لیجئے اس بزم میں اے ہمنشیں — دور فلک سے کیا خبر پہنچے گا لب تک یا نہیں
یہ کاسۂ فیروزہ گوں ہے شیشہ باز پر فنون — جتنے حیل ہیں اور فسوں سب اس کے ہیں زیر نگیں
ہو اعتماد اس کا کسے ہے کاسہ بازی یاد اسے — رکھتا ہے شاد ایک دم جیسے کرتا ہے پھر اندوہگیں
کل دامن صحرا میں ہم گزرے سے تھے وقت صبح دم — ایک کاسۂ سر پُر الم آیا نظر اپنے تئیں
بولا بہ فریاد و فغاں کیا دیکھتا ہے او میاں — تھے ہم کبھی سر بر آسماں گو اب پڑے ہیں بر زمیں

گل برگ سے نازک بدن، سرپاؤں سے رشکِ چمن
زریں و سیمیں پیرہن، دلکش مکانوں کی مکیں

دن رات نازاور نعمتیں مہ طلعتوں سے صحبتیں
عیش و نشاط و عشرتیں، ساقی قراں مطرب مکیں

باغ و چمن پیشِ نظر بزم و طرب شام و سحر
ہر سو بہ کثرت جلوہ گر، حسنِ بتانِ نازنیں

ایک آسماں کے دور سے ایک گردشِ فی الفور سے
ٹک سوچیے گا غور سے درلحظہ آں درلحظہ ایں

سنتے ہی جی تھرا گیا رخسار پر اشک آگیا
دل عبرتوں سے چھا گیا، خاطر ہوئی بس مہگیں

اس میں سراپا ناگہاں، ہر مو بنا مثلِ زباں
بولا نظیر آگہ ہو ہاں، من نیز روزے ہم چنیں

گر کسی صورت سے وہ صورت دکھا جاتے ہیں
تو غم و درد آج یہ صورت نہ دکھلاتے ہمیں

وہ تو اپنا منہ دکھا کر چھپ گئے پر ہمنشیں
دو پہر اب چاہئیں پھر ہوش میں آتے ہمیں

جیسے کل تم نے خفا ہو کر کہا تھا مر رہو
سچ اگر پوچھو تو کیا لگتا تھا مر جاتے ہمیں

پر یہ ڈر تھا پھر جو بلوا دیں سو بلوایا ہے آج
کیوں جی مر جاتے تو اب پھر تم کہاں پاتے ہمیں

ہم تو یہ کرتے ہیں خاطر داریاں اور مہریاں
تو بھی تم واللہ خاطر میں نہیں لاتے ہمیں

سن کے فرمایا چہ خوش بس اک نہ چلیے اس قدر
یہ تمہارے چوچلے ہی تو نہیں بھاتے ہمیں

ہجر کی سختی نظیر ایک تو یہ ہے جو شام سے
صبح ہو جاتی ہے اکثر سر کو ٹکراتے ہمیں

کیا دل لگاویں مہرباں ہم حسن صورت سے کہیں
نہ وہاں ثبات اس سے ہم نہ یہاں قیام اپنے تئیں

تھا اک مکان دلکشا رشکِ چمن جس کی فضا
تھی اس جگہ پر رونق فزا رقاصہ شوخ ایک نازنیں

قد حسرتِ سروِ چمن لب غیرتِ لعلِ یمن
جعدِ معنبر پُر شکن نوکِ مژہ نشتر قریں

دیکھ اس کی رقصوں کی ادا دل رقص میں ہے جابجا
نغمات یکسر سحر زا، انداز کُل جادو گریں

نازواداکی گرمیاں غارت گرِ صبروتواں ‏ طورِ تکلّم دُرفشاں، طرزِ تبسم شکّریں
کیاکیا لگاوٹ بے بدل کیاکیا رکھاوٹ برمحل ‏ کیاکیا بناوٹ پل بہ پل کرتی تھی وہ زہرہ جبیں
گردوں نے اک گردش جو کی زار وعجوزہ ہوگئی ‏ وہ نوجوانی تازگی دیکھا تو کوسوں تک نہیں
وہ گل سے مکھڑا زرد ہے گرمی کا عالم سرد ہے ‏ جان رنج وغم پُردرد ہے آزردہ دل اندوہگیں
جوں بید لرزاں دست و پا ہے جائے چوبِ گل عصا ‏ ہر مو جو سنبل رشک تھا کیسر ہے برگِ یاسمن
نہ چشم میں مستی رہی نہ خو میں وہ تندی رہی ‏ نہ لب میں وہ سُرخی رہی نہ مُنہ میں وہ دُرِ ثمیں
دیکھا اس کو ہم نے ناگہاں پوچھا کچھ اپنا کر بیاں ‏ تھی کل تو رشک گلستاں ہے آج خار بھگیں

بولی نظیرؔ عبرت ہیں رہ کیا پوچھنے کی ہے جگہ
یہاں کی یہی ہے رسم وراہ گگا ہے جہاں گاہے چنیں

کہا جو ہم نے "ہمیں در سے کیوں اٹھاتے ہو" ‏ کہا کہ "اس لئے تم یاں جو غل مچاتے ہو"
کہا "لڑاتے ہو کیوں ہم سے غیر کو ہمدم" ‏ کہا کہ "تم کبھی تو ہم سے نگہ لڑاتے ہو"
کہا جو حال دل اپنا، تو اس نے ہنس ہنس کر ‏ کہا "غلط ہے یہ باتیں جو تم بناتے ہو"
کہا "جتاتے ہو کیوں ہم کو روز ناز و ادا" ‏ کہا "کہ تم بھی تو چاہت ہمیں جتاتے ہو"
کہا کہ "عرض کریں ہم پہ جو گزرتا ہے" ‏ کہا "خبر ہے ہمیں کیوں زباں پہ لاتے ہو"
کہا کہ "روٹھے ہو کیوں ہم سے کیا سبب اس کا" ‏ کہا "سبب ہے یہی تم جو دل چھپاتے ہو"

کہا کہ "ہم نہیں آنے کے یاں" تو اس نے نظیرؔ
کہا کہ "سوچو تو کیا آپ سے تم آتے ہو"

نکلے ہو کس بہار سے تم زرد پوش ہو ‏ جس کی نوید پہنچی ہے رنگ بسنت کو
دی بر زمیں اب لباسِ بسنتی کو جیسے جا ‏ ایسے ہی تم ہمارے بھی سینے سے آلگو

گر ہم نے ہیں "بوسہ" کہیں دو تو لطف سے ۔۔۔ تم پاس منہ کو لاکے یہ ہنس کر کہو کہ "لو"
بیٹھو چمن میں نرگس و صد برگ کی طرف ۔۔۔ نظارہ کرکے عیش و مسرت کی داد دو
سن کر بسنت مطرب زریں لباس سے ۔۔۔ بھر بھر کے جام پھر مئے گل رنگ کے پیو
کچھ قمریوں کے نغمے کو دو سامعے میں راہ ۔۔۔ کچھ بلبلوں کا زمزمہ دل کشا سنو

مطلب یہ ہے نظیر کا یوں دیکھ کر بسنت
ہو تم بھی شاد، دل کو ہمارے بھی خوش کرو

نور حق شافع امت سے کہو عشق اللہ ۔۔۔ ہر دم اس شاہ ولایت سے کہو عشق اللہ
یاد کر، مومنو، اس کا وہ ہرا پیراہن ۔۔۔ سبزۂ باغ امامت سے کہو عشق اللہ
لشکر شام کو للکار کے تنہا وہ لڑا ۔۔۔ گوہر درج شجاعت سے کہو عشق اللہ
پہ سوا حق کی رضا اس نے نہ کچھ دم مارا ۔۔۔ اس جواں مرد کی ہمت سے کہو عشق اللہ
ہیں زمانے میں یہی بارہ امام اے یاراں ۔۔۔ سب ہر ایک صاحب عزت سے کہو عشق اللہ
راہ مولیٰ میں خوشی ہو کے دیا سر اپنا ۔۔۔ اِن شہیدوں کی شہادت سے کہو عشق اللہ
مال و جان دولت و گھر بار تلک بخش دیا ۔۔۔ اِس سخی دل کی سخاوت سے کہو عشق اللہ
دل میں خوش بیٹھے ہوئے کرتے ہیں اللہ اللہ ۔۔۔ اِن جوانوں کی قناعت سے کہو عشق اللہ
کہیں ہیں باطنی لوٹے ہیں عبادت کے مزے ۔۔۔ دوستو ان کی عبادت سے کہو عشق اللہ
چاہیں اکسیر کریں خاک کو ہر دم لے لے ۔۔۔ اُن کی سب کشف و کرامت سے کہو عشق اللہ

کہ سخن عشق کا پھر سب کو سناتا ہے نظیر
اس کے سب حرف و حکایت سے کہو عشق اللہ

انداز کچھ اور ناز و ادا اور ہی کچھ ہے ۔۔۔ جو بات ہے وہ نام خدا اور ہی کچھ ہے

نہ برق نہ خورشید نہ شعلہ نہ بھبوکا — کیوں صاحبو یہ حسن ہے یا اور ہی کچھ ہے
بلور کی چمکیں ہیں نہ الماس کی جھمکیں — اُس گورے سے سینے کی صفا اور ہی کچھ ہے
پیچھے کو نظر کی تو وہ گدی ہے قیامت — آگے کو جو دیکھا تو گلا اور ہی کچھ ہے
سینے پہ کہا میں نے یہ دو سیب ہیں کیا ہیں — شرما کے یہ چپکے سے کہا اور ہی کچھ ہے
تم باتیں ہمیں کہتے ہو اور سنتے ہیں ہم چپ — اپنی بھی خموشی میں صدا اور ہی کچھ ہے
ہیں آپ کی باتیں تو شکر ریز پہ اے جان — اس گونگے کے گڑ میں بھی مزا اور ہی کچھ ہے
پوچھی جو دوا ہم نے طبیبوں سے تو بولے — بیماری نہیں ہے یہ بلا اور ہی کچھ ہے
عناب نہ خطمی نہ بنفشہ نہ خیارین — اِس ڈھب کے مریضوں کی دوا اور ہی کچھ ہے

ہم کو تو نظیر اُن سے شکایت ہے جفا کی
اور اُن کا جو سنیے تو گلا اور ہی کچھ ہے

یہ جو اٹھتی کونپل ہے جب اپنا رنگ نکالے گی — ڈالی ڈالی چاٹے گی اور پتا پتا کھالے گی
ہونہار بروا کے پتے چکنے چکنے ہوتے ہیں — بہت نہیں کچھ تھوڑے ہی دن میں بل بھنگ کر لے گی
ابھی تو کیا ہے چھٹپن ہے نادانی ہے بے ہوشی ہے — پھر تو اس دن ہووے گا جب اپنا ہوش سنبھالے گی
ناز ادا اور غمزوں کے کچھ اور ہی کترے گی گل پھول — سین لگاوٹ چتون کا بھی اور ہی عطر نکالے گی
کاجل مہندی پان مسی اور کنگھی چوٹی میں ہر آن — کیا کیا رنگ بنا دے گی اور کیا کیا نقشے کاڑھے گی
جب یہ تن گدرا دے گا اور بازو باہیں ہووے گی گول — اُس دم دیکھا چاہیے کیا کیا پیٹ کے پاؤں نکالے گی
کس کس کا دل دھڑکے گا اور کون ملے گا ہاتھوں کو — پکپن ہے جب انگیا میں یہ کچے سیب اچھالے گی
پان چبا اور آئینے میں دیکھ کے اپنے ہونٹوں کو — کیا کیا ہنس ہنس دیوے گی اور کیا کیا ڈیٹھے بھالے گی
خانہ جنگیاں ہوویں گی اور لوگ مریں گے کٹ کٹ کر — شہر کے کوچے گلیوں میں ایک شور قیامت ڈالے گی

جب یہ میوۂ حسن کا رس رس پک کر ہووے گا تیار　　نا نکہ اس کی قیمت کا جب دیکھا چاہیئے کیا لے گی
سونا روپا سیم و جواہر صبر و دل و دیں ہوش و قرار　　آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہی ایک آن میں سب رکھوا لے گی
اپنے وقت جوانی میں یہ شوخ خدا ہی جانے نظیر
کس کس کا زر لوٹے گی اور کس کس کا گھر گھالے گی

چتون میں شرارت ہے اور سین بھی چنچل ہے　　کافر تری نظروں میں کچھ اور ہی چھل بل ہے
بالا بھی چمکتا ہے جگنو بھی دمکتا ہے　　بدھی کی لپٹ الگ پر تعویذ کی ہیکل ہے
گورا وہ گلا نازک اور پیٹ ملائی سا　　سینے کی صفائی بھی ایسی گویا مخمل ہے
وہ حسن کے گلشن میں مغرور نہ ہو کیونکر　　بڑھتی ہوئی ڈالی ہے اٹھتی ہوئی کونپل ہے
انگیا وہ غضب جس کو ملتی ہی کرے دل ہی　　کیا جانے کہ شبنم ہے تن سکھ ہے کہ ململ ہے
یہ دو جو نئے پھل ہیں سینے پہ ترے ظالم　　ٹک ہاتھ لگانے دے جینے کا یہی پھل ہے
ابھرا ہوا وہ سینہ اور جوش بھرا جوبن　　ایک ناز کا دریا ہے ایک حسن کا بادل ہے
کیا کیجئے بیاں یارو چنچل کی نکھاوٹ کا　　ہر بات میں دُر دُر ہے ہر آن میں چلبل ہے
یہ وقت ہے خلوت کا اے جان نہ کر کل کل　　کافر تری کل کل سے اب جی مرا بیکل ہے
کل میں نے کہا اس سے کیا دل میں یہ آیا جو　　کنگھی ہے نہ چوٹی ہے مسی ہے نہ کاجل ہے
معلوم ہوا ہم سے روٹھے ہو تم اے جانی　　الٹا ہی دوپٹے کا مکھڑے پہ یہ آنچل ہے
یہ سن کے لگی کہنے روٹھی تو نہیں تجھ سے　　پر کیا کہوں دو دن سے کچھ دل مرا بیکل ہے
جس دن ہی نظیر آ کر وہ شوخ ملے ہم سے
ہنس کھیل رہیں یا بوسے ہیں یا دن رات کی رل مل ہے

تیرے بت کی جھلکیں کیا کہوں جسے دیکھ رہے ہیں مہ و مشتری　　رستے ہوش گنوا بیٹھے پھر سنے باؤلی سی تری ایک جھلک کو دیکھ پری

تری نظریں تیر کمان بھویں تری آنکھیں ترک سنان مژہ
تیری آن ہٹیلی چلبلی تری شوخ ادائیں فریب بھری

تو نے پان سے منہ کو لال کیا کہوں کیا جو دل کا حال کیا
دیا سرمہ آنکھوں میں وہ بلا جیسے اوپی تیغ پہ باڑھ دھری

تیرے تن کی نرمی کیا کہوں تیرے پیچھے پاؤں کے تلوے کو
چھوئی مخمل آن کے جس گھڑی لگی ہاتھ کو میرے کھر کھری

زری پوش جو ہو کے نکلا ہے تو چمک جھمک سے او میاں
ہے نظیر بھی تیرا مبتلا بھلا اس کے پاس بھی بیٹھ ذری

پھڑکتی چشم ہے اور شوق بیتابی جتاتا ہے
خوشی سے جان بھی اور دل بھی نہیں پھولا سماتا ہے

نگہ بھی لحظہ لحظہ سوئے در آتی ہے سرعت سے
خیال گوش بھی ہر دم طرف کھٹکے کے جاتا ہے

تو ہم مضطرب ہو دوڑتا ہے دمبدم کہہ کر
چلیں دیکھیں کوئی تو حلقۂ در کھٹکھٹاتا ہے

نجومی خود بخود آ کہہ گیا خوش وقتیاں دن کی
ادھر کچھ زاغ بھی پیہم صدا اپنی سناتا ہے

شگوں جتنے معین ہیں جہاں میں شاد ہونے کے
ہر ایک ان سے بھی ہر ساعت بروئے کار آتا ہے

نگار خوش دلی کرتا ہے وا بند نقاب اپنا
طرب سے دست عشرت بھی تکدر کو مٹاتا ہے

نظیر ایسی تو باتوں سے عیاں یہ ہے کہ وہ گل رو
کوئی دم یا کوئی پل میں ابھی تشریف لاتا ہے

کل سنا ہم نے یہ کہتا تھا وہ اک ہمراز سے
دیکھتا تھا مجھ کو آج ایک شخص عجب انداز سے

وہ نیاز و عجز تھا اس کی نگہ سے آشکار
جس طرح سے تھک رہے طائر کہیں پرواز سے

تو جو واقف ہو تو جا اس کو بلا لا اس گھڑی
میں تسلی دوں اسے کچھ شرم سے کچھ ناز سے

ہے مرا سننے کو اس کے دل نہایت بے قرار
سن کے وہ ہمراز بولا اس بت طناز سے

میں تو اس کو جانتا ہوں نام اس کا ہے نظیر
اور خبر ہے مجھ کو اس کی چاہ کے آغاز سے

تم جو سادے مہر دل اس کو تجھ سے یاد ہیں
اور سوا اس کے وہ ڈرتا ہے بھی غماز سے

ہنس کے وہ گل رو لگا ہم راز سے کہنے میاں
کچھ ہی ہو ہم تو ملیں گے اس بکھیڑے باز سے

چتون کی کہوں یا کہ اشارات کی گرمی — ہے نام خدا اس میں ہر اک بات کی گرمی
رونے سے مرے اس کو عرق آگیا یارو — سچ ہے کہ بڑی ہوتی ہے برسات کی گرمی
ٹک پھول چھوا تھا سو نزاکت سے کئی بار — رہ رہ کے دکھائی مجھے کل ہاتھ کی گرمی
کھلواتے ہی بندوں کے بدن گرم ہوا یا — شاید کہ لگی اس کو مرے ہاتھ کی گرمی
جلتا ہوں میں اور شعلے نہیں دیتے دکھائی — ہے عشق میں یارو یہ طلسمات کی گرمی
رہنا ہے کوئی دن تو سمجھ جائیو اے دل — یہاں پھر وہی ٹھہری ہے ملاقات کی گرمی
گرمی تھی کہیں آہ ہم افسردہ دلوں میں — ساقی کی فقط ہے یہ عنایات کی گرمی
آتے ہی جو تم میرے گلے لگ گئے واللہ — اس وقت تو اس گرمی نے سب مات کی گرمی
کہتا ہے وہ جس دم کہ چلو ہم سے نہ بولو — اس بات میں ہے اور ہی اک بات کی گرمی
سب پوچ ہے ظاہر کی یہ شوخی و شرارت — معشوق میں جب تک کہ نہ ہو ذات کی گرمی
تم غصہ ہو یا قہر ہو آتش ہو غضب ہو — اب ہم نے یہ سب دل پہ مساوات کی گرمی
یا حضرت دل تم تو بڑے صاحب دل تھے — رکھتے تھے بہت اپنے کمالات کی گرمی
ایک ہی نگہ گرم سے بس ہو گئے تم سرد — اب کہئے کہاں ہے وہ کرامات کی گرمی

یوں گرمی صحبت تو بہت ہو گی نظیر آہ
پر یار نہ بھولے گی مجھے رات کی گرمی

وہ صنم جو مہر نہاد ہے اسے ہم سے ملنے میں عار ہے — وہ لے اپنا جو دل زار ہے وہ ہزار جان سے نثار ہے
ملے جب سے کوچے میں اس کے جا یہ سر و زمیں سے ہے برملا — لب دل ہے اور وہ نقش پا یہ زبان ہے اور در یار ہے

وہ نگہ جو اس کی ہے فتنہ گر اسے مشق صید ہے بیشتر　　ہے جو دل کا طائر تیز پر اُسی باز کا یہ شکار ہے
وہ مژہ لگا کے جو ایک سناں گئی پھر تو کر نہ دل اب فغاں　　کئی ایسے ہوویں گے امتحاں یہ ابھی تو پہلا ہی وار ہے
جو بہار گل پہ ہی ہے تلی ہمیں کیا جو حسن کی پی سے مل　　جنھیں چاہیے ہے وہ رشک گل انھیں گل سے کیا سروکار ہے
جو بتوں کو دیویں دل اور دیں کہیں اس کو یہ یہ الم تریں　　بھلا کہیے کیا اُسے ہمنشیں یہ عجب کچھ ان کا شعار ہے

کئی دن ہوئے ہیں نظیر اب کہ خفا ہے ہم سے وہ غنچہ لب
اُسے کیا دلے ہیں روز و شب نہ تو صبر ہے نہ قرار ہے

جب آنکھ اس صنم سے لڑی تب خبر پڑی　　غفلت کی گرد دل سے جھڑی اب خبر پڑی
پہلے کے جام میں نہ ہوا کچھ نشہ تو آہ　　دلبر نے دی تب اس سے کڑی تب خبر پڑی
لاسنے سے تھے ہم تو عمر بتایاں لکھا دلے　　جب سیاہی پہ سفیدی چڑھی تب خبر پڑی
ڈاڑھیں لگیں اکھڑنے کو دنداں ہوئے شہید　　مجلس میں چل بچل یہ پڑی تب خبر پڑی
بن دانت بھی ہنسے پہ جب آنکھیں جلیں تو آہ　　جب لاگی آنسوؤں کی جھڑی تب خبر پڑی
شہتیر سا وہ قد تھا سو خم ہو کے جھک گیا　　گرنے لگی کڑی پہ کڑی تب خبر پڑی
پنجہ دکھایا شیر نے تو بھی یہ سمجھے جھوٹ　　جب چاب لی گلے کی نڑی تب خبر پڑی

جب آئے اس گڑھے میں نظیر اور ہزار من
اوپر سے آ کے خاک پڑی تب خبر پڑی

دیکھ کر کرتی گلے میں سبز دھانی آپ کی　　دھان کے بھی کھیت نے اب آن مانی آپ کی
کیا تعجب ہے اگر دیکھے تو مردہ جی اُٹھے　　چھین سینے کی ڈھلک پھڑ دیہ آنی آپ کی
ہم تو کیا ہیں دل فرشتے کا بھی تو فریفتین سے　　ٹک جھجک دکھلا کے پھر انگیا چھپانی آپ کی
آپڑے دوست ہیں سے کے مردہ بے جاں میں جان　　جس سے اوپر دو گھڑی ہو مہربانی آپ کی

ایک لپٹ کشتی کی ہم سے بھی تو لڑ دیکھو ذرا — ہاں بھلا ہم بھی تو جانیں پہلوانی آپ کی
وقت تو جاتا رہا پر بات باقی رہ گئی — ہے یہ جھوٹی دوستی اب ہم نے جانی آپ کی

کیا ہمیں لگتی ہے پیاری جب وہ کہتی ہے نظیر
ہے میاں یہ ان دنوں تا مہربانی آپ کی

گلباز عشرت ہو جسے کیا گل رخوں سے دم گھڑی — کرتا ہے گلبازی کی یہاں ایک دم میں گردوں گلجھڑی
ہر دم تغیر دیکھ یہاں ہیبت سے یوں کانپے ہے جاں — جیسے ہوا سے ہر زماں ہو بید کی لرزاں چھڑی
ایک گلبدن مغرور تھا رقص اس کا بس مشہور تھا — جس جس کا وہ منظور تھا کرتا تھا جور اس پر کڑی
دل اس نے دیکھا جس جگہ بے جرم و تقصیر و گنہ — مارا وہیں تیر نگہ یا تیغ ابرو کی جڑی
ہر دم نگاہ جانستاں لے کر بیٹا غمزے کا ہاں — کرتی تھی کیا کیا پھرتیاں وہاں جا پڑی یہاں آ پڑی
سر پاؤں سے گل پوش تھا بلبل وشوں کا جوش تھا — ہر دل پڑا بیہوش تھا جاں دست بستہ تھی کھڑی
وہ گرم دیکھا اس کی وہ گال ایک سر دہری کر عیاں — ناگاہ جور آسماں اس مہر پیکر سے لڑی
وہ حسن سب جاتا رہا میں نے کہا یہ کیا ہوا — بولا نظیر اب کہیے کیا حیرت سے ہے مجھ کو بھی بڑی

تھی وہ جو خوبی کی جھمک جاتی رہی سب یک بیک
کیا جانے وہ ظالم جھمک مہتاب تھی یا پھلجھڑی

ایام شباب اپنے بھی کیا عیش اثر تھے — کہتے ہیں جنھیں عیب وہ اس وقت ہنر تھے
دن رات وہ محبوب میسر تھے کہ جن کی — زلفیں الم شام تھیں رخ اشک سحر تھے
ساقی کے ادھر جام ادھر ناز و ادا سے — جادو نظر ان خوش نگہاں پیش نظر تھے
محفل سے جو اٹھتے تھے ذرا بھی تو لپٹ کر — نازک بدناں مو کمراں دست و کمر تھے
ہمراہ گل اندا موں کے ہو خرم و خنداں — باغ و چمن گلشن و بستاں میں گزر تھے

کیا شور تھے کیا روز تھے کیا عیش تھے کیا لطف　　کیا ولولے کیا تمتعے سب بے خوف و خطر تھے
دکھلا کے جھمک جاتے رہے دم میں نظیر آہ
کیا جانے وہ دن برق تھے یا مثل شرر تھے

یک بہ یک مو کی سیاہی اس قدر جاتی رہی　　کیا کہیں گویا سیاہی یک سر مو بھی نہ تھی
گو سفیدی مو کی یوں روشن ہے جوں آب حیات　　لیکن اپنی تو اسی ظلمات سے تھی زندگی
دم بہ دم بزم سرود و ہر گھڑی سیر چمن　　عشرت و عیش و نشاط و خرمی و تازگی
خندہ شادی سے ہرگز لب نہ ہوتے تھے بہم　　ساغر و مینا، سرود و رقص، خوش طبعی ہنسی
جام دیتا تھا ادھر ساقی بہ منت ہاتھ جوڑ　　اُس طرف کیا کیا لگاوٹ دلبروں کی تھی نئی
گلبدن کرتے تھے کس کس طور اظہار اشتیاق　　غنچہ لب ملتے تھے سو سو دل میں رکھ کر بے کلی
کوئی دیتا تھا محبت سے گلے میں ہاتھ ڈال　　کوئی دیتا تھا زبردستی سے بوسہ ہر گھڑی
جس طرف تھے دیکھتے عیش و طرب کا جوش تھا　　مستی و رندی، ہوس بازی و بے اندیشگی
آن کر مُو کی سفیدی نے یہ کیں بربادیاں　　کھول دیں جتنی بندھی تھیں وہ ہوائیں عیش کی
قد میں خم، آنکھوں میں نم، چہرے پہ چھبری رنگ زرد　　سر سے پا تک سخت ناخوش منظری بدہیئتی
کیا تماشے انقلاب چرخ کے دیکھے نظیر
دم میں وہ رونق تھی اور ایک دم میں یہ بے رونقی

جس کے لب سے سخن پند گہر جوش ہوئے　　عمر بھر پھر وہ ہمارے گہر گوش ہوئے
کل جو گزرے تھے ہم ایک کہنہ مزارستاں میں　　وہاں عجب طور کی عبرت سے ہم آغوش ہوئے
یعنی ایک شخص یہ بولا کہ یہاں عظم دہن　　سخت بوسیدہ نگہ سے مری ہمدوش ہوئے
مجھ سے یوں کہنے لگی ہم تھے بڑے صاحب عیش　　کبھی گلشن میں پھرے اور کبھی مے نوش ہوئے

رات دن عیش و طرب میں ہی بسر کرتے تھے
مثل عشرت طلباں خوش خور و خوش نوش ہوئے

گل عذاران سمن بر سے رہے شاد مدام
نازنینان جفاجو سے وفا کوش ہوئے

ایک دم چرخ حسد پیشہ سے مانند چراغ
ایک پلک بھر نہ کھنچی دیر جو خاموش ہوئے

اب کوئی نام و نشاں سے نہیں اپنے آگاہ
ایسے ہم خاطر عالم سے فراموش ہوئے

جب سُنا میں نے یہ اس شخص سے احوال نظیر
روح تھرّا گئی لرزاں خرد و ہوش ہوئے

فرض ہے سب کو جناب کبریا کی دوستی
ہے وہی بندہ کہ جس کو ہے خدا کی دوستی

گر شفاعت کی تمنا ہے تو رکھ جی میں سدا
شافع محشر محمد مصطفےٰ کی دوستی

جام کوثر کا پیا چاہے تو اپنے دل میں رکھ
ساقیٔ کوثر علی مرتضیٰ کی دوستی

حشر میں کھیتی ہری چاہے تو کر یہاں اختیار
سبز پیراہن امام مجتبےٰ کی دوستی

سُرخ روئی دین دنیا کی اگر درکار ہے
تو تو رکھ دل میں شہید کربلا کی دوستی

زیب و زینت حشر کی چاہے تو سینے میں بٹھا
عابد و باقر شہ ہر دوسرا کی دوستی

گر بہشتی جنتی ہونا ہو تو کر دل میں نقش
جعفر و کاظم علی موسیٰ رضا کی دوستی

قبر کی سختی سے چھٹتا ہو تو اے مومن محب
رکھ تقی حضرت نقی سے پیشوا کی دوستی

راہ جنت کی اگر چاہے تو اپنے ساتھ لے
عسکری مہدی امام رہنما کی دوستی

جس کو سکیے مذہب حق اور صراط المستقیم
ہے وہ بیشک اہل بیت مصطفےٰ کی دوستی

جنتی ہے جنتی ہے جنتی ہے وہ سعید
ان کی خدمت میں جو رکھتا ہے وفا کی دوستی

دوزخی ہے دوزخی ہے دوزخی ہے وہ شقی
اس طرف سے جو رکھے روئے ریا کی دوستی

نوح کی کشتی انھیں کو ہے پیمبر نے کہا
چھوڑ مت اے دل تو ان بحر سخا کی دوستی

کل صراط حشر میں جس دم ترا کھسکے گا پاؤں
وہاں نہ تھامے گی کسی یار آشنا کی دوستی

ہاں مگر جب تو کہے گا یا علی مشکل کشا
جب سنبھالے گی تجھے مشکل کشا کی دوستی

دیکھیو کس کس طرح سے واں ترے آتی ہے کام
مرتضیٰ مشکل کشا شیر خدا کی دوستی

گر تو یہ چاہے ہے خدا اور مصطفیٰ ہو تجھ سے شاد
تو علی حیدر سے رکھ صدق و صفا کی دوستی

[illegible] حیف اس کی بندگی اور خاک اس کی زندگی
شیر حق سے جو رکھے مکر و دغا کی دوستی

دین و دنیا میں وہی ہے جنتی بے شک نظیر
جس کے دل میں ہے سدا آل عبا کی دوستی

کل دیکھ کے اس کے عالم کو اک عالم کے اوسان گئے
واللہ عجب کچھ عالم تھا جو جان گئے سو جان گئے

کیا حسن کہوں اللہ رے حسن اس رشک پری کی صورت پر
انسان بھلا ہے کس گنتی میں جب حور و ملک قربان گئے

اس مکھڑے چاند کے ٹکڑے کو تر دیکھ عرق کے قطروں سے
کتنوں کے دین پھرے بہتے اور کتنوں کے ایمان گئے

تھے چین جبیں پر ایسے ہی اس رشک بت چیں کے جس سے
جو کافر کٹے چین کے تھے وہ کافر بھی چیں مان گئے

وہ بوند سیاہی مژگاں کی جب اتری تیر اندازی پر
دل چھید جگر سوراخ کیا اور سینہ تو سب چھان گئے

کچھ بھیس بدل کر شب کو ہم جوں پہنچے اس کی مجلس میں
وہ کافر دو ہیں بول اٹھا ہم جان گئے ہم جان گئے

وہ دیکھ کے خط آئینے میں کل ابھر آنے لگا کہنے
اس سبز قدم کے آتے ہی سب خوبی کے سامان گئے

جب میں نے نظیر اس سے یہ کہا اب غم کھائے کیا ہوتا ہے
ان باتوں کو مت یاد کرو وہ پانی بہ ملتان گئے

یہ رنگ پان سے جو دہن اس کا لال ہے
آج ان لبوں سے لعل کی پوری مثال ہے

استغفر اللہ لعل کہاں اور یہ لب کہاں
اے بے وقوف کچھ بھی تجھے انفعال ہے

خورشید جس سے لعل کی ہوتی ہے تربیت
وہ ان لبوں کے پان کا ادنیٰ اگال ہے

یوں لعل گرچہ سرخ ہے پر سنگ سخت ہے
گو نرم بھی ہوا تو یہ اس کی مجال ہے

کہتے ہیں لعل ٹوٹ کے ہوتا نہیں درست
سچ ہے پر اپنے دل میں تو اور ہی خیال ہے

ہر دم سخن میں ٹوٹ کے بنتا ہے لعلِ لب
یہ معجزہ ہے یا کوئی سحر حلال ہے

بس لعلِ لب سے لعل کو نسبت ہے کیا نظیر
یہاں لعل کی بھی اب تو زباں منہ میں لال ہے

گل رنگی و گل پیرہنی گل بدنی ہے
وہ نام خدا حسن میں سچ مچ کی بنی ہے

گلزار میں خوبی تئیں اب اس گل کے برابر
بوٹا ہے نہ شمشاد نہ سرو چمنی ہے

انداز بلا ناز ستم قہر تبسم
اور اس پہ غضب کم نگہی کم سخنی ہے

اس گورے بدن کا کوئی کیا وصف کرے آہ
ختم اس کے اوپر گل رخی و سیمتنی ہے

منہ چاند کا ٹکڑا ہے بدن چاندی کی تختی
دنداں ہیں گہر ہونٹ عقیق یمنی ہے

بلور کی پتلی کہوں یا موتی کا دانہ
یا چین میں ایک چینی کی مورت یہ بنی ہے

نرمی میں صفائی میں نزاکت میں تن اس کا
ریشم ہے نہ گلبرگ نہ برگ سمنی ہے

گر پھول کی پتی کی بنا پہنے وہ پوشاک
چھل جاوے بدن اس کا یہ نازک بدنی ہے

کل میں نے کسی شخص سے نام اس کا جو پوچھا
یعنی یہ پری یا کہ غزال ختنی ہے

وہ بولا کہ اس شوخ کے تئیں کہتے ہیں ہیرا
کام اس کا سدا دلبری و دل شکنی ہے

جب میں نے وہیں ہنس کے کہا اس سے نظیر آہ
ہیرا نہ کہو اس کو یہ ہیرے کی کنی ہے

جو تو کہتا ہے اے غافل یہ میرا ہے یہ تیرا ہے
یہیں کا ہے اسی کا ہے نہ میرا ہے نہ تیرا ہے

تو اول سوچ تو دل میں کہ تو ہے کون اور کیا ہے
نمازی ہے، شرابی ہے، اچکا ہے، لٹیرا ہے

فرشتہ ہے، پری ہے، دیو ہے، یا آدمی جن ہے — بلا ہے، بھوت ہے، یا مَن مُزوّر یا کمیرا ہے
تری کیا ذات ہے کیا نام ہے کیا کام کرتا ہے — مسافر بے وطن ہے یا ترا اس جا پہ ڈیرا ہے
جب ان چیزوں سے تو اپنے تئیں کچھ چیز ٹھہرا دے — تو اس کے بعد یہ کہیو، یہ تیرا ہے یہ میرا ہے
یہ چیزیں تو غرض کیا ہیں تو اپنا ہی نہیں مالک — تجھے او بے خبر ناداں یہ کس غفلت نے گھیرا ہے
تو نکلے سوت کا دھاگا عبث بل پیچ کھاتا ہے — یہ سب وہم و غلط ہے اور تصورِ فہم تیرا ہے
تو کیا جانے کہ تجھ کو کس نے کس چرخے میں کاتا ہے — تو کیا جانے کہ تجھ کو کس اٹیرن میں اٹیرا ہے
تماشا ہے، مزا ہے، سیر ہے، کیا کیا اہاہاہا — مصور نے عجب کچھ رنگ قدرت کا بکھیرا ہے
ترقی میں تنزل ہے، تنزل میں ترقی ہے — اندھیرے میں اجالا ہے، اجالے میں اندھیرا ہے
طلسمات حقیقی ہے یہ کچھ سمجھا نہیں جاتا — یہی چاند اور یہی سورج، یہی شام اور سویرا ہے

نظیر اللہ اللہ اس جہاں میں دم غنیمت ہے
کہاں ہم اور کہاں پھر تم، کوئی دم کا بسیرا ہے

یہ حسن ہے آہ یا قیامت کہ اک بھبوکا بھبک رہا ہے — فلک پہ سورج بھی تھرتھرا کر منہ اس کا حیرت سے تک رہا ہے
کھجوری چوٹی، ادائیں موٹی، جفائیں لمبی، وفائیں چھوٹی — ہے ایسی کھوٹی کہ دل ہر اک کا ہر ایک لٹ میں لٹک رہا ہے
وہ نیچی کافر سیاہ پٹی کہ دل کے زخموں پہ باندھئے پٹی — پڑھی ہے جس نے کہ اس کی پٹی وہ پٹی سے سر پٹک رہا ہے
وہ ماتھا ایسا کہ چاند نکھرے، پھر اس کے اوپر وہ بال بکھرے — دل اس کے دیکھے سے کیوں نہ نکھرے کہ مثل سورج چمک رہا ہے
وہ چین خود رو کٹیلے ابرو، وہ چشم جادو، نگاہیں آہو — وہ پلکیں ناوک کہ جن کا ہر مو جگر کے اندر کھٹک رہا ہے
غضب وہ چنچل کی شوخ بینی، پھر اس پہ نتھنوں کی کچھ چھینی — پھر اس پہ نتھ کی وہ ہمنشینی، پھر اس پہ موتی پھڑک رہا ہے
لب وہاں پھبتی وہ نرم و نازک، مسی وہاں پھبتی وہ قہر آفت — سخن بھی کرنے کی وہ لطافت کہ گویا موتی ٹپک رہا ہے
وہ کان خوبی میں چھک رہے ہیں [illegible] میں جھمکے ہیں — ادھر کو جھمکے جھمک رہے ہیں ادھر کا بالا چمک رہا ہے

صراحی گردن وہ آبگینہ پھر آگے سینہ بھی جوں نگینہ — بھرا ہے جس میں تمام کینہ کہ جوں نگینہ دمک رہا
پچین وہ کچھ کچھ ثمر درختی کچھ ان کی سختی وہ کچھ کرختی — ہیں جس نے دیکھے وہ پھل فرختی کلیجہ اس کا دھڑک رہا
وہ سرخ انگیا جو کس رہی ہے وہ چپ رہی ہے اکس رہی ہے — کچھ ایسے ڈھب سے وہ کس رہی ہے کہ اس کا کسنا کسک رہا
وہ پیٹ دل کو لپیٹ لیوے وہ ناف جی کو سمیٹ لیوے — مزا جی کا جھپیٹ لیوے کچھ ایسا پیڑو پھڑک رہا
وہ پیٹ گوری کمر وہ پتلی غضب لگاوٹ وہ پھر سرین کی — اب آگے کہنے تو کیا کہوں میں کہ ہوش اس جا ٹھٹک رہا
فقط وہ چمپے کی اک کلی ہے کچھ اک مندی ہے کچھ ایک کھلی ہے — سلاخ سونے کی ایک ڈلی ہے کہ گویا کندن دمک رہا
وہ پیاری رانیں وہ گول ساقیں وہ کف ملائم وہ نرم پہنچے — کڑی کڑی سے کھڑک رہی ہے کڑا کڑے سے کھڑک رہا

نظیر خوبی میں اس پری کی کہوں کہاں تک تنا بنا کر
صفت سراپا میں جس کے لکھنے دل اب اسی سے اٹک رہا ہے

اولاً اس بے نشاں اور بانشاں کو عشق ہے — بعد ازاں سرحلقۂ پیغمبراں کو عشق ہے
لافتا الا علی ہے شان میں جس کی نزول — دوستاں اس شاہ مرداں سے جواں کو عشق ہے
پھر جو ہے باغ نبوت اور امامت کی بہار — غنچہ و گل سبزۂ عنبر فشاں کو عشق ہے
عرش و کرسی حور و غلماں اور ملایک خاص و عام — عالم بالا کے سب باشندگاں کو عشق ہے
جنت و عدن و بہشت و خلد و مینو اور ارم — ساتھ ان باغوں کے رضواں باغباں کو عشق ہے
ہیں جو سیار و ثوابت آفتاب و ماہتاب — قایم و میل فلک قطب زماں کو عشق ہے
ہیں جو یہ چودہ طبق متحرک و ساکن سدا — بے سخن ان سب زمین و آسماں کو عشق ہے
مختلف ہیں اور ملے رہتے ہیں باہم روز و شب — خاک باد و آتش و آب رواں کو عشق ہے
ہے جہاں میں جن سے روشن عدل کے گھر کا چراغ — دمبدم ان بادشاہان جہاں کو عشق ہے
اور خراساں اصفہاں ایران اور توران کو — پھر ہمارے گلشن ہندوستاں کو عشق ہے

ہیں جہاں تک سلسلے فقراء کے از کہہ تا بہ مہ
عارفاں اور کاملاں اور عاشقاں کو عشق ہے

کوہ تھراتے ہیں لرزیں ہیں زمین و آسماں
عاشق مولا کی فریاد و فغاں کو عشق ہے

ہر طرف گلزار ہے سبزاں اور آب رواں
اپنی نظروں میں بہار گلستاں کو عشق ہے

وہ جو ہیں اس گلشن ہستی میں اب محو فنا
ان کے آگے موسم باد خزاں کو عشق ہے

دل کو لے پامال کر دینا بہ صد جور و جفا
اس خوبان عالم دلستاں کو عشق ہے

گرد کے مانند پھرتی ہیں پڑی اُڑتی خراب
لٹ گئی دست جنوں کی کارواں کو عشق ہے

لوٹتے ہیں مست مے خانے کے در پر جا بجا
جام و صہبا ساقی و پیر مغاں کو عشق ہے

کل ہی نقش فنا لقہ سن کر بھی ہم غافل رہے
اے عزیزاں اس حیات رائگاں کو عشق ہے

خلقت کون میں کیا جن و کیا انساں نظیرؔ
وحشی و طائر زبان و بے زباں کو عشق ہے

موضوعی غزلیں

موضوعی غزلیں

بسنت

جوشِ نشاط و عیش ہے ہر جا بسنت کا
ہے طرفہ روزگار طرب زا بسنت کا

باغوں میں لطفِ نشو و نما کی ہیں کثرتیں
بزموں میں نغمہ خوش دلی افزا بسنت کا

پھرتے ہیں کر لباس بسنتی وہ دلبراں
ہے جن سے زرنگار سراپا بسنت کا

چادر پہ یار کے یہ کہا ہم نے صبح دم
اے جان ہے اب تو ہر کہیں چرچا بسنت کا

تشریف تم نہ لائے جو ہو کر بسنتی پوش
کہیے گناہ ہم نے کیا، کیا بسنت کا

سنتے ہی اس بہار سے نکلا کہ جس کے تئیں
دل دیکھتے ہی ہو گیا شیدا بسنت کا

اپنا وہ خوش لباس بسنتی دکھا نظیر
چمکایا حسن، یار نے کیا کیا بسنت کا

ہولی

ہولی کی رنگ فشانی سے ہے رنگ یہ کچھ پیراہن کا
جوں رنگا رنگ بہاروں میں ہو صحن چمن اور گلشن کا

جس خوبی اور رنگینی سے گلزار کھلے ہیں عالم میں
ہر آن چھڑکواں جوڑوں سے ہے حسن کچھ ایسا ہی تن کا

لے جام لبالب بھر دینا پھر ساقی کو کچھ دھیان نہیں
یہ ساغر پہنچے دوست تلک یا ہاتھ پہنچ لے دشمن کا

ہر محفل میں رقاصوں کا کیا سحر دلوں پر کرتا ہے
وہ حسن بتانا گانے کا اور جوشش دکھانا جوبن کا

ہے روپ عبیروں کا مہوش اور رنگ گلالوں کا گلگوں
ہیں بھرتے جس میں رنگ بنا ہے رنگ عجب اس تن کا

اس گل رو نے یوں ہم سے کہا کیا مستی و مدہوشی ہے
نہ دھیان نہیں کچھ ہولی کا نہ ہوش تمہیں کچھ دامن کا

جب ہم نے نظیر اس گل رو سے یہ بات کہی ہنس کر اس دم
کیا پوچھے ہے آ رنگ بھری ہے مست مہینہ پھاگن کا

جوانی

بنا ہے اپنے عالم میں وہ کچھ عالم جوانی کا
کہ عمر خضر سے بہتر ہے ایک ایک دم جوانی کا

نہیں بوڑھوں کی داڑھی پر میاں یہ رنگ وسمے کا
کیا ہے ان کے ایک ایک بال نے ماتم جوانی کا

یہ بوڑھے گو کہ اپنے منہ سے شیخی میں نہیں کہتے
بھرا ہے آہ پر ان سب کے دل میں غم جوانی کا

یہ پیران جہاں اس واسطے روتے ہیں اب ہر دم
کہ کیا کیا ان کا ہنگامہ ہوا برہم جوانی کا

کسی کی پیٹ گیڑی کو بھلا خاطر میں کیا لاوے
اکڑ میں تو جوانی کے جو مارے دم جوانی کا

شراب و گلبدن ساقی مزے عیش و طرب ہر دم
بہار زندگی کہئے تو ہے موسم جوانی کا

نظیر اب ہم تو اس تب میں [illegible]
بنایا ہے عجب اللہ نے عالم جوانی کا

بالا

تم نے جس دن سے صنم کان میں بالا ڈالا
ہو گیا چاند سے مکھڑے کا اجالا بالا

کیوں نہ ہوں ہوش کا میں اس کے دوانہ یارو
جس پری زاد نے بالی سے نکالا بالا

ایک تو قہر ہے جھمکے کے کرن پھول میں جھمک
جس پہ کافر ہے جگر چھید نے والا بالا

اب تو بالی نہیں اک فروہ بڑی سیانی ہے
کیوں نہ اب اس کا بتا دے ہمیں بالا بالا

واہ جی ہم کو تو بالے ہی بتانا ہر دم
آپ غیروں میں مزے لوٹنا بالا بالا

یہ بھی کیا آن غضب ہے کہ دکھانا ہر آن
کان کے پاس سے سرکا کے دوشالا بالا

جیسے مہتاب پہ ہالے کا بندھے ہے کنڈل
ہے ترے چاند سے رخسار کا ہالا بالا

کیا غضب تھی وہ ادا آہ کہ چنچل نے شتاب
گو نخ کھلتے ہی جھجک کر جو سنبھالا بالا

نوک مژگاں کو خبر ہونے نہ دی آہ ذرا
دل کو یوں اس کی نگہ لے گئی بالا بالا

لے دل اس بالے کی ہرگز تو لگاوٹ میں نہ آ
تجھ کو بتلاوے گا بالے پہ یہ بالا بالا

چوسے ہر جھوک میں کافر ترے رخسار کو آہ
کیوں نہ مارے ہے مرے سینے میں یہ بھالا بالا

اور بھی یوں تو پری زاد ہیں بالے والے
پر ہے اسے جان ترا سب سے نرالا بالا

جب ہلاتی ہے صراحی سی وہ گردن اپنی
نشۂ حسن کو کرتا ہے دوبالا بالا

اب تو رہ رہ کے مرا دل یہی کہتا ہے نظیرؔ
اک نظر چل کے تجھے اس کا دکھا لا بالا

پینکھیا

کیوں نہ جھمک کر کرے جلوہ گری پینکھیا
کچھ کفن نازک پری، کچھ وہ پری پینکھیا

قطعہ

دیکھ چمن میں سحر اس کی جبیں پر عرق | لائی اُدھر سے نسیم عطر بھری پنکھیا
شاخ نے گل کی ادھر برگ جو تھی سبز تر | اُن کی بنا کر بھلی اس کو ہری پنکھیا
گرمی میں ایک دن گئے اس سے جو ملنے کو ہم | چھوٹی سی آگے تھی ایک اس کے دھری پنکھیا
ہم تھے پسینے میں تر بیٹھتے ہی یک بیک | ہاتھ بڑھا کر جو لی اس کی ذری پنکھیا
اس نے وہیں چھین لی اور یہ کہا واہ واہ | تو نے چھوئی کیوں مری زیب بھری پنکھیا

کچھ تھی عرق کی تری کچھ ہوئی خجلت نظیر
اور تری کے اوپر لائی تری پنکھیا

بٹوا

دیکھ تیرا یہ جھمکتا ہوا اے جاں بٹوا | صبح نے پھینک دیا مہر کا رخشاں بٹوا
چاندنی میں ترے بٹوے کے مقابل ہونے | بن کے نکلا ہے فلک پر مہِ تاباں بٹوا
گر چمن میں تجھے بٹوے کی طلب ہو تو وہیں | زر بھرا غنچے کا لا دے گلِ خنداں بٹوا
ہاتھ نازک ہیں ترے اور وہ ہے سنگیں ورنہ | بن کے آ جاوے ابھی لعلِ بدخشاں بٹوا

قطعہ

یوں کہا میں کہ یہ بٹوا ذرا ہم کو دیجئے | ہم بھی بنوائیں گے ایسا ہی درخشاں بٹوا
سن کے بٹوے کو دکھا کر یہ کہا واہ رے شعور | ارے بن سکتا ہے ایسا کوئی اب یہاں بٹوا

جب کہا میں نے سبب کیا تو کہا ہنس کے نظیر
یہ تو لائیں ہیں مرے واسطے پریاں بٹوا

☆

بٹوا

تمہارے ہاتھ سے ہوتا نہیں اک دم جدا بٹوا — یہ کس الفت بھری نے سچ کہو تم کو دیا بٹوا
معطر ہو رہا ہے نکہت جوز و قرنفل سے — کہوں میں عطر داں، کیوں صاحب اس بٹوے کو یا بٹوا
گھڑی ہی غنچہ، گھڑی گل، پھر گھڑی میں گل سے غنچہ ہو — تمہارے آگے کیا کیا رنگ بدلے ہے پڑا بٹوا
تمہیں ہم چاہیں تم بٹوے کو چاہو کیا تماشہ ہے — ہمارے دلربا تم اور تمہارا دلربا بٹوا
جو تم نے بدلے ایک بٹوے کے ایک بوسہ ہی ٹھہرایا — تو صاحب یاد رکھیو یہ ہمارا ہے چھٹا بٹوا

قطعہ

نہایت پر تکلف اور بہت خوش قطع نازک سا — بہ صد تاکید بنوایا تھا ہم نے ایک نیا بٹوا
گئے ہم اتفاقاً اس پری رو سے جو ملنے کو — تو کیا کہیے وہی اس دم ہمارے پاس تھا بٹوا
یکایک آ پڑی اس کی نظر اس پر تو لے ہم سے — کہا، یہ تو بنایا ہے کسی نے واہ کیا بٹوا
بہت تعریف کی اور ہنس دیا جب دل میں ہم سمجھے — کہ یہ تعریف کچھ خالی نہ جاوے گی چلا بٹوا
کبھی یوں اور کبھی ووں دیکھ آخر یوں کہا ہنس کر — یہ کس کا ہے قیامت پر نزاکت خوش نما بٹوا
کہا جب میں نے ہنس کر سو نیاز و عجز سے اے جاں — اسے میلا نہ کیجیے یہ ہے ایک محبوب کا بٹوا
میں بھولے سے لے آیا تھا اگر درکار ہو تم کو — تو میں اس سے بھی بہتر اور دوں تم کو منگا بٹوا
کہا ہم تو یہی لیں گے تو میں نے پھر کہا صاحب — میں بیگانہ تمہیں اب کس طرح سے دوں بھلا بٹوا
جونہیں یہ بات نکلی میرے منہ سے پھر تو جھنجھلا — وہیں اس شوخ نے مارا ہمارے منہ پہ اٹھا بٹوا
کہا میں نے خفا ہوتے ہو کیوں چاہو تمہیں لے لو — یہ کہہ کر میں نے پھر اس کی طرف ڈھلکا دیا بٹوا
چلا جب وہ ڈھلکتا اس کی جانب پیچھے شتابست — کہیں ناگہ سر زانو میں اس کے جا لگا بٹوا
تو لے بٹوے کو اور زانو پکڑ کر یوں کہا دشمن — یہ تو نے آپ سے مارا مرے وارو ترا بٹوا

جلادوں ٹکڑے کر ڈالوں ولے تجھ کو نہ دوں ہرگز   لگا میرے بہت اب تو یہ میرا ہو چکا بٹوا
نہ بٹوا دوں نظیر اور تجھ سے زانو کا بھی بدلہ لوں
یہی دھمکی دکھا کر آخر اس نے لے لیا بٹوا

سنگترا

کیا کیا ہر ایک درخت پہ آیا ہے سنگترا   پھل اور بھی مزے کا کہایا ہے سنگترا
نارنگی اور انار کب اچھے لگیں اسے   جس رس بھری کے دل میں سمایا ہے سنگترا
چھاتی پہ ہاتھ رکھ کے کہا میں نے اس سے جان   مدت میں میرے ہاتھ پہ آیا ہے سنگترا
گر تم برا نہ مانو تو اک بات میں کہوں   یہ تو کسی کا تم نے چرایا ہے سنگترا
تم توڑتی تھیں آن پڑا اس میں باغباں   انگیا میں اس کے ڈر سے چھپایا ہے سنگترا
یہ سن کے اس نے ہنس دیا اور یوں کہا مجھے   اب ہم نے اس طرح سے یہ پایا ہے سنگترا
ایک باغ حسن کا ہے جوانی ہے اس کا نام   وہاں سے ہمارے ہاتھ یہ آیا ہے سنگترا
جوبن کے باغبان نے اٹھتی بہار سے   تازہ ابھی یہ ہم کو بھجایا ہے سنگترا
کوئلے ہی لگ رہا ہے ہمارے تمام عمر   جب کو کبھی یہ ہم نے دکھایا ہے سنگترا
جب تو نظیر میں نے یہ ہنس کر کہا اسے
میوہ خدا نے خوب بنایا ہے سنگترا

پنکھا

برگ گل و لالہ کا نہ بنوایئے پنکھا   اس سے بھی سبک اور کوئی منگوایئے پنکھا

ہم تر ہیں پسینے میں تو کیا آپ کو صاحب　　خوش بیٹھے ہوئے آپ تو جھلکائیے پنکھا

قطعہ

مدت سے تمھارے ہیں ہوادار ہم اے جاں　　ایک چار گھڑی ہم سے بھی جھلوائیے پنکھا
سن کر یہ کہا خیر اگر ہے یونہی دل میں　　تو جا کے شتابی ابھی لے آئیے پنکھا
جب ہم نے کہا یاں تو بجوروں کے ہیں اکثر　　مقیش کا لے آویں جو فرمائیے پنکھا
فرمایا کسی کا ہو یہ نازک ہو سبک ہو　　ایسا نہ ہو جو کھپ سکے بدلوائیے پنکھا
بنوا کے بصد زیب کہا ہم نے یہ آکر　　ہم شرط بدیں ایسا جو دکھلائیے پنکھا
جب ہنس کے کہا چھوٹ تمھاری ہی نہیں جاتی　　اب جی میں ہے منہ پر کوئی لگوائیے پنکھا
القصہ جو ہیں جھلنے لگے ہم آہستہ خوش ہو　　بولا وہیں بس بس ذرا ٹھہرائیے پنکھا
حلقے مری زلفوں کے کھلے جاتے ہیں پل پل　　ایسا بھی تو لپ جھپ نہ جھپکائیے پنکھا
پنکھے کے کبھی جھلنے کا نہیں تم کو شعور اب　　معلوم ہوا بس جی ادھر لائیے پنکھا
ایک دن عرق آلود ہو گھبرا کے کہا میں　　اس وقت تو ہم کو کوئی دلوائیے پنکھا
بولا کہ چہ خوش فائدہ کیا اب جو تمھارے　　ان گھر گھر سے ہاتھوں سے پکڑوائیے پنکھا
اس چھوٹے سے پنکھے کی ہوا کب تمھیں آئے　　بے فائدہ جاگر سے نہ ہلوائیے پنکھا

ایسا ہی جو جھلنا ہے نظیر اب تمھیں تو آپ
گدھ پنکھ کے پر کا کوئی بنوائیے پنکھا

حنا

کچھ دل فریب ہاتھ وہ کچھ دل ربا حنا　　لگتی ہے اس پری کی عجب خوش نما حنا
دیکھے ہیں جب سے دل نے حنا بستہ اس کے ہاتھ　　راتوں کو چونک پڑتا ہے کہہ کر حنا حنا

ہے سرخ یہاں تلک کہ جو چھلّے ہیں نقرئی
کرتی ہے اس کے ہاتھ میں ان کو طلا حنا

یہ فندقیں نہیں مرے قاتل کے ہاتھ میں
ہوتی ہے پور پور پہ اُس کے فدا حنا

خونِ شفق میں پنجۂ خورشید رشک سے
ڈوبا ہی تھا اگر وہ نہ لیتا چھپا حنا

غرفے سے ہاتھ کھول کے اور پھر لیا جو کھینچ
بجلی سی کچھ چمک گئی کافر بلا حنا

شب کے خلاف وعدہ کا جب بن سکا نہ عذر
ناچار پھر تو ہنس دیا اور دی دکھا حنا

کل مجھ سے ہنس کے اُس گل خوبی نے یوں کہا
پاؤں میں تو ہی آج تو میرے رچا حنا

وہ چھوٹی پیاری انگلیاں وہ گورے گورے پاؤں
ہاتھوں میں اپنے لے لے میں لگانے لگا حنا

اُس وقت جیسی نکلیں مری حسرتیں نظیر
اُن لذتوں کو دل ہی سمجھتا ہے یا حنا

برسات

ساقیا موسم برسات ہے کیا روح فزا
دیکھ ملک تازگی صنعت بیچون و چرا

کھل رہے ہیں در و دیوار پہ درہائے بہشت
آرہی ہے چمن خلد کی گھر گھر میں ہوا

جابجا نکلے ہیں اس حسن سے طفلان نبات
اپنے ہاتھوں پہ کھلاتے ہیں جنھیں نشو و نما

دیکھ سبزوں کی طراوت کو زمیں پڑھتی ہے
وصدہم انبتہ اللہ نباتاً حسنا

برگ اشجار وہ سرسبز ہیں اور نرم و لطیف
فی المثل حُلّۂ جنت انہیں کہئے تو بجا

کوہ و صحرا میں وہ سبزی ہے کہوں کیا گویا
مخمل تازہ کسی نے ابھی یاں دی ہے بچھا

الغرض دشت تو ہیں کارگہ مخمل سبز
اور جو ہیں کوہ تو وہ کوہ زمرد برپا

مرج سے کرتے ہیں اب نضرت و خضرت وہ سلوک
جیسے غنچوں سے نسیم سحر اور گل سے صبا

ہے زمینِ چمن ازبس کہ جو پانی سے سفید
اس میں لب عکس ہر ایک گل کا ہے یوں جلوہ نما

عقل کہتی ہے تامل سے جسے دیکھ کے یہ
طشت بلور ہے اقسام جواہر سے بھرا

شاخ پر گل کا یہ عالم ہے کہ جیسے محبوب
سرخ دستار یہ سر رکھتا ہے اور سبز قبا

غلغلِ رعد خوش آتا ہے ہر ایک گوش کو یوں
جیسے شادی میں پسند آتی ہے نوبت کی صدا

آتشِ برق جو ہے مشتعل ازبس ہر دم
اس سے کیا جھوم کے اٹھی ہے دھواں دھار گھٹا

ایسی آتش کے لئے چاہیئے ایسا ہی دھواں
کیا تناسب ہیں یہ صفت کے اہاہا

اس سیہ ابر میں یوں اڑتے ہیں بگلے جیسے
لبِ مالیدہ مسی میں دُرِ دنداں کی صفا

بدلیاں برسے ہیں کیا رنگ سے نئے رنگا رنگ
جنگل ایک رنگ پہ سو مانیٔ ارژنگ فدا

روحِ بہزاد کی کہتی ہے تصدق ہو کر
کس سے یہ رنگ ہوں یا رب تری قدرت کے سوا

متصل برسے ہے جھڑیوں سے وہ بارانِ گہر
جس کے قطرے سے بنے صد گہر بیش بہا

لوگ کہتے ہیں یہ ہیں آب کے قطرے لیکن
ہم تو جانے ہیں یہ کل برسے ہے مینہ موتی کا

بلکہ موتی سے ہے فقط گوشِ بتاں کی زینت
یہ وہ قطرے ہیں کہ ہیں آبِ رُخِ شاہ و گدا

آبِ رُخ کیا کہ اسی سے ہے حیات ہر شے
شاہد اس بات کی ہے حیٌ من الما کی ندا

جن کو ہے وصل تو وہ خندہ زناں ہیں جوں برق
اور ہیں مہجور تو وہ گریہ کناں ابر آسا

اس طرف ابر سیہ اس طرف آہوں کے ہجوم
ہے اُدھر مینہ تو اِدھر آنسو کا ٹیکا ہے لگا

سن پپیہے کی وہ پی پی کی صدا کہتے ہیں
چپ بھی ہو رہ ارے کم بخت نہ جلتوں کو جلا

قصہ کوتاہ یہ کچھ رکھتے ہیں اندوہِ فراق
جن کے احوال پہ ہر ابر کو آتا ہے بکا

اب میں ساون کے اندھیر کی کروں کیا تعریف
کوئی تشبیہ نہیں ملتی مسرت پیرا

ہے تجسس تو بہت لیک میں اب حیراں ہوں
جعدِ شیریں کہوں یا زلفِ سیاہ لیلا

جگنو اس طور چمکتے ہیں کہ جوں وقت سنگار
جبۂ فیل پہ شنگرف کسی نے چھڑکا
کہیں رقاص کا رقص اور کہیں مطرب کا سرود
گونج اور شور سے معمور ہے کل ارض و سما
یہاں تو پپیہا گاتی ہے وہاں ہر وہ کچھ سنگھا
جس کو سن سن کے فلک ناچتے ہے بر روئے ہوا
مور کا شور فغاں غوک کی جھینگر کی جھنکار
کوئل کی صدا
سجدۂ شکر کہیں نغمۂ رقاص کہیں
بوس و آغوش کہیں ساغر و مینا کی ادا
ایک جہاں بھیگ رہا ہے ایک خلق ہے سیراب نشاط
ایک عالم کو ہے عیش و طرب و برگ و نوا
اہل ظاہر ہی نہیں مست سے عیش و سرور
اہل باطن کبھی اچھلتا ہے ہر ایک وجد میں آ

شہر اور دشت میں یہاں چار مہینے تو نظیر
نظر آجاتے ہیں جنت کے نمونے ہر جا

عید

شاد تھا جب دل وہ تھا اور ہی زمانا عید کا
اب تو یکساں ہے ہمیں آنا نہ آنا عید کا
دل کا خون ہوتا ہے جب آتا ہے اپنا ہم کو یاد
آدھی آدھی رات تک مہندی لگانا عید کا
آنسو آتے ہیں بھر جب دھیان میں گزرے ہے آہ
پچھلے پہرے سے وہ اٹھ اٹھ کر نہانا عید کا
حشر تک جاتی نہیں خاطر سے اس حسرت کی بو
عطر نیفوں میں وہ بھر بھر کر لگانا عید کا
ہونٹھ جب ہوتے تھے لال اب آنکھیں ہو جاتی ہیں سرخ
یاد آتا ہے جو ہم کو پان کھانا عید کا
دل کے ہو جاتے ہیں ٹکڑے جس گھڑی آتا ہے یاد
عید گہ تک دلبروں کے ساتھ جانا عید کا
گلعذاروں کے میاں ملنے کی خاطر جب تو ہم
ٹھان رکھتے تھے حسینوں سے بہانا عید کا
اب تو یوں چھپتے ہیں جیسے پھر سے ہم آئے کوئی
یا بنے پھرتے تھے ہم آپ ہی نشانا عید کا

نیند آتی تھی نہ ہرگز بھوک لگتی تھی ذرا — یہ خوشی ہوتی تھی جب ہوتا تھا آنا عید کا

کیا ہوئے وہ دن کہاں جاتے رہے جواب نظیرؔ
اُٹھ گیا خاطر سے سب ہنسنا ہنسانا عید کا

رات

کھینچ کر اس ماہ رو کو آج یہاں لائی ہے رات — یہ خدا نے مدتوں میں ہم کو دکھلائی ہے رات

چاندنی ہے رات ہے خلوت ہے صحن باغ ہے — جام بھر ساقی کہ یہ قسمت سے ہاتھ آئی ہے رات

بے حجاب اور بے تکلف ہو کے ملنے کے لئے — وہ تو ٹھہرا لیتے تھے دن پر ہم نے ٹھہرائی ہے رات

جب میں کہتا ہوں کسی شب کو تو کافر یہاں بھی آ — ہنس کے کہتا ہے میاں ہاں وہ بھی بنوائی ہے رات

کیا مزہ ہو ہاتھ میں زلفیں ہوں اور یوں پوچھئے — اے مری جاں سچ کہو تو کتنی اب آئی ہے رات

جب نشے کی لہر میں بال اس پری کے کھل گئے — صبح تک پھر تو چمن میں کیا ہی لہرائی ہے رات

دور میں حسن بیاں کے ہم نے دیکھا بارہا — رخ سے گھبرایا ہے دن زلفوں سے گھبرائی ہے رات

ہے شب وصل آج تو دل بھر کے سو وے گا نظیرؔ
اس نے یہ کتنے دنوں میں عیش کی پائی ہے رات

عالم کے بیچ جس گھڑی آتی ہے شب برات — کیا کیا ظہور نور دکھاتی ہے شب برات

دیکھے ہے بندگی میں جسے جاگتا تو پھر — پھولی نہیں بدن میں سماتی ہے شب برات

روشن ہیں دل جنھوں کے عبادت کے نور سے — اُن کو تمام رات جگاتی ہے شب برات

بخشش خدا کی راہ میں کرتے ہیں جو عجب — برکت ہمیشہ اُن کی بڑھاتی ہے شب برات

خالق کی بندگی کرو اور نیکیوں سے دم — یہ بات ہر کسی کو سناتی ہے شب برات

غافل نہ بندگی سے ہو اور خیر سے ذرا — ہر لحظہ یہ سبھوں کو جتاتی ہے شب برات
حُسنِ عمل کرو جو بھلا عاقبت میں ہو — سب کو یہ نیک راہ بتاتی ہے شب برات
لے کر امیر حمزہ کے ہر یار نام کو — خلقت کو اُن کی یاد دلاتی ہے شب برات

کیا کیا میں شب برات کی خوبی کہوں نظیرؔ
لاکھوں طرح کی خوبیاں لاتی ہے شب برات

ازار بند

چھوٹا بڑا نہ کم نہ منجھولا ازار بند — ہے اس پری کا سب سے امولا ازار بند
گوٹا، کناری، بادلہ، مقیش کے سوا — تھا چار تولے موتی جو تولا ازار بند
ہر ایک قدم پہ شوخ کے زانو کے درمیاں — کھاتا ہے کس جھلک سے جھکولا ازار بند
جوں ہی کمر سے اس کی مرا ہاتھ لگ گیا — لونڈی سے بولی، جا مرا ڈھولا ازار بند
سہنے میں ہاتھ میرا کہیں لگ گیا تو وہ — لونڈی سے بولی جا مرا ڈھولا ازار بند
اور دھو نہیں تو پھینک دے ناپاک ہو گیا — وہ دوسرا جو ہے سو پرولا ازار بند
اک دن کہا یہ میں نے کہ اے جان آپ کا — ہم نے کبھو مزے میں نہ کھولا ازار بند
سُن کر لگی یہ کہنے کہ وا چھوڑے جیہ خوش — ایسا بھی کیا میں رکھتی ہوں پولا ازار بند
آجاوے اس طرح سے جو ہر کسی کے ہاتھ — ویسا تو کچھ نہیں مرا بھولا ازار بند
اک رات میرے ساتھ وہ عیّار مکرباز — لیٹی چھپا کے اپنا ممولا ازار بند
جب سو گئی تو میں نے بھی دہشت میں اس کی — پہلے تو چپکے چپکے ٹٹولا ازار بند
آخر بڑی تلاش سے اس شوخ کا نظیرؔ — جب آدھی رات گزری تو کھولا ازار بند

کوٹھا

کبھی تو آؤ ہمارے بھی جان کوٹھے پر
لیا ہے ہم نے اکیلا مکان کوٹھے پر

کھڑے جو ہوتے ہو تم آن آن کوٹھے پر
کرو گے حسن کی کیا تم دوکان کوٹھے پر

تمھیں جو شام کو دیکھا تھا بام پر میں نے
تمام رات رہا میرا دھیان کوٹھے پر

یقیں ہے بلکہ مری جاں جب کہ نکلے گی
تو آ رہے گی تمھارے ہی جان کوٹھے پر

مجھے یہ ڈر ہے کسی کی نظر نہ لگ جائے
پھرو نہ تم کھلے بالوں سے جان کوٹھے پر

بشر تو کیا ہے فرشتے کا جی نکل جاوے
تمھارے حسن کی دیکھ آن بان کوٹھے پر

جھمک دکھا کے ہمیں اور بھی پھنسانا ہے
جبھی تو چڑھتے ہو تم جانِ جان کوٹھے پر

تمھیں تو کیا ہے ولیکن مری خرابی ہو
کسی کا آن پڑے اب جو دھیان کوٹھے پر

گو چونے کاری میں ہوتی ہے سرخی تو ایسی
کسی کے خون کا یہ ہے نشان کوٹھے پر

یہ آرزو ہے کسی دن تو اپنے دل کا درد
کریں ہم آن کے تم سے بیان کوٹھے پر

لڑاؤ غیر سے آنکھیں کہو ہو ہم سے آہ
کہ تھا ہمیں تو تمھارا ہی دھیان کوٹھے پر

خدا کے واسطے اتنا تو جھوٹ مت بولو
کہیں نہ ٹوٹ پڑے آسمان کوٹھے پر

کمند زلف کی لٹکا کے اس صنم نے نظیرؔ
چڑھا لیا ہے مجھے اپنے ندان کوٹھے پر

کوٹھا

رہے جو شب کو ہم اس گل کے ساتھ کوٹھے پر
تو کیا بہار سے گزری ہے رات کوٹھے پر

یہ دھوم دھام رہی صبح تک آہاہاہا
کسی کی اُتری ہے جیسے برات کوٹھے پر

مکان جو عیش کا ہاتھ آیا غیر سے خالی
پٹے کے چلنے لگے پھر تو ہات کوٹھے پر

گرایا، شور کیا، گالیاں دیں، دھوم مچی
عجب طرح کی ہوئی واردات کوٹھے پر

لکھیں ہم عیش کی تختی کو کس طرح اے جاں
قلم زمین کے اوپر دوات کوٹھے پر

کمند زلف کی لٹکا کے دل کو لے لیجئے
یہ جنس یوں نہیں آنے کی ہات کوٹھے پر

خدا کے واسطے زینے کی راہ بتلاؤ
ہمیں بھی کہنی ہے کچھ تم سے بات کوٹھے پر

لپٹ کے سوئے جو اس گل بدن سے کوٹھے پر
تمام ہو گئیں حل مشکلات کوٹھے پر

بہار

گلشن عالم میں جب تشریف لاتی ہے بہار
رنگ و بو کے حسن کیا کیا کچھ دکھاتی ہے بہار

صبح کو لاکر نسیم دلکشا ہر شاخ پر
تازہ تر کس کس طرح کے گل کھلاتی ہے بہار

نونہالوں کی دکھا کر دمبدم نشو و نما
جسم میں روح رواں کیا کیا بڑھاتی ہے بہار

بلبلیں چہکارتی ہیں شاخ گل پر جا بجا
بلبلیں کیا فی الحقیقت چہچہاتی ہے بہار

حوض و فواروں کو دے کر آبرو پھر لطف سے
کیا مطرا فرش سبزے کا بچھاتی ہے بہار

جنبش باد صبا سے ہو کے ہم دوش نشاط
ساتھ ہر سبزے کے کیا کیا لہلہاتی ہے بہار

خلق کو ہر لحظہ اپنے حسن کی رنگت دکھا
بے تکلف کیا ہی ہر دل میں سماتی ہے بہار

مجمع خوباں ہجوم عاشقاں اور جوش گل
دیکھ ان رنگوں کو کیا کیا کھلکھلاتی ہے بہار

گل رخوں کی دیکھ کر گل بازیاں ہر دم نظیر
گل ادھر خنداں، ادھر دھومیں مچاتی ہے بہار

آگرہ

رکھتا ہے گو قدیم سے بنیاد آگرہ　　اکبر کے نام سے ہوا آباد آگرہ
یاں کے کھنڈر بنا اور جگہ کی عمارتیں　　یارو عجب مقام ہے دل شاد آگرہ
شداد زر لگا نہ بناتا بہشت کو　　گر جانتا کہ ہووے گا آباد آگرہ
توڑے کوئی قلعے کو کوئی لوٹے شہر کو　　اب کس سے اپنی مانگے بھلا داد آگرہ
اب تو ذرا سا گاؤں ہے بیٹی نہ دے اسے　　لگتا تھا ورنہ چین کا داماد آگرہ
ایک بارگی تو اب مجھے یارب تو پھر بسا　　کرتا ہے اب خدا سے یہ فریاد آگرہ
اک خوب رو نہیں ہے یہاں ورنہ ایک دن　　تھا رشک حسن بلخ و نوشاد آگرہ
ہرگز وطن کی یاد نہ آوے اسے کبھی　　جو کر کے اپنی جان کو کرے شاد آگرہ

اس میں سدا خوشی سے رہا ہے ترا نظیر
یارب ہمیشہ رکھیو تو آباد آگرہ

پری

رخ پری، چشم پری، زلف پری، آن پری　　کیوں نہ اب نام خدا ہو ترے قربان پری
جھمکے جھلکے وہ ثریا کے، کرن پھول، وہ پھول　　بندے، بالے پری، موتی پری اور کان پری
رشکِ خورشید جبیں، ابر سے یہ سی پٹی　　لہر چوٹی کی غضب، زلف پریشان پری
حسن گلزار، قمر شکل، صراحی گردن　　مہ جبیں، سیب ذقن، چاہِ زنخدان پری
مار غمزے کی بلا، تیر نگہ، دشت سناں　　تیغ ابرو کی ستم، ترکشِ مژگان پری

مسکرانے کی ادا جیسے چمک بجلی کی — آن ہنسنے کی قیامت، لب و دندان پری
آنکھیں مستی کی بھری شوخ نگاہیں چنچل — تہر کاجل کی کھچاوٹ، مسی دیان پری
بینی و نتھ کا وہ عالم کہ چھدے دل جس سے — جو رحیتی کی جھلک گوہر غلطان پری
چاک سینے کا غضب صاف بدن موتی سا — انگیا تصویری، کرتی کا گریبان پری
دھگدھگی چاندسی، جگنو بھی ستاروں کی مثال — توڑے زنجیر تماشا وہ عطردان پری
پشت گلبرگ، شکم سیم، کمر تار نگاہ — ساق بلور، گلاوٹ میں ہر اک آن پری
گھیرا پشواز کا وہ جس کے کنارے قربان — چال آفت کا نشان، جنبش دامان پری

کیا کہوں اس کے سراپا کی میں تعریف نظیر
قد پری، دھج پری، عالم پری اور شان پری

بسنت

مل کر صنم سے اپنے ہنگام دلکشائی — ہنس کر کہا یہ ہم نے اے جان بسنت آئی
سنتے ہی اس پری نے گل گل شگفتہ ہو کر — پوشاک زرفشانی اپنی وہیں رنگائی
جب رنگ آئی اس کی پوشاک پُر نزاکت — سرسوں کی شاخ پُر گل پھر جلد اک منگائی
اک پنکھڑی اٹھا کر نازک سی انگلیوں میں — رنگت کو اس کی اپنی پوشاک سے ملائی
جس دم کیا مقابل کسوت سے اپنے اس کو — دیکھا تو اس کی رنگت اس پر ہوئی سوائی
پھر تو بصد مسرت اور سو نزاکتوں سے — نازک بدن پہ اپنے پوشاک وہ کھپائی
چمپے کا عطر مل کر موقع سے پھر خوشی ہو — سیمیں کلائیوں میں ڈالے کڑے طلائی
بن ٹھن کے اس طرح سے پھر راہ لی چمن کی — دیکھی بہار گلشن بھر طرب فزائی

جس جس روش کے اوپر جا کر ہوا نمایاں — کس کس روش سے اپنی آن و ادا دکھائی
کیا کیا بیاں ہو جیسے — وہ زرد پوشی اس کی وہ طرز دلربائی
صد برگ نے صفت کی، نرگس نے بے تامل — لکھنے کو وصف اس کا اپنی قلم اٹھائی
پھر حسن میں چمن کے آیا یہ حسن خوبی — اور طرفہ تر بسنتی اک انجمن بنائی
اس انجمن میں بیٹھا جب ناز و تمکنت سے — گلدستہ اس کے آگے ہنس ہنس بسنت لائی
کی مطربوں نے خوش ہو آغاز نغمہ سازی — ساقی نے جام زریں بھر بھر کے مے پلائی

دیکھ اس کو اور محفل اس کی نظیرؔ ہر دم
کیا کیا بسنت آ کر اس وقت جگمگائی

دوالی

دوستو کیا کیا دوالی میں نشاط و عیش ہے — سب مہیا ہے جو اس ہنگام کے شایاں ہے شے
اس طرح ہیں کوچہ و بازار پر نقش و نگار — ہو عیاں حسن نگارستان چیں کی جن سے لے
گرمجوشی اپنی با جام چراغاں لطف سے — کیا ہی روشن کر رہی ہے ہر طرف روغن کی مے
مائل سیر چراغاں خلق ہر جا دمبدم — حاصل نظارہ حسن شمع رویاں پے بہ پے
عاشقاں کہتے ہیں معشوقوں سے با عجز و نیاز — ہے اگر منظور کچھ لینا تو حاضر ہیں روپے
گر مکرر عرض کرتے ہیں تو کہتے ہیں وہ شوخ — ہم نہیں لیتے میاں تکرار و حجت تا بہ کے
کہتے ہیں اہل قمار آپس میں ہو گرم اختلاط — ہم تو ڈوبے ہیں سو روپے رکھتے ہیں تم رکھ دو ہو کے
جیت کا پڑتا ہے جس کا داؤں وہ کہتا ہے لو — سو سے دست راست ہے میرے کوئی فرخندہ پے
ہیں بہت سے شہر میں بھی یوں تو زینت و فرحت نظیرؔ — پر دوالی بھی عجب پاکیزہ تر تہوار ہے

خربوزے

اب تو بازار کے ہیں زیب فزا خربوزے — ہیں جدھر دیکھو اُدھر جلوہ نما خربوزے
قند و مصری کی حلاوت تو عیاں ہے لیکن — قند و مصری کے بھی ہیں ہوش ربا خربوزے
دلکش اتنے ہیں کہ بازار میں سینے تربوز — گر کوئی جا دے تو لاتا ہے کٹا خربوزے
ناشپاتی کو لگا کر اگر امرود و انار — ہوں مقابل تو انھیں گنتے ہیں کیا خربوزے
سو بڑھل لے کے کٹھل بھی اگر آوے چل کر — اپنے ایک قاش سے دیں اس کو ہٹا خربوزے
یار آیا تو کہا ہم نے منگا دیں لڈو — قطعہ — ہنس کے اس شوخ شکر لب نے کہا خربوزے
ککڑیاں فالسے منگوا دیں تو جھنجھلا کے کہا — پوچھتے کیا ہو تمھیں کہہ تو دیا خربوزے
ہم نے دیکھا کہ ادھر رغبت خاطر ہے بہت — حکم کرتے ہی دیے ڈھیر لگا خربوزے
چھو لیا سیب ذقن کو تو کہا واہ چہ خوش — تم نے منگوائے اسی واسطے کیا خربوزے
اب کے تنفتا لوئے لب سے کوئی لو گے بوسہ — اچھی حرفت کو لئے تم نے منگا خربوزے

شکریں میوے ہوں اور سب کو بہم پہنچیں بہت
سو نظیر ایسے تو تربوز ہیں یا خربوزے

سمدھن

سراپا حسن سمدھن کا گویا گلشن کی کیاری ہے — پری بھی اب تو بازی حسن میں سمدھن سے ہاری ہے
کھنچی کنگھی گندھی چوٹی جمی پٹی لگا کاجل — کماں ابرو نظر جادو نگہ ہر ایک دولاری ہے
جبیں مہتاب آنکھیں شوخ شیریں لب گہر دنداں — بدن موتی دہن غنچہ ادا ہنسنے کی پیاری ہے

نیا کمخواب کا لہنگا، جھمکتی تاش کی انگیا
کچیں تصویر سی جن پر لگا گوٹا کناری ہے

ملایم پیٹ مخمل سا، کلی سی ناف کی صورت
اُٹھا سینہ، صفا پیڑو، عجب جوبن کی تیاری ہے

سرین نازک، کمر پتلی، خط گلزار ردِ ما دل
کہوں کیا آگے اب اس کے مقام پردہ داری ہے

لٹکتی چال مدھ ماتی، چلے بچھوؤں کو جھنکاتی
ادائیں دل لیے جاتی، عجب سمدھن ہماری ہے

پھرے جوبن پہ اتراتی جھمک انگیا کی دکھلاتی
کمر لہنگے سے بل کھاتی، لٹک گھونگھٹ کی پیاری ہے

تمھیں کیا ہے خبر اس بات کی سنتے ہو سمدھی جی
ہمیں سمدھن کی خدمت میں بہت مدت سے یاری ہے

ہنسے بولے ہوا دل شاد بوسے بھی لیے ہم نے
مگر اس عین مطلب کی رہی امیدواری ہے

لکھی تو نے نظیر ایسی غزل، اب وصفِ سمدھن میں
مصور نے گویا تصویر نک سُک کی اُتاری ہے

سمدھن

کروں کس منہ سے اب یارو بیاں میں شان سمدھن کی
لگی ہے اب تو میرے دل کو پیاری آن سمدھن کی

چمن میں حسن کے ہوں اس کے رُخ اور زلف پر قرباں
اگر دیکھیں ذرا صورت گل و ریحان سمدھن کی

کمر نازک، مٹکتی چال، آنکھیں شوخ، تن گورا
نظر چنچل، ادا اچپل، یہ ہے پہچان سمدھن کی

سنہری تاش کا لہنگا، روپہلے گوٹ کی انگیا
چمکتا حسن جوبن کا، جھمکتی آن سمدھن کی

ملائی سا شکم، سینہ مصفا، خوش نما ساقیں
صفا زانو کا آئینہ، ملایم ران سمدھن کی

کہوں کچھ اور بھی آگے جو سمدھن حکم فرمادیں
صفت منظور ہے ہم کو تو اب ہر آن سمدھن کی

بڑا احسان مانیں ہم تمھارا آج سمدھی جی
میسر ہو اگر صحبت یہیں ایک آن سمدھن کی

ہمیں ایک دو گھڑی کے واسطے دلوا دو لا دو تم
جو کچھ لہنگے کے اندر چیز ہے پنہاں سمدھن کی

نظیر اب آفریں ہے یار تیری طبع کو ہر دم
کہی تعریف تو نے خوب عالی شان سمدھن کی

موتی

پریزادوں میں ہے نام خدا جس شان موتی
کوئی ایسا نہیں موتی اگر موتی اگر موتی
جھمک جاوے نگاہوں میں جواہر خانۂ قدرت
جو کھا کر پان اور مل کر مسی ہنس دے اگر موتی
رگ گل اس کمر کے سامنے بھرتی پھرے پانی
لچک میں اور نزاکت میں جو رکھتی ہے کمر موتی
ادھر ہر ایک مکاں پر موتیوں کے ڈھیر ہو جاویں
ادائے ناز سے ہنس کر قدم رکھے جدھر موتی
صدا سن کر ہر ایک کی چشم سے موتی ٹپکتے ہیں
فقط بیٹھے ہی گانے میں یہ رکھتی ہے اثر موتی
عجب نقشہ عجب سج دھج عجب آنکھیں عجب نظریں
بڑے طالع بڑی قسمت جو دیکھے اک نظر موتی
شرف دینے کو بیٹے پر شرف ہیرے کو ہیرے پر
شرف شرفن کو لعلوں پر رہی ہے جس کے گھر موتی
ہر ایک دندان موتی حسن موتی نام بھی موتی
سراپا چشم موتی اس پہ پہنے سربسر موتی

جو خوبان بے نظیر اس دور میں ہیں نازک و رنگیں
شرف رکھتی ہے یارو اب تو سب کے حسن پر موتی

آرسی

قطعہ

بنوا کے ایک آرسی ہم نے کہا کہ لو
پکڑی کلائی اس کی جو وہ شاخسار سی
لے کر بڑے دماغ سے اور دیکھ یک بہ یک
تیوری چڑھا کے ناز میں کچھ کر کے عار سی
جھنجھلا کے دور پھینک دی اور یوں کہا نہ خوش
ہم مارتے ہیں ایسی انگوٹھے پہ آرسی

چند تضمین و مستزاد

خمسہ بر غزل سعدی

کل ہم جو گئے باغ میں ٹک لطف اٹھانے　　اور دل کو لگے سیر گلستاں کی دکھانے
اتنے میں کہوں کیا تجھے اے یار یگانے　　بر بود دلم در چمنے سرو روانے
زریں کمرے، سیم برے، موئے میانے

وہ شوخ کہ عالم میں نہ دیکھا ہو کسی نے　　وہ حسن کہ ستے حور نے پایا نہ پری نے
کیا تجھ سے کہوں اس کی میں خوبی کے قرینے　　خورشید رخے، ماہ وشے، زہرہ جبینے
یاقوت لبے، سنگ دلے، تنگ دہانے

گلفام، گل اندام، دلارام، نکوئے　　دلدار، دل آزار، جفا کار دو رُوئے
آہو صفتے، کبک تگے، عنبریں موئے　　بیداد گرے، کج کلہے، عربدہ جوئے

شکر شکنے، تیر قدے، سخت کمانے

ابرو خم طاق حرم و زلف کنشتے ۔۔۔ قد رنج دل طوبیٰ و رخ رشک بہشتے
تل نقش سویدائے دل و خط لب کشتے ۔۔۔ جادو نظرے، عشوہ گرے، حسن سرشتے
آسیب دلے، رنج تنے، آفت جانے

وہ رخ کہ ہر اک شوخ پریزاد کو شہ دے ۔۔۔ وہ زلف کہ سنبل جسے بیتاب ہو کہہ دے
گر حور کبھی دیکھے تو اُسے جان میں رد دے ۔۔۔ عیسیٰ لقبے، خضر رہے، یوسف عہدے
جم مرتبہ، تاجورے، شاہ جہانے

شمشیر نگہ، تیرہ مژہ، قاتل خلقے ۔۔۔ غارت گر و برباد دہ حاصل خلقے
مشہور جہاں، فتنۂ جاں، مقبل خلقے ۔۔۔ تنگ شکرے، چوں شکرے در دل خلقے
شوخے، نمکینے، چو نمک شور جہانے

کیا اس کی میں تعریف کہوں حسن ادا کی ۔۔۔ ہے ختم دو عالم کی اسی شوخ پہ خوبی
پھر مثل نظیر اس بت رعنا سے لگا جی ۔۔۔ بے زلف و رخ و لعل لب او شدہ سعدی
آہے و بخارے و غبارے و دخانے

خمسہ بر غزل خسرو

کب لالہ و گل کر سکیں عارض سے ترے ہمسری ۔۔۔ قد سے خجل سرو سہی، رفتار سے کبک دری
محبوب تجھ سے سیکھ لیں ناز و ادا و دلبری ۔۔۔ اے چہرۂ زیبا سے تو رشک بتان آذری
ہر چند وصفت می کنم در حسن زاں زیباتری

ہے شور تیرے حسن کا اے گل زمیں سے چرخ تک ۔۔۔ دن رات صوت کو تری تسبیح کرتے ہیں ملک

دیکھے ہے جو تیرے تئیں کہتا یہی ہے یک بہ یک   تا نقش می بندد فلک کس را نہ داد است ایں نمک
حورے نہ دانم یا ملک فرزند آدم یا پری
تیرا رخ اے رعنا صنم بھر کر نظر دیکھے ہے جو   کھو دین و ایماں سے تئیں باندھے ہے وہ زنار کو
دیوانے تیرے عشق میں ویسے نہیں کچھ ایک دو   عالم ہمہ یغمائے تو خلقے ہمہ شیدائے تو
ایں نرگس شہلائے تو آورد رسم کافری
ہے خلق و خوبی میں بھرا اس طور سے وہ نازنیں   بہزاد و مانی دیکھتے تو ہوتے وہ حیرت قریں
گر اس بیاں کے راست کا آتا نہیں تجھ کو یقیں   صورت گر نقاش چیں رو صورت یارم بہ بیں
یا صورتے کش ایں چنیں یا ترک کن صورت گری
ہیں خلق میں ہر سو عیاں رنگیں ادا زیبا صنم   گلگوں قبا، نازک بدن، ہے سو بہ زینت سے بہم
کی غور تو سچ ہے یہی مجھ کو محبت کی قسم   آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری
آیا نظر جس روز سے تجھ سا شکر لب مہ لقا   ابرو کماں، جادو نظر، شیریں سخن اور عشوہ زا
اپنے وطن کو چھوڑ کر مثل نظیر مبتلا   خسرو غریب ست و گدا افتادہ در شہر شما
باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

خمسہ بر غزل حافظ

کہاں وہ کیقبادی کار خانہ   کہاں وہ مے وہ جام خسروانہ
کہوں کیا تجھ سے اے یار یگانہ   سحر گاہاں مخمور شبانہ
گرفتم بادہ با چنگ و چغانہ

پڑا جب گوش میں وہ نالۂ نے　　تو سوجھی اور ہی عالم کی اک شے
ہوئی مستی ز دمہوشی جو در پے　　نہادم عقل را رہ توشۂ از مے

بہ ملکِ عاقبت کردم روانہ

کیا پہلے ہی ساغر نے یہ دل شاد　　کہ سر اپنا رہا مجھ کو نہ یا یاد
تو مجھ کو کر کے اور ایک جام امداد　　نگارے می فروشم عشوہ داد

کہ ایمن گشتم از مکرِ زمانہ

ہوا جب میں نہایت شاد و خرم　　تو رکھ کر سر قدم پر اس کے ہر دم
کہا میں نے اسے لے ساقیِ جم　　بہ دہ کشتی مے تا خوش سرایم

دریں دریائے ناپیدا کرانہ

کیا ہے گر مجھے منزل سے محرم　　تو رستے میں نہ چھوڑ اے خضرِ عالم
کہا جب میں نے یہ نکتہ تو اس دم　　ز ساقیِ کمان ابرو شنیدم

کہ لے تیرِ ملامت را نشانہ

یہ باریک ہے اور تو ہے فربہ　　کمان اس عزم کی ہرگز نہ کر زہ
گمان و وہم کی جا گہ نہیں یہ　　برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ

کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اگر ہے تجھ کو اس رہ سے سروکار　　تو ہو سب ماسوا سے تارک اے یار
نہ رکھیو بیخودی کی کچھ خبر دار　　نہ بندی زاں میاں طوقِ کمر دار

اگر خود را نہ بینی در میانہ

وہی عاشق وہی معشوق دلجوست　　وہی بو اور وہی مغز اور وہی پوست

وہی جامی، وہی دشمن، وہی دوست — شراب و شاہد و ساقی ہمہ اوست

خیالِ آب و گِل در رہ بہانہ

نظیر اب چوں تو شیدا نیست حافظ — تن خاکی عجب جائیست حافظ

نہ دریا و نہ صحرا نیست حافظ — وجودِ ما معمائیست حافظ

کہ تحقیقش فسون است و فسانہ

خمسہ بر غزل خود

قمر خجل ہواخوں کی تھلک نہ دیکھ سکا — سنہرے رنگ کی کندن ڈلک نہ دیکھ سکا

گہر بھی لب کے سخن کی ڈھلک نہ دیکھ سکا — ترے جمال کی سورج جھلک نہ دیکھ سکا

کھلی نقاب رہی جب تلک نہ دیکھ سکا

ترے الم میں نہ ہو وصل سو دہورت کو — نہ ہمسری ہو کبھی ہاف سے کہ ورت کو

ملاپ تجھ سے کہاں آب و گل کی صورت کو — تو وہ ہے نور سراپا کہ تیری صورت کو

بشر تو کیا ہے مری جاں ملک نہ دیکھ سکا

غم فراق میں جینے سے ہم جو اکتائے — ندان یار کے کوچے میں جا کے کام آئے

تو واں بھی ذرّے ہمارے ہوا نے اڑوائے — گلی کی خاک بھی ہو کر نہ ٹھہرنے پائے

ہمیں تو آہ فلک یاں تلک نہ دیکھ سکا

ہوا ہوں سوکھ کے کانٹا میں ہجر میں یارو — نہ بال اور نہ پر اب مرے مقابل ہو

کمال ضعف کا اپنے میں کیا کہوں یارو — یہ ناتواں ہوں کہ آیا جو یار ملنے کو

تو صورت اس کی اٹھا کر پلک نہ دیکھ سکا

پڑا ہے آہ مجھے جب سے شوخ سے پالا　　نہ جی کو چین ہوا اور نہ دل نے سکھ پایا
لگا لگا کے نگاہوں کا تیر اور بھالا　　گھڑی تو دل کو پرویا گھڑی جگر چھیدا
کبھی خوشی وہ مجھے ایک پل نہ دیکھ سکا

ابھی تو آہ خموں میں شراب ہے باقی　　سبھوں کی عیش کی یاں ہو رہی ہے بیباقی
ہمارے یار کو ظالم یہ چین مشتاقی　　لگا گھٹانے جواب سے کو دمبدم ساقی
ہمارے جام کی شاید جھلک نہ دیکھ سکا

کبھی ادھر کو جو قاصد ترا گزر ہووے　　وہاں کہ راہ میں جاتے کہیں تجھے وہ ملے
تو آہ بھر کے یہ کہیو تو اس پری رو سے　　نظیر تجھ سے نہ ہوتا کبھی جدا پیارے
مگر یہ عشق، حسد سے فلک نہ دیکھ سکا

خمسہ بر غزل سراج

کھلی جب کہ چشم دل حزیں تو وہ غم رہا نہ تری رہی　　ہوئی حیرت ایسی کچھ آن کر کہ اثر کی سب بے اثری رہی
پڑی گوش جاں میں عجب ندا کہ جگر نہ بے جگری رہی　　خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

ہوئیں کیا ہی دل کو فراغتیں گئی جب سے قید لباس کی　　نہ ہوائے اطلس و گلبدن نہ تلاش بادلہ و زری
کوئی پہنو یا کہ نہ پہنو اب غرض اس کو جانے بلا مری　　شہ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

کسی وقت مکتب عقل میں بہت علم ہم نے بھی تھا پڑھا　　کہ ہر اک سے حجت و بحث تھی سو اس علم کا یہ کمال تھا
گیا جب کہ مدرسۂ عشق میں تو اب آگئے یار دکھوں میں کیا　　وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا

کہ کتاب عقل کی طاق میں جو دھری تھی وہ ہیں دھری رہی

ترے منہ پہ اب تو ہے وہ جھلک کہ جہاں تو جا کے نہاں ہوا
اگر آفتاب جمال تھا تجھے دیکھ وہ بھی نہاں ہوا
کوئی آگے تیرے نہ آ سکا وہ قمر کہ مہر نشاں ہوا
ترے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر تو عیاں ہوا
کہ نہ آئینے میں جلا رہی، نہ پری کی جلوہ گری رہی

عجب اتفاق ہے خود بخود مرے دل سے عشق نکل گیا
پڑی آگ غم کی وہ تن میں آ کہ بہ رنگِ شمع پگھل گیا
ادھر آہ شعلہ زناں ہوئی ادھر اشک آنکھوں سے ڈھل گیا
چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

کرے عشق اب وہ جہاں میں کہ سبھوں سے بیٹھے وہ ہاتھ دھو
نہ کسی کے ڈر سے چھپے کہیں نہ کسی کے خوف سے دیوے د
اسے کچھ کسی کی خبر نہیں ہوا اب تو مثلِ نظیر وہ
ترے دردِ عشق میں اے میاں دل بنو اسے سراج کو
نہ خطر رہا، نہ حذر رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

مستزاد

ساقی مری آغوش میں ہے آج وہ دلبر، یہ وصل کی ہے شب
جلدی سے گلابی سے گلگوں کی اٹھا کر بھر جام لبالب
عطر و گل و رقص و شبِ مہتاب و لبِ بام، اور مجمعِ خوباں
اسباب جو ہیں فرحت و عشرت کے سراسر اس وقت وہ ہیں سب
سینے میں تری، لب میں ہنسی، جان میں شادی، نظروں میں بہاریں
آنکھوں میں نشے دل میں خوشی رہیں سمت کیا عیش ہیں مطلب
رنگین در و دیوار ہیں اور صحن میں ہر جا ہیں ڈھیر گلوں کے
اس حسرتِ گلزار کے آنے سے مرا گھر ہے رشکِ چمن اب

ساقی کی ادا دل کو اُدھر کھینچے ہے کیا کیا، ہر جام کے ہمراہ
چھینیں ہیں ادھر صبر و خرد ناز سے ہنس کر محبوب شکر لب

مدت سے نظیرؔ عشق کی سرکار سے، بارے طالع کی مدد سے
عشرت کی ہوئی ہے مری جاگیر مقرر، اور عیش کا منصب
مستقرا ۲

کرتا ہے نگاہوں کو ترا مطلع انوار، یہ مہر فزا رخ
کس کا ہے بتا نام خدا ایسا چمک دار، اے تیرے سوا رخ

دل تڑپے ہے اور آنکھیں کھلی رہتی ہیں دن رات فرقت کے الم سے
وہ کون سا دن ہوگا مبارک جو ہم اے یار دیکھیں گے ترا رخ

مہتاب کی کیا تاب جو ہو تیرے مقابل اے رشک مہ و مہر
خورشید بھی دیکھے جو ترے منہ کو تو یک بار چھپ جاوے تپا رخ

مدت سے ترستے ہیں ترے دیکھنے کو ہم، ڈر کچھ تو خدا سے
زلفوں کے تئیں کھول کے اے دلبر عیار مت ہم سے چھپا رخ

آئینہ ترے دیکھ کے عارض کی صفائی رہ جاتا ہے حیراں
رکھتا ہے ترا حسن میں اے حسرت گلزار یہ حسن صفا رخ

اتنا کوئی کہتا نہیں اس شوخ سے جا کر افسوس صد افسوس
مرتا ہے ترے ہجر میں ایک طالب دیدار، ٹک اس کو دکھا رخ

کیونکر نہ بھلا اپنے کو دل دیجئے نظیرؔ آہ، جو حسن میں جس کا
لب روح فزا، عشوہ ستم، زلف فسوں کار اور ہوش ربا رخ

فرهنگ

فرہنگ

۱- الٰہی نامہ

ٹھاٹھ - سامان - انتظام	کشف - پوشیدہ حالات جاننا	زنار - جنیو	طور - قسم
ہو حق - نیست نابود - فنا فی اللہ	کرامات - خلاف عادت باتیں کرنا معجزہ	قلندر - آزاد	وثاقی - وفادار
خبیثات - بد روحیں	مستور - پوشیدہ	گھاتے - مشہور	ٹک - ذرا
سماوات - آسمان	خسرہ - پٹواری کا کاغذ - سند	آگے - پیشتر	ایہام - ایک صنعت شعر کا نام ہے۔

۲- برسات کی بہاریں

ڈابر - چشمے	ڈونڈ - جوش مارنا	امنڈ - جمع ہو کر غل کرنا	جھڑ - پیہم برسنا

گھمنڈ - یکجا ہونا۔ جمع ہونا
ٹکوریں - ٹکریں
ملار - برسات کا گیت
ژٹل - بیہودہ آواز
سیج - بستر
سوہین - زیب دینا۔ سرخ
ابرن - پوشاک

سوگن - فرقت زدہ
برہ - دردِ فرقت
برہن - مہجور عورت
سُدھ - خبر
اٹری - بھری
ماروجی - جنگجو۔ عاشق
رین - رات

جنگلے - جنگل
سنگ - ہمراہ
اسارا - چھپر کا دالان
دوانا - پاگل۔ دیوانہ
اٹاری - چھپر کا بالاخانہ
ندان - آخرکار
کیڑا - سانپ

گھلاوٹ - حسن
چھک - بدمست
کھوئی - بورئیے کی چادر
نکھٹو - نالائق
سکنے - پاس
رت - موسم
اکس - اٹھنا

۳- بنجارہ نامہ

UR.12

بدیس - پردیس
گونیں - جمع ہے گون کی بمعنی
بدری بوری
پلا - تھیلا، ترازو کا پلا
سربھارا - سر پر رکھنے کا تھیلا
لکھی - لکھپتی
چترا - بہتر
داکھ - کشمش
کیسر - زعفران

دھن - دولت
ناتی - نواسہ
ڈنڈا - لاؤ لشکر
بھانڈا - بھرم، دکھاوٹ کا
سامان -
کھانڈا - غالباً کسی پرانے
ہتھیار کا نام ہے۔
نایک - سپاہی۔ جوان۔ دوج
بانڈا - سیاح۔ پھرنے والا
ڈھل - گر پڑنا

دھی پوت - ہونہار فرزند
جنوائی - داماد
کھپنی - تباہ ہونی۔ برباد ہونی
چوپاری - بالاخانے کا کمرہ
جس میں چار کھڑکیاں
ہوں -
بان - تیر
تاش تمامی - ایک قدیم کپڑا
کوٹ - عمارت۔ محل
رند - دیوارِ قلعہ کے موکھے

گڑھ - چھوٹا قلعہ
رہکلہ - چھوٹی توپ
دائی - دودھ پلانے والی
رضاعی ماں
دودا - کھلانے والی
چیلا - شاگرد
بھجنگا - چھوٹے سے چھوٹا
کیڑا -

۴ - عاشق نامہ

نیرنگ - عجائبات
نت - ہمیشہ
راہیل - راے بیل
سیل - نام ہتھیار، بھاری بوجھ
حال - عالم بیخودی، وجدان
حرم - کعبہ، مسجد

پوتھی - مقدس کتاب
سماچار - حالات، روایات، مضامین
وار - اس کنارے پر
سمرن - تسبیح
بھوگی - عیاش، غنی
سوگی - مجبور، فرقت زدہ

بیکنٹھ - جنت
دیوات - بقول شہباز غالباً یہ رلوات ہے جس کے معنی بلندی اور ٹیلہ ہیں
سکنات - خموشی، سکون
مرگانگ - کشتہ

جیبھ - زبان
ڈانگ - مال، سہارا
تھانگ - نقب
مایا - طلسم خیال

۵ - آدمی نامہ

بےنوا - محتاج
کہاتا - مشہور
برملا - کھلم کھلا
حسن - نیکی، اچھائی

قبح - عیب
زور - فریب، چالاکی، ریا
ہادی - رہنما
امام - پیش نماز، پیشوا

تاڑنا - پہچاننا، بھانپنا
نقیب - اعلان کرنے والا
چاکر - نوکر
مزور - مزدور

جاضرور - پاخانہ
وائرے - مجیرے
ٹنگ - طرحدار
مریلہ - شاگرد

۶ - ھنس نامہ

سمنبر - سفید رنگ
طور - قسم
سنوارا - بنایا، سجایا

چاہت - محبت
چنگ - ایک ایرانی باجے کا نام ہے
سیمرغ - رخ، ہما، عنقا، موسیقار

ققنس کی طرح رومان کا پرندہ ہے -
مدارا - خاطر مدارات

برٹنگے - بڑی ناک کا ایک پرندہ
غش - مہوستا
کھپی - پسند آئی

چھماٹپو - شہر پیلی - ایک گاؤں کا نام ہے
جھپ - فوراً
بہبری - بہبودی

وارا - نثار کیا
پیت - محبت
سہارا - برداشت کیا

پنکھ - پر
پسارا - پھیلایا
سنگرارا - مضبوط

دسے - کیفیت - حالت
نرباہ - نباہ
سدھارا - روانہ ہوا

۷ - رقصِ طاؤس تاج گنج

گمزیاں - چھوٹے گنبد
اساس - مضبوط

باس - خوشبو
جھجر - جالیاں

سہاگ - تازگی، شگفتگی
مجلی - چمکیلا

سروسہی - سیدھے سرو
شکرشکن - خوش آواز

۸ - تندرستی نامہ

حرمت - عزت
سدا - ہمیشہ
چلن - چال چلن
نیں - واسطے، کو، لئے

نیری - سرداری
عین - مخصوص
سراسر - بالکل
تباہ - بسراوقات

بنے ٹھنے - خوبصورت سجے ہوئے
بنے - دولھا
ددھیں - فوراً، اسی دم
سو - وہ

تن - بدن
کل - مشین
کل - آرام
چل بچل - بیکار

۹ - ذکرِ مرغان

بھتول - خدا
سانجھ - شام
سویرے - صبح

بپچول - خدا اس کے وجود میں
کوئی شک وشبہ
نہیں
تپنے - جلنے

کلپنے - تڑپنے، بےچین ہوتے
آپ -
بیپچے - اداسے
دادر - مینڈک

سولی - سرخ
تھم - بیج
پنکھی - پرند

۱۰۔ فنا نامہ

افسر۔ تاج
سرور۔ سردار
ڈہائی۔ حکومت
مورچہ۔ محفوظ مقام قلعہ
سنگر۔ لشکر
جھپال۔ ایک قسم کی عماری نما
پالکی۔
میگ ڈنبر۔ ایک قسم کی
گاڑی۔
مہر چھاپا۔ حکم عمل
فوجدار۔ افسر پولیس کا عہدہ دار
کنک۔ زبان آزوار زبی ہیا

لشکر کو کہتے ہیں۔
خاصہ۔ مخصوص
جلیب۔ چلنے والا
ہرہر۔ بشکل
لبیدہ۔ سونٹا آلہ سزا
مردھا۔ مرد یہ دس جوان کا
افسر ایک عہدہ دار جو
سرکار کی طرف سے
دیہاتیوں پر مقرر کیا جاتا
چہرہ۔ ایک قسم کا صافہ
جمدھر۔ ایک قسم کا خنجر
خود۔ لڑائی کے وقت سر

پوشش۔
سلاح۔ ہتیار
بکتر۔ زرہ، لوہے کا بنا ہوا جامہ
گنڈا۔ بدمعاش شہدا
بانکا۔ رنگیلا سپاہی، وضعدار
سپر۔ ڈھال
بچارے۔ سوچے
سبد۔ شبد نانک شاہیوں کی
اصطلاح میں گیت کو
کہتے ہیں۔
وید۔ اہل ہنود کی مقدس کتاب
یہ چار ہیں۔

پران۔ ہنود کی ایک مقدس کتاب
کا نام ہے۔
مصر۔ عالم
نوپلے۔ نشے
جنگم۔ ایک قسم کا فقیر جس کے سر
پر جٹائیں ہوتی ہیں اور
ہاتھ میں سونٹا۔
سیوڑا۔ جین مذہب کا فقیر
جٹا۔ بالوں کا گچھا۔
بانکا۔ چیلا
گبر۔ آتش پرست
نقاش۔ صورت گر

۱۱۔ طفی

منت۔ مراد
ڈول۔ ویسے، ہر طرح

بگڑنا۔ خفا ہونا
گھرنا۔ قید

اوسنتے۔ پھیلاتے
کھسوٹتے۔ کھینچتے

سلونا۔ نمکین
بلوچو۔ منہ سے بجنے والا باجا

۱۲- جوانی

ڈنگ - حیران	گل - زخم	سیف - تلوار	پھل بل - غمزے، ادائیں
پھندے میں - گرفتار	سین - اشارہ، آنکھ کا اشارہ	چاؤ - آؤ بھگت، خوشی	جوں - مثل
معجون - نشہ کی ایک شے ہے	نین - آنکھ	بھاؤ - نرد کرنا	پن - زمانہ، عالم

۱۳- بڑھاپا

کنے - پاس	لنڈورے - بے دم	لگاوٹ - محبت، تعلق	بڑھ کا نام ہے۔۔
رکھ - درخت	پھکڑی - نصیحت	چاہت - محبت	پات - پتہ
پت جھڑ - خزاں	مت - عقل	لت - عادت	بھبوکے - سفید، گورے
ادھوئے - بیکار، لاچار، اپاہج	جگت - پھبتی	ڈھاک - ایک ہندوستانی	چاؤ - محبت، نوازش

۱۴- فقیرن کی صدا

بٹ مار - رہزن	دان - خیرات	پژمردہ	آنند - آرام
بس - قابو	بھاجی - مرنے کا کھانا جو اعزا کرتے ہیں۔	لابھ - دلچسپی، حرص	پھند - مکروفریب
من - طبیعت، قلب، دل		کرنی - افعال، اعمال	ارتھی - جنازہ
بچ چکا - بچ چکا	ناگن - وحشی، بدلگام	سکھ - آرام	ہستی - باقی
پن - خیرات	ہلکان - پریشان، نیم جان	جنتی - گھاتی	اسواری - سواری

۱۵۔ خوشامد

ڈھب ۔ ڈھنگ ، انداز

بیچ ۔ اندر
سروکار ۔ تعلق

آشنا ۔ شناسا
خرابی ۔ بدمست

پیر ۔ مرشد ، ولی

۱۶۔ کلجگ

کرجگ ۔ جاسے عمل ، جائے مکافات
بسیکھا ۔ شمار
تس ۔ اس

پرکھا ۔ تنقید ، پرکھ ، پہچان
تل تل ۔ ذرہ ، ذرہ
لیکھا ۔ تحریر
پڑا ۔ محد

چہیئے ۔ چاہیے
کل ۔ آرام ، چین
کلپاوے گا ۔ دکھ دے گا
آن ۔ ذراسی دیر

طوفان ۔ بہتان
جاگہ ۔ جگہ ، مقام
ہانک ۔ خوف ، ہشیاری

۱۷۔ مفلسی

جہاتی ۔ شرمندہ کراتی
ان ۔ حمیت ، غیرت
ست ۔ طاقت ، خیروبرکت
گزرگئی ۔ مرگئی

پھٹکڑیاں ۔ خواریاں ، ذلتیں
جھکڑیاں ۔ خاردار درخت
پرے ۔ دوسری طرف ، منہ پھیر کر
کلانوٹ ۔ گویا ۔

گوری ۔ ایک راگنی کا نام ہے
بھیاس ۔ ایک راگنی کا نام ہے
بول بول ۔ منت مان کر
حلال خوری ۔ مہترانی

ٹھٹول ۔ مذاق
چدر ۔ چادر
نجابت ۔ حسب نسب کی درستی
ندان ۔ آخرکار

۱۸۔ معجزہ حضرت علی علیہ السلام

بنی ۔ جنگل

جنی ۔ پیدا کرنا

جیب ۔ زبان

عنقریب ۔ قریب

بغبغا - آواز شوم - بد بخت	قدیم - سلف، ہمیشہ سے کھپا کی - زائل کرتی	کرم نہاد - بخشش کرنے والے، محسن	ناتمام - عاجز

۱۹- دوالی

دیا - چراغ	ٹکی موٹھ - ایک قسم جوے کی	نوگرہی - ایک زیور کا نام ہے	فیر - نٹ نہ لگانا
کھلونے - شکر کے کھلونے	نرد - چوسر کی گوٹ	کھڑوسے - ملامت	آڑے آنا - دستگیر ہونا
گنڈے - پانچ کوڑی	زارا - تباہ حال	جھونٹے - بال	کھٹانیو - اختیار کرنا
گرو - رہن	اُزار - پاجامہ	خندری - چھنال	کہوائیو - بیان کرنا

۲۰- حضرت سلیم چشتی

دوجہاں - دنیا و عقبیٰ	لوا - جھنڈا، علم	مسلّم - ثابت	تفاوت - فرق
عرفان - تصوف، خدا شناسی	مقتدا - پیشوا	سالک - چلنے والے، شاگرد	دوجگ - دوجہاں

۲۱- ہولی کی بہار

دف - ایک ایرانی باجا، ڈھول	آہنگ - آواز، سُر	بھگتیے - بھانڈ، بھاؤ بتا کر ناچنے والے لونڈے	جو آگ کے لیے جلتا ہے -
دمکتے - روشن، چمکدار	مُنہ چنگ - ایک مُنہ سے بجنے کا باجا	جھکڑ - ہنگامہ	اٹر تھتر - شرابور، لوسا ہوا نمایاں
چہکتے - مست	خوبوں - معشوق، حسین	جھکڑو - بدلگام، زیادہ گو	
	ڈوبوں - شرابور	لکڑ - لکڑی کا بڑا موٹا ٹکڑا	

۲۲- نانک شاہ گرو

- آگاہ - عارف
- جگ - دنیا
- سیس - سر
- نوا - جھکا کر
- ارداس - عرض داشت
- اوچ - بیچ
- ادھیان - خیال
- سیوک - خادم، پرستار
- کاج - خواہش - آرزو
- من - دل
- گہتے - ہاتھ پکڑتے، دستگیری
- کرتے -
- چنتا - تردد، اضطراب
- ہرتے - دور کرتے ہیں
- وو - وہ

۲۳- جنم کنہیا جی

- ریت - رسم و رواج
- جنم - زمانہ
- بالک - بچہ، طفل
- منڈل - مکان
- بتھا - رنج و غم
- نچھتر - ساعت
- اوتار - پیغمبر
- سبھ - نیک سعد
- گربھ - حمل
- نارد من - روشن ضمیر
- سمست - عالم
- اپکار - حرکات، افعال
- بل - زور
- تیج - رعب
- انیک - انواع اقسام
- ڈیل - جسم
- گج - ہاتھی
- ترنگ - گھوڑے
- نیکے - عمدہ اعلیٰ
- پاپی - گنہگار
- اننک دل - بے شمار فوج
- بنج - شکل و مشابہت
- دوجا - دوسرا
- بلی - قوی، طاقت ور
- بان - تیر
- بڑھ بل - مشہور طاقتور
- دُشٹ - بدذات، شیطان، ظالم
- جدھہ - تعلی
- موں - مجھ پر
- وا - اس
- بول - باتیں
- گربھ - غرور
- سبھا - انجمن
- پرکھ - عاقل، دانا
- مارن ہارا - مارنے والا، قاتل
- مورکھ - شیطان، گنہگار
- ہنکار لیا - غرور کرنا، تعلی کرنا
- بھو - ڈر، خوف
- سگرے - سارے
- بسرے - زائل ہوئے
- مات پتا - ماں باپ
- ناؤں - نام
- ریکھا - لکیر

پاچھے - پیچھے، آخر میں	اجیالی - روشنی	پگ - پاؤں	ٹیک - حق
مارگ - چارہ، طریقہ	گھیر - جمع کرنا	پراچے - پہنچے، دل تک اثر ہوئے	بیر - بہن
پھندہ - جال	باسی - باشندے		تمہارے - تمہارے
نکسن - نکلنے	دیا - عنایت	اجیالی - اجالا	بڈبھاگی - خوش قسمت
رسوئی - طعام، کھانا پکانے کا مکان	جال - فوڑا	دیوے - چراغ	موہے - مجھے
	کرم - قسمت	اچنبھا - عجیب بات	کرپا - نوازش
دوار - دروازہ	نکھ - ننھ	بھور - صبح	باگے - دو جوڑے جو دولہا کو دئے جاتے ہیں
ہارے - واسطے	الیشر - خدا	لجیایا - شرمایا	
وا - وہ	سانکر - سانکل، زنجیر در، کنڈی	کارج - کام	لوگ لگائی - مرد عورت
چنڈال - بدذات، شیطان	نربھو - بےخوف	ناری - عورت	
		جیا - زندگی	پرچاتے - خوش رکھتے
پرگھٹ - پیدائش	تپھا - اضطراب، مصیبت	بلہاری - تصدق، نثار	

۴۴-بانسری

مرلی - بانسری	کوڑھ مت - کند ذہن	بنسی - بانسری	موہن - پیارے
نیت - محبت	گنی - عاقل	پپیہی توتی - چڑیوں کے نام ہیں	جتن - طریقے، ڈھب
بیاکلی - اضطراب	کانھ جی - کنہیا جی		بچن - درود
سبھی	گوالوں - چرواہوں	شیام جی - سری کرشن جی	چرن پون - پاؤں چلنے والا
	گؤئیں - گائیں	مرلی - بانسری	

۲۵- آگرہ کی تیراکی

پیرنے - تیرنے	لتار - کرتب	چھوٹو - کشتی	کشتی
رت - موسم	لرارے - کنارے	ڈونگے - سیر و تفریح کی	نواڑے - چھوٹی کشتی
سیانے - سمجھدار جواں	بجرے - کشتی	کشتی	مور - پھولوں کا گجرا
دل لگن - دلچسپی	ناؤ - بڑی کشتی	پنے - ایک قسم کی لمبی	تیر - کنارہ

۲۶- موسم زمستان

چلا - چلے کا جاڑا سخت	جھاوٹ - آگ کی بارش	نیمہ - نیم آستین	چھب - طرحداری
سردی	باؤ - ہوا	جان - معشوقہ، نازنیں	

۲۷- اومس

اومس - سڑی گرمی	بٹ - سراسر	بدلی - بادل	آدھن - کھولتا ہوا پانی
	تاؤ - غصہ	آٹیں - بھریں، پُر کریں	

۲۸- کورا برتن

کھنکی - پڑی گری، جس سے	گولی - بڑا مٹکا	کورا کھوٹا - فاسد خیالات	گڑھتے - بناتے
آواز پیدا ہوئی	مول - قیمت	کا ہجوم	سگھڑپن - حسن
مات - شکست	ٹھٹھولیاں - مذاق	عالم میں - حسین، پُرجمال	جوجرے - پرانے، استعمال شدہ

۲۹- کوا اور ہرن کا بچہ

لگا - بھلا چنگا
حذر - ڈر، پرہیز

بدسگال - بدمعاش
بدوضع

لپٹ - زمین سے مل کر
جھپاک - فوراً جلدی سے

چھیتا - چابا

۳۰- خواب کا طلسم

کڑی کڑی - بے غل وغش
بکثرت
کھان - کان

جرات - جرأت
ہڑبڑی - گھبراہٹ،
ہیجان، اضطراب

لوٹ پوٹ - بے قابو
بے تاب
بناؤ - سنگھار، آرائش

بکھرن - بوچھاڑ، جھڑی
دمڑی - بے بس سیہ
تغیر

۳۱- ریچھ کا بچہ

سونٹا - ڈنڈا
جھولنا - جھولی
دُر - موتی، بندے

تیق - چیخ، ہاتھی کی
آواز
ڈکاریں - آواز شتر

جنگلے - جنگل
سدھایا - رام کیا
ڈھپلی - ڈفلی

کہروا - ایک قسم کا ناچ
سحر - جادو

۳۲- راکھی

راکھی - ایک قسم کا اون
اور سنہری پھولوں

کا ہار جو سلونوں
کے دن باندھا جاتا ہے

باہمن - برہمن
دوالی - دیوالی

قشقہ - ٹیکا

۳۳- سخاوت و عشرت

تن زیب - ایک قسم کا باریک کپڑا	پاپی - کنجوس، بخیل	من ماتا - خاطر خواہ	ڈل - نقدی، زر
نن سکھ - ایک قسم کا کپڑا	داتا - سخی	کٹن - قرساق، دیوث	آن - کھانا، رزق
	ڈنکا - شہرہ	خالصہ - کورٹ	

۳۴- چاندنی رات

بادریں - موجیں مارنا، ہچکولے لینا	گجر - صبح کا مسلسل گھنٹہ	فرار - غائب	گمان
	دوچار - بے حجاب	بک نہ دھک سبے نشان	جیون میں - طبیعتوں میں

۳۵- ہولی

خرسند - خوش	مردنگ - ایک قسم کا ڈھولک	عبیر - گلال	فقرہ بازیاں
سج دھج - چھبیلا پن، سنگھار		دھینگا مشتی - زبردستی	چھلبوں - خوشی، شگفتگی
سوانگ - کسی کی صورت بنانا	جھمڑیں - تار کی آواز	مار دھاڑ کرنا	کامنیوں - کامنی، حسین
موہ لیا - چھین لیا	جاگہ - جگہ	نوکا جھونکی - نداق،	دلربا، نازک اندام عورت

۳۶- جوگی نامہ

پھبن - زینت	بید - ایک درخت کا نام	مندرے - حلقے	نمن - طرح
ذقن - ٹھوڑی	تکلم - گفتگو	سیل - سیلاب	بھبوت - راکھ

پونگی - عام اصطلاح میں بین کہتے ہیں بین حالانکہ دوسری چیز ہے۔
ہر - خدا
درشن - دیدار
سیلے - چادر، دوپٹہ

پنتھ - گروہ
برن - تھوک، جماعت، قبیلہ
گیان - خدا کا وقوف، عرفان
رمائی - لی
لنگھن - فاقہ
کارن - وجہ، سبب

استھل - خانقاہ، اڈہ
مگن - خوش و خرم
ان بن - جھگڑا، الجھن
پیتم - معشوق
اتیت - جوگیوں کی ایک قسم

بندھن - رشتہ، تعلق
چرّان - جسم، بدن
کٹھن - مشکل
لگن - دھن
اکسیر - امرت
قدح - پیالہ

نین - آنکھیں
اچپل - شوخ
آسن - نشست
چھتر - شامیانہ
سنگھاسن - جوگی کی ایک قدیم سواری

۳۷ - جوگن نامہ

تونبہ - کشکول
منکوں - تسبیح کے دانے
چندرماں - چاند

پت - شوہر
ساجن - معشوق
بیری - دشمن

کمتی - کمی
من - میرے
تھہانہ - تھانا نہ

جتیو - جل جائے
متوالا - سرشار، دیوانہ
گنگ - گنگا

بہاروں - جھاڑوں، صاف کروں
پیا - پیارے، عاشق

۳۸ - موتی

سیسر - سمجھ
نرموں - کان کی لو
دھگدگی - سینے کا ایک زیور
پور - انگلی کا پورا، گرہ
انٹے - حصہ
واریئے - قربان کیجئے، نثار کیجئے

۴۰ - الٰہ آباد

جہاں تہاں - کہیں کہیں جگہ
عارض - رخسار
احمد - ذات
نبات - مصری

حواشی

۱۰- حواشی

(روایتی و ادبی نقطہ نظر سے)

۱- الٰہی نامہ

گنبد ازرق - نیلا آسمان۔ مشرقی نجوم اور قدیم فلسفے کی بنا پر آسمان کو گردش کرنے والا سمجھا جاتا ہے اور شعرا اس کو گنبد سے تشبیہ دیتے ہیں۔

لوح، قلم، عرش - قدیم عقیدہ ہے کہ یہ آسمان جو نظر آتا ہے یہ عرش ہے۔ اس پر ایک جگہ کرسی ہے اور کرسی پر لوح محفوظ ہے جس پر قرآن مجید اور دیگر کتب آسمانی یعنی زبور، توریت، انجیل وغیرہ منقوش ہیں۔ جس قلم نے ان کتب کو لوح پر تحریر کیا اسے قلم قدرت کہتے ہیں

عالم ارواح - وہ مقام جہاں مرنے کے بعد روحوں کا اجتماع ہوتا ہے۔

عالم جنات - وہ مقام جو جنات کا مسکن ہے۔

دارا وسکندر۔ مقدونیہ کے بادشاہ سکندر اعظم نے ایران قدیم پر حملہ کیا اور وہاں کے آتش پرست بادشاہ دارا سے اس کی جنگ ہوئی۔ جس میں سکندر فتح مند ہوا اور دارا مغلوب۔ نظامی کی مشہور مثنوی سکندر نامہ میں یہ تاریخی فسانہ نہایت وضاحت کے ساتھ مرقوم ہے۔

مجنون لیلی۔ قیس جس کا لقب بعد کو مجنون ہوا عرب کا ضرب المثل عاشق ہے۔ یہ قبیلہ بنی عامر کا ایک فرد اور غالباً جناب امام حسن علیہ السلام کا ہم عصر تھا۔ لیلیٰ اس کی معشوقہ نجد کی رہنے والی تھی۔ جس پر یہ بچپن ہی میں مکتب میں عاشق ہو گیا تھا۔ یہ بدنصیب ناکام و نامراد عشاق میں اس کا نام اب بھی نہایت احترام سے لیا جاتا ہے۔

ع قیس سا پھر نہ اٹھا کوئی بنی عامر میں

فرہاد وشیریں۔ ایران کے آتش پرست بادشاہ خسرو نے شیریں نگار ارمنی کی تصویر پر عاشق ہو کر اسے شادی کا پیغام دیا اور وہ اپنے ملک سے شادی کرنے کے لئے ایران آئی۔ شیریں کی ماں نے اسے ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنے واسطے پہلے محل و باغ و نہر تعمیر کرائے اس وقت شادی کرنے پر رضامند ہو۔ چنانچہ اس نے اس کی فرمائش خسرو سے کی۔ خسرو نے فرہاد نامی سنگتراش کو بلا کر حکم دیا کہ بے ستون نامی پہاڑ سے نہر جوئے شیر کاٹ کر لائے۔ فرہاد شیریں کو دیکھ کر عاشق ہو گیا اور اسی عالم جنون و بدحواسی میں پہاڑ کاٹنا شروع کر دیا۔ یہ خبر شدہ شدہ خسرو کو پہونچی اس نے بدنامی کے خیال سے فرہاد کو خفیہ قتل کرانے کی کوشش کی۔ یہ کام ایک پیرزن کے سپرد کیا گیا وہ اس مقام پر پہونچی جہاں فرہاد شیریں کے عشق میں بہوت نہر کاٹ رہا تھا اور اس سے کہا کہ شیریں نے اپنی جان دیدی۔ دیوانہ عاشق کے لئے یہ تازیانہ کافی تھا۔ یہ خبر وحشت اثر سنتے ہی فرہاد نے تیشہ مار کر اپنا کام تمام کر لیا۔ جب یہ خبر شیریں کو پہونچی فرہاد کا تیر عشق اس کے جگر کے پار ہو گیا۔ اس کی وفاداری اور صداقت عشق پر دیوانی ہو کر

شیریں نے بھی اپنے کو ہلاک کرلیا۔ فرہاد و شیریں کا وجود اب دنیا میں نہیں لیکن ان کی محبت کا فسانہ اب تک ہمارے تڑپانے کے لئے زندہ ہے۔

۲۔ برسات کی بہاریں

ماہ تا بہ ماہی۔ قدیم فلسفہ ہندوستان اس کا قائل ہے کہ سب سے نیچے پانی ہے اس پر ایک مچھلی قائم ہے اور اُس پر ایک گائے کھڑی ہوئی ہے اور گائے کے ایک سینگ پر دنیا قائم ہے چنانچہ جب گائے کا ایک سینگ تھک جاتا ہے تو وہ دوسرا بدلتی ہے اس طرح جو حرکت ہوتی ہے اس کا نام زلزلہ ہے۔ اِس لئے اس محاورے کے یہ معنی ہیں کہ اوج کے اعلیٰ تریں نقطے ماہ سے لے کر حضیض کے پست تریں نقطے ماہی تک۔

۳۔ بنجارہ نامہ

سیسہ دارو اور گولا۔ زمانہ قدیم میں جب غنیم قلعہ پر حملہ کرتا تھا اور خندق کو پار کرکے دروازہ توڑنے پر آمادہ ہوتا تھا تو قلعہ کے اوپر سے اس پر بہت سے حملے کئے جاتے تھے۔ منجملہ ان کے گولے بھی مارے جاتے تھے اور سیسہ بھی پگھلا کر ڈالا جاتا تھا کہ ان باتوں سے مجبور ہوکر پسپا ہوجائے۔

۴۔ عاشق نامہ

روم ۔ قدیم ترکی کا نام ہے۔
زنگ ۔ زنگبار افریقہ میں ایک ملک کا نام ہے۔
بُرج ۔ قدیم اسلامی نجوم کے مطابق آسمان پر بارہ برج ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں:۔ حمل، حوت، دلو، جدی

قوس، عقرب، میزان، سنبلہ، اسد، سرطان، جوزا، ثور۔

۵- آدمی نامہ

ابدال، قطب، غوث، ولی — یہ تصوف کی اصطلاحیں اور مدارج عرفان کے نام ہیں۔ ابدال سب سے بڑے عارف کو کہتے ہیں اور یہ دنیا میں صرف چالیس ہوتے ہیں۔ غوث کا رتبہ ابدال سے کم ہے اور یہ بہت ہوسکتے ہیں۔ قطب کا مرتبہ غوث سے کم ہے لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ تو سب مدارج عرفان اور تصوف کے عہدے ہیں لیکن ولی کا مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے۔ ولایت عہدوں کے سلسلہ میں شامل نہیں لیکن فی نفسہ اعلیٰ ترین درجۂ فقر و تصوف ہے۔

فرعون۔ فراعنہ کے خاندان نے مدت دراز تک قدیم مصر پر حکومت کی ہے۔ فرعون کسی فرد واحد کا نام نہیں بلکہ ایک خاندان کا لقب ہے۔ اس خاندان کی لاشیں ممی بنی ہوئی اب تک مصر کے میناروں اور حفریات سے برآمد ہوتی ہیں۔ حضرت موسیٰ کے زمانے میں جو فرعون بادشاہ تھا اس کا نام بعض مورخوں کے نزدیک رعمسیس تھا۔ اُسے نجومیوں نے خبر دی کہ تو موسیٰ کے ہاتھ سے جو بنی اسرائیل میں پیدا ہوگا مارا جائے گا۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں جتنے بچے پیدا ہوتے تھے فرعون انھیں قتل کراتا تھا۔ جب موسیٰ پیدا ہوئے تو ان کی ماں نے فرعون کے ڈر سے انھیں ایک صندوق میں بند کر کے ایک دریا میں چھوڑ دیا۔ خدا کی قدرت دیکھو فرعون کی زوجہ آسیا نے اپنے باغ سے صندوق کو دریا میں بہتا دیکھ کر نکلوا لیا۔ آسیا کے کوئی اولاد نہ تھی اس نے موسیٰ کو مثل اپنی اولاد کے پرورش کیا۔ جب موسیٰ بڑے ہوکر پیغمبر ہوئے تو فرعون کو ہدایت فرمائی اور تلقین دین حق کرنی چاہی۔ فرعون نے قبول نہ کیا اور بڑے بڑے ساحروں سے حضرت موسیٰ کے مقابلے کرائے۔ آپ نے سب کو اپنے

عصا کے ذریعہ سے شکست دی۔ آخر کار فرعون سے جنگ کی نوبت آئی۔ بہت سی مرتبہ حضرت موسیٰ ہارے لیکن آخر کار غضب الٰہی فرعون اور اس کی فوج پر نازل ہوا اور دریائے نیل میں غرق کر دیا گیا۔ حضرت موسیٰ کو دو معجزے خدا وند تعالیٰ نے عطا فرمائے تھے ایک تو ید بیضا یعنی آپ کی کف دست مثل ماہتاب کے چمکتی تھی دوسرا عصا یعنی جب اپنی لکڑی کو زمین پر ڈال دیتے تھے تو سانپ کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔

شدّاد۔ کہتے ہیں کہ عاد کے دو بیٹے تھے شدّاد اور شدید اور یہ دونوں بادشاہ تھے۔ جب شدید مر گیا تو شدّاد سب ملکوں کا بادشاہ ہوا اور بہت سے بادشاہوں نے اس کی اطاعت اختیار کی۔ اس کا غرور یہاں تک بڑھا کہ خدائی کا دعویٰ کرنے لگا۔ خدا وند تعالیٰ نے حضرت داؤد کو اس کی ہدایت کے لئے بھیجا۔ انھوں نے فرمایا کہ اگر تو ایمان لائے گا تو خدا تجھ کو بہشت عطا کرے گا۔ اس نے پوچھا بہشت کیا ہے، حضرت داؤد نے بہشت کے محاسن اس کے سامنے بیان کئے۔ اس نے جواب دیا کہ ایسا تو میں خود بنوا سکتا ہوں۔ چنانچہ اس نے سرزمین یمن میں ایک بہشت تعمیر کرایا جس کا نام ارم رکھا۔ جس وقت وہ بن کر تیار ہوا اور شدّاد اس میں جانے لگا تو ملک الموت نے اس کی روح قبض کر لی اور واصل جہنم ہوا۔

نمرود۔ اپنے زمانے کا بہت بڑا بادشاہ گزرا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اسی کے زمانے میں تھے۔ ان کا چچا آذر بت تراش اور بت پرست تھا حضرت ابراہیمؑ کو اس مذہب سے نفرت تھی۔ آخر کار نمرود نے ایک بہت بڑی آگ روشن کرا کے حضرت ابراہیمؑ کو منجنیق میں رکھ کر اس میں پھکوایا۔ اس دوران میں تمام آسمانی فرشتے ایک ایک کرکے حضرت ابراہیمؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہمدردی کرنی چاہی لیکن آپ نے ہر ایک کی مدد قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اللہ کی مدد کے منتظر رہے۔ جس وقت آپ کو آگ میں پھینکا گیا۔ خداوند تعالیٰ نے

آگ کو سرد ہو جانے کا حکم دیا آگ سرد ہو گئی اور حضرت ابراہیم کو اس سے کوئی گزند نہ پہونچی۔

کلمہ - لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ - یہ مسلمانوں کے اعتقاد کا پہلا سبق اور جزو اعظم ہے۔

۷- روضۂ تاج گنج

دو مرقدیں - ممتاز محل اور شاہجہاں کی قبریں اس کے اندر ہیں لیکن درمیان میں ممتاز محل کی ہے اس لئے کہ صرف اسی کے لئے یہ مقبرہ تعمیر کرایا گیا تھا شاہجہاں کی وفات کے بعد اورنگ زیب نے شاہجہاں کو بھی اسی میں ایک طرف دفن کرا دیا اور دوسرا تاج گنج بنوانا فضول خرچی سمجھ کر اس سے قطعی انکار کر دیا۔

خط طغریٰ - بہت سی قسم کے خط ہیں مثلاً خط نستعلیق، خط ثلث، خط گلزار وغیرہ وغیرہ منجملہ ان کے خط طغریٰ بھی ہے۔ تاج گنج کے دروازے پر یہی خط لکھا ہوا ہے۔

برج بسی - تسبیح خانہ کے قریب دریا کے کنارے جو برج ہے اس کو برج بسی کہتے ہیں۔

تاجدار شاہجہاں - مشہور ہے کہ ممتاز محل کے بعد شاہجہاں نے خواب دیکھا کہ ممتاز محل اس سے یہ فرمائش کر رہی ہے کہ اس کا مقبرہ ایسا بے عدیل بنوایا جائے جس کی مثال و نظیر دنیا میں کہیں نہ ہو۔ اس عالم خواب میں شاہجہاں نے وعدہ کر لیا۔ اس خواب کو دیکھے جب کئی روز ہو گئے تو ایک فقیر دربار میں آیا اور کہا کہ بابا بی بی کی وصیت بھول گیا۔ شاہجہاں نے کہا سائیں جی بھولا تو نہیں لیکن اس پریشانی میں ہوں کہ نقشہ کہاں سے لاؤں۔ فقیر نے یہ سن کر ایک ٹھیکری اس کے ہاتھ میں دیدی اور کہا کہ اس نقشہ کا بنوا دے، یہ کہہ کر غائب ہو گیا۔ مشہور ہے کہ وہ فقیر فرشتہ تھا اور ممتاز محل کے مکان بہشتی کا نقشہ شاہجہاں کو دے کر غایب ہو گیا۔ چونکہ بہشت کے

نقشے پر بنا ہے اس لئے تاج میں یہ دلفریبی ہے۔

۹۔ ذکر مرغان

کُن فیکون۔ یہ عربی کا فقرہ قرآن مجید میں ہے اس کے معنی یہ ہیں "ہو جا پس ہو گیا" اسلام کی کتاب آسمانی یعنی قرآن مجید میں ذکر ہے کہ خداوند عالم نے کائنات کو لفظ کن کہہ کر پیدا کیا اور فوراً تمام کائنات وجود میں آ گئی۔

۱۰۔ فنا نامہ

گوہر۔ شہزادہ علی گوہر کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بعد کو شاہ عالم کے نام سے بادشاہ ہوا۔

ماہی مراتب۔ اعزازی نشانات۔ یہ انگریزی "کوٹ آف آرمس" کا مترادف ہے۔

جم۔ ایران قدیم کے مشہور بادشاہ جمشید کے نام کا مخفف ہے۔ یہ آتش پرست تھا اور اسی نے جامِ جمشید بنوایا تھا۔

اکبر۔ خاندان مغلیہ کا مشہور و معروف شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر۔

نوشیرواں۔ ایران قدیم کا بادشاہ تھا، اپنے عدل و انصاف کی وجہ سے ضرب المثل ہے، اس کا مذہب آتش پرستی تھا۔

راج بنسی۔ راجپوت، راجہ کے خاندان کا۔

چتوڑ گڑھ۔ ریاست اودے پور میں ایک مقام ہے جہاں ایک قدیم قلعہ بنا ہوا ہے، یہاں راجپوت راجاؤں کا ایک مشہور خاندان آباد ہے جو غایت شرافت سے اپنے آپ کو آفتاب نسب خیال کرتا ہے اور سورج بنسی کے لقب سے ملقب ہے۔ اس خاندان کے راجہ اپنے تئیں

رام چندر کی اولاد جانتے ہیں۔ سب سے پہلے چتوڑ گڈھ پر اموں نے حملہ کیا مگر اس کا حملہ ناکام رہا، علاءالدین خلجی نے حملہ کرکے اس پر فتح حاصل کی۔ اس فتح کے بیسیوں قصے بن گئے انہی میں آلا اودل بھی ہے۔ دوسری فتح اکبر نے حاصل کی۔

ستارا۔ ستارا وہ جگہ ہے جہاں رام راجہ قلعہ جنجی سے بھاگ کر قلعہ بند ہوا گر اورنگ زیب نے سنہ ۱۷۰۰ء میں بذات خاص اس کا محاصرہ کرکے چوتھے ہی مہینہ فتح کرلیا تاریخ فتح ستارا اپریل سنہ ۱۷۰۰ء ہے۔

کالنجر۔ بندیل کھنڈ کا ایک نہایت ہی مضبوط قلعہ ہے جس کے محاصرے میں شیر شاہ کی جان گئی۔

پنج ہزاری۔ شاہان مغلیہ کے زمانہ میں پنج ہزاری ایک منصب تھا۔

امیر خاں۔ امیر خاں محمد شاہ رنگیلے کا مصاحب تھا اور بادشاہ کا بہت ہی منہ چڑھا تھا۔

ذوالفقار خاں۔ ذوالفقار خاں اورنگ زیب کا سپہ سالار تھا سنہ ۱۶۹۸ء میں قلعہ جنجی اس کے ہاتھ سے فتح ہوا۔

مخلدار خاں۔ دلی میں مخلدار خاں کا باغ شہر سے باہر چھاونی میں واقع ہے۔

ہانسی - مشہور تاریخی مقام ہے	}	یہ سب پنجاب میں ہیں۔
حصار - مشہور تاریخی مقام ہے		
ٹھٹھہ - مشہور تاریخی مقام ہے		

شہنواز خاں۔ یہ ناصر جنگ والی ریاست حیدر آباد کا مدار المہام تھا۔

سرفراز خاں۔ سرفراز خاں، شجاع الدین کا بیٹا اور مرشد قلی خاں کا پوتا تھا۔ سنہ ۱۷۳۹ء میں اپنے باپ کا جانشین ہوا، نادر شاہ کا حملہ اسی کے زمانہ میں ہوا۔ جب نادر شاہ چلا گیا تو علی وردی خاں صوبہ دار بہار نے محمد شاہ کے وزیر کو کچھ دے لے کر بنگال کی صوبہ داری حاصل کرلی۔ سند

لے کر مرشد آباد پر چڑھ دوڑا، سرفراز خاں گولی سے مارا گیا، علی وردی خاں اس کی جگہ تخت پر بیٹھا اور خطبہ سکہ جاری کیا اور حسب وعدہ دہلی کو ایک کروڑ زر نقد اور ستر لاکھ کے جواہرات بطور نذر روانہ کئے۔

عیسیٰ ۔ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام۔ یہ بن باپ کے پیدا ہوئے مسلمان اور عیسائی دونوں ان کو پیغمبر سمجھتے ہیں۔ ان کا معجزہ یہ تھا کہ مردوں کو جلا دیتے تھے اس لئے ان کا لقب روح اللہ ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ان کو صلیب پر چڑھا دیا گیا لیکن مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ ان کو خداوند عالم نے زندہ اٹھا لیا اور اب چوتھے آسمان پر مقیم ہیں۔ حضرت امام مہدی آخر الزماں علیہ السلام کے ہمراہ پھر دنیا میں تشریف لائیں گے۔

لقمان ۔ لقمان زمانۂ قدیم کا ایک بہت بڑا حکیم اور فلسفی گزرا ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ یہ ایشیائے کوچک کا باشندہ تھا اور ۵۷۰ قبل مسیح میں اس نے کریسس نامی بادشاہ کی خواہش سے شہر سارڈس میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ڈلفی کے باشندوں نے اس پر پیالہ چرانے کا جھوٹا الزام لگا کر اس کو ٹیلے سے سر کے بل نیچے گرا کر ہلاک کر ڈالا۔ لقمان بڑا نیک کردار اور مرتاض شخص تھا اس نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے مصائب اٹھائے۔ سبق آموز حکایات کا ایک مجموعہ اس کی یادگار ہے اور اس کی اہمیت اس سے معلوم ہو سکتی ہے کہ سقراط نے اپنی زہر خورانی سے پیشتر اپنی حیات کے باقی چند گھنٹے جیل خانہ میں اسی کتاب کے مطالعے میں گزارے تھے۔ اہل اسلام اس کو نبی کا درجہ دینے کے لئے تیار ہیں۔

افلاطون ۔ یونان قدیم کا ایک بڑا حکیم اور مہتمم بالشان فلسفی تھا، یہ سقراط کے ارشد تلامذہ میں تھا اور قدیم فلسفے کا موجد اور استاذ الاساتذہ سمجھا جاتا ہے۔

نانک ۔ گرو نانک سکھ مذہب کے موجد ہیں اس لئے سکھوں کے بہت بڑے پیشوا سمجھے جاتے ہیں۔

ان کا وطن پنجاب تھا اور یہ اورنگ زیب کے معاصر تھے۔

کبیر۔ یہ بنارس کے بہت بڑے برگزیدہ بزرگ اور عارف شاعر گزرے ہیں۔ ان کے اشعار اب ضرب المثل کا کام دیتے ہیں۔ دوہے، مثالوں اور کہاوتوں کے طور پر زبان زد خلائق ہیں۔ ان کا مذہب کسی کو معلوم نہیں، زندگی میں ہر فرقہ انھیں اپنے مذہب پر سمجھتا تھا۔ جب انتقال ہوا تو لاش پر ہندو مسلمانوں نے جھگڑا کیا اور اپنے اپنے مذہب کے مطابق تجہیز و تکفین کرنی چاہی جب چادر اٹھا کر دیکھی تو لاش غائب تھی صرف کچھ پھول ہاتھ آئے جو نصف ہندوؤں نے لیکر پھونک دیئے اور نصف مسلمانوں نے لے کر دفن کر دئیے ان کا کلام تصوف کے رنگ میں ہے اور محبت کی تلقین کرتا ہے۔ رابندرا ناتھ ٹیگور نے اس کا کچھ حصہ انگریزی میں ترجمہ کر کے شائع کرایا ہے۔

۱۳- بڑھاپا

یوسف ثانی۔ حضرت یوسف علیہ السلام بنی اسرائیل کے بڑے مشہور اور برگزیدہ پیغمبر اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادے تھے۔ حسن و جمال میں اب تک ان کا ثانی کوئی پیدا نہیں ہوا۔ اس لئے حسینانِ عالم کو یوسف کے حسن سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ حضرت یعقوب ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس لئے ان کے بھائیوں نے ان کو کنوئیں میں ڈھکیل دیا۔ خدا کی قدرت سے وہاں ان کو کوئی گزند نہ پہونچی اور ایک شخص نے باہر نکال لیا اور اپنا غلام بنایا۔ اور آخر کار یہ مصر میں فروخت ہوئے عزیز مصر کی زوجہ زلیخا ان پر عاشق ہوگئی جس کے دام فریب سے یہ بمشکل اپنے کو محفوظ رکھ سکے۔ عرصہ دراز تک یہ مصر کے محبس میں قید رہے لیکن آخر کار مصر کے بادشاہ ہوئے۔ ان کا قصہ تفصیل کے ساتھ ملا جامی نے اپنی مشہور مثنوی

یوسف زلیخا میں لکھا ہے۔

خضر۔ حضرت خضر علیہ السلام اسلام کے بڑے جلیل القدر پیغمبر اور انبیاے اولوالعزم میں سے ہیں۔ ان کا علم زبردست اور وسیع ہے یہاں تک کہ حضرت موسیٰ کو ان سے استفادہ کرنے کی ہدایت ہوئی تھی۔ یہ اب تک زندہ سمجھے جاتے ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گے لیکن عوام کی نظروں سے نہاں ہیں بھولے بھٹکوں کو راستہ بتانا ان کا کام ہے اور عالم آب خصوصاً ان کی حکومت میں سمجھا جاتا ہے۔

۱۶۔ کلجگ

کلجگ ۔ ہندو فلسفے نے دنیا کی عمر چار حصوں میں تقسیم کی ہے ست یُگ، تریتا، دوآپر، اور کل یُگ۔ ست یگ بہترین زمانہ تھا۔ تریتا اور دُوآپر درمیانی لیکن کل یُگ (کل جگ) جو آج کل ہے بدترین زمانہ ہے۔ ہر زمانہ کی مدت بہت وسیع ہے جس کا صحیح حساب بتانا بہت مشکل ہے۔

۱۷۔ مُفلِسی

گوری، بھیاس } یہ دونوں راگنیوں کے نام ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظیر علم موسیقی اور اس کی اصطلاحوں سے خوب واقف تھے۔

۱۸۔ معجزہ حضرت علی علیہ السلام

علی ۔ حضرت علی علیہ السلام اسلام کے وہ رکن اعظم ہیں جنہوں نے سب سے پہلے دعوت اسلام تیرہ سال کی عمر میں قبول کی۔ آپ جناب سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے چچازاد بھائی اور اُن جناب کے داماد تھے اسلام کی جڑ آپ کی ذات سے جمی ابتدائی تمام لڑائیاں مثل بدر، خیبر، خندق وغیرہ سب محض آپ کی ذات سے فتح ہوئیں۔ اہل تشیع آپ کو آنحضرت کے بعد وصی رسول اور خلیفہ برحق جانتے ہیں لیکن اہل تسنن چوتھا خلیفہ سمجھتے ہیں۔ نوروز کے دن آپ کو کوفہ میں ظاہری خلافت ملی۔ اس لئے اور موسمی تیوہار ہونے کی وجہ سے بھی ایران میں نوروز منایا جاتا ہے۔ اہل تصوف کے آپ سب سے بڑے پیشوا ہیں اور یہ فرقہ آپ کو سرچشمہ ولایت و تصوف گردانتا ہے۔

نجف اشرف۔ حضرت مولا علی علیہ السلام کی قبر اطہر نجف اشرف میں ہے جو عراق عرب کا ایک مشہور شہر ہے۔

حیدر صفدر۔ حضرت علی علیہ السلام نے عہد طفولیت میں ایک اژدہا چیر کر پھینک دیا تھا اس لئے آپ کا لقب حیدر ہوا اور چونکہ آپ ایسے شجاع یکتا تھے کہ تن تنہا صفوں کے منہ پھیر دیتے تھے اس لئے صفدر مشہور ہوئے۔

صاحب قنبر۔ حضرت قنبر حضرت مولا علی کے خادم اور ذوالجناح کے سائیس تھے اسلام میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے اور بڑے جلیل القدر بزرگ سمجھے جاتے ہیں حضرت علی علیہ السلام چونکہ قنبر کے آقا تھے اس لئے آپ کو صاحب قنبر بھی کنایۃً کہا جاتا ہے۔

شریف۔ نجف اشرف کے ملکی حاکم کو شریف کہتے ہیں۔

۱۹۔ دِوالی

دوالی۔ دوالی ہندوؤں کا نہایت مشہور تیوہار ہے۔ آپ دیوالی پر اس کا خصوصاً نہایت اچھا اثر پڑتا ہے۔ مکانوں کی صفائی لازمی طور پر کرائی جاتی ہے۔ شب کو چراغاں کیا جاتا ہے اور سیر دل بلکہ سنوں گھی اور خوشبودار مصالح بخورات کے سلسلے جلائے جاتے ہیں جس سے ہوا نہایت

صاف اور صحت پرور ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں جبکہ ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا شباب تھا یہاں کے مصور لڑکے اور لڑکیاں دوالی کے روز اپنی صنعتوں کے نمونے عوام کے سامنے پیش کرتے تھے اور بہترین تصویر کو انعام دیا جاتا تھا۔ یہ بات تو اب مفقود ہو گئی ہے لیکن تصویروں کی نمایش اب بھی ہوتی ہے کاش ہندوستان کا وہ عہد زریں پھر واپس آجائے اور اسی طرح آرٹ کی نمایش پھر ہونے لگے۔ دوالی کے دن لکشمی کی جو ہندو علم الاصنام میں دولت کی دیوی سمجھی جاتی ہے پرستش ہوتی ہے۔

۲۰۔ حضرت سلیم چشتی

حضرت سلیم چشتی۔ شیخ سلیم بن بہاؤالدین چشتی فتح پور سیکری میں دفن ہیں اور ۲۹ رمضان کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ جہانگیر آپ ہی کی دعا کی برکت سے پیدا ہوا تھا اس وجہ سے اکبر کو آپ سے خاص عقیدت تھی۔ آپ فریدی ہیں اور حضرت بابا فرید کی اولاد سے ہیں۔

فغفور۔ چین کے قدیم بادشاہوں کا لقب ہے۔

خاقان۔ یہ بھی چین کے قدیم بادشاہوں کا لقب ہے۔

سلیمان۔ حضرت سلیمان بن داؤد بہت بڑے پیغمبر اور جملہ خلائق کے بادشاہ تھے آپ کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس پر کچھ اسمار الٰہی کندہ تھے۔ اس کی وجہ سے تمام مخلوق آپ کے زیر فرمان تھی۔ آپ کا تخت بساط سلیمان ہمیشہ ہوا پر اڑا کرتا تھا۔ آصف بن برخیا جو قوم جن سے تھے آپ کے وزیر اعظم تھے۔ سبا کی شہزادی بلقیس کے حسن و جمال، تہذیب و شایستگی کا قصہ حضرت سلیمان نے ہدہد سے سن کر اس شاہزادی کو اپنے یہاں دعوت دی تھی۔ یہ شاہزادی خود بھی نہایت دولتمند اور بڑی جلیل القدر ملکہ تھی۔ حضرت سلیمان کی بلقیس سے ملاقات ایک نہایت دلچسپ

تاریخی فسانہ ہے۔ آخر کار بلقیس نے ایمان قبول کیا اور حضرت سلیمان ؑ کی زوجیت میں داخل ہوئی۔

۲۲۔ نانک شاہ گرو

واہ گرو، واہ گرو۔ بابا نانک شاہ گرو کی تعریف کا نقرہ اور سکھوں کی قومی صدا ہے۔

۲۳ جنم کنہیا جی

کنس ۔ کنس متھرا کا راجہ اور نہایت ظالم و بدکردار شخص تھا اس کے اطوار راون کے سے تھے۔ یہ کرشن جی کا ماموں تھا۔ آخر کار کرشن جی کے ہاتھ سے مارا گیا کنس اور کرشن کا قصہ بالکل فرعون اور موسیٰ کا سا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے حامیوں اور تاریخ میں دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ مشابہت نہایت پرلطف اور بار آور نکتہ ہے۔

بسدیو ۔ کرشن جی کے باپ کا نام ہے۔

دیوکی ۔ کرشن جی کی ماں کا نام ہے۔

روہنی ۔ ایک نچھتر کا نام ہے یعنی یہ اس ساعت سعد و نیک کا نام ہے جس میں کرشن جی پیدا ہوئے۔

گوکل ۔ ہندوؤں کا ایک مقدس مقام ہے جو متھرا کے نزدیک ہے۔ یہ بہت بڑی تیرتھ کی جگہ ہے۔ کرشن جی کا بچپن اسی مقام پر گزرا۔

نند ۔ اس شخص کا نام جس نے کرشن جی کی بطور باپ کے پرورش کی اس لئے اس کو رضاعی باپ سمجھنا چاہیئے۔

جسودا ۔ نند کی زوجہ کا نام ہے یہ کرشن جی کی رضاعی ماں تھی۔

دَو کاندے۔ ہندوؤں کی ایک قدیم رسم کا نام ہے۔ یہ اُس وقت کی جاتی ہے جب بچہ پہلی مرتبہ پاخانہ پھرتا ہے۔ دہی اور زعفران ملا کر بچہ کا مصنوعی پاخانہ بنایا جاتا ہے اور کورے مٹی کے برتنوں میں دودھ بھروا کر رکھوایا جاتا ہے اور اس میں ہلدی پیس کر ملا دی جاتی ہے تاکہ اس کا رنگ زرد ہو جائے۔ پھر اس دودھ کو تمام اہل خانہ غالباً ایک دوسرے پر چھڑکتے ہیں۔

۲۴۔ بانسری

رادھے۔ رادھا کرشن جی کی معشوقہ کا نام ہے۔

۲۵۔ آگرہ کی تیراکی

جھرنا۔ تاج گنج سے لوٹنڈا تک تیر کر جاتے ہوئے درمیان میں ایک مقام پڑتا ہے جس کو جھرنا کہتے ہیں۔ وہاں ایک پل بنا ہوا ہے جسے جھرنے کا پل کہتے ہیں۔

سہجا کا پیالہ۔ سہجا کسی اُستاد تیراک کی لڑکی اور قوم کی ساقن تھی۔ اس کو تیرنے کا بڑا شوق تھا، نوچندی کے میلہ میں سہجا حقہ لے کر جاتی تھی اور تیرنے کی حالت میں انھیں حقہ پلاتی جاتی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد تیراکوں نے اس کی یادگار میں ایک میلہ قائم کیا۔ جس کا نام پیالہ رکھا، سہجا کا انتقال چونکہ نوچندی جمعرات سے دو روز پیشتر یعنی منگل کو ہوا تھا اس لئے یہ میلہ ہمیشہ منگل کو ہوتا ہے۔ جس مقام پر پہلے پہل سہجا کی فاتحہ خوانی تیراکوں نے کی تھی وہ مقام اب سہجا کے نام سے مشہور ہے اور سہجا مائی کا پیالہ کہلاتا ہے۔ شہباز کی رائے ہے کہ سہجا کسی امیر عورت کا نام تھا اور اس کا کوئی نالہ ہے۔ یہ قطعی غلط معلوم ہوتا ہے۔

چھتری۔ سہجا کے پیالے سے تھوڑی دور لب دریا ایک برج بنا ہوا ہے جسے چھتری کہتے ہیں۔ یہ آگرہ

کے کسی قدیمی سیٹھ نے جس کا نام جسونت تھا بنوائی ہے۔ اس مقام پر غالباً کوئی مندر یا معبد بنوانے کا قصد تھا جو کسی وجہ سے مکمل نہ ہوسکا لیکن یہ چھتری اب تک موجود ہے۔

برج خونی ۔ آج کل یہ برج دریا کنارہ کی سڑک پر واقع ہے۔ کسی زمانے میں یہاں سڑک نہ تھی بلکہ دریا اس سے ٹکراتا تھا۔ یہاں پانی اس قدر عمیق اور خطرناک تھا کہ اکثر اناڑی تیراک ڈوب جایا کرتے تھے اس لئے اس کا نام خونی برج مشہور ہوگیا۔

دارا کا چونترہ۔ سید کے باغ اور آرام باغ کے درمیان شکستہ شاہی عمارات کا ایک سلسلہ ہے جس میں سے ایک دالان منہدم ہوکر پانی کے اندر بیٹھ گیا ہے اس دالان کی چھت مثل چبوترے کے ہوگئی ہے جو کبھی پانی کے اندر پوشیدہ اور کبھی نمایاں رہتی ہے۔ ممکن ہے یہاں پہلے دارا کا محل ہو اور اس مقام کو محل منہدم ہوجانے کے بعد دارا کا چونترا کہنے لگے ہوں۔

مہتاب باغ ۔ تاج گنج کے سامنے دوسرے کنارے پر ایک برج بنا ہوا ہے اس مقام کو تیراک مہتاب باغ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ غالباً کسی زمانہ میں یہاں باغ تھا اور وہ خصوصاً تاج گنج کے تیراکوں کی آماج گاہ بنا رہتا تھا۔ اس جگہ شاہجہاں اپنا مقبرہ بنوانا چاہتا تھا۔

سید ۔ جھرنے سے آگے لب دریا ایک قبر ہے جو سید شاہ صوفی کی مشہور ہے۔ سید سے مراد یہ مقام ہے۔ یہ مقام تاج گنج سے براہ آب ۲۵ میل کے فاصلہ پر ہے تیر کر ٹونڈلے جانے والے تیراک اس مقام پر دریا سے نکل آتے ہیں اور پھر ریل سے آگرہ واپس آتے ہیں۔

تُلسی ۔ تاج گنج اور جھرنے کے درمیان ایک باغچہ ہے جو سیا چرن کی باغیچی کہلاتا ہے اس میں کوئی تلسی باوا رہتے تھے جنھیں تیراکوں سے بڑی محبت تھی۔ باوا ان لوگوں کے لئے بھنگ، تمباکو، چرس، آگ، پانی ہمیشہ مہیا رکھتے تھے، یہاں پرانے تیراک اکثر جایا کرتے تھے، تلسی باوا کے مرنے کے بعد ان کی سِل جس پر وہ بھنگ پیسا کرتے تھے بہت مشہور ہوئی۔

باغ حکیم۔ سبھا کے پیلے اور بلکیشر کے درمیان ایک باغ ہے جو حکیم کا باغ مشہور ہے یہاں ایک لانبی سفید قبر ہے جو غالباً کسی شاہی حکیم کی ہے۔ تیراکی کے میلہ کے دن یہاں رقص و سرود کی محفلیں بپا ہوتی اور تیراک یہاں کچھ دیر قیام کرتے ہیں۔

شیوداس کا چمن۔ جس مقام پر لب دریا کارخانے بنے ہوئے ہیں وہاں کسی زمانے میں ایک بہت بڑا باغ تھا جو راے شیوداس کا بنایا ہوا تھا یہاں میلے کے دن رقص و سرود کی محفلیں قائم ہوتی تھیں۔ اور تیراک یہاں بھی تفریح کے لئے ٹھیرتے تھے یہ باغ اب موجود نہیں لیکن یہ مقام اب بھی راشوداس کا چمن کہلاتا ہے جو یقیناً راے شیوداس کی خرابی ہے۔

۲۸۔ کومرایتن

آب حیات۔ مشہور ہے کہ آب حیات وہ پانی ہے جس کو پی کر انسان کبھی نہیں مرتا۔ اس کا چشمہ ظلمات میں ہے۔ سکندر ذوالقرنین کو اس چشمے تک پہنچنے کی خواہش ہوئی لیکن کیونکر پہنچ سکتا تھا اس لئے کہ وہ تو نگاہوں سے پوشیدہ ہے آخر کار حضرت خضر کی رہبری سے وہاں پہنچا لیکن وہاں عجیب عبرتناک منظر نظر آیا۔ دیکھا سینکڑوں آدمی اپاہج بنے پڑے ہیں صرف سانس چل رہا ہے۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ آب حیات پی کر یہ کیفیت ہو جاتی ہے تو اس نے نہ پیا اور واپس چلا آیا۔

۲۹- کوّا اور ہرن کا بچّہ

کوّا اور ہرن - یہ قصہ اصل میں انوار سہیلی میں ہے - میاں نظیر نے خود اعتراف کیا ہے کہ یہ قصہ نثر میں تھا میں نے نظم کیا ہے -

۳۴- چاندنی رات

ارم - ارم ایک بہشت کا نام ہے - ارم دراصل اس بہشت کا نام ہے جو شداد نے دنیا میں تعمیر کرایا تھا شداد کے واصل جہنم ہونے کے بعد اس کو آسمان پر اٹھا لیا گیا -

۳۶- جوگی نامہ

بندرابن - متھرا کے نزدیک ایک مشہور پرستش گاہ اور تیرتھ کا مقام ہے -

آدم - ابوالبشر حضرت آدم کو خدا وند تعالیٰ نے مٹی سے بنایا اور ان کی زوجہ حوا کو ان کی بائیں پسلی سے پیدا کیا - ابلیس کو حکم ہوا کہ حضرت آدمؑ کو سجدہ کرے لیکن اس نے انکار کیا - اس لئے اس کو راندہ درگاہ کر دیا گیا اور وہ دخلاق قرار پایا اور شیطان کے نام سے مشہور ہوا - حضرت آدم کو بہشت میں سوائے گندم کے جملہ میوہ جات کھانے کا حکم تھا - شیطان کی اب یہ کوشش ہوئی کہ آپ کو کسی طرح گیہوں کھانے - پہلے

اس نے حضرت حوّا کو بہکایا اور اُن کے ذریعے اسے حضرت آدمؑ کو گیہوں کھلانا چاہا۔ لیکن ناکامیاب ہوا۔ کئی ناکامیوں کے بعد آخر کار ایک مرتبہ شیطان حضرت آدمؑ کو فریب دینے میں کامیاب ہوا اور انھیں گیہوں کھلا دیا۔ اس ترک اولیٰ کی بنا پر حضرت آدم اور حوّا بہشت سے نکال کر دنیا پر ڈال دئے گئے اور دونوں کو علیحدہ علیحدہ مقام پر رکھا گیا ایک مدت کے فراق اور بڑی آہ وزاری کے بعد دونوں کو ایک دوسرے کی ملاقات نصیب ہوئی۔ بنی نوع انسان ان ہی کی نسل ہے۔

۳۷۔ جوگن نامہ

کاشی ۔ بنارس کا قدیم نام ہے۔ یہ ہندوؤں کا بڑا مقدس شہر، پرستش گاہ اور تیرتھ ہے، یہ زمانہ قدیم میں بہت بڑا دارالعلوم تھا۔ اب بھی سنسکرت کے بڑے بڑے علما اور جوتشی یہاں رہتے ہیں۔ اس مقام پر شیخ علی حزیں کی قبر ہے۔

دکن ۔ شاہی زمانہ میں دکن نہایت دور دراز جگہ سمجھی جاتی تھی۔

۳۸۔ موتی

موتی ۔ موتی، میاں نظیر کی معشوقہ کا نام تھا۔ یہ شہباز کی تحقیق ہے اور غالباً صحیح ہے۔

۴۰۔ اکبرآباد

اکبرآباد۔ آگرہ کا قدیمی نام ہے۔ یہ مقام اکبر کو بہت پسند تھا اور اسی نے اس کو آباد کیا اور اسی زمانہ سے اس کا نام اکبرآباد پڑا۔ پرانا آگرہ جمنا کے بائیں کنارے پر ہے اور اب صرف ایک محلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کوئی جانتا بھی نہیں کہ اکبر کے بسانے سے پیشتر آگرہ اس طرف آباد تھا۔

عنوانات کا انڈیکس

۱۔ عنوانات کا انڈیکس

(اِشاریہ)

(الف) اخلاقی پہلو ۱۹
ادب القدما ۲۴
آدمی نامہ ۴۹، ۲۲۳
اژدہے کا بچہ ۱۲۲، ۳۴۷
اکبرآباد ۹۱، ۳۳۵
اکبرآباد کی قدیم زبان ۳۰
آگرے کی تیراکی ۷۱، ۲۹۱
الٰہی نامہ ۴۳، ۲۰۳
آندھی ۱۲۰، ۳۴۵
اوس ۷۵، ۲۹۶
آئینہ ۱۱۷، ۳۴۰
ایلیگری یا تمثیل ۲۲
(ب) بانسری ۷۰، ۲۸۹
برسات کی بہاریں ۴۵، ۲۰۷
بڑھاپا ۵۸، ۲۴۷
بلدیو جی کا میلہ ۱۳۵، ۳۶۶
بنجارہ نامہ ۷۴
بھونچال ۱۲۵، ۳۵۲
(پ) پری کا سراپا ۹۳، ۳۳۶
(ت) تبصرہ ۴۱، ۳۴
تخریب کلام ۲۹
تضمینیں ۵۲۱
تصنیع کلام ۲۸
تغزل ۱۳۹
تقدیم و تاخیر کلام ۲۷
تمہید ۳
تندرستی نامہ ۵۲، ۲۳۱
(ج) جنم کنھیا جی ۲۸۳
جوانی ۵۶، ۲۴۳
جوانی بڑھاپا ۳۶۲
جوگن نامہ ۹۸، ۳۲۳
جوگی نامہ ۸۹، ۳۱۷
(چ) چاندنی رات ۸۶، ۳۱۳
چڑیوں کی تسبیح ۲۳۵
(ح) حاکیانہ انداز ۱۸
حضرت سلیم چشتی ۶۶، ۲۷۸
حواشی ۵۴۷
(خ) خاتمہ ۴۰
خالص ہندوستانی شاعر ۱۵
خواب کا طلسم ۸۰، ۳۰۳
خوشامد ۶۰، ۲۵۹
(د) دوالی ۶۵، ۲۷۵
دیباچہ ۱
دیباچہ طبع دوم ۹
(ذ) ذکر مرغاں ۵۴
(ر) راکھی ۸۴، ۳۰۹
رسم خط ۳۸
رنگ کے موجد ۱۰
روٹی نامہ ۱۱۸، ۳۴۲
روح نظیر ۱
روضۂ تاج گنج ۵۲، ۲۳۰
ریچھ کا بچہ ۸۲، ۳۰۶
(ز) زبان پر اجتہاد ۳۱
زبان پر احسان ۳۲
(س) سخاوت و عشرت ۸۵، ۳۱۰
سوانح نظیر ۳۸

(ش) شاعرانہ اہمیت ۷
شیکسپیر ۲۵
شیب و شباب ۱۳۱
(ط) طفلی ۵۶، ۲۴۲
(ع) عاشق نامہ ۴۸، ۲۲۰
عروض ۳۶
علمیت ۹
عنوانات کا انڈکس ۵۶۹
(غ) غزلیات ۲۷۵
غزلیں ۲۷۷
(ف) فارسی ترکیب ۱۹۱
فحشیات ۳۷
فرہنگ ۵۳۱

فلسفیت ۱۶۵
فقیروں کی صدا ۵۹، ۲۵۶
فنا نامہ ۵۵، ۲۳۷
فہرست مضامین ۱۷
(ق) قطعات ۳۹
قومی شاعر ہے مخمس ادبی
نہیں ۳۲
(ک) کثرت کلام ۲۸
کلام نظیر ۲۰۱، ۲۰۳
کلجگ ۹۰، ۲۶۳
ککڑی ۱۲۳، ۳۴۹
کنہیا جی کا جنم ۲۸
کوا اور ہرن کا بچہ ۶۵، ۳۰۱

کورا برتن ۶۷، ۲۹۸
کوڑی نامہ ۱۲۷، ۳۵۷
کوئی بڑا شاعر اتنا گمنام نہیں
(گ) گمنامی ۴
(ل) لوکل کلر یا مقامی رنگ ۲۱
(م) متروکات و معائب ۳۵
مسلسل غزلیں ۴۶۱
مستزاد ۵۲۹
معاشرت نگاری ۱۶
معجزہ حضرت علیؓ ۶۳، ۲۷۱
معشوق کی تذکیر ۱۳
مفلسی ۶۳، ۲۶۶
مقبولیت ۲۷

مقدمہ ۱
موتی ۹۰، ۳۳۱
موت ۳۳۳
موسم زمستان ۷۳، ۲۹۴
موضوعی غزلیں ۵۰۱
(ن) نانک شاہ گرو ۷۸، ۲۸۱
نظیر کا آرٹ ۱۱
نظیر کا پرتو غالب پر ۱۹۲
نو آزادانہ ۳۴
(و) وجد و حال ۱۳۰، ۳۲۰
(ہ) ہنس نامہ ۵۱، ۲۲۶
ہولی کی بہار ۷۶، ۲۸۰
ہولی ۸۸، ۳۱۵

خاتمہ

نوشتہ حفیظ اکبرآبادی